# ضیاء الدین احمد برنی کی علمی و ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ

مقالہ برائے

پی ایچ ڈی (اردو)

۲۰۰۹ء


تحقیق کار

رفیق احمد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، جامعہ سندھ

نگرانِ کار

ڈاکٹر نسیم آرا سرتاج

پروفیسر و سابق صدر نشین شعبۂ اُردو، جامعہ سندھ

شعبۂ اردو، کلیۂ فنون، جامعہ سندھ، جام شورو

بسم الله الرحمن الرحيم

# CERTIFICATE

Certified that Mr. Rafique Ahmed S/o Shabbir Ahmed has carried out research on the Topic: **Ziauddin Ahmed Barni: Critical Analysis of his Scholarly and Literary Contributions** under my supervision and that his work is original and distinct and his dissertation is worthy of presentation of the University of Sindh for award of the degree of Doctor of Philosophy.

DR. NASIM ARA SARTAJ
Ex. Professor, Department of Urdu
University of Sindh, Jamshoro.

# انتساب

بیوی (سیدہ ارجمند فاطمہ)

اور بچوں

فضیل احمد خاں

رمیز احمد خاں

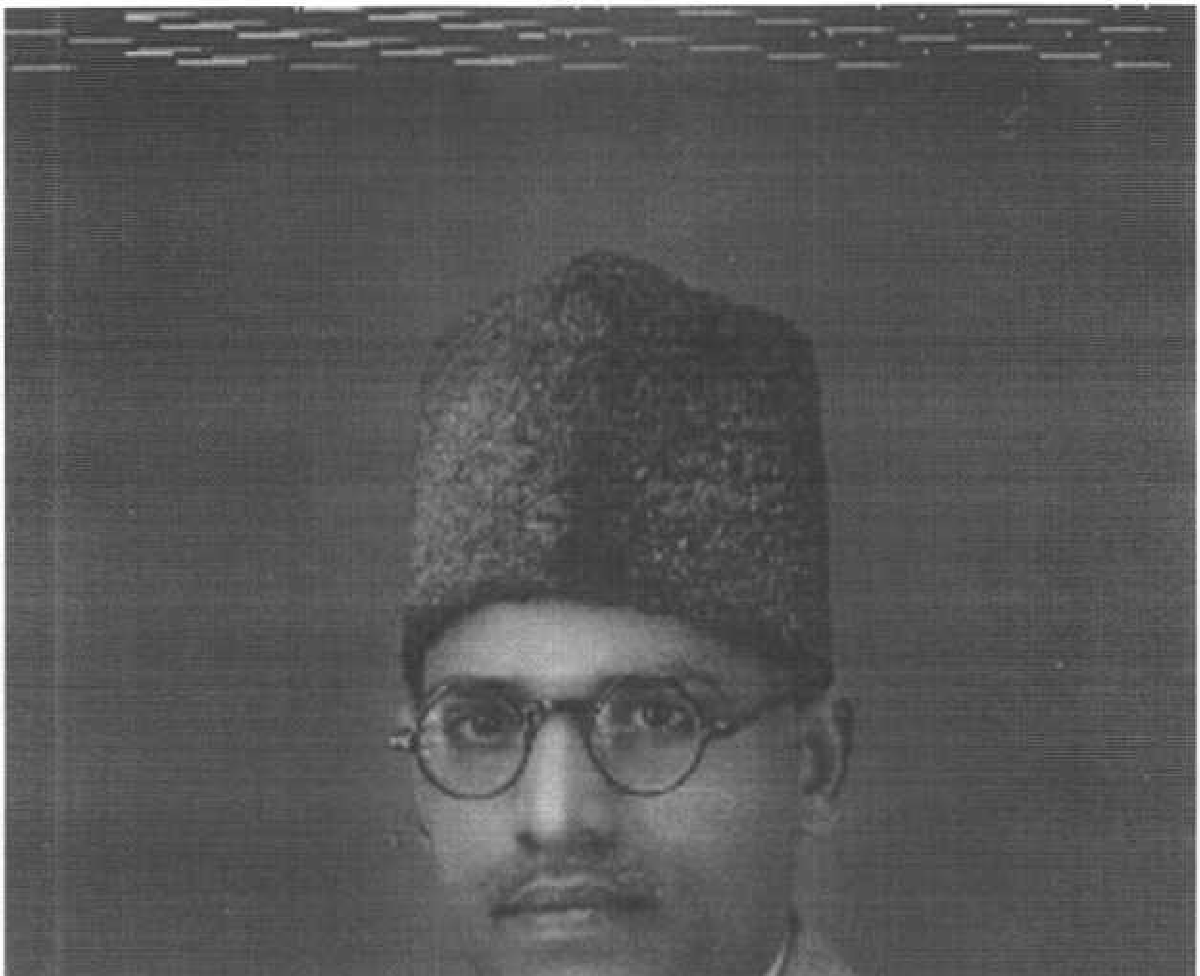
حسیب احمد خاں

اور

طلیب احمد خاں

کے نام

barni3.jpg (276x377x24b jpeg)



# ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# حرفِ آغاز

یہ امر میرے لیے باعثِ مسرت اور افتخار ہے کہ میں نے ضیاء الدین احمد برنی جیسے مشہور صاحبِ قلم کے احوال و آثار پر تحقیقی کام کیا۔ میں نے اس سفر کا آغاز ۲۰۰۰ء میں برنی کی کتاب ''عظمتِ رفتہ'' کے مطالعے سے کیا تھا جس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس کتاب سے مجھ پر کھلا کہ برنی کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کیا کرتے رہے ہیں؟ ان کے کن کن لوگوں سے مراسم و تعلقات تھے؟ کون ان کا چہیتا ہے اور وہ کس کے چہیتے ہیں؟ اس کے مطالعے نے جہاں عظمتِ رفتہ شخصیات کی شان و شوکت کا نقش میرے دل پر بٹھا دیا وہاں برنی اور برنی کے خاندان کی عظمت بھی میرے دل میں پیدا کر دی۔ اُسی زمانے میں بشیر ڈار کی کتاب ''انوارِ اقبال'' میں برنی کے نام علامہ اقبال کے خطوط دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں برنی کی چند کتابوں کا احوال بھی تھا چناں چہ ان خطوط کے مطالعے نے میرے اندر تجسس کو بڑھا دیا اور میں مزید کی تلاش میں لگ گیا۔

یہ جان کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ برنی کا ذکر بڑی بڑی اور اہم کتابوں میں ہے تاہم ان کے بارے میں معلومات ناپید ہیں! اسی لمحے میرے اندر یہ احساس جنم لینے لگا کہ بے خود دہلوی، سائل احمد دہلوی (شاگردانِ داغؔ)، مولانا الطاف حسین حالؔی، ابوالکلام آزادؔ، محمد علی جوہرؔ، خواجہ حسن نظامی، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی آنکھیں دیکھنے والے اور ان کی صحبتِ فیض رساں سے مستفیض ہونے والے ضیاء الدین احمد برنی پر کوئی کام نہیں ہوا۔ اس احساس نے مجھے اس جانب متوجہ کیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ برنی پر تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ اُسی زمانے میں محمد راشد شیخ صاحب نے، جن کے تعلقات برنی کے بیٹوں سے تھے، اپنے اشاعتی ادارے ''ادارۂ علم و فن، کراچی'' سے برنی کی کتاب ''عظمتِ رفتہ'' کو نئی جلد اور سابقہ سرورق کے عکس کے ساتھ دوبارہ شائع کیا اور مجھے تبصرے کے لیے بھیجا، میں اس حوالے سے غور تو کر رہا تھا کتاب ملتے ہی محمد راشد شیخ صاحب سے رابطہ کیا اور ان پر اپنا ارادہ ظاہر کیا ان کی نظر میں اور بھی کچھ تھا۔ وہ اس خاندان سے واقف تھے اور اپنی کتاب ''تذکرۂ خطاطین'' جو اسی زمانے میں شائع ہوئی تھی اس خاندان کے افراد کا تذکرہ کر چکے تھے۔ انھوں نے میرے ارادے پر نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ امداد کا یقین دلایا۔

اس سلسلے میں، میں نے مرحوم مشفق خواجہ سے مشورہ کیا تو انھوں نے بھی میرے ارادے کی تائید کی کہا کہ کام ضرور ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانے سے برنی کی مترجمہ کتاب ''دلی کی صبح و شام'' فوٹو کاپی کے لیے فراہم کی اور ساتھ ہی اصل انگریزی کتاب بھی دی۔

ان دو حضرات سے ملاقات اور ان کے حوصلہ دلانے کے بعد میرے ارادے میں استحکام پیدا ہو گیا اور میں نے ضیاء الدین احمد برنی کے بیٹوں سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ ایک شام ہم نے برنی کے بڑے بیٹے اعجاز احمد برنی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقات کی۔ وہ نہایت تپاک سے ملے جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں ضیاء الدین احمد برنی پر پی ایچ ڈی سطح کا تحقیقی کام کرنا چاہتا ہوں

تو انھوں نے اپنے تعاون کا یقین دلایا اور اسی وقت برنی کی چند کتب جو غالباً دو چھتی پر رکھی تھیں اتروا کر دیں اور ایک فائل سے جس میں برنی کے انتقال پر شائع ہونے والے اخبار جنگ کے دو مضامین اور ان کے انتقال پر شائع ہونے والی خبریں تھیں، نقلیں دیں۔

وہ سرمایہ لے کر میں حیدرآباد آ گیا۔ اس کے بعد اعجاز برنی سے کئی سالوں تک ملاقات نہیں ہوئی نہ انھوں نے معلوم کیا کہ میں کون تھا؟ کہاں گیا؟ کیا کیا؟ کیا کر رہا ہوں؟۔ اس دوران راشد شیخ صاحب سے نہ صرف ملاقاتیں رہیں بلکہ وہ حتی المقدور تعاون بھی کرتے رہے۔

اس کے بعد محمد راشد شیخ صاحب کے توسط سے ضیاء الدین احمد برنی کے سب سے چھوٹے بیٹے ریاض احمد برنی سے ملاقات کی۔ ریاض صاحب نہایت اخلاص سے ملے اور ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ ریاض صاحب نے اپنا وعدہ نبھایا اور تحقیقی کام کے مکمل ہونے تک تعاون فرماتے رہے۔

۲۰۰۴ء میں رجسٹریشن کے بعد فیلڈ ورک کا آغاز کیا سب سے پہلے حیدرآباد سندھ اور کراچی کی درج ذیل کتاب خانوں میں لوازمہ تلاش کیا گیا۔ ان کتاب خانوں میں سرکاری و نیم سرکاری اور نجی کتاب خانے بھی ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے:

حسرت موہانی لائبریری، حیدرآباد، سندھ۔

شمس العلماء داؤد پوتا لائبریری، حیدرآباد، سندھ۔

جامعہ سندھ، ''مرکزی کتاب خانہ'' جام شورو، سندھ۔

سندھالوجی، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، سندھ۔

سندھی ادبی بورڈ ''کتاب خانہ''، جام شورو، سندھ۔

کتاب خانہء غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، حیدرآباد، سندھ۔

کتاب خانہء عتیق احمد جیلانی، حیدرآباد، سندھ۔

کتاب خانہء شاہ انجم، حیدرآباد، سندھ۔

انجمن ترقی اردو، ''کتب خانہء خاص''، کراچی۔

جامعہ کراچی، ''مرکزی کتاب خانہ''، کراچی۔

بیدل لائبریری، شرف آباد، کراچی۔

غالب لائبریری، ناظم آباد، کراچی۔

بہادر یار جنگ لائبریری، بہادرآباد، کراچی۔

لیاقت میموریل لائبریری، کراچی۔

نیشنل میوزیم پاکستان، ''شعبہء مخطوطات''، کراچی۔

کتاب خانہء مشفق خواجہ، کراچی۔

کتاب خانہء معین الدین عقیل، ڈاکٹر، کراچی۔

کتاب خانہء ریاض احمد برنی، کراچی۔

۹ مئی ۲۰۰۵ کو پہلا دفاعی سیمینار شعبہء اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو میں، ڈاکٹر قاضی خادم حسین، ڈین کی صدارت میں ہوا۔ ۸/اپریل تا ۱۴/اپریل لاہور اور گوجرانوالہ کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران درج ذیل حضرات سے ملاقاتیں کیں اور بعض کے انٹرویو بھی کیے:

**ملاقاتیں:**

ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور۔

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، لاہور۔

جہاں آرا نظام (ضیاء الدین احمد برنی کی بیٹی)، لاہور۔

عبدالقیوم (برنی کے عزیز)، لاہور۔

عظمت اللہ سلیم (برنی کے عزیز)، گوجرانوالہ۔

امان اللہ (عظمت اللہ سلیم کے برادرِ خرد)، جنڈیالہ ڈھاب والا، گوجرانوالہ۔

زاہدہ خاتون (بنت ظہیر الدین بن منشی عبدالقدیر)، گوجرانوالہ۔

لاہور میں ملاقاتوں کے علاوہ درجِ ذیل کتاب خانوں میں لوازمہ بھی تلاش کیا:

پنجاب پبلک لائبریری، لاہور۔

پنجاب یونی ورسٹی، مرکزی کتاب خانہ، لاہور۔

گورنمنٹ کالج، لائبریری، لاہور۔

سلفیہ کتاب خانہ، لاہور۔

کتاب خانہء عجائب گھر، لاہور۔

لاہور میں قیام کے دوران برنی کے بیٹی جہاں آرا نظام سے کئی دنوں تک اپنے موضوع پر بات چیت رہی بلکہ ان سے باقاعدہ انٹرویو بھی کیا۔ ان کے علاوہ عبدالقیوم صاحب سے بھی انٹرویو کیا انھوں نے بہت سے مفید باتیں خاندان اور برنی سے متعلق بتائیں۔

گوجرانوالہ میں عظمت اللہ سلیم صاحب سے نہ صرف ملاقات کی بلکہ ان کا انٹرویو بھی کیا۔ ان کے ساتھ ان کے آبائی گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا بھی گیا وہاں ان کے بھائی امان اللہ سے ملاقات کی اور ان کے آبائی قبرستان میں ضیاء الدین احمد برنی کے تایا مولوی گنج بخش کے مزار کا دیدار بھی کیا علاوہ ازیں ان کے بزرگوں کی تعمیر کردہ مسجد میں نہ صرف نمازِ عصر ادا کی بلکہ اس کی دیواروں پر آویزاں امان اللہ کے ہاتھ کی خطاطی کے نمونے بھی دیکھے۔

عظمت اللہ سلیم، عبدالقیوم اور زاہدہ خاتون صاحبان کی مدد سے منشی محمد الدین کا خاندانی شجرہ ترتیب دیا گیا جس میں بعد میں ریاض احمد برنی اور مولوی گنج بخش کی پوتی نے امریکہ سے مدد کی۔

رجسٹریشن کے بعد اور پہلے سیمینار کے وقت کل کام کا جو خاکہ ترتیب دیا گیا اس کے ہر باب کے خلاصے کے ساتھ درج کیا جاتا ہے تاکہ مجموعی کام کو ایک نظر میں دیکھا جا سکے۔

**مقالے کا خاکہ:**

ابواب:



**ضمیمے:**

مقالے کے اختتام پر چند ضمیمے شاملِ مقالہ کیے گئے ہیں جن کی ترتیب و تفصیل اس طرح ہے:

**۱۔ ضمیمہ نمبر ۱:**

برنی کے والد منشی محمد الدین، بہن فاطمۃ الکبریٰ اور بھائی منشی محمد یوسف دہلوی کے خطاطی کے نمونے اور ان کی تصاویر، وہ ڈائری جس میں خاندان کے افراد کی پیدائش و انتقال کی تاریخیں درج ہیں۔

**۲۔ ضمیمہ نمبر ۲:**

ضیاءالدین احمد برنی کی اسکول اور کالج کی اسناد، امتحانی پرچے، اسکول اور کالج کے نتیجے، ملازمت کی بعض دستاویزات، نکاح نامہ، برنی کی یادداشتیں اور خودنوشت کے عکس، بعض اہم شخصیات کی جانب سے دیے جانے والے سرٹیفکیٹس وغیرہ۔

**۳۔ ضمیمہ نمبر ۳:**

برنی کے اپنے ہاتھ کے خطوط، مشاہیر کے چند خطوط بہ طور نمونہ۔

**۴۔ ضمیمہ نمبر ۴:**

برنی کی تحریر کا عکس، برنی کی چند غیر مطبوعہ کتب کے عکس

**کتابیات:**

مقالے کے اختتام پر ایک مکمل فہرست ان کتب، رسائل اور اخبارات کی علاحدہ علاحدہ دی گئی ہے جن سے مقالے میں استفادہ کیا گیا ہے۔ فہرست کی ترتیب مصنف وار رکھی گی ہے۔۔رسائل اور اخبارات کی ترتیب ان کے نام سے دی گئی ہے۔

**نتائج تحقیق:**

آٹھ ابواب اور چار ضمیمہ جات ماحصلِ تحقیق ہیں جن کے ذریعے برنی کے اُناسی سالہ سوانح اور علمی و ادبی خدمات کو تحقیقی اور تنقیدی جائزے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ہر باب کا خلاصہ ملاحظہ فرمایئے جس کے ذریعے مجموعی کام کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے:

**باب اوّل: طریقِ تحقیق**

اس باب میں شخصیات کے حوالے سے ہونے والے مروجہ طریق ہائے تحقیق کو مثالاً پیش کیا گیا ہے اور اس کی روشنی میں ضیاء الدین احمد برنی پر تحقیق کے دوران جو جو نئے طریقے برتے گئے ہیں ان کی تفصیلی وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً خطوط کے ذریعے متعلقہ افراد اور اداروں سے رابطہ کیا گیا۔ اسی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ سہ ماہی العلم، کراچی میں خط کی وساطت سے اہلِ علم کو اپنے کام کی جانب متوجہ کیا گیا۔ بہ قدرِ ضرورت ٹیلی فون کا ذریعہ بھی اس سلسلے میں استعمال کیا گیا۔ انٹرنیٹ چوں کہ وقت کی اہم ضرورت ہے اور ہمارے بہت سے تحقیقی کاموں میں معاون رہتا ہے لہذا اس ذریعے کو بھی کام میں لایا گیا اور پاک و ہند کے علمی اداروں اور شخصیات سے رابطے کیے گئے علاوہ ازیں کانگریس لائبریری، آکسفورڈ لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری، لندن سے رابطہ کیا گیا۔ ڈیجیٹل کیمرے کا استعمال بھی تحقیقی کاموں میں ضروری ہوگیا ہے لہذا مذکورہ تحقیقی کام میں اس سے بھی فائدہ اٹھایا گیا۔ بعض دست آویز کے لیے اسکینر کا استعمال بھی ضروری سمجھا گیا۔ اہم شخصیات کے انٹرویو کیے گئے اور سوالناموں کی مدد سے بھی معلومات جمع کی گئیں اور ان کی روشنی میں برنی کی شخصیت اور زندگی کے اہم واقعات کی کڑیوں کو مرتب و مربوط کیا گیا۔ اس ضمن میں برنی کے خطوط اور برنی کے نام مشاہیر کے خطوط کے تقابل اور موازنے سے بھی شخصیت اور خدمات کی تفہیم میں مدد لی گئی۔

**باب دوّم: ضیاء الدین احمد برنی کا خاندانی پس منظر**

اس عنوان کے تحت ضیاء الدین احمد برنی کے خاندانی حالات پر تفصیلی روشنی ڈالنے سے پہلے اُن کے آبائی وطن گوجرانوالہ کے محل وقوع اور تاریخ میں اس کی مختلف حیثیتوں کا تذکرہ ہے۔ ازاں بعد برنی کا خاندانی پس منظر مکمل تحقیق کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ پس منظر ہے جس میں برنی کی ذہنی، فکری اور اخلاقی تربیت ہوئی۔ اس کے بغیر برنی کی فکر، نظریہ حیات اور ان کی خدمات کو درست زاویے سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ لہذا اس منظر نامے کو بنیاد بنا کر آئندہ کے ابواب میں برنی کی شخصیت، کردار، فکر، سوانح اور خدمات کو جانچا اور پرکھا گیا ہے۔ برنی کا خاندانی شجرہ بھی اسی غرض سے پہلی مرتبہ مرتب کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت معلومات تحقیق کر کے مرتب کی گئی ہیں:

گوجرانوالہ کی حیثیت اور اس کا محلِ وقوع۔صوبہ پنجاب میں گوجرانوالہ کی حیثیت۔گوجرانوالہ اور فنِ خطاطی۔ضیاء الدین احمد برنؔی کا خاندان۔قومیت۔مولوی نظام الدین (برنی کے دادا)۔منشی کرم الٰہی (برنی کے تایا)۔مولوی گنج بخش (برنی کے تایا)۔مولوی رجب علی (برنی کے چچا)۔منشی محمد الدین (ضیاء الدین احمد برنؔی کے والد)۔نام اور پیدائش۔تعلیم۔آبائی گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا سے ہجرت۔دہلی میں مستقل قیام سے قبل لاہور اور ملتان میں عارضی قیام۔دہلی آمد اور مختلف محلّوں میں قیام۔منشی محمد الدین کا دینی شغف اور علم وفضل۔شرافت،قناعت اور وضع داری۔منشی محمد الدین اور فنِ خوش نویسی/خطاطی۔منشی محمد الدین کے تعلقات دہلی کے اکابر ومشاہر سے۔منشی محمد الدین اور غبارِ خاطر کا مقدمہ۔منشی محمد الدین کا صحافت اور سیاست سے تعلق۔ہفتہ وار ''دارالعلوم'' دہلی، کا اجراء۔حُسن بیگم(ضیاء الدین احمد برنی کی والدہ)۔منشی محمد الدین کی اولاد:منشی عبدالقدیر دہلوی۔فاطمۃ الکبریٰ۔آمنہ بیگم۔محمد یوسف دہلوی۔محمد احمد۔

باب سوم: برنی کے سوانح اور علمی وادبی خدمات

ضیاء الدین احمد برنی نے ایسے زمانے میں آنکھ کھولی جب ہندوستان انگریزی اقتدار کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا اور مسلمانوں پر ہر طرح کی ترقی کے دروازے بند تھے۔تحریر اور تقریر میں بھی انھیں آزادی حاصل نہیں تھی۔اُن حالات میں برنی نے نہ صرف زبان وادب کی خدمت کی بلکہ اپنی اسلامی غیرت وحمیت کو بھی برقرار رکھا اور ایک ایسے مسلمان کی زندگی بہ طور نمونہ پیش کی جو دیانت داری سے اپنے فرائض بھی انجام دیتا ہے اور اپنے شوق،محنت اور خداداد صلاحیتوں سے زبان وادب اور قوم وملک کی خدمت بھی انجام دینے میں پیش پیش رہتا ہے۔

مذکورہ باب میں بیشتر عنوانات کے ذریعے ضیاء الدین احمد برنی کے اُناسی سالہ سوانحی واقعات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر زمانی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔اس میں برنی کی شخصیت وکردار،فکر اور نظریات کو بھی سامنے لایا گیا ہے اور ان کی مختلف حیثیتوں مثلاً سوانح نگار،خاکہ نگار،مترجم،صحافی،مؤرخ اور مدیر رسالہ کو اجاگر کیا گیا ہے۔

اس باب میں درجِ ذیل عنوانات قائم کیے گئے ہیں:

برنی کا اصل نام،لقب اور ولادت۔ابتدائی تعلیم۔مڈل اسکول کی تعلیم۔میٹرک کی تعلیم۔انٹرمیڈیٹ اور کالج کی تعلیم۔یونی ورسٹی کی تعلیم۔برنی کے اساتذہ۔زمانہ طالب علمی میں علمی وادبی سرگرمیاں۔برنی کی علمی وادبی زندگی کا آغاز۔برنی کے ہم جماعت:ملا واحدی،ڈاکٹر سید سجاد احمد دہلوی،عارف ہسوی۔برنی اور خواجہ حسن نظامی۔برنی اور مولانا محمد علی جوہرؔ۔برنی اور علامہ اقبالؔ۔برنی کی شخصیت۔ملازمتیں۔صحافت سے وابستگی۔برنی کی ازدواج اور اولاد۔برنی کی فارسی زبان سے دل چسپی۔برنی بہ طور مدرس۔برنی کے مشاغل۔انجمنوں اور سوسائٹیوں سے وابستگی۔برنی کی علالت اور وفات۔انتقال کے بعد اخبارات کی خبریں۔برنی پر مضامین۔برنی کا تذکرہ اردو کی اہم کتب میں۔برنی کا تذکرہ انگریزی کی اہم کتب میں۔

باب چہارم: مطبوعہ کتب کا تحقیقی جائزہ

اس مقالے سے پیشتر ضیاء الدین احمد برنی پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ان کی زیادہ سے زیادہ انیس (۱۹)

مطبوعات کے صرف نام ملتے ہیں۔اس باب میں ان کی اردو انگریزی چھبیس (۲۶) مطبوعات کو بازیافت کر کے ان کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور اس حوالے سے ان کی خدمات کو وقتِ نظر سے دیکھا گیا ہے۔جب کہ غیر مطبوعہ کتب کے لیے علاحدہ باب مختص ہے۔

برنی کی کتابوں کے بالاستعاب مطالعے اور جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے مذکورہ کتابیں بھرپور مطالعے اور نہایت تحقیق کے ساتھ لکھی ہیں۔جا بہ جا حوالہ جات اور تعلیقات کا اہتمام بھی کیا ہے۔مشاہیر کے نام ان کے خطوط سے بھی اُن کی اِن تحقیقی سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ برنی کی اکثر کتابیں بطور سند استعمال ہوتی رہی ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل ادب، صحافت، سیاست اور تاریخ میں امتیاز کرنا دشوار تھا۔اکثر ادیب صحافت، سیاست اور تاریخ کے میدانوں میں بیک وقت تحریراً اور تقریراً سرگرم نظر آتے ہیں۔یہی سبب ہے کہ برنی کی تصانیف اور مضامین میں بھی یہ تمام رنگ نمایاں ہیں۔

''اخباری لغات معروف بہ کلیدِ اخبار بینی'' (۱۹۱۵ء) ان کی وہ تصنیف ہے جس کی مثال اس سے پیشتر نہیں ملتی۔اس میں انھوں نے اس وقت کے اردو اخبارات میں انگریزی زبان کے الفاظ، اصطلاحات، علامات کے معانی اور ان کی تفصیلات تحقیق کے ساتھ درج کی ہیں اور ان کے حوالے بھی دیے ہیں۔علامہ اقبال نے ایک خط میں برنی کے اس کام کو اس طرح سراہا ہے ''آپ کی کتاب مفید ثابت ہوگی۔اردو خوانوں کے لیے بالخصوص اس قسم کی کتاب کی ضرورت تھی۔''

''تعلیم اور تربیت'' بھی ان کی ایک اہم کتاب ہے جو ان کے مطالعے، ذاتی مشاہدے اور تجربے سے وجود میں آئی تھی۔''عظمتِ رفتہ'' برنی کی وہ تصنیف ہے جس میں برنی نے ۹۳ مرحوم شخصیات کے شخصی خاکے، دہلوی اسلوب تحریر میں پیش کیے گئے ہیں۔یہ وہ کتاب ہے جسے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔اسی طرح ''سید جمال الدین افغانی'' اور ''جہاں آرا بیگم'' بھی وہ کتابیں ہیں جن کی تخلیق وقت کی اہم ضرورت تھی۔دونوں کتابیں مکمل تحقیق اور بھرپور مطالعے کے بعد لکھی گئی ہیں۔ان کتابوں میں جہاں برنی کی مشاہیر اسلام سے محبت دیکھی جاسکتی ہے وہاں ان کے فنِ سوانح نگاری میں ہنر کو بھی پرکھا جاسکتا ہے۔

**باب پنجم: برنی کے خطوط کا تجزیاتی مطالعہ**

خط کا تعلق چوں کہ براہ راست انسان کے باطن سے ہوتا ہے اور اس میں جس طرح کی بے تکلفی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے ویسی کسی اور صنف ادب میں نہیں پائی جاتی۔یعنی خطوط دِلی جذبات اور باطنی کیفیات کا اظہار یہ ہوتے ہیں اس لیے کسی شخص کی شخصیت کو پرکھنے اور اس کی نفسیات کو جانچنے میں یہ نہایت اہم دست آویز کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

اس باب میں برنی کی مکتوب گاری کی خصوصیات اُنھی کے خطوط سے اخذ کر کے واضح کی گئی ہیں۔غیر مطبوعہ اور مطبوعہ خطوط کا تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کے ذریعے برنی کی نفسیات، مزاج اور عادت واطوار کی تفہیم کی گئی ہے۔

اُس عہد میں برنی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو سامنے لایا گیا ہے۔مکتوب الیہان میں ادبی شخصیات، مدیرانِ رسائل اور ان کے عزیز ہیں چناں چہ برنی سے مکتوب الیہان کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔بعض مقامات پر برنی کے نام خطوط سے موازنہ کر کے بعض اہم

باتوں کا پتا لگایا گیا ہے۔

باب ششم: برنی کے نام مشاہیر کے خطوط کا تجزیاتی مطالعہ

ضیاء الدین احمد برنی کے تعلقات و مراسم تمام عمر جن لوگوں سے رہے ان میں مختلف مذاہب، مکتبۂ فکر، مراتب اور عمر کے لوگ ہیں۔ اِن سب سے برنی کی خط کتابت بھی رہی۔ برنی کے تعلقات کے دائرے کو پیش نظر رکھ کر حتمی طور پر یہ نہیں کہا سکتا کہ انھوں نے کتنے خطوط لکھے اور کتنے خطوط انھیں لکھے گئے تاہم ان کے نام خطوط کی تعداد پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ ان کے خطوط کی تعداد بھی ہزاروں میں ہوگی۔

ایک مدت کی تلاش و تحقیق کے بعد راقم نے ضیاء الدین احمد برنی کے نام مشاہیر ادب، صحافت اور سیاست کے ڈیڑھ ہزار سے زائد خطوط کھوج نکالے۔ یہ خطوط بھی برنی کے سوانح، شخصیت، کردار، ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور بعض نجی معاملات کے علاوہ مکتوب نگار کی زندگی، فکر اور برنی سے تعلقات کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض خطوط اُس عہد کے ادبی، سیاسی اور معاشرتی منظر نامے کو بھی اجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چند باتیں مثالاً لکھی جاتی ہیں:

۱۔ علامہ شبلی نعمانی کے خط سے پتا چلتا ہے کہ سیرت نبوی کے سلسلے میں شبلی نے برنی کی معاونت کی پیش کش کو قبول کرلیا تھا۔

۲۔ سید سلیمان ندوی کے خط سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ برنی نے ان کی تصنیف ''حیات''شبلی کی اغلاط کی نشان دہی کی جسے سلیمان ندوی نے نہ صرف بہ خوشی تسلیم کیا بلکہ آئندہ ایڈیشن میں درست کا یقین دلایا۔

۳۔ مولوی عبدالحق کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ برنی نے مولوی عبدالحق کی مرتبہ اردو انگریزی لغت کے کام میں حصہ لیا اور انجمن کی مطبوعات پر تبصرے لکھ کر بمبئی کرانیکل میں شایع کیے۔

۳۔ سید سعید رضا کے خطوط سے برنی کے بعض خانگی معاملات پر روشنی پڑتی ہے۔

۴۔ سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر بمبئی کرانیکل کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ برنی نے کرانیکل میں کون کون سے مضامین لکھے۔

۵۔ خواجہ حسن نظامی کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے برنی سے کن کتابوں کے تراجم کروائے۔

۶۔ عبدالمجید سالک کے خط سے ''زمیندار'' کے معاملات پر روشنی پڑتی ہے۔

۷۔ انیس شاہ جیلانی کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ برنی کب کب بیمار رہے، کن پریشانیوں میں مبتلاء رہے۔ عبدالمجید حیرت شملوی کے خطوط کی جمع آوری میں برنی کی کوششوں کا احوال بھی انھی خطوط میں ہے۔

۷۔ ہمدرد میں برنی کی سب ایڈیٹر کا مسئلہ بھی انھی خطوط سے حل ہوتا ہے۔

۸۔ اقبال اور برنی کے تعلقات بھی برنی کے نام اقبال کے خطوط سے واضح ہوتے ہیں اور یہ کہ اقبال نے برنی کے کام پر کس طرح داد دی ہے۔

۹۔ انھی خطوط سے پتا چلتا ہے کہ برنی نے احسن مارہری کو نہ صرف بمبئی میں بہ طور شاعر متعارف کروایا بلکہ ان کی انتہائی پریشانیوں میں کس طرح ان کی مدد کی۔ انھی خطوط سے احسن اور ان کے نامور شاگرد مصطفیٰ خاں احمق پھپھوندوی

(مداح) کے درمیان کشیدگی کا پتا چلتا ہے۔

۱۰۔ ماہر القادری اور برنی کے تعلقات کا پتا چلتا ہے اور یہ کہ برنی ہی نے انھیں بمبئی میں شاعر کی حیثیت سے متعارف کروایا۔

۱۱۔ نیاز فتح پوری کے خطوط سے ''نگار'' لکھنؤ میں برنی کے مضامین کی اشاعت اور نیاز سے متعلق بھی بعض اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔

۱۲۔ محمد طفیل کے خطوط سے ''انجمن ادبی رسائل'' سے متعلق برنی کی سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے۔

۱۴۔ بدر جلالی (روزنامہ ''مدینہ'' بجنور اور روزنامہ ''خلافت''، بمبئی کے سابق ایڈیٹر) کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ برنی نے ان کی مالی مدد اُس زمانے میں کی جب وہ نہایت تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے۔

۱۵۔ سیماب اکبرآبادی کے خط سے معلوم ہوا کہ برنی نے چند دن قبل ریڈیو پر عبدالرحمٰن کابلی پر تقریر کی تھی۔ یہ بات کہیں اور درج نہیں۔

۶۔ غلام السیدین اور رشید احمد صدیقی کے خطوط سے برنی کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' پر ان کی رائے سامنے آتی ہے۔

اس طرح کی اور بہت سی اہم باتیں اُن خطوط میں بکھری ہوئی ہیں۔

**باب ہفتم: ماہنامہ کتابی دنیا ایک جائزہ**

ادبی دنیا میں، تخلیقی، تنقیدی، تاریخی اور تحقیقی حوالوں سے رسائل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی رسائل عوام میں زبان وادب کی ترویج واشاعت اور ذہنی وفکری تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عموماً ہر رسالہ اپنا علاحدہ مزاج اور منہاج رکھتا ہے، جس میں مدیر کے فکری رجحان کو محسوس کیا جاسکتا ہے، مدیر کے اسی فکری رجحان کے باعث رسالہ اپنی منفرد سمت اور رفتار متعین کرتا ہے۔ جو رسالے کسی خاص فکر کے ساتھ جنم لیتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں، اُن رسالوں کا سفر جاری وساری رہتا ہے اور وہ تادیر پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

یہ باب بھی برنی کی زندگی کی طرح بہت اہم ہے۔ انھوں نے دسمبر ۱۹۵۵ء میں ماہنامہ ''کتابی دنیا'' جاری کیا اور اپنی وفات ۱۹۶۹ء تک باقاعدگی سے نکالتے رہے۔ یہ رسالہ اپنی نوع کا منفرد رسالہ تھا۔ اس کا مقصد پاکستان میں کتاب، کتاب سازی اور اس کی ترسیل سے متعلق مسائل زیرِ بحث لاکر حکومت کو ان پر متوجہ کرنا تھا۔ جب کہ ضیاء الدین احمد برنی کے ادبی رجحان کے سبب اس میں ادبی موضوعات اور ادبی شخصیات پر مضامین، علمی وادبی خبریں، کتابوں پر معروضی تبصرے، وفیات کے ذیل میں مختصر مختصر سیکڑوں مضامین، رسائل پر طائرانہ نظر کے ذیل میں تنقید اور ادباء وفضلاء کے خطوط شائع کیے جاتے تھے۔ یہ رسالہ برنی کے تنقیدی رجحانات کا آئینہ داری کرتا ہے۔ بہت سے عنوانات کے ذریعے اس باب کو سمیٹا گیا ہے: مثلاً

کتابی دنیا سے پیشتر کی صورت حال۔ کتابی دنیا کے ہم مزاج رسائل۔ کتابی دنیا کا آغاز۔ کتابی دنیا کا اجراء۔ کتابی دنیا کے مقاصد۔ رسالے کا ڈکلریشن۔ کتابی دنیا کا پہلا پرچہ۔ رسالے میں رونما ہونے والی بعض تبدیلیاں۔ برنی بہ حیثیت مدیر۔ مدیر رسالہ کی بے باکی۔ مدیر رسالہ کا عجز وانکسار۔ اصلاح اور تعمیر کی فکر اور سعی۔ انسانی ہمدردی اور امداد کی فکر۔ رسالے

کے اداریے۔ادیبوں کی وفات۔مضامین ومقالات۔خبریں۔اقتباسات۔مراسلات ۔زیرطبع کتابیں۔رسالوں پر طائرانہ نظر وغیرہ۔

''کتابی دنیا'' اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب رہا اس کا سہرا یقیناً ضیاء الدین احمد برنی کے سر جاتا ہے۔جنھوں نے اس کو کامیاب بنانے اور میں شبانہ روز محنت کی۔

**باب ہشتم: برنی کی غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں کا تحقیقی جائزہ**

برنی کی غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں کی نوعیت دو طرح کی ہے ایک مضامین کی صورت میں اور دوسری کتابوں کی صورت میں۔ان میں وہ مضامین اور کتب بھی شامل ہیں جو دست یاب ہیں اور وہ بھی جو دست یاب نہیں ہیں مگر ان کے حوالے موجود ہیں۔

اس باب کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے،اول حصہ ءکتب اور دوم حصہ ءمضامین۔حصہ ءاول میں چھے ایسی کتابیں بازیافت کر کے پیش کی گئی ہیں جو مرتب ہو چکی تھیں تاہم زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی تھیں۔تین کتابیں وہ ہیں جو نہ مرتب ہوئیں اور نہ چھپ سکیں۔ایک ڈائری ہے جس کی نوعیت بھی ایک کتاب کی سی ہے۔علاوہ ازیں سات ایسی کتابیں ہیں جن کا برنی کی تحریروں میں محض ذکر ملتا ہے اور مزید معلومات نہیں ملتیں۔

دوسرے حصے میں برنی کے مضامین بابت معلومات تحقیق کر کے درج کی گئی ہیں۔غیر مدون مضامین کی تعداد سو سے زائد ہے۔کتابی دنیا میں شائع ہونے تبصرے،وفیات کے ذیل میں مختصر مضامین،رسائل پر طائرانہ نظر کے زیر عنوان تبصرے اس کے علاوہ ہیں۔

**نتیجہءتحقیق:**

آٹھ ابواب اور ضمیمہ جات کی تشکیل وترتیب کے بعد یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ضیاء الدین احمد برنی کے سوانح اور ان کی علمی وادبی خدمات تحقیق اور تنقیدی جائزے کے ساتھ مجتمع ومرتب ہونا ضروری تھے۔اس کی تفصیل ابواب کے اختتام پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

۲۰۰۰ء سے شروع ہونے والا تحقیقی کام الحمدللہ اپنے تمام مراحل طے کر کے تکمیل کی منزل کو پہنچ گیا۔اس سلسلے میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تو رب العالمین کا ہزار ہزار شکریہ کہ اسی نے ہمت،طاقت،صحت اور فہم عطا کیا کہ یہ کام تمام ہوا اگر اس کی نصرت شامل حال نہ ہوتی تو شاید یہ مکمل نہ ہوتا یہ شروع ہی نہ ہوتا۔ازاں بعد وہ حضرات جن کا تعاون شاملِ کار رہا ان کا شکریہ نہ صرف واجب ہے بلکہ مجھ ناچیز پر فرض ہے۔سب سے زیادہ میرے شکریے کی مستحق میری بیوی ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس کی کسی طرح کی قربانی کا بھی بدل پیش نہیں کر سکتا اور نہ میرے پاس الفاظ ہیں کہ شکریہ ادا کر سکوں،سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے وہی ٹھیک اجر دے سکتا۔میرے بچے بھی میرے شکریے کے اتنے ہی مستحق ہیں۔

ڈاکٹر نسیم آرا سرتاج صاحبہ کی رہ نمائی قدم قدم رہی۔ان کے مشوروں اور اراء سے میں نے اپنے کام کو زیادہ بہتر

بنایا۔انھی کے تعاون سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو صاحب،ڈین فیکلٹی آف آرٹس کا شکریہ بھی مجھ پر واجب ہے کہ انھوں نے اپنے مفید اور کارآمد مشوروں سے میرے کام اور کام کی رفتار فائدہ پہنچایا۔ان کے علاوہ دیگر افراد یہ ہیں:

محمد راشد شیخ صاحب۔

ریاض احمد برنی صاحب۔

اعجاز احمد برنی صاحب۔

اقبال احمد برنی صاحب۔

عظمت اللہ سلیم صاحب۔

امان اللہ صاحب۔

زاہدہ خاتون صاحبہ۔

جہاں آرا نظام صاحبہ۔

ڈاکٹر نظام الدین صاحب۔

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صاحب۔

ضیاء اللہ کھوکھر صاحب،گوجرانوالہ۔

علی ارشد مرحوم،فیصل آباد۔

عتیق احمد جیلانی صاحب۔

ڈاکٹر شاہ انجم صاحب۔

نسیم احمد صاحب،انجمن ترقی اردو،شعبۂ تحقیق،کراچی۔

معروف صاحب،انجمن ترقی اردو،شعبۂ تحقیق،کراچی۔

زبیر احمد صاحب،بیدل لائبریری،شرف آباد،کراچی۔

دیگر وہ حضرات بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جن کا ذکر ہونے سے رہ گیا ہے تاہم انھوں نے کسی نہ کسی طور میرے کام میں ذرہ برابر بھی معاونت کی ہو۔

اس تحقیقی کام کے ذریعے میں نے کوشش کی ہے کہ ضیاء الدین احمد برنی کو ان کا صحیح مقام دلوایا جائے۔ان کی وہ تمام جہتیں اور ان کی تمام خدمات جو وقت کی گرد تلے دبی جاتی تھیں اور حقائق کے معدوم ہونے سے جو غلط فہمیاں اور تسامحات جنم لے رہے تھے،نمایاں کی جائیں بلکہ برنی کی وہ خدمات جو کسی زمانے میں بھی سامنے نہیں آسکیں سامنے لایا جائے۔

میں نے اپنے طور پر کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا،ہر پہلو پر روشنی ڈالنے بلکہ جائزہ لے کر حقائق کی بازیافت کی بھرپور کوشش کی ہے۔تاہم بندہ بشر ہونے کے ناطے کوئی بات یا کوئی گوشہ تشنہ رہ گیا ہو تو تحقیق کا دروازہ بند نہیں ہوا ان شاء اللہ آئندہ بھی

ان پہلوؤں پر غور و فکر اور تحقیق جاری رہے گی اور جیسے ہی کوئی نئی بات سامنے آئی ان شاء اللہ قلم اُٹھاؤں گا۔

میری محنت، میرے شوقِ تحقیق، میرے جذبے کی پرکھ مقالے کے بالاستیعاب مطالعے ہی سے ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ میری محنت کو ٹھکانے لگائے۔

خاکسار

رفیق احمد خاں

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو

۱۲۷گست ۲۰۰۹

# باب اوّل

# طریق تحقیق

☆۔ قدیم اور مروجہ طریقِ تحقیق

☆۔ موضوع کا انتخاب

☆۔ مقاصد کا تعین

☆۔ ابواب کا تعین

☆۔ کمپیوٹر کا استعمال

☆۔ ملاقاتیں

☆۔ اخذِ نتائج

☆۔ تاریخی یا دستاویزی تحقیق

☆۔ موضوع کا تعارف اور اس کی اہمیت

☆۔ سابقہ تحقیق

☆۔ مصادر کا حصول اور اس کے طریق ہائے کار

☆۔ انٹرنیٹ کا استعمال

☆۔ اولین اور ثانوی مآخذ کا حصول اور تجزیہ

☆۔ کتابیات

☆۔ ضمیمہ جات

# باب اوّل:

# طریقِ تحقیق

## قدیم اور مروجہ طریقِ تحقیق:

موضوع اور طریقِ کار کے اختلاف سے تحقیق کی کتنی ہی قسمیں وجود میں ہو چکی ہیں۔(۱) باوجود اس اختلاف کے ان سب کا مقصد حقائق کی تلاش یا موجود حقائق کی بازیافت ہے۔

سائنس میں ترقی، انسانی فکر اور نظریات میں تبدل و تغیر کے باعث دیگر علوم کے ساتھ ساتھ ادبی تحقیقی نظریات اور طریقِ کار میں بھی تبدیلی آئی ہے، جس کا اعتراف اور اقرار اس موضوع پر کام کرنے والے حضرات کرتے رہے ہیں۔ جدید طرزِ تحقیق میں محض کمپیوٹر کے استعمال ہی نے قدیم طرزِ تحقیق میں ایک نوع کا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

جدید طریقِ تحقیق میں لوازمے تک رسائی سے لے کر اُس کے حصول، تجزیے اور نتائج اخذ کرنے تک کے مراحل میں سائنسی طریقِ کار کا استعمال ناگزیر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر عطش درانی کے بہ قول "تحقیق میں سائنسی طریق کار استعمال کیے بہ غیر کوئی علم سائنس نہیں کہلا سکتا اور کوئی تحقیق پایہ وثوق و اعتبار تک نہیں پہنچ سکتی۔۔۔ یہی صورت لسانی اور ادبی تحقیق کی ہے کہ سائنسی طریق کار استعمال کیے بغیر اسے قابلِ قبول نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔" (۲)

ڈاکٹر عطش درانی نے سائنسی طریقِ کار کے تحت تحقیق کے پانچ بڑے حصے بیان کیے ہیں۔ ان کے مطابق یہی پانچ اقدامات ہر قسم کی جدید تحقیق میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ ادبی اور سائنسی تحقیق کا خاکہ بھی انھی پانچ اقدامات کی توسیع ہوتا ہے۔ وہ پانچ حصے یہ ہیں:

۱۔ قابلِ تحقیق مسئلے کی نشان دہی۔

۲۔ مسئلے سے متعلق ضروری حقائق کی جمع آوری۔

۳۔ مسئلے کے حل کے لیے ایک یا زیادہ آزمائشی ممکنہ حل کا انتخاب۔

۴۔ متبادل حل کی پڑتال تا کہ معلوم کیا جا سکے کہ کون سا حل تمام حقائق کے مطابق ہے۔

۵۔ ممکنہ حد تک مسئلے کے حل کا آخری انتخاب۔ (۳)

اس سائنسی طریقِ کار پر عمل پیرا ہونے کے لیے تحقیق کار کو مندرجہ ذیل چار اقدامات کرنے پڑتے ہیں:

۱۔ مسئلے کا انتخاب (Identification of a Problem)

۲۔ فرضیوں کی تشکیل (Formulation of Hypotheses)

۳۔ آزمائشِ فرضیات (Testing of Hypotheses)

۴۔ نتیجہ (Conclusion) (۴)

## تاریخی یا دستاویزی تحقیق:

بنیادی طور پر میرے موضوع "شخصیت" کا تعلق تاریخی تحقیق (Historical Research) اور دستاویزی تحقیق (Documentary Research) سے ہے۔ سید جمیل احمد رضوی کے بہ قول "دستاویزی تحقیق کو تاریخی تحقیق بھی کہتے ہیں۔" (۵)

ڈیوڈ۔ جے فاکس (David. J.Fox) کے مطابق:

اس [تاریخی تحقیق] میں تاریخی دستاویزوں، آثارِ قدیمہ اور ماضی کی برگزیدہ شخصیتوں، کارناموں اور فلسفوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقۂ کار اور اقدامات وہی ہیں جو عام سائنسی طریقے کے ہیں۔ (۶)

ٹائرس ہل وے (Tyrus Hilway) نے دستاویزی تحقیق کی چھے اقسام بیان کی ہیں (۷):

۱۔سوانح حیات

۲۔اداروں اور تنظیموں کی تاریخ

۳۔ذرائع اور اثرات

۴۔ترتیب وتدوینِ متن

۵۔نظریات کی تاریخ

۶۔کتابیات

پہلی قسم یعنی ''سوانح حیات'' کی تعریف وتفصیل ٹائرس ہل وے(Tyrus Hilway)اس طرح بیان کرتا ہے:

اس میں کسی شعبہء علم کی کسی معروف شخصیت کی زندگی، کردار اور کارناموں کے بارے میں بڑے بڑے حقائق کو جمع کیا جاتا ہے اور ان کو صداقت و دیانت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ادبیات میں محقق کسی ادیب کی سوانح اور آثار کو تحقیق کا موضوع بنائے گا۔(۸)

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے شخصیت پر ہونے والی تحقیق کے طریق کار سے متعلق نہایت واضح اور سلیس پیرائے میں روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

اگر کوئی محقق کسی ادبی شخصیت کی زندگی اور کارناموں پر تحقیق کر رہا ہے تو وہ حیات و کارناموں پر ضروری کوائف جمع کرے گا۔یہ بھی حقائق کی تلاش کا طریقہ ہے لیکن اگر محقق شخصیت اور کام کی قدر و قیمت کا تعین کرے، معاصرین پر اس کے اثرات ثابت کرے اور ایک خاص نقطہء نظر پیدا کر سکے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا کام حقائق کی تلاش سے بڑھ کر ہے۔(۹)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ تاریخی تحقیق اور دستاویزی تحقیق ایک ہی طریقے کے دو نام ہیں ۔یا یہ کہ دونوں طریق ہائے تحقیق جدا جدا نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔

اس نہج اور طریقِ کار کے تحت ہونے والے تحقیقی کام کی مقدار اور معیار کی کوئی حد نہیں ہے۔جامعات اور بیرونِ جامعات ہونے والے تحقیقی کام جن کی نوعیت تاریخی و دستاویزی ہے اسی طریق کار کو استعمال کرتے ہوئے کیے گئے ہیں۔اس طریقے کے مطابق موضوع سے متعلق لوازمے کو مختلف طریقوں سے جمع کیا جاتا ہے اور اس کے بعد تجزیے کے ذریعے اس سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اور موضوع کا بنیادی مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔

Frestenger Kartz نے لوازمہ جمع کرنے کے تین امور کی نشان دہی کی ہے:

۱۔سوال ناموں کے ذریعے

۲۔افراد کے مشاہدات کے ذریعے

۳۔ماضی میں جمع کیے گئے ڈاٹا (لوازمے) کے مطالعے کے ذریعے۔(۱۰)

ڈیوڈ، جے، فاکس (David,J,Fox) نے موضوع کے انتخاب سے لے کر نتیجہ اخذ کرنے تک کے مراحل کو سائنسی طریقے کے مطابق اس طرح بیان کیا ہے:

۱۔مسئلہ یا موضوع کی وضاحت اور مفروضہ کا تعین

۲۔ڈاٹا (Data) کا حصول، مع طریقہء کار

۳۔تنقیدی تجزیہ

۴۔نتائج اخذ کرنا اور مفروضہ کا رد یا قبول

۵۔رپورٹ مرتب کرنا (۱۱)

میرے مقالے کا موضوع شخصیت ہے چناں چہ سوانحی واقعات اور خدمات اور اثرات کی کھوج اور تلاش کے لیے ہر وہ قدیم و جدید طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو اس ضمن میں ناگزیر ہوتا ہے اور مآخذ و مصادر کے حصول و دست یابی کے بعد جانچ اور پرکھ اور تجزیے کے سلسلے میں بھی ہر ممکن طریقہ اختیار کر کے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

اس نوع کی تحقیق اور دیگر اقسام کی تحقیق کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال کے باعث، کئی حوالوں سے ایک نئی شکل اختیار کر چکی ہے۔اس میں آسانیاں بھی ہیں دشواریاں بھی۔آسانیوں میں سب سے بڑی آسانی یہ ہے کہ محقق کا بہت سا وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے، کاغذ کا ضیاں نہیں ہوتا۔کام کو محفوظ کر لیا جاتا ہے۔مقالے کی تسوید، ترتیب و تشکیل بہ سہولت ہو جاتی ہے۔نقصانات میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اگر احتیاط نہ برتی جائے تو سارا کام، بہت سا وقت اور سرمایہ برباد ہو سکتا ہے۔

پیشِ نظر مقالے میں جو طریقِ تحقیق اختیار کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل مراحل کے ذریعے تکمیل کو پہنچا ہے:

۱۔موضوع کا انتخاب

۲۔موضوع کا تعارف اور اس کی اہمیت

۳۔مقاصد کا تعین

۴۔سابقہ تحقیق

۵۔ابواب کا تعین

۶۔اولین اور ثانوی مآخذ کا حصول اور تجزیہ

۷۔لوازمے کی جانچ پرکھ اور مفروضات کا رد و قبول

۸۔اخذِ نتائج

۹۔امکانات

۱۰۔کتابیات

## ۱۔موضوع کا انتخاب:

۲۰۰۰ء میں، ضیاء الدین احمد برنی کی مشہور و معروف تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' (۱۹۶۱ء) میرے مطالعے میں آئی۔ تاریخ اور تاریخی شخصیات سے مجھے دل چسپی رہی ہے چناں چہ مذکورہ کتاب نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مصنف کتاب کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ فوری طور پر ذہن تاریخِ فیروز شاہی کے مصنف ضیاء الدین برنی کی جانب گیا مگر اس کے عہد اور مصنفِ کتاب کے عہد میں زمین آسمان کا فرق پایا۔ طبیعت میں ایک تجسس سا پیدا ہو گیا کہ برنی کون ہے؟۔ کچھ عرصے بعد میرے محترم دوست محمد راشد شیخ کی مشہور تالیف ''تذکرۂ خطاطین'' (۱۲) طبع ہو کر منصۂ شہود پر آئی اور اُس میں برنی کے خاندان کے بعض افراد کے مختصر کوائف شایع ہوئے تو اُن کا احوال پڑھ کر میرے دل میں برنی اور اُن کے خاندان کی عظمت کا احساس پیدا ہوا۔ اس دوران میں برنی کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی کوشش میں رہا۔ برنی کی دوسری تصنیف ''اقبال از عطیہ بیگم'' (۱۹۵۶ء) میرے ہاتھ آ گئی۔ اُس کے مطالعے نے میرے شوق کو اور بڑھایا۔

بہت سی معلومات اکٹھی کر لینے اور یہ جان لینے کے بعد کہ برنی پر کسی نوع کا بھی بڑا کام نہیں ہوا اور ان کی زندگی اور ان کی خدمات اس نوعیت کی ہیں کہ ان پر پی ایچ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام کیا جانا چاہیے۔ چناں چہ میں نے جناب محمد راشد شیخ پر اپنا خیال ظاہر کیا اور ان سے اس سلسلے میں مشاورت کی۔ انھوں نے میرے خیال کی نہ صرف تائید کی بلکہ امداد کی یقین دہانی بھی کروائی۔ اس ضمن میں میں نے مرحوم مشفق خواجہ صاحب سے رجوع کیا اور اُنھیں بھی اپنے ارادے سے آگاہ کیا انھوں نے بھی میرے خیال کی تائید کی۔ اُن دونوں حضرات کی حوصلہ افزا آرا نے میرے اندر ارادے کو تقویت بخشی۔

جناب محمد راشد شیخ نے ضیاء الدین احمد برنی کے بڑے صاحب زادے جناب اعجاز احمد برنی سے میری ملاقات کروائی۔ اعجاز احمد برنی نے برنی پر لکھے گئے چند کاغذات کے فوٹو کاپی عنایت فرمائے جن میں برنی پر لکھے گئے چند اخباری مضامین، ان کے انتقال پر بعض اخبارات کی اطلاعات اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا برنی پر ایک مختصر مضمون تھا۔

یہ وہ کل سرمایہ تھا جسے بنیاد بنا کر میں نے تلاش اور تحقیق کا کام تیز کر دیا۔ اسی دوران جناب محمد راشد شیخ کے توسط سے برنی کے چھوٹے بیٹے جناب ریاض احمد برنی سے ملاقات ہوئی۔ اپنی ابتدائی معلومات کی بنیاد پر میں ایک سوالنامہ ترتیب دے چکا تھا۔ وہ سوال نامہ ریاض صاحب، اعجاز احمد برنی صاحب اور برنی کی بیٹی جہاں آرا نظام صاحبہ کو پیش کیا گیا۔ ایک اور سوال نامہ ان لوگوں کے لیے ترتیب دیا گیا جن کی واقفیت برنی سے تھی ان میں برنی کے عزیز و اقارب بھی شامل تھے۔

ان سوال ناموں کے ذریعے جو مواد حاصل کیا گیا اُن کی بنیاد پر ۲۰۰۱ء میں، ''ضیاء الدین احمد برنی کی علمی و ادبی خدمات کا تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند کے لیے رجسٹریشن ہو گئی۔ اس کے بعد سے تحقیقی کام تواتر سے جاری رہا۔

## ۲۔ موضوع کا تعارف اور اس کی اہمیت:

دیگر زبان وادب کی طرح اردو زبان وادب میں بھی شخصیات پر ہونے والے تحقیقی کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ شخصیت واقعی ہمہ جہت اور سبق آموز زندگی کی حامل ہو تو اس پر کام کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ گزشتہ اوراق میں یہ بات نہایت جامعیت کے ساتھ واضح ہو چکی ہے کہ ضیاءالدین احمد برنی کی زندگی اور ان کی خدمات اس لائق ہیں کہ ان پر تحقیقی کام ہونا چاہیے تھا۔

اگر برنی کی مجموعی خدمات پر نگاہ ڈالی جائے تو وہ کئی لحاظ سے متنوع اور مثالی ہیں، اس کا اعتراف وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے۔ جس کی مثالیں بھی گزشتہ اوراق میں آچکی ہیں۔ پیش نظر مقالے میں برنی کی زندگی کے واقعات کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر مربوط و مرتب حالت میں پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اُن کی مجموعی خدمات کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جن میں چالیس کتابیں، دو مختصر خود نوشتیں، ایک ڈائری، سوا سو سے زائد اُردو انگریزی مضامین اور ان کے نام مشاہیر کے ڈیڑھ ہزار سے زائد خطوط شامل ہیں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ضیاءالدین احمد برنی کی تحریروں کے حوالے سند کے طور پر پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ پاک و ہند کی بعض جامعات میں لکھے جانے والے پی ایچ ڈی کے مقالات میں بھی برنی کی تحریروں کے حوالے ملتے ہیں تاہم لوگ برنی اور برنی کے کام سے کما حقہ واقف نہیں۔ اس میں برنی کی عدم شہرت پسندی کے علاوہ مؤرخین و محققین ادب کی کم کوشی اور کم نظری کو بھی دخل ہے جس کے باعث وہ نظر انداز ہوتے رہے۔ اس مقالے سے پیشتر برنی پر چند مضامین کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ بعض لائبریروں میں ان کی کتابیں مشہور مورخ ضیاءالدین برنی مولفہ ''تاریخ فیروز شاہی'' کے نام درج پائی گئیں۔ برنی کی وہ کتابیں جن کے بارے میں انھوں لکھا کہ یا تو کسی اور کے نام سے شائع ہوئیں یا بہ غیر کسی مصنف کے نام کے شائع ہوئیں۔ تحقیق نہیں کی گئی تھیں۔

ان کی زندگی، جس کا تعلق برصغیر پاک و ہند کے ایک خاص عہد سے تھا اور جس طرح سے وہ گزاری گئی اور ان کی وہ خدمات جس کا بھرپور طریقے سے جائزہ لیا جانا اور سامنے لانا چاہیے تھا نہیں لایا گیا۔

مذکورہ سندوں کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے جن سے برنی کی اہمیت واضح ہو جائے گی:

میمونہ ستار (بیگم عبدالستار دَلوی) کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''بمبئی میں اُردو''، (یہ مقالہ شعبۂ اُردو، بمبئی یونی ورسٹی کا پہلا پی ایچ ڈی مقالہ ہے)، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''مولوی نذیر احمد دہلوی، احوال و آثار''، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی اہم تصنیف ''تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ''، ڈاکٹر تحسین فراقی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''مولانا عبدالماجد دریابادی، احوال و آثار''، ڈاکٹر انور سدید کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اُردو ادب کی تحریکیں''، ڈاکٹر عبدالغنی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''ماہر القادری۔ حیات اور ادبی خدمات''، ڈاکٹر معین الدین عقیل کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ''، ڈاکٹر سید عبداللہ کی تصنیف ''سرسید احمد خاں اوران کے نامور رُفقاء کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ''، امداد صابری کی تصنیف ''تاریخ صحافتِ اُردو''، حمزہ فاروقی کی معروف کتاب ''سفر نامۂ اقبال''، ولی مظہر کی کتاب ''عظمتوں کے چراغ'' (۵ جلدوں میں)، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری کی تصنیف ''مولانا محمد علی اوران کی صحافت''، سید مظفر حسین برنی کی مرتبہ ''کلیاتِ مکاتیب اقبال''، بیگم رشیدہ آفتاب، کی کتاب ''علامہ اقبال اوران کے

فرزند اکبر آفتاب اقبال"۔

انگریزی میں "Librarianship in pakistan fifteen year's work"by Anis Shushid,"Nationallist Conscience"byMushirul Hassan,"Publications of learned Bodies and Research Organizations in Pakistan" by National Book Centre,"New History of India"by Abdul qayyum,"Letters Writings of Iqbal" by Bashir Ahmed,"Mohammad Ali in India politics" by Mushirul Hassan,"Separatism Among Indian Muslims" by Francis Robinson,"Successor of Sir Syed Ahmed Khan" by Shan Muhammad,"Journal of the Research Society of Pakistan" ,"Leadership in south Asia" by Bishwa Nath,"The Voice of Islam" by Jamiyat-ul-Falah,"Selections from Mohammad Ali's Comrade"by Rais Ahmed,"Hakim Ajmal Khan" by Zafar Ahmed Nizami,"The Twenth Century"act.۔ قابلِ ذکر ہیں۔

اردو اور انگریزی زبان کی کتنی ہی ایسی کتابیں ہیں جن میں برنی کا تذکرہ ہے یا ان کے مضامین یا کتابوں سے سندیں پیش کی گئی ہیں۔

برنی کے ساتھ استحصالی رویہ بھی سامنے آیا ہے جس کا بنیادی سبب بھی ان پر تحقیق کا نہ ہونا ہے۔ غدر دہلی کے سلسلے میں دو کتابیں "غدر کی صبح شام" اور "محاصرۂ دہلی کے خطوط" اگر چہ برنی کی ترجمہ کردہ ہیں تاہم انھیں ملا واحدی اور دیگر مصنفین نے خواجہ حسن نظامی کی کتابوں میں شمار کیا ہے، "کتابیات تراجم" مرتبہ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، میں برنی کی بیس کتابوں میں سے صرف دو کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب "علامہ اقبال۔ حیات، فکر و فن" میں برنی کی مترجمہ کتاب "اقبال از عطیہ بیگم" سے مضمون حوالہ دیے بہ غیر شاملِ کتاب کر لیا، ڈاکٹر سید عبداللہ نے "سر سید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ" میں برنی کی مترجمہ کتاب "تذکرہ مولوی ذکاءاللہ" سے سند لی اور حوالہ سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی انگریزی کتاب "Zakaullah of Delhi" کا دیا۔ ولی مظہر نے اپنی کتاب "عظمتوں کے چراغ" میں جا بہ جا برنی کی کتاب "عظمتِ رفتہ" سے عبارتیں نقل کیں اور حوالہ نہیں دیا۔ بعض لائبریروں میں ان کی کتابیں مشہور مورخ ضیاء الدین برنی مؤلفہ "تاریخ فیروز شاہی" کے نام درج پائی گئیں۔ برنی کی بعض کتابیں جن پر ان کا نام درج نہیں تحقیق نہیں کی گئیں۔ ان کی زندگی، جس کا تعلق برصغیر پاک و ہند کے ایک خاص عہد سے تھا اور جس طرح وہ گزاری گئی اور ان کی وہ خدمات جس کا بھر پور طریقے سے جائزہ لیا جانا اور سامنے لایا جانا چاہیے تھا نہیں لایا گیا۔

برنی نے مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "ہمدرد" اور مولانا ظفر علی خاں کے اخبار "زمیندار" میں کام کیا۔ تین رسالے

جاری کیے جن میں ''کتابی دنیا'' وہ مشہور و مقبول رسالہ ہے جس کی مدتِ اشاعت ۱۲ سال سے زائد رہی اور جو بہ غیر کسی تعطل کے علم و ادب کی خدمت انجام دیتا رہا۔

برنی نے بمبئی کے مشہور انگریزی اخبار ''بمبئی کرانیکل'' میں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۵ تک اردو کتابوں پر تبصرے اور جائزے تحریر کرتے رہے۔ ان کے بہ قول پورے ہندوستان میں کرانیکل نے جتنی اردو کی خدمت کی ہے کسی اور نے نہیں کی۔ یہ خدمت برنی ہی کے طفیل تھی۔ برنی نے فرضی نام سے کالم بھی لکھے۔ ان کے خطوط اور مراسلے ایک بڑی تعداد میں مشاہیرِ ادب اور مدیرانِ رسائل و جرائد کے نام پائے جاتے ہیں۔

ان کے نام مشاہیرِ ادب کے خطوط کا ایک بڑا اہم اور قیمتی ذخیرہ موجود ہے جو کئی لحاظ سے تاریخی اور ادبی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تقاضا کرتا ہے کہ اس کا حواشی و تعلقات کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔

برنی کا انتخاب بہت غور و خوض اور سوچ بچار اور مشاورت کے بعد کیا گیا ہے۔ پیش نظر مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ تحقیق کے تمام تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

ضیاء الدین احمد برنی کا شمار بھی ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے ادب، صحافت، تاریخ نویسی، سوانح نگاری، خاکہ نگاری اور لغت نویسی میں اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ مترجم اور مبصر کے طور پر بھی ان کی خدمات یادگار ہیں۔

## ۳۔ مقاصد کا تعین:

۱۔ ضیاء الدین احمد برنی کے مکمل سوانح ان کے خاندانی پس منظر کے ساتھ سامنے لانا۔

۲۔ ان کی مختلف النوع خدمات کا مجتمع و مرتب کرنا اور اس کا محاکمہ۔

۳۔ ان کے اور ان کے نام مشاہیر کے خطوط کا جائزہ۔

۴۔ برنی کے صحیح مقام کا تعین۔

## ۴۔ برنی سے متعلق سابقہ تحقیق:

برنی پر زیرِ تحقیق مقالے سے پیشتر کوئی تحقیقی کام کسی بھی نوعیت کا نہیں ہوا۔ چند مضامین ملتے ہیں جن کی نوعیت تاثراتی ہے۔ بعض محض تعارفی نوٹ ہیں یا بعض کی نوعیت محض تذکرے کی ہے۔ ان میں سے بھی بعض میں غلط باتیں درج ہوگئی ہیں۔ جن کتابوں، رسالوں اور اخبارات میں برنی سے متعلق مضامین یا تذکرے پائے گئے ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

### ملا واحدی: ''میرے زمانے کی دلّی'' (۱۹۵۶):

ملا واحدی نے ۱۹۵۶ء میں ''میرے زمانے کی دلّی'' شائع کی تو اس میں برنی کا تذکرہ جگہ جگہ کیا ہے مگر اس کی حیثیت تذکرے ہی کی ہے۔ ایک جگہ انھوں نے سہواً برنی کو عربک ہائی اسکول، دہلی کا طالب علم لکھ دیا ہے (۱۳) حال آں کہ گزشتہ اوراق میں ثابت ہو چکا ہے کہ برنی نے عربک ہائی اسکول میں نہیں پڑھا۔ ملا واحدی کی ایک اور کتاب ''دلی جو ایک شہر تھا'' میں بھی برنی کا

تذکرہ سرسری سا ہے۔(۱۴)

**ملا واحدی: ''ملا واحدی کے قلم سے''، (مئی ۱۹۶۹):**

ملا واحدی کا یہ مضمون گزشتہ تحریروں سے نسبتاً تفصیلی ہے۔ ملا واحدی کا بیانیہ انداز تحقیقی نہیں بلکہ قصہ گوئی کا سا ہے ۔ جو بات جس وقت یاد آگئی بیان کردی۔ دو مختصر وہ پچھلی تحریروں میں بھی بیان کر چکے ہیں انھیں پھر دوہرایا گیا ہے۔ ان کی سوانح، ان کی سیرت اور کی خدمات سے متعلق چند باتیں مختصراً بیان کی گئی ہیں۔(۱۵)

**بیگم ذاکر اعجاز: ''عظمتِ رفتہ کا مصنف خود عظمتِ رفتہ بن گیا''، (۱۴ جون ۱۹۶۹ء):**

یہ مضمون برنی کے انتقال کے فوری بعد لکھا گیا۔ اس کی نوعیت بھی تاثراتی ہے۔ مگر اس میں جو باتیں آگئی ہیں مبنی بر حقیقت ہیں۔ بیگم ذاکر اعجاز برنی کے قریبی دوست ڈاکٹر سید سجاد دہلوی کی بھانجی اور بہو تھیں اور ڈاکٹر سید سجاد دہلوی کے چھوٹے بھائی سید شوکت دہلوی سے بھی برنی کا دوستانہ تھا۔ یہ مضمون انھی گزری ہوئی یادوں پر مبنی ہے۔(۱۶)

**ماہر القادری: ''ضیاء الدین احمد برنی'' (جولائی ۱۹۶۹ء):**

یہ مضمون بھی دیگر مضامین کی طرح برنی کے انتقال پر تعزیتی مضمون کے طور پر لکھا گیا۔ ماہر القادری کے اس مضمون میں کوئی نئی بات نہیں بیشتر باتیں وہ ہیں جو برنی خود اپنی تصنیفات خاص کر عظمتِ رفتہ میں تحریر کر چکے تھے۔ بعض باتیں انھوں نے اپنے مشاہدے سے لکھی ہیں۔ ایک واقعہ جس کا تعلق برنی کی بمبئی کی زندگی سے ہے جب کہ وہ ''بزمِ خیال'' کے صدر تھے اور انھوں نے مولانا کو مشاعرے میں مدعو کیا تھا۔ یہ واقعہ گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ مولانا کا یہ لکھنا حق بجانب ہے کہ ''اردو ادب میں ان کا ذکر آنا چاہیے۔''(۱۷)

**قمر القادری: ''روشنی کا مینار ضیاء الدین احمد برنی'' (۹ راگست ۱۹۶۹ء):**

یہ مضمون بھی تحقیقی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت تعزیتی ہے۔ یہ برنی کے انتقال کے فوری بعد لکھا گیا تھا تاہم اس میں برنی کی زندگی اور بمبئی کی زندگی سے متعلق کچھ اہم باتیں آگئی ہیں۔ برنی کے مزاج، کردار اور ان کے مذہبی رجحان سے متعلق اور ان کی اولاد سے متعلق بھی بعض باتیں آگئی ہیں۔ یہ مضمون بھی برنی کی زندگی کے واقعات کو کسی خاص ترتیب سے پیش نہیں کرتا۔ اس میں کوئی بات خلافِ واقعہ نہیں ہے۔ مصنفہ نے ان کا بہت نزدیک سے مشاہدہ کیا تھا۔(۱۸)

**ڈاکٹر محمود الرحمٰن: ''ضیاء الدین احمد برنی'' (ستمبر ۱۹۶۹ء):**

یہ مضمون صاحبِ مضمون کی ۱۶ راگست ۱۹۶۷ء کو برنی سے ملاقات پر مبنی ہے۔ یہ بھی ایک اچھا مضمون ہے۔ اس میں برنی کے سوانح پر کم اور ان کی شخصی خوبیوں اور ان کی ادبی خوبیوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس میں برنی کی کتابوں اور ان کے رسالے ''کتابی دنیا'' کا تذکرہ بھی ہے تاہم اس کی نوعیت بھی تاثراتی ہے۔ اس کی بنیاد بھی تحقیق پر نہیں ہے۔(۱۹)

ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب کا ایک اور مضمون ''اخبارِ اردو''، اسلام آباد کے اقبال نمبر مئی ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں

''اقبال کے ایک دہلوی نیاز مند کی اردو خدمات'' کے عنوان سے شایع ہوا۔ یہ مضمون بھی ایک تاثراتی مضمون ہے۔ بیشتر معلومات کا ماخذ برنی کی اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' ہے۔ اس میں کوئی بات بھی تحقیق سے نہیں لکھی گئی چناں چہ بہت سی بات غلط درج ہو گئی ہیں۔ برنی نے عظمتِ رفتہ میں اقبال پر اپنے خاکے میں اقبال کے پہلے دیدار کا مختصر احوال لکھا ہے کہ وہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۱ء میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لے گئے تھے اور اپنی مشہور نظم ''بلادِ اسلامیہ'' کا وہ ٹکڑا بھی ترنم سے سنایا تھا جس کا تعلق مدینہ منورہ سے ہے۔ برنی کی تحریر سے اندازا ہوتا ہے کہ وہ اقبال سے اور ان کے پڑھنے کے انداز سے متاثر ہوئے تھے۔ ڈاکٹر محمود الرحمٰن صاحب نے اس بیان کو داستانی رنگ دے دیا ہے اور برنی کے جذبات میں اپنے جذبات کا اضافہ بھی کر دیا ہے۔ جو باتیں اضافہ کر کے انھوں نے برنی سے منسوب کی ہیں وہ میں نے کہیں نہیں پڑھیں میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا اضافہ ہے۔ ان کی عمر اٹھارہ انیس سال لکھی ہے حال آں کہ برنی کی عمر اس وقت ۲۱ سال تھی۔

۱۹۱۲ء میں جب برنی بی اے کا امتحان دینے لاہور، گئے (۲۰) تو بہ قول ڈاکٹر محمود الرحمٰن ''اپنی والدہ سے کہا کہ 'اماں! میں لاہور جا رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے، وہاں اردو کے عظیم شاعر اقبال سے ملوں۔ مگر میں ایک طالب علم ہوں اور وہ پورے ہند کی معروف شخصیت ہیں۔ بھلا میں ان سے کس طرح مل سکتا ہوں۔ اماں! کوئی صورت نکالو۔ رحم دل ماں نے بیٹے کی یہ بات سنی تو کہنے لگی: 'بیٹا! چل میرے ساتھ! سلطان جی چلتے ہیں۔ میرے پیر حضرت خواجہ نظامی لاہور جاتے رہتے ہیں۔ وہ اقبال صاحب کو جانتے ہیں۔ تجھے ضرور کوئی چٹھی وٹی دے دیں گے۔''

یہ قصہ طویل ہے وہ تانگے میں بیٹھ کر خواجہ صاحب کے پاس گئیں اور چٹھی لے کر آئیں۔ دراصل ڈاکٹر صاحب نے ذرا سی بات کا افسانہ بنا دیا۔ انھوں نے برنی ہی کی فراہم کردہ معلومات میں اپنی جانب سے خوب خوب اضافہ کر کے اسے چٹ پٹا قصہ بنا دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برنی کی والدہ صحیح اردو نہیں بول سکتی تھیں۔ برنی نے کہیں نہیں لکھا کہ وہ تانگے میں بیٹھ کر خواجہ صاحب کے پاس گئیں اور انھوں نے چٹھی دی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ وہ ''تانگے میں بیٹھ کر محلہ مفتی والاں سے بستی نظام الدین گیا۔'' حال آں کہ اس زمانے میں برنی کوچہ چیلاں میں رہا کرتے تھے۔

ایک طویل تمہید کے بعد ڈاکٹر صاحب نے برنی کا نام بھی غلط لکھا یعنی ضیاء الدین برنی اس نام سے عام ذہن مشہور مؤرخ اور مصنف تاریخ فروز شاہی کی جانب، جاتا ہے۔ انھوں نے برنی کا نام جتنی مرتبہ بھی لکھا ضیاء الدین برنی ہی لکھا۔ بعض اور بھی غلطیاں ہیں جنھیں معمولی سمجھتا ہوں تاہم اس سے یہ اندازا کر لینا مشکل نہیں رہتا کہ انھوں نے کسی معاملے میں بھی تحقیق نہیں کی برنی نے عظمتِ رفتہ میں خواجہ حسن نظامی پر اپنے خاکے میں اقبال کے سفر یورپ سے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے کہ اقبال نے یورپ جاتے ہوئے حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار مبارک پر اپنی نظم ''التجائے مسافر'' پڑھی تھی جب کہ مجموعہ ''بانگ درا'' شایع ہوا تو اس میں ایک شعر کم تھا وہ شعر تھا۔

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا ملا یہ جس کے توسل سے آستاں مجھ کو (۲۱)

ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے اس واقعے کے بعد یہ شعر بھی درج کیا ہے اور حوالہ بانگِ درا ہی کا دیا ہے جب کہ یہ شعر اب بھی بانگِ درا میں نہیں ہے۔

## سید انیس شاہ جیلانی: ''مجنوں جو مر گیا ہے'' (۱۹۹۴ء):

یہ مضمون بھی اگرچہ تاثراتی نوعیت کا ہے بلکہ انیس شاہ جیلانی صاحب کے اسلوب میں ایک نوع کا انشائیہ ہے تاہم اس میں برنی سے متعلق معلومات خاصی آ گئی ہیں۔ ان میں بہت سی باتیں وہ ہیں جو برنی کی تحریروں میں موجود ہیں۔ کچھ باتیں قمر القادری کے مضمون سی لی گئی ہیں اور کچھ کے وہ خود شاہد ہیں۔ بہر حال برنی پر شایع ہونے والے مضامین میں یہ طویل اور زیادہ معلومات افزا ہے۔ (۲۲)

## عبداللطیف اعظمی: ''مشاہیر کے خطوط'' (دسمبر ۱۹۷۵ء):

اس مضمون کی نوعیت تعارف کی ہے۔ عبداللطیف اعظمی نے اپنے نام مشاہیر کے خطوط شایع کیے تو ہر مکتوب نگار کا تعارف بھی قبل از خطوط دیا۔ اس مجموعے میں برنی کے آٹھ عدد خط شامل ہیں جن کی تفصیل گزشتہ باب میں آ چکی ہے۔

یہ تعارف مختصر ہے اور اس کی بنیادی معلومات ہیں جو برنی کے بھتیجے علاء الدین خالد نے عبداللطیف اعظمی کے مطالبے پر انھیں برنی کے انتقال کے بعد ارسال کی تھیں۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں سوائے اس کے کہ اس میں انیس کتابوں کے نام دیے گئے ہیں۔

عبداللطیف اعظمی نے کچھ باتیں ان سے تعلقات کے ذیل میں لکھی ہیں مگر یہ تعلقات دو رسائل کے مدیروں کے تعلقات تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جانب سے صرف رسالے ''کتابی دنیا'' سے متعلق ہی لکھ سکے ہیں۔ عبداللطیف اعظمی نے خطوط کے حواشی میں بعض معلومات فراہم کی ہیں۔ (۲۳)

## سید مظفر حسین برنی: کلیاتِ مکاتیب اقبال (۱۹۹۳ء):

یہ بھی تعارفِ خط نگار ہے۔ ایک صفحے پر مختصر سی معلومات دی گئی ہیں جن کا ماخذ مالک رام اور صابر کلوروی (مکاتیبِ اقبال کے ماخذ) ہیں۔ فراہم کردہ ان معلومات میں کئی غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔ چوں کہ برنی کے ایک خط پر سرنامہ چھتہ لال میاں، دہلی لکھا ہوا تھا چناں چہ مؤلفِ کلیات نے لکھا ''دلی میں چھتہ لال میاں میں رہے۔'' حال آں کہ برنی دلی کے کئی محلوں میں رہے زیادہ عرصہ ''کوچہء چیلاں'' میں گزرا۔

یہ بات بھی غلط لکھی گئی کہ ''۱۹۱۵ء تک تھیوسوفیکل ہائی اسکول کانپور میں ملازم رہے۔ ۱۹۱۶ء میں Translation Office بمبئی میں ملازم رہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ ''ہمدرد''، دہلی سے علاحدگی کے بعد جولائی ۱۹۱۵ء میں تھیوسوفیکل ہائی اسکول کانپور میں ملازم ہوئے اور فروری ۱۹۱۸ء میں بمبئی چلے گئے جہاں انھوں نے انجمنِ اسلام ہائی اسکول میں پڑھایا اور اس کے بعد جولائی ۱۹۱۸ء میں وہ''

اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس''، بمبئی میں اردو فارسی مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔

برنی کی مشہور زمانہ کتاب ''عظمتِ رفتہ'' سے متعلق لکھا گیا ''انھوں نے سی این اینڈریوز (C.F.Anrews) کی مشہور کتاب ذکاءاللہ دہلوی (Zakaullah of Delhive) کا ترجمہ عظمتِ رفتہ کے نام سے کیا۔''

اس ٹکڑے میں بہت سی غلطیاں آگئی ہیں۔ ''عظمتِ رفتہ'' سی ایف اینڈریوز کی کتاب Zakaullah of Delhi کا ترجمہ نہیں ہے۔ اس کا ترجمہ ''تذکرہ ذکاءاللہ'' کے نام سے کیا گیا تھا۔ (۲۴)

## ضیاءالدین احمد برنی: ''حیاتِ مولانا محمد علی جوہر'' (۲۰۰۱ء):

اس کتاب کی تفصیل گزشتہ اوراق میں آچکی ہے۔ اس کتاب کو اس غرض سے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے کہ یہ کتاب برنی کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہے اور اسے ڈاکٹر اعظم چوہدری نے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے کتاب کے پیش لفظ میں برنی کے مختصر حالات زندگی دیے ہیں۔ حاشیے میں انھوں نے لکھ دیا ہے کہ یہ معلومات انھیں برنی کے بڑے بیٹے اعجاز احمد برنی نے فراہم کی ہیں۔ ریاض احمد برنی مرتب کو نہیں جانتے پیش لفظ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ اسی طرح کی معلومات ہیں جیسی عبداللطیف اعظمی کو علاءالدین خالد نے فراہم کی تھیں۔ اس میں برنی کی سولہ کتابوں کے نام دیے گئے ہیں۔ ایک کتاب ''لطائفِ ملا نصرالدین'' کو لطائف ملا نصیرالدین لکھا گیا ہے۔

اس کتاب کے فلیپ پر مرحوم ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی تاثراتی اور معلوماتی تحریر دی گئی ہے۔ ان کی تحریر سے برنی کے کریکٹر پر روشنی پڑتی ہے۔

## احمد حسین صدیقی: ''دبستانوں کا دبستان کراچی'' (۲۰۰۳ء):

یہ تعارف بھی تحقیقی نہیں ہے۔ احمد حسین صدیقی نے مختصر سوانح لکھی ہے ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ معلومات کہیں سے لی ہیں مگر ان کے حوالے نہیں دیے۔ معلومات وہی ہیں جو گزشتہ تحریروں میں آچکی ہیں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس میں برنی کی انیس کتابوں کے نام دیے گئے ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کے نام کم یا زیادہ مختلف مضامین یا تعارفات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

ان تمام مضامین یا تعارف ناموں میں کوئی بھی تحقیق کر کے نہیں لکھا گیا۔ معلومات اخذ کی گئیں مگر حوالے نہیں دیے گئے۔ یہ معلومات نامکمل بھی ہیں اور برنی کی زندگی اور خدمات کو پورے طور پر سامنے نہیں لاتیں بلکہ خاص ضرورت کے تحت لکھی گئیں تھیں۔

ان کے علاوہ کوئی اور تحریر ایسی نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ اردو زبان و ادب کے اتنے بڑے خدمت گار کی زندگی، اس کی خدمات اور اس کی تخلیقات کو نہ صرف محفوظ کرتی ہو بلکہ آج کے مؤرخ کو متوجہ بھی کرتی ہو۔ برنی کی زندگی اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کی زندگی ایک زمانے کی تاریخ ہے۔ انھوں نے جس زمانے میں اردو کی خدمت کی ہے وہ

زمانہ جبر اور بندشوں کا زمانہ تھا۔ ان کی زندگی سبق آموز زندگی ہے کہ آنے والی نسلیں ان کی زندگی اور کارناموں کا مطالعہ کریں اور جینا سیکھیں۔

## ۵۔ابواب کا تعین:

موضوع کے انتخاب سے پیشتر راقم نے جو معلومات جمع کی تھیں وہ اس وقت تک مکمل نہیں تھیں، تلاش اور کھوج کا سلسلہ جاری تھا اور جیسا کہ تحقیق میں ہوتا ہے کہ کوئی بات حتمی اور حرفِ آخر نہیں ہوتی بلکہ تحقیق کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ نہ صرف نئی معلومات اور حقائق سامنے آتے ہیں بلکہ بعض میں معلومات میں ردّ وقبول بھی ہوتا ہے۔ چناں چہ راقم نے اس وقت بازیافتہ حقائق اور معلومات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنی سابقہ نگراں محترمہ فہمیدہ شیخ صاحبہ کی مشاورت سے درجِ ذیل ابواب کا تعین کیا تھا:

باب اوّل: ضیاءالدین احمد برنی کا خاندانی پس منظر

باب دوم: ضیاءالدین احمد برنی کے حالاتِ زندگی

باب سوم: ضیاءالدین احمد برنی اور ان کا رسالہ ''کتابی دنیا''

باب چہارم: سوانح نگاری کی تاریخ میں ضیاءالدین احمد برنی کا مقام

باب پنجم: ضیاءالدین احمد برنی کی صحافتی خدمات

باب ششم: ضیاءالدین احمد برنی بہ حیثیت مترجم

باب ہفتم: تبصرہ نگاری اور ضیاءالدین احمد برنی

باب ہشتم: ضیاءالدین احمد برنی بہ حیثیت خاکہ نگار

باب نہم: ضیاءالدین احمد برنی کے نام مشاہیر کے خطوط کا مطالعہ

باب دہم: ضیاءالدین احمد برنی کی غیر مدوّن تحریروں کا تجزیہ

نتیجۂ تحقیق

رجسٹریشن کے وقت اور پہلے سیمینار تک ابواب کی یہی ترتیب اور تعداد رکھی گئی تھی تاہم جیسے جیسے تحقیق آگے بڑھتی گئی نئے حقائق اور معلومات سامنے آتی گئیں جس نے میرے ذہن میں اپنے بنے ہوئے منصوبے کے حوالے سے غور وفکر کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ راقم نے اپنی نگراں محترمہ پروفیسر ڈاکٹر نسیم آرا سرتاج سے مشاورت کی اور ان سے مشاورت کے بعد اور بہت سی نئی معلومات ہاتھ آجانے کے بعد محسوس کیا کہ سابقہ خاکے میں تبدیلی ناگزیر ہوگئی ہے۔ چناں چہ گزشتہ خاکے میں تبدیلی کی گئی اور نیا خاکہ اس طرح وضع کیا گیا:

باب اوّل: طریقِ تحقیق

باب دوم: ضیاءالدین احمد برنی کا خاندانی پس منظر

باب سوم: برنی کے سوانح اور علمی وادبی خدمات

باب چہارم: مطبوعہ کتب کا تحقیقی جائزہ

باب پنجم: برنی کے خطوط کا تجزیاتی مطالعہ

باب ششم: برنی کے نام مشاہیر کے خطوط

باب ہفتم: ماہنامہ ''کتابی دنیا'' ایک جائزہ

باب ہشتم: غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں کا تحقیقی جائزہ

نتیجۂ تحقیق

مندرجہ بالا خاکے میں ایک باب ''طریقِ تحقیق'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ سابقہ خاکے میں جو تبدیلیاں کی گئیں ان کا مقصد یہ ہے کہ دست یاب لوازمے کو زیادہ بہتر اور منظم صورت میں پیش کیا جائے۔

## ٦۔ مصادر کا حصول اور اس کے طریق ہائے کار:

مآخذ کی نشان دہی اور تعین کے بعد اولین اور ثانوی مآخذ کی تلاش کا کام شروع ہوا۔ زیرِ تحقیق کام میں اولین اور ثانوی مآخذ کی تفریق درجِ ذیل ہے:

١۔ **اولین مآخذ:** برنی کی تخلیقات و تراجم (کتابیں، مضامین اور دیگر تحریریں)، تعلیمی اور ملازمتی دستاویزات، برنی کے خطوط اور برنی کے نام خطوط، افراد اور ادارے جن سے براہ راست برنی کا تعلق رہا۔

٢۔ **ثانوی مآخذ:** وہ تحریریں جن میں برنی کا تذکرہ ہے، وہ افراد جو برنی کے بارے میں بالواسطہ جانتے ہوں۔

مذکورہ مآخذ کی تلاش اور کھوج کے لیے پیشِ نظر مقالے میں سابقہ اور مروجہ طریق ہائے کار کے علاوہ جدید طریقے بھی استعمال کیے گئے ہیں۔ تجزیے سے قبل مآخذ، مصادر یا لوازمے تک رسائی اور اس کے حصول کے لیے محقق کو جو محنت اٹھانی پڑتی ہے وہ سب سے زیادہ ہوتی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں ایسی ایسی مشکلات درپیش آتی ہیں کہ دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے اور دل برداشتگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وقت، رُپیا، جسمانی روحانی قوتیں سب پر اثر پڑتا ہے تاہم ایک حقیقی ذی فہم اور باہمت محقق کے قدم پیچھے کی جانب نہیں اٹھتے۔

مجھے بھی ایسے سب مراحل طے کرنے پڑے ہیں۔ باوجود وسائل کی کمی اور مسائل کی زیادتی سے میرے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ میری ثابت قدمی اور اولوالعزمی میرے شوق اور جذبے سے اور بھی توانا اور طاقت ور ہوگئی۔

یہ امر میرے لیے باعثِ اطمینان وانبساط ہے کہ مجھے تمام لوازمہ ایک ہی جگہ یا ایک ہی شخص سے دست یاب نہیں ہوا۔ میں نے اپنے کام کا آغاز ایک نقطے سے کیا تھا اور ذرہ ذرہ جمع کر کے یہ خزانہ بنایا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں نے برنی کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' سے کام کا آغاز کیا تھا۔ برنی کے بڑے بیٹے اعجاز احمد برنی سے ملاقات کی انھوں نے ابتداً برنی کی چند مشہور کتابیں اور برنی کے انتقال پر شایع ہونے والے ایک دو مضامین اور اخبارات کی خبروں کی فوٹو کاپی اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا برنی پر

ایک تعارفی مضمون عنایت فرمایا۔ ''عظمتِ رفتہ'' محمد راشد شیخ نے عنایت فرمائی تھی۔

درحقیقت میں نے عظمتِ رفتہ سے رہ نمائی حاصل کی اور اپنی تحقیق کو آگے بڑھایا۔ میرے شوق اور جستجو نے مل کر میری منزل کو آسان کیا۔ یہ امر پیشِ نظر رہے کہ اوّل روز سے میری تحقیقی کاوشوں میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال لازم رہا ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے میں نے اپنے کام کو اس طرح آسان بنایا:

## کمپیوٹر کا استعمال:

☆۔　کمپیوٹر پر ایک فولڈر (Folder) زیڈ اے برنی (Z.A.Barni) کے نام سے بنایا گیا۔

☆۔　کمپیوٹر ہی پر ایک فائل ''تلاش'' کے نام سے بنائی گئی، جس میں تلاش کی جانے والی معلومات کی فہرست ہوتی تھی۔ نوعیت کے اعتبار سے اس کے کئی نام تھے، ''لاہور ٹاسک''، ''کراچی ٹاسک''، ''جھنڈیر ٹاسک'' وغیرہ۔

☆۔　ایک نوٹ بک بنائی گئی جس میں حاصل ہونے والی نئی معلومات نوٹ کر لی جاتی تھیں جنھیں بعد میں کمپیوٹر کے ذریعے محفوظ کر لیا جاتا تھا۔

☆۔　حاصل ہوجانے والی معلومات کو علاحدہ علاحدہ فولڈر اور فائلوں میں محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ جیسے فولڈر: ''برنی کی کتابیں''، ''برنی کے مضامین'' وغیرہ۔ اس کی ذیلی فائلیں (الف) مطبوعہ (ب) غیر مطبوعہ (ج) گم شدہ وغیرہ۔

☆۔　تجزیہ اور تحلیل کے بعد تسوید کا کام بھی کمپیوٹر پر شروع کیا گیا۔

## انٹرنیٹ کا استعمال:

☆۔　ابتداء ہی سے انٹرنیٹ کا استعمال جاری رکھا گیا۔ انڈیا اور بیرون ملک اشخاص اور اداروں مثلاً کتاب خانوں، آرکائیوں، جامعات، مدیرانِ رسائل و اخبارات سے ای میل کے ذریعے رابطہ کیا گیا۔

☆۔　انٹرنیٹ پر موجود درج ذیل لائبریاں کھنگالی گئیں۔

www.questia.com,w

ww.books.google.com

www.nlindia.index2.html

www.hero.ac.uk

www.brain.brain.net.pk

www.chapatimystery.com/archives/univercity/1857_documents.html

http://www.austheos.org.au/indices/THEOST.HTM

برنی کی بعض کتابیں جو انگریزی سے ترجمہ ہیں اور اصل کتاب کے بارے میں ترجمہ میں کچھ نہیں معلوم ہوتا یا وہ ترجمے جن میں ناکافی معلومات دی گئی ہیں انھیں انٹرنیٹ پر تلاش کیا گیا اور بہت سی اضافی معلومات حاصل کی گئیں۔

**ملاقاتیں:**

☆۔ برنی کی اولاد اور دیگر عزیزوں سے کراچی، لاہور اور گوجرانوالہ میں ملاقاتیں کیں اور انٹرویو کیے۔

☆۔ کراچی، لاہور، گوجرانوالہ (جنڈیالہ ڈھاب والا برنی کے بزرگوں کا اصل وطن)، بہاولپور، سردار پور جھنڈیر میلسی تک سفر کیا اور ملاقاتیں کیں۔

☆۔ جہاں نہیں جایا جاسکا وہاں ٹیلی فون اور ای میل کا ذریعہ استعمال کیا گیا۔

☆۔ احباب کو اس سلسلے میں خطوط لکھے۔

☆۔ سہ ماہی ''العلم'' کراچی میں خط کی اشاعت بھی اسی سلسلے کے باعث ہوئی۔

برنی کے بڑے بیٹے اعجاز احمد برنی اور چھوٹے بیٹے ریاض احمد برنی نے برنی کی طبع زاد اور ترجمہ کردہ کتابیں فراہم کیں۔ ریاض احمد برنی نے برنی کی تعلیمی اور ملازمتی دستاویزات بھی فراہم کیں۔ برنی کی بعض غیر مطبوعہ کتب بھی ریاض احمد برنی نے فراہم کیں۔

ای میل کے ذریعے انڈیا آفس لائبریری اور اوکسفورڈ یونی ورسٹی لندن میل کیا گیا اور دبرنی اور ان کے اساتذہ سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ باوجود کوشش کے برنی کے بارے میں مذکور سائٹ سے معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ ریاض احمد برنی صاحب سے مسلسل ای میل کے ذریعے رابطہ رہا انھوں نے خاندان کے بارے میں بہت سی معلومات ای میل کے ذریعے فراہم کیں۔

موضوع کی رجسٹرشن کے بعد جب برنی کے خاندان کے بارے میں معلومات جمع کی جارہی تھیں اور اس سلسلے میں لاہور اور گوجرانوالہ کا دورہ کیا گیا اور وہاں ان کے خاندان کے کئی لوگوں کے انٹرویو بھی کیے گئے۔ اس کے بعد میں نے عظمت اللہ سلیم اور عبدالقیوم صاحب (۲۵) کے تعاون سے ضیاء الدین احمد برنی کے خاندان کا شجرہ ترتیب دیا گیا۔ وہ شجرہ کئی مرتبہ ترتیب پایا بنا بنا کر خط کے ذریعے ان دونوں صاحبان کو لاہور اور گوجرانوالہ بھیجا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں ضیاء الدین احمد برنی کے ایک اور تایا مولوی گنج بخش کے خاندان کی ایک فرد رضیہ فرحت بانو سے امریکا میں رابطہ رہا انھوں نے وہاں سے اپنے خاندان کے بارے میں معلومات فراہم کیں اور ایک مختصر فیملی ٹری (شجرہ) بنا کر بھیجا اور اس سلسلے میں ریاض احمد برنی نے بھی خاصا تعاون فرمایا۔

برنی کے خاندان سے متعلق اور برنی کی ابتدائی زندگی سے متعلق معلومات کے لیے جہاں ان کے پاکستان میں موجود خاندان کے افراد سے رابطہ رکھا گیا وہاں بعض حضرات سے دہلی میں بھی خط کتابت کی گئی۔ کہیں سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب مشاہیر کے خطوط جمع کر رہے ہیں چناں چہ انھیں ۲۰۰۱ء میں خط لکھ کر برنی کے خطوط کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب میں لکھا:

آپ کا خط موصول ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ قدرے تاخیر سے جواب دے رہا ہوں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اردو آرکاؤز میں مشاہیر کے دو لاکھ کے قریب خطوط ہیں مگر مجھے افسوس ہے کہ ضیاء الدین احمد برنی صاحب کے نام یا اُن کا کوئی خط نہیں ہے۔ عزیز! برنی صاحب کے بارے میں میری معلومات بہت محدود ہیں۔ اس لیے اس سلسلے میں میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

بہت دن ہوئے میں نے برنی صاحب کے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر کا ایک خاکہ لکھا تھا (۲۶) اگر مل گیا تو میں اس کی کاپی آپ کو بھیج دوں گا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ خاکہ کراچی کے ماہ نامہ ''ثاقی'' (۲۷) میں شایع ہوا تھا۔

نیاز کیش
(خلیق انجم)

پھر میں نے انھیں ۲۳؍جنوری ۲۰۰۵ء کو تفصیلی خط لکھا اور اس میں درجِ ذیل باتیں دریافت کیں۔ جواب نہ آنے کی صورت میں ۱۰؍مارچ ۲۰۰۵ء کو پھر خط لکھا اور وہی باتیں دریافت کیں:

۱۔ منشی محمد الدین کی ابتدائی زندگی یا دہلی کی زندگی کے بارے میں بھی جو برنی مرحوم نے جو لکھ دیا ہے اسی کو بعض نے نقل کیا ہے کوئی نئی بات پتا نہیں چلتی، کسی کتاب یا کسی رسالے کی نشان دہی کیجیے ''کرزن گزٹ ''حیرت دہلوی کا، دیکھا جائے؟ اور ان کے اخبار ''دارلعلوم'' دہلی کے بارے میں بھی امداد صابری نے جو لکھ دیا ہے اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا اس ضمن میں بھی آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ منشی صاحب اپنے عہد کے نامور خطاط تھے کیا دہلی کے خطاطین پر کوئی کتاب مرتب ہوئی ہے؟ اس میں یقیناً منشی محمد الدین، منشی عبدالقدیر، فاطمۃ الکبریٰ اور منشی محمد یوسف کا تذکرہ ہوگا؟

۲۔ اسی طرح ان کی اولاد منشی عبدالقدیر دہلوی، فاطمۃ الکبریٰ، ضیاء الدین احمد برنی، محمد یوسف دہلوی کی بھی ہندوستانی زندگی کے بارے میں نہیں معلوم ہوتا۔ ایک اور بہن اور بھائی کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

۳۔ ''جامعہ کی کہانی'' از عبدالغفار دہلوی مطبوعہ مکتبہء جامعہ لمیٹیڈ دہلی، ۱۹۶۵ء، کیا جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تاریخ ہے؟

۴۔ مندرج اداروں کی تاریخ مرتب ہوئی ہو تو نشان دہی فرمائیے: سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی، (اس کے تحت شائع ہونے والا رسالہ بھی اہم ہے، برنی مرحوم ۱۹۰۸ء میں مذکورہ کالج میں داخل ہوئے، چناں چہ کیا اس

پرچے کا اشاریہ بنا ہے؟)، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی (مہتمم: حامد علی خاں) حالی پبلی شنگ ہاؤس دہلی اس کا رسالہ ''کتابی دنیا''، اردو اکیڈمی دہلی، منشی عبدالقدیر کا اشاعتی ادارہ: میسرز عبدالقدیر والاخوان، ناشران و تاجرانِ کتب، دہلی اور ان کا اخبار ''قاصد'' دہلی۔ تھیوسوفیکل ہائی اسکول کانپور، اسلامیہ ہائی اسکول بمبئی، جہاں برنی مرحوم مدرس رہے، Oriental Translator Office Bomby جہاں برنی مرحوم، آخری خدمات انجام دے کر ریٹائر ہوئے۔

۵۔　برنی مرحوم کی ابتدائی تصنیف (انگریزی) جو مدراس سے شائع ہوئی تھی Muhammad Ali,his life and services اب ناپید ہے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ یقیناً دہلی کی کسی بڑی لائبریری میں ضرور ہوگا، کیا اس کی بازیافت ممکن ہے؟

۶۔　حالی پبلشنگ ہاؤس کی جانب سے جو رسالہ ''کتابی دنیا'' نکلتا تھا اس کا حال معلوم ہوگا؟ کس کتاب میں؟

برنی مرحوم کی اپنے زمانے کے مشاہیر سے خط کتابت رہی تھی۔ مکتوبات کے بعض مجموعوں میں ان کے مکتوبات نظر آتے ہیں۔ کیا آپ کی نظر میں ایسے مجموعے ہیں جن میں برنی مرحوم یا ان کی والد یا کسی اور عزیز کے خطوط شاملِ کتاب ہوں؟

ان کی جانب سے ان سوالوں کے جواب موصول نہیں ہوئے۔

اسی طرح صدر شعبہء اردو دہلی یونی ورسٹی کو ۱۲؍فروری ۲۰۰۶ء کو خط لکھا گیا اور درج ذیل باتوں سے متعلق معلومات فراہم کرنے کی درخواست کی گئی:

۱۔　کرزن گزٹ (مدیر مرزا حیرت دہلوی) سے وہ حصے فوٹو کاپی ہو جائیں۔ جن میں منشی محمد الدین کا تذکرہ ہے۔

۲۔　منشی محمد الدین (م ۱۹۴۳)، منشی عبدالقدیر (۲۵ جنوری ۱۹۶۹) فاطمۃ الکبریٰ (۱۹ دسمبر ۱۹۶۷ء) کے انتقال پر اخبارات و رسائل میں جو کچھ لکھا گیا ہو اس کی نقل دست یاب ہو سکے۔

۳۔　خطاطوں کے تذکروں میں منشی محمد الدین اور یوسف دہلوی (م ۱۱ مارچ ۱۹۷۷) کا تذکرہ ہوگا، آپ کے علم میں ہے؟ کیا اس بابت کچھ فراہم کر سکیں گے؟

ان سے یہ بھی درخواست کی گئی کہ اگر وہ مصروف ہوں تو کسی اور صاحب کو تعاون کی زحمت دیں تاہم ان کی جانب سے بھی جواب موصول نہیں ہوا۔

صدر شعبہء اردو جامعہ ملیہ دہلی کو بھی ۱۲؍فروری ۲۰۰۶ء کو خط لکھا گیا اور ان سے بھی چند باتیں دریافت کی گئیں اور ان سے بھی یہی درخواست کی گئی کہ مصروفیت کے باعث کوئی اور صاحب تعاون کر سکیں تو انھیں زحمت دی جائے۔ درج ذیل باتیں ان

سے دریافت کی گئیں:

۱۔''کتابی دنیا'' کچھ عرصہ دہلی سے بھی جاری ہوا تھا۔حقیقت کا مکمل علم نہیں آپ ہی کے تعاون سے مکمل اور درست معلومات حاصل ہوسکیں گی۔اس سلسلے میں کتاب نما کے شاہد علی خاں کو بھی لکھا گیا مگر جواب نہیں آیا۔ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کو بھی لکھا مگر اس در سے بھی جواب نہیں ملا۔

۲۔منشی عبدالقدیر (ضیاء الدین احمد برنی کے بڑے بھائی) نے دہلی میں مکتبہ ''میسرز عبدالقدیر والاخوان، ناشران وتاجران'' قائم کررکھا تھا۔اس کی بھی کچھ خبر نہیں۔ایک اخبار ''قاصد'' بھی جاری کیا تھا۔اس کی تفصیل بھی درکار ہے۔

۳۔مرزا حیرت دہلوی کے ''کرزن گزٹ'' سے وہ حصے فوٹو کاپی ہوجائیں۔جن میں منشی محمد الدین کا تذکرہ ہے۔

۴۔منشی محمد الدین، منشی عبدالقدیر اور فاطمۃ الکبریٰ کے انتقال پر اخبارات ورسائل میں جو کچھ لکھا گیا ہو؟

۵۔خطاطوں کے تذکروں میں منشی محمد الدین اور یوسف دہلوی کا تذکرہ ہوگا اس بابت معلوم ہوسکتا ہے؟

کتابوں، اداروں اور شخصیات کی جانب نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

چناں چہ فیروز دہلوی شعبہء اردو، ذاکر حسین کالج، دہلی نے جواب دیا۔انھوں نے وہ سب باتیں لکھ دیں جن کا مجھے پہلے سے علم تھا۔چناں چہ انھیں پھر لکھا گیا مگر جواب موصول نہیں ہوا۔

اسی طرح ادارہ ءمکتبہ ءجامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے منتظم کو ۱۴ مارچ ۲۰۰۵ء خط لکھا گیا اور درجِ ذیل باتیں دریافت کی گئیں:

۱۔　کیا مکتبہ ءجامعہ دہلی کی تاریخ مرتب اور شائع ہوئی ہے؟

۲۔　حالی پبلشنگ ہاؤس کے متعلقین کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں؟

۳۔　کیا حالی پبلشنگ ہاؤس کی تاریخ مرتب وطبع ہوئی ہے؟

۴۔　کیا ''اردو اکیڈمی'' جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تاریخ لکھی گئی ہے؟

۵۔　کیا ''کتابی دنیا'' دہلی رسالہ جاری ہے؟ نہیں تو کب تک جاری رہا؟ اس کا بھی احوال معلوم ہوسکتا ہے؟

۶۔　کیا کتابی دنیا پر تحقیقی کام ہوا ہے؟

۷۔　درج بالا معلومات کہاں سے اور کیسے حاصل کی جاسکیں گی اس پر بھی روشنی ڈالیے گا۔

۸۔　اگر آپ کے ادارے کی ویب سائٹ ہو یا ای میل ایڈریس ہو تو مرحمت فرمائیے گا۔

اسی سلسلے میں ایک خط خواجہ حسن ثانی نظامی کو بھی لکھا گیا کہ وہ خواجہ حسن نظامی اور برنی کے تعلقات کے حوالے سے اور برنی کی دہلی کی زندگی کے بارے میں کچھ مطلوبہ معلومات فراہم کر سکیں:

۲۹ر جولائی ۲۰۰۶ء

محترم قبلہ خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ان شاء اللہ تعالیٰ مزاج گرامی بہ عافیت ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم آپ کا پتا وہی خواجہ حسن نظامی مرحوم کا ہوگا۔ ملا واحدی کے نواسے محترم اوصاف علی واحدی صاحب سے آپ کا پتا معلوم کیا، انھیں نہیں معلوم تھا۔ دہلی میں فیروز صاحب شعبہ اردو، ذاکر حسین کالج سے خط کتابت تھی ان سے درخواست کی تو انھوں نے کرم فرمایا۔

محترم ومکرم عرض یہ کرنی تھی کہ راقم ''ضیاء الدین احمد برنی (ملا واحدی کے ہم جماعت) کے سوانح اور علمی وادبی خدمات'' پر پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی کام کر رہا ہے۔ اس کام میں راقم اس سلسلے میں کئی سالوں سے جستجو کر رہا ہے۔ تقریباً ان کے تمام عزیزوں سے ملاقات کر چکا ہے۔ ان کے والد کے گاؤں بھی جا چکا ہے۔ تقریباً ان کی تمام کتابیں دست رس میں ہیں سوائے ایک کتاب کے مولانا محمد علی پر پہلی انگریزی سوانح ''Mohammad Ali:his life and services'' تھی، جسے مدراس سے گنیش پبلی شر نے شائع کیا تھا وہ پاکستان میں نہیں مل سکی۔ احباب کو لکھے گئے خطوط اس قدر نہیں ہیں جتنے انھوں نے لکھے ہوں گے۔ ہاں ان کے نام مشاہیر کے خطوط خاصی تعداد میں ہیں۔

آپ کو علم ہوگا کہ برنیؔ کا لقب بھی خواجہ صاحب ہی کا عنایت کیا ہوا ہے۔ برنی صاحب کے والد منشی محمد دین اور بھائی منشی عبدالقدیر تو ہندوستان کی اس وقت کی سیاست وصحافت میں خاصے آگے نکلے ہوئے تھے۔ ان کی بہن فاطمۃ الکبریٰ نے بھی خطاطی میں خاصی شہرت پائی۔ ان کے چھوٹے بھائی منشی محمد یوسف دہلوی تو پاکستان کے خطاط اعظم کے لقب سے یاد کیے گئے۔

برنی صاحب پر لکھنے سے قبل ان کے خاندان پر بھی بہ طور پس منظر لکھنا ہے۔ اگر آپ اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکیں تو ممنون رہوں گا۔ دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر کو خط لکھا گیا تھا ایک مرتبہ جواب آیا دوبارہ نہیں آیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو کئی خط لکھے گئے، جواب ندارد۔ ان دونوں کو لکھے گئے ایک ایک خط کی نقل آپ کے مطالعے وملاحظے کے لیے ارسال کر رہا ہوں تاکہ آپ میرے موضوع اور میری ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

اسی سلسلے میں ممبئی بھی خط لکھے گئے ہیں مگر جواب سے محروم ہوں۔

امید ہے آپ ضرور جواب سے مشرف فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور اقارب واحباب کو صحت وسلامتی عطا فرمائے۔

اپنا ٹیلی فون نمبر بھی لکھ دیجیے گا ممنون رہوں گا۔ آج کل ای میل کا ذریعہ تیز تر اور محفوظ ہے مگر لوگ جواب نہیں دیتے۔

محتاجِ دعا

رفیق احمد خاں

شعبہء اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، سندھ، پاکستان

مگر افسوس کہ خواجہ حسن ثانی نظامی کی جانب سے بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

۱۲ر فروری ۲۰۰۶ء کو صدر شعبہء اردو، کانپور یونی ورسٹی، کو بھی ایک تفصیلی خط لکھا گیا اور برنی کی کانپور کی زندگی سے متعلق معلومات چاہیں۔ دریافت طلب باتیں یہ تھیں:

۱۔　مسز اینی بیسنٹ کے ''تھیوسوفیکل ہائی اسکول کانپور'' جہاں برنی نے کوئی تین سال ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۸ء بہ طور مدرس خدمات انجام دیں، کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔

۲۔ اس دوران برنی ''زمانہ'' کانپور میں نہ صرف لکھتے رہے بلکہ دیا نرائن نگم سے دوستی بھی نبھاتے رہے۔ کچھ اس سلسلے میں۔

۳۔ برنی نے اپنے ایک مضمون جو نگم کی وفات پر لکھا تھا اس میں کانپور میں بعض فلاحی کاموں میں حصہ لینے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

اس ضمن میں تعاون کرنے والی کتابوں، اداروں اور شخصیات کی جانب بھی متوجہ کیا جا سکتا ہے زیادہ بہتر تو یہ ہوگا کہ مواد فراہم کیا جائے، ورنہ متوجہ کیا جا سکتا ہے۔

افسوس کہ ان کا جواب بھی نہیں آیا۔

''اخبارِ اردو'' اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۶ء کی اشاعت میں بمبئی کے ماجد قاضی صاحب کا ایک مضمون ''ممبئی یونی ورسٹی میں اردو تحقیق کی سمت و رفتار'' شائع ہوا اس میں محترمہ میمونہ دلوی کے مقالے کا حوالہ تھا۔ اس مضمون سے معلوم ہوا کہ یہ شعبہء اردو بمبئی یونی ورسٹی کا پہلا مقالہ ہے اس میں برنی کے ایک مضمون کا حوالہ ہے چناں چہ میں نے یہ سوچ کر کہ ضرور میری مدد کریں گے انھیں خط لکھا اور چند سوالات کے ذریعے مطلوبہ معلومات چاہیں:

۳۰ مارچ ۲۰۰۶ء

محترم ماجد قاضی صاحب

السلام علیکم

ان شاء اللہ مزاج گرامی بہ عافیت ہوگا۔ ''اخبارِ اردو'' اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۶ء میں آپ کا مضمون ''ممبئی یونی ورسٹی میں اردو تحقیق کی سمت ورفتار'' نہایت دل چسپی سے مطالعہ کیا۔ آپ نے حقائق کی پردہ کشائی میں جس بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابلِ تعریف وتقلید ہے۔

راقم بھی پی ایچ ڈی کے تحقیقی کام میں مصروف ہے۔ موضوع ضیاء الدین احمد برنی سے متعلق ہے۔ ضیاء الدین احمد برنی وہ شخص ہیں جن کی عمر کا ایک بڑا حصہ بمبئی میں گزرا۔ بمبئی میں ان کی علمی وادبی سرگرمیاں بڑے زوروں پر رہیں مگر افسوس کہ آج پاکستان میں وہ معلومات دست یاب نہیں۔ ممبئی میں کئی حضرات کو لکھا، ای میل سے بھی ربطے کیے مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا۔

آپ کے مضمون سے میری دل چسپی یہ ہے کہ آپ نے جس پہلے مقالے کا ذکر کیا ہے یعنی ''بمبئی میں اردو'' میمونہ دلوی، اس میں برنی کے ایک مضمون ''صوبہء بمبئی کے اردو، فارسی اور عربی اخبارات'' کا حوالہ آیا ہے۔ وہ کتاب بھی میری دست رس میں نہیں۔

برنی اور بمبئی کے تعلق کے حوالے سے لکھتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ ضرور جواب سے مشرف فرمائیں گے۔

برنی ۱۹۸۱ء میں کانپور کے تھیوسوفیکل ہائی اسکول سے بمبئی پہنچے اور انجمن اسلام ہائی اسکول میں ملازمت کی۔ اسی سال اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس بمبئی( Oriental Translator Office Bombay) میں ملازمت کی۔ جہاں سے ۱۹۴۵ء میں سبک دوش ہوئے۔ اس دوران انھوں انگریزی اخبار بمبئی کرانیکل میں کتابوں پر تبصرے کیے۔ انھوں نے اور چند دوستوں نے ایک بزم ''بزمِ خیال'' کی بنیاد رکھی اور اس کے تحت کئی آل انڈیا مشاعرے کیے۔ وہ پنجابی ایسوسی ایشن بمبئی کے جوائنٹ سیکریٹری تھے۔ اس کے تحت بھی انھوں کئی اقبال ڈے منائے۔ انھوں نے اس دوران مولانا محمد علی پر انگریزی میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ Muhammad Ali:his life and his services اور Oriental Translator Office Bombay, Romance of the لکھیں پہلی کتاب قطعی نہیں ملتی اس پر برنی کا نام درج نہیں ہے۔ وہ مدراس سے گنیش پبلی شرز نے شائع کی تھی۔

کیا آپ درج ذیل معلومات فراہم کرسکتے ہیں؟

۱۔ انجمن اسلام ہائی اسکول، انجمن اسلام ہائی اسکول اور ضیاء الدین احمد برنی۔

۲۔ اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس بمبئی، اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس بمبئی اور برنی۔

۳۔ پنجابی ایسوسی ایشن بمبئی۔

۴۔ ''بزمِ خیال'' اس کی سرگرمیاں اس دور کے رسائل میں شائع ہوتی رہی تھیں۔

۵۔ انگریزی اخبار بمبئی کرانیکل، بمبئی کرانیکل اور برنی۔

۶۔ انھوں نے وہاں سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ۵۵ء میں کتابی دنیا کے نام سے رسالہ نکالا تھا۔

مجھے گمان نہیں یقین ہے کہ آپ جیسا صاحبِ علم ہی نہ صرف جواب سے مشرف فرمائے گا بلکہ بھر پور مدد بھی فرمائے گا۔ میں اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوں اس لیے گھنٹوں بیٹھ کر خط ٹائپ کرتا ہوں۔ بہت سا قیمتی وقت ضائع ہوگیا ہے مگر پرامید ہوں۔

احباب واقارب کی خدمت میں سلام۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحت وسلامتی عطا فرمائے۔

نیازمند وخیراندیش

رفیق احمد خاں

شعبہء اردو سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، سندھ، پاکستان

انھوں نے ای میل کے ذریعے سے جواب سے مشرف فرمایا انھی کے میل سے معلوم ہوا کہ میمونہ ستار معروف محقق عبدالستار دلوی کی بیگم ہیں۔ انھوں نے عبدالستار دلوی کا فون نمبر بھی دیا۔ میں اس سے قبل ستار صاحب کو ایک خط ۱۴ فروری ۲۰۰۶ کو لکھ چکا تھا جس میں میں نے ان درج ذیل معلومات چاہی تھیں:

۱۔ بمبئی کرانیکل میں برنی کے کام سے متعلق معلومات فراہم کر دیجیے۔

۲۔ سب سے ضروری ''بزمِ خیال'' کے بارے میں معلوم کا حاصل ہونا ہے۔

۳۔ انجمن اسلام ہائی اسکول میں برنی پڑھایا، ملازمت سے علیحدگی ہوئی کیوں؟ نہیں معلوم۔ یہ گوشہ بھی اہم ہے۔

۴۔ Oriental Translator Office Bombay میں برنی زندگی کا بڑا حصہ گزارا اور "Romance of theOriental Translator Office Bombay" کے نام سے کتاب بھی لکھی۔ اس بارے میں معلومات کا حاصل ہونا بھی ضروری اور اہم ہے۔

اس ضمن میں تعاون کرنے والی کتابوں، اداروں اور شخصیات کی جانب بھی متوجہ کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ اچھا تو یہ ہے کہ فوٹو کاپی ارسال فرمائیں تو ازحد ممنون رہوں گا۔

میں نے بمبئی میں عبدالستار دلوی صاحب سے فون پر بات کی انھوں نے اتنا'' کہا کہ ہم مسلمان اپنی تاریخ کو بھول چکے ہیں بلکہ مٹا چکے ہیں اب یہاں کچھ نہیں بچا۔''

۱۲ر فروری ۲۰۰۶ء کو شعبہء اردو بمبئی یونی ورسٹی کو بھی خط لکھا گیا تاہم ان کی جانب سے بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

۱۴ فروری ۲۰۰۶ء ہی کو ایک خط بمبئی کے مشہور زمانہ اردو رسالے "شاعر" کے ایڈیٹر کو بھی لکھا گیا تاکہ وہ میری مطلوبہ معلومات فراہم کر سکیں۔ان سے دریافت کیا گیا "۔۔۔افسوس یہ ہے کہ ان کی اور ان کے خاندان کی ہندوستانی زندگی سے متعلق معلومات نہیں ملتیں۔اگر آپ یا کوئی اس عدیم الفرصتی کے زمانے میں علمی تعاون فرمائیں تو یہ مجھ پر احسان ہونے کے علاوہ اردو زبان وادب کی خدمت بھی ہوگی۔اس سلسلے میں جو بھی خرچ ہوگا حتی المقدور ادا کروں گا۔"

حقائق کی بازیافت کے سلسلے میں اس نوعیت کے پاکستانی احباب کو بھی خطوط لکھے گئے۔جن میں ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، جناب ضیاءاللہ کھوکھر، جناب عظمت اللہ سلیم، جناب محمد راشد شیخ، جناب علی ارشد مرحوم، جناب شبیر میواتی وغیرہ۔

اسی طرح کا ایک خط سہ ماہی "العلم" کے "محمد علی جوہر نمبر" اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۳ء میں شایع کروایا گیا تاکہ اہل علم باخبر ہوں کہ برنی پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔قارئین سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس سلسلے میں تعاون فرمائیں۔قابل افسوس ہے کہ کسی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

اسی نوع کا ایک خط انگریزی زبان میں انگریزی روزنامے "دی ڈان" کو بھی ای میل کے ذریعے بھیجا گیا مگر نہ ان کو جواب آیا انھوں نے اس خط کو شایع کیا تاہم خوشی ہے کہ مذکورہ تحقیقی کام کے سلسلے میں ہر وہ کوشش کی جو کی گئی جاسکتی تھی یا جسے موجودہ زمانے میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔

## ۷۔اوّلین اور ثانوی مآخذ کا حصول اور تجزیہ:

اولین مآخذ کے طور پر ضیاءالدین احمد برنی کی تصنیفات، تراجم، مضامین، یادداشتیں، مختصر خودنوشت، ان کے خطوط اور ان کے نام خطوط، ان کی تعلیمی دستاویزات، ملازمتی دستاویزات، اسناد، نکاح نامہ وغیرہ حاصل کیے گئے۔ثانوی مآخذ کے طور پر برنی پر لکھے جانے والے مضامین، خاکے، تذکرے، ان کی کتب اور مضامین کے حوالے جن کتب اور مضامین میں دست یاب ہوئے وہ اور انھوں نے جن انگریزی کتب کے ترجمے کیے وہ انگریزی کتب تک رسائی اور حصول کے بعد ان سب کا بہ غور مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا۔

برنی کے خاندانی حالات کے لیے واقعات کو حقیقی ترتیب میں لایا گیا۔نمایاں اور ممتاز شخصیات سے متعلق حقائق کو جمع کیا گیا اور پرکھا گیا اور غلط اور صحیح میں تمیز کی گئی اور انھیں زمانی ترتیب دی گئی۔حوالوں اور سندوں کے ساتھ صحیح واقعات قلم بند کیے گئے۔مثلاً برنی کے خاندان کے جس جس فرد کے واقعات قلم بند کیے گئے تحقیق کے ساتھ لکھے گئے۔برنی کے والد کے ورود دہلی کے بعد کے واقعات کو زمانی ترتیب سے تحریر کیا گیا۔برنی کے والد دہلی کے کس کس محلے میں رہے اس کی تحقیق کی گئی اور زمانی ترتیب دی گئی۔

برنی کی زندگی کے واقعات کو ترتیب دینے سے پیشتر ان کی خوب خوب چھان پھٹک کی گئی اور اس کے بعد زمانی ترتیب سے لکھے گئے۔اس سلسلے میں ان کے اولین مآخذ سے بھرپور مدد لی گئی۔

برنی کی علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں جمع شدہ حقائق کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا تجزیہ کیا گیا، جہاں موازنے

کی ضرورت پڑی وہاں موازنہ کر کے برنی کے کام کی نوعیت اور کیفیت بیان کی گئی ہے اور اس کے بعد ضبط تحریر میں لایا گیا۔

**۸۔اخذِ نتائج:**

ابواب کے اختتام پر تمام تر تحقیق کے نتائج درج کیے گئے ہیں۔

**۹۔کتابیات:**

مقالے کے اختتام پر ایک مکمل فہرست ان کتب، رسائل اور اخبارات کی علاحدہ علاحدہ دی گئی ہے جن سے مقالے میں استفادہ کیا گیا ہے۔فہرست کی ترتیب مصنف وار رکھی گی ہے۔رسائل اور اخبارات کی ترتیب ان کے نام کے حروف ابجد سے دی گئی ہے۔

**۱۰۔ضمیمے:**

مقالے کے اختتام پر چند ضمیمے شامل مقالہ کیے گئے ہیں جن کی ترتیب وتفصیل اس طرح ہے:

**ا۔ضمیمہ نمبرا:**

برنی کے والد منشی محمد الدین، بہن فاطمۃ الکبریٰ اور بھائی منشی محمد یوسف دہلوی کے خطاطی کے نمونے اور تصاویر۔

**۲۔ضمیمہ نمبر۲:**

برنی کی اسکول اور کالج کی اسناد، امتحانی پرچے، اسکول اور کالج کے نتیجے، ملازمت کی بعض دستاویزات، نکاح نامہ بعض اہم شخصیات کی جانب سے برنی کو دیے جانے والے سرٹیفکیٹس وغیرہ۔

**۳۔ضمیمہ نمبر۳:**

برنی کے اپنے ہاتھ کے خطوط، مشاہیر کے چند خطوط بہ طور نمونہ۔

**۴۔ضمیمہ نمبر۴:**

برنی کی یادداشتیں اور خودنوشت کے عکس۔

## حواشی وتعلیقات:

۱۔ ''مقدمہ'' از ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ''اردو میں اصولِ تحقیق''، جلد اوّل، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء ص۱۰۔

۲۔ ''جدید رسمیات تحقیق''، ڈاکٹر عطش درانی، لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۵، ص۷۶۔

۳۔ ایضاً، ص۷۷۔

۴۔ ایضاً، ص۷۸۔۷۷

۵۔ ''دستاویزی طریق تحقیق''، سید جمیل احمد رضوی، مشمولہ ''اردو میں اصولِ تحقیق''، جلد اوّل، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص۱۶۱۔

۶۔ ''مقدمہ'' از ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، اردو میں اصولِ تحقیق، جلد اوّل، ص۱۱۔۱۰۔

۷۔ ''دستاویزی طریق تحقیق''، سید جمیل احمد رضوی، ص۱۹۰۔۱۸۹۔

۸۔ ایضاً، ص۱۹۰۔

۹۔ ''ادبی تحقیق کے اصول''، تبسم کاشمیری، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۲ء، ص۲۶۔

۱۰۔ ''تحقیق کے طریقہ کار''، ڈاکٹر ش۔ اختر، مشمولہ اردو میں ''اصولِ تحقیق''، جلد اوّل، ص۱۹۷۔

۱۱۔ ''مقدمہ'' از ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ''اردو میں اصولِ تحقیق''، جلد اوّل، ص۱۱۔ تسوید مقالہ کے سلسلے میں ڈاکٹر نجم الاسلام کا مقالہ ''رسمیات مقالہ نگاری''، مشمولہ رسالہ تحقیق، شمارہ اوّل، ۱۹۸۷ء، شعبہ اردو، سندھ یونی ورسٹی، بھی رہ نمائی کرتا ہے۔ اسی سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور زاہد منیر عامر کا مقالہ ''مقالہ نگاری''، مشمولہ سہ ماہی ''مجلہ تحقیق''، جلد ۲۰، عدد ۱ تا ۴، عدد مسلسل ۶۴، کلیہ علوم اسلامیہ وشرقیہ، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۹۹ء۔

۱۲۔ ''تذکرہ خطاطین''، محمد راشد شیخ، کراچی، ادارہ علم وفن، ۱۹۹۸ء۔

۱۳۔ میرے زمانے کی دلی، ملا واحدی، کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص۴۸۔

۱۴۔ تفصیلاً دیکھیے: میرے زمانے کی دلی، ملا واحدی، کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء

۱۵۔ تفصیلاً دیکھیے: روزنامہ جنگ کراچی، مئی ۱۹۶۹ء۔

۱۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: روزنامہ جنگ، کراچی، سنڈے ایڈیشن، ۱۴ جون ۱۹۶۹ء۔

۱۷۔ دیکھیے: ماہ نامہ ''فاران''، کراچی، جولائی ۱۹۶۹ء۔ ''یادِ رفتگاں'' مرتبہ طالب ہاشمی، لاہور، البدر پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء۔

۱۸۔ ۹ راگست ۱۹۶۹ء، روزنامہ جنگ، کراچی۔

۱۹۔ دیکھیے: ماہ نامہ ''کتاب''، لاہور، ستمبر ۱۹۶۹ء۔

۲۰۔ تفصیل کے لیے دیکھیے مقالہ ہذا کا باب سوم۔

۲۱۔ دیکھیے: عظمتِ رفتہ، ص۴۸۔

۲۲۔ دیکھیے کتاب ''آدمی غنیمت ہے''، اوّل، صادق آباد، مبارک لائبریری، محمد آباد، جنوری ۱۹۹۴ء، ص۱۳۷۔

۲۳۔ دیکھیے: ''مشاہیر کے خطوط''، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، دسمبر ۱۹۷۵ء۔

۲۴۔ دیکھیے: کلیات مکاتیب اقبال، جلد اوّل، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء۔

۲۵۔ عظمت اللہ سلیم برنی کے تایا منشی کرم الٰہی کے بیٹے مولوی غلام اللہ کے پوتے ہیں، جب کہ عبدالقیوم برنی کے ایک اور تایا مولوی رجب علی کے بیٹے مولوی عبدالقادر کے پوتے ہیں۔

۲۶۔ ڈاکٹر خلیق انجم، ''منشی عبدالقدیر''، ماہ نامہ ساقی، کراچی، ستمبر ۱۹۵۶ء

۲۷۔ سہواً ثاقی لکھا دیا مراد، ماہ نامہ ساقی، کراچی، ہے۔

# باب دوم

## ضیاءالدین احمد برنی کا خاندانی پس منظر

☆۔صوبہ پنجاب میں گوجرانوالہ کی حیثیت

☆۔گوجرانوالہ اورفن خطاطی

☆۔مولوی نظام الدین (برنی کے دادا)

☆۔آبائی گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا سے ہجرت

☆۔دہلی آمداورمختلف محلّوں میں قیام

☆۔شرافت،قناعت اوروضع داری

☆۔منشی محمدالدین کے تعلقات دہلی کے اکابرومشاہر سے

☆۔منشی محمدالدین کاصحافت اورسیاست سے تعلق

☆۔منشی محمدالدین کاانتقال

☆۔منشی محمدالدین کی اولاد

☆۔گوجرانوالہ تعلق رکھنے والی بڑی شخصیات

☆۔ضیاءالدین احمد برنی کا خاندان

☆۔منشی محمدالدین (ضیاءالدین احمد برنی کے والد)

دہلی میں مستقل قیام سے قبل لاہوراورملتان میں عارضی قیام

☆۔منشی محمدالدین کادینی شغف اورعلم وفضل

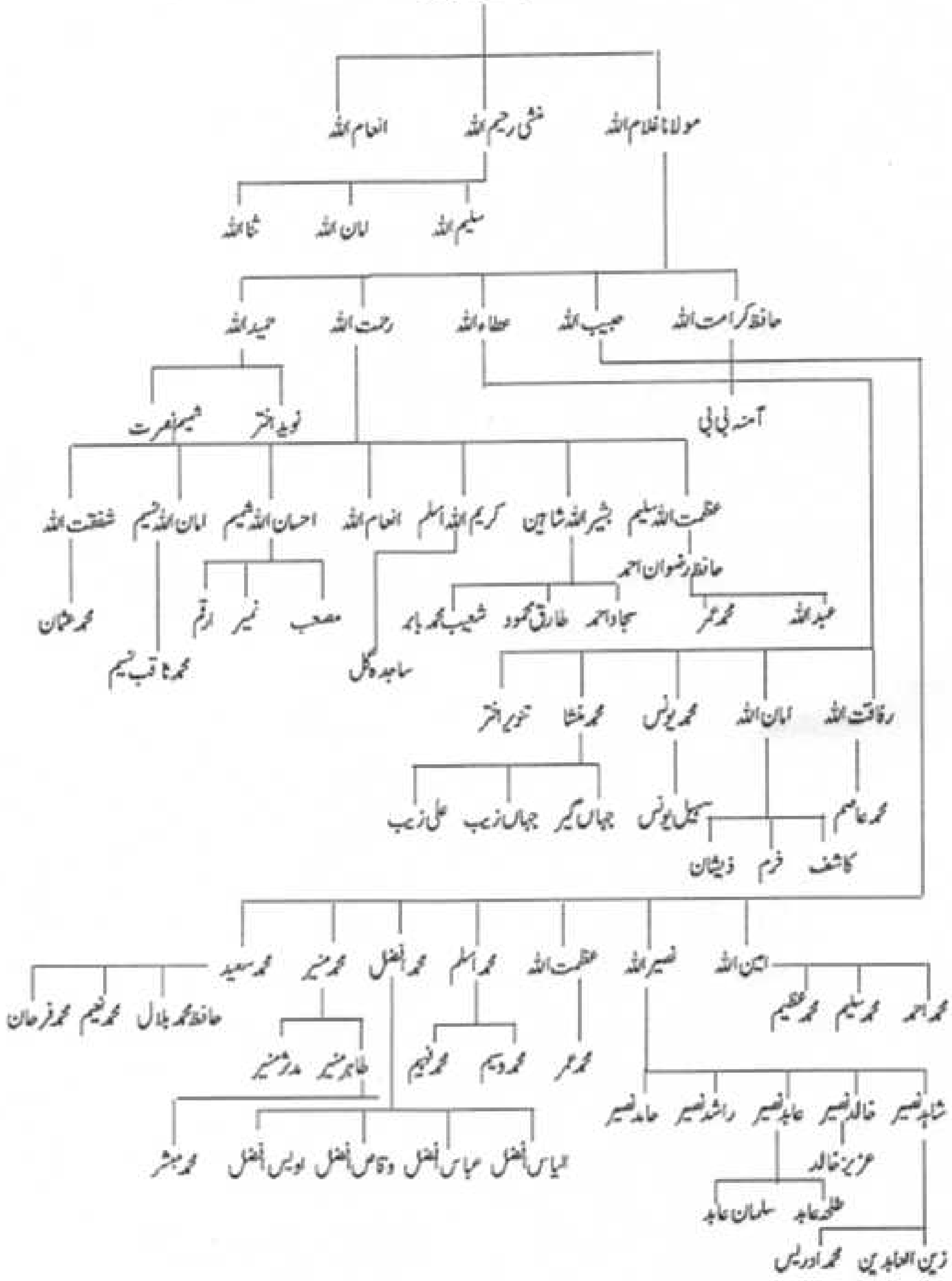
☆۔منشی محمدالدین اورفنِ خوش نویسی/ خطاطی

☆۔منشی محمدالدین اورغبارِخاطر کامقدمہ

☆۔ہفتہ وار ''دارالعلوم'' دہلی،کااجراء

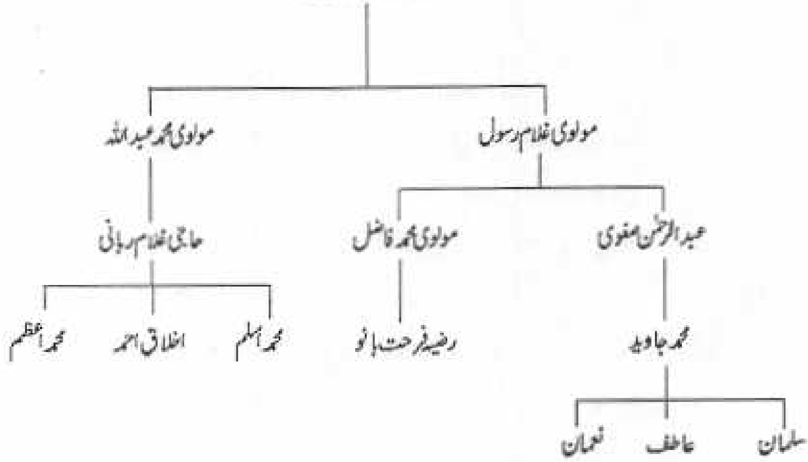
☆۔حسن بیگم (ضیاءالدین احمد برنی کی والدہ)

# شجرہ منشی کرم الٰہی بن مولوی نظام الدین بن مولوی اشرف علی بن مولانا عبدالرسول



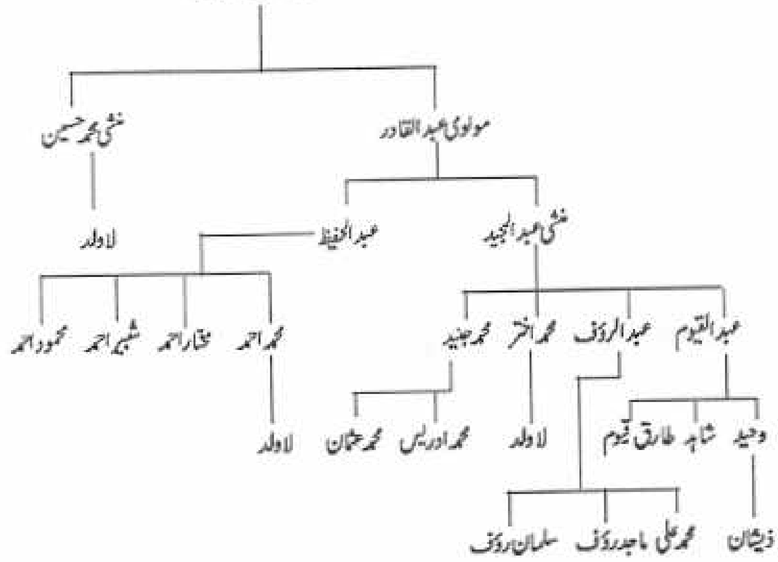
shajra new3.gif (793x1122x256 gif)

## شجرہ مولانا گنج بخش بن مولوی نظام الدین بن مولوی اشرف علی بن مولانا عبدالرسول

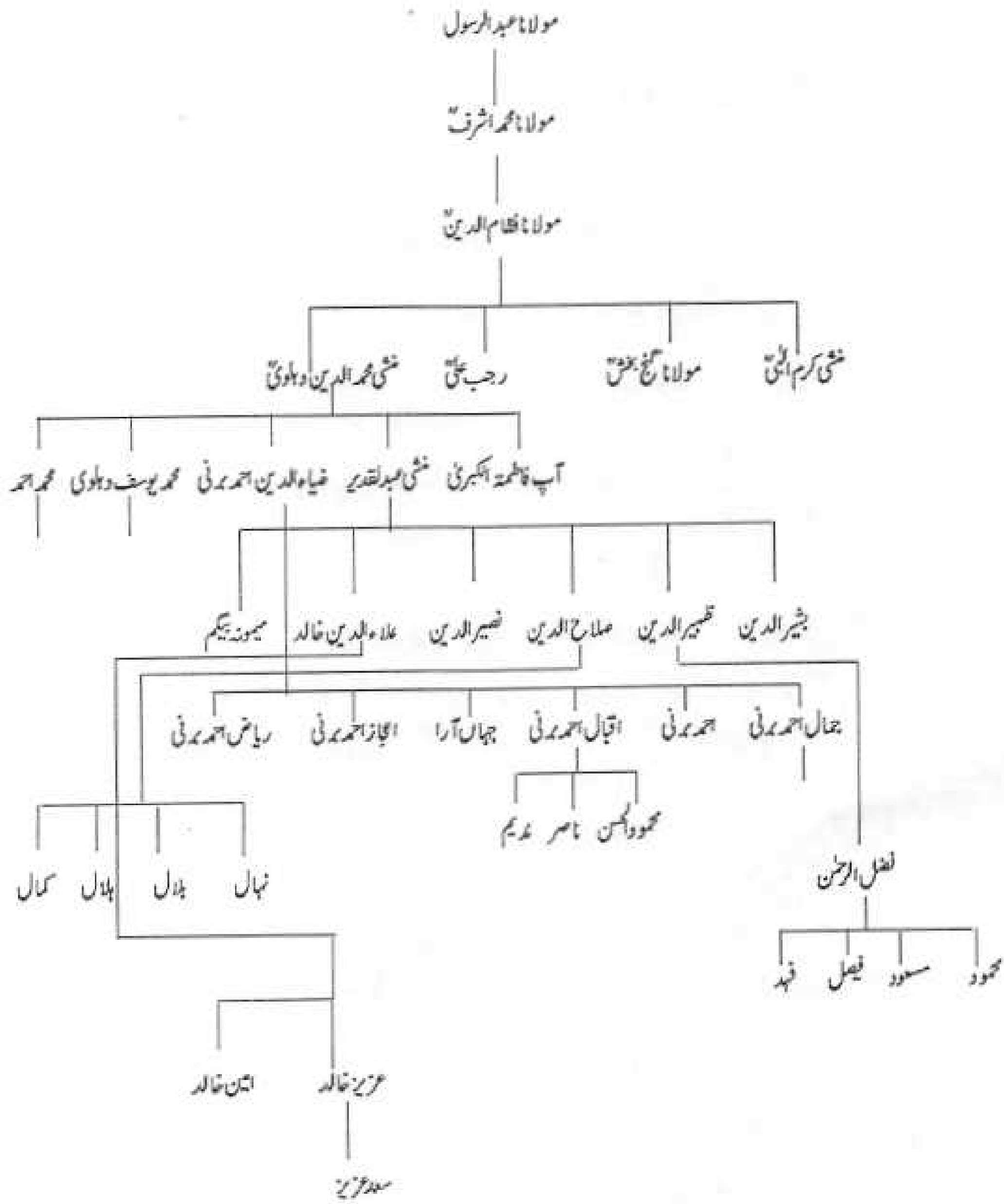


shajra new4.gif (793x1122x256 gif)

## شجرہ مولوی رجب علی بن مولوی نظام الدین بن مولوی اشرف علی بن مولانا عبدالرسول



# شجرہء نسب جناب ضیاء الدین احمد برنی



# باب دوّم:

## ضیاءالدین احمد برنی کا خاندانی پس منظر

ضیاءالدین احمد برنی کے خاندان کا تعلق مغربی پنجاب کے مردم خیز شہر گوجرانوالہ کے ایک قصبے جنڈیالہ ڈھاب والا سے تھا۔ گوجرانوالہ برصغیر اور بالخصوص پنجاب کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ سیاست، صحافت، صنعت وحرفت، ادب وفن غرضیکہ ہر میدان میں یہاں کے باشندگان نے ذہانت وذکاوت، ہنرمندی، شجاعت و بہادری، جوش وولولے اور وسعتِ قلب ونظر کا مظاہرہ کیا ہے۔ گوجرانوالہ سے کتنی ہی نام ور شخصیات نے جنم لیا اور ملک اور بیرونِ ملک اپنی خدمات سے نہ صرف گوجرانوالہ بلکہ ملکِ پاکستان کا نام بھی روشن کیا۔

اس ذیل میں گوجرانوالہ کی منفرد حیثیت اور اس کے علمی وادبی ماحول پر روشنی ڈالی جائے گی۔

## صوبہ پنجاب میں گوجرانوالہ کی حیثیت:

یکم جولائی ۱۹۸۲ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے گوجرانوالہ شہر کو ڈویژن کی حیثیت دے دی گئی۔ڈویژن کے قیام سے گوجرانوالہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوگیا۔اس ڈویژن کی تشکیل سے قبل گوجرانوالہ اور سیالکوٹ کے اضلاع لاہور ڈویژن میں شامل تھے جب کہ گجرات، راولپنڈی کا ایک ضلع تھا۔گوجرانوالہ ڈویژن ۶۴۳،۶ مربع میل رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔

اس وقت گوجرانوالہ کی حیثیت ڈویژن کی ہے۔یہ پنجاب کا سب سے بڑا ڈویژن ہے۔اس کے چھ اضلاع ہیں۔ضلع سیالکوٹ، ضلع نارووال، ضلع گوجرانوالہ، ضلع حافظ آباد، ضلع گجرات، ضلع منڈی بہاءالدین۔(۱)

## گوجرانوالہ تعلق رکھنے والی بڑی شخصیات:

یہ بڑی شخصیات زندگی کے ہر میدان سے تعلق رکھتی ہیں۔یعنی شعروادب، صحافت، سیاست، مذہب ،صنعت وحرفت، فنِ خطاطی، فنِ تن سازی، زراعت، ظروف سازی وغیرہم۔

گوجرانوالہ برصغیر کے دیگر مردم خیز خطوں کی طرح ایک مردم خیز خطہ ہے۔یہاں سے جنم لینے اور دنیا بھر میں اپنی ذہانت، علمیت، ادبیت اور شجاعت سے اس خطے کا نام روشن کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔اس ضمن میں نمایاں اور اہم شخصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔مولوی میر حسن، اقبال کے استاد۔

۲۔منشی محبوب عالم ایڈیٹر "پیسہ"۔

۳۔میر خلیل الرحمن ایڈیٹر "روز نامہ جنگ"۔

۴۔ڈاکٹر وحید قریشی، محقق، استاد، دانشور، نقاد، ادیب۔

۵۔امرتا پریتم، مشہور شاعرہ۔

۶۔مجید لاہوری، ایڈیٹر "نمک دان"۔

۷۔مولانا سراج الدین احمد خاں، ایڈیٹر "زمیندار"۔

۹۔مولانا ظفر علی خاں، شاعر، مجاہدِ ملت، صحافی، ایڈیٹر "زمیندار"۔

۹۔حامد علی خاں، مولانا ظفر علی خاں کے بھائی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد، ایڈیٹر: ہمایوں، مخزن اور الحمراء۔

۱۰۔حفیظ تائبؔ، مشہور نعت گو شاعر۔

۱۱۔منو بھائی، دانشور، ڈرامہ نگار، مشہور کالم نگار۔

۱۲۔الطاف گوہر، ادیب، نقاد، کالم نگار۔

۱۳۔ظفر اقبال ظفر، شاعر۔

۱۴۔ ملک سکندر حیات۔

۱۵۔ دیوان سنگھ مفتون، مشہور صحافی۔

۱۶۔ ڈاکٹر ممتاز حسن، خان لیاقت علی خاں کے پرسنل سیکریٹری، ادیب، شاعر، سماجی کارکن۔

۱۷۔ بابا گرونانک، سکھوں کے مذہبی پیشوا۔

۱۸۔ ن۔ م۔ راشد، مشہور شاعر۔

۱۹۔ خالد عباس ڈار، فن کار۔

۲۰۔ دلدار پرویز بھٹی، استاد، فن کار۔

یہ نہایت مختصر فہرست ہے جو محض تعارف کی غرض سے دی گئی ہے۔ ''گوجرانوالہ کے اہلِ قلم'' مرتبہ محمد اقبال نجمی (فروغ ادب اکادمی گوجرانوالہ، ۱۹۹۱ء)، میں ساڑھے پانچ سو سے زائد افراد کی فہرست دی گئی جو گوجرانوالہ کے علمی وادبی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔

## گوجرانوالہ اورفن خطاطی:

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ پاکستان کے مغربی حصے یعنی موجودہ سندھ میں پہلی صدی ہجری میں اسلام کی روشنی پھیل گئی۔ دیبل، منصورہ، سکھر، روہڑی، ٹھٹھہ، اُچ، ملتان وغیرہ اسلامی ثقافت کے مراکز قرار پائے۔ قرآنی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے قرآنی نسخے تحریر کرنے کی غرض سے فن خطاطی کا آغاز پہلے یہیں ہوا۔ اس کے بعد سرحد اور پنجاب کے شہروں میں اس کا رواج ہوا۔

سرزمینِ گوجرانوالہ کے دیہات اور قصبات میں ہزاروں کاتبوں نے اپنے فن سے فنِ خطاطی کو فروغ اور عروج بخشا۔ ایمن آباد نے اس سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لاہور کی موجودہ طرزِ خطاطی کا بانی پرویں رقم ایمن آباد، گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا۔ دہلی کے طرزِ خطاطی اور موجودہ کراچی اسکول کا موجد محمد یوسف دہلوی بھی ایمن آباد، گوجرانوالہ کے ایک قصبے جنڈیالہ ڈھاب والا سے تعلق رکھتا تھا۔ (۲) اس سلسلے میں تفصیل کے لیے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے رسالے ''مہک'' کے خصوصی نمبر ''گوجرانوالہ نمبر'' ۱۹۸۲ء کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی مردم خیز خطے کے ایک خاندان جس کے جداعلا مولانا عبدالرسول تھے، ان کے ہاں مولوی نظام الدین کی ولادت ہوئی، اُن کے بیٹوں میں منشی محمد الدین نے خطاطی اور خوش نویسی میں شہرت وعزت پائی۔ اُن کے بیٹے ضیاءالدین احمد برنی کی ولادت دہلی میں ہوئی، برنی کے سوانح اور خدمات ہی ہمارا موضوع ہے۔

## ضیاءالدین احمد برنی کا خاندان:

ضیاءالدین احمد برنی کے خاندان کا تعلق مغربی پنجاب کے مردم خیز شہر گوجرانوالہ کے ایک قصبے جنڈیالہ (۳) ڈھاب والا سے تھا۔ برنی کے جدامجد مولانا عبدالرسول تھے۔ ان کی اولاد میں صرف ایک بیٹے کا نام معلوم ہوسکا ہے۔ وہ تھے مولوی

اشرف علی ان کی کتنی اولاد تھی نہیں معلوم ہو سکا، اُن کے بھی صرف ایک ہی بیٹے کا نام سامنے آیا ہے، یعنی مولوی نظام الدین۔ یہی مولوی نظام الدین ضیاء الدین احمد برنی کے دادا تھے (۴)۔ وہ ذات کے راجپوت کھوکھر تھے۔ (۵) اس خاندان کا تعلق موضع ہیرانوالہ تحصیل وزیر آباد، ضلع گوجرانوالہ سے تھا۔ (۶) تا حال یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ مولوی نظام الدین نے کس زمانے میں ہیرانوالہ سے ہجرت کر کے جنڈیالہ ڈھاب والا میں سکونت اختیار کی۔ یہ چھوٹا سا گاؤں جی ٹی روڈ پر گکھڑ منڈی سے شمال کی جانب دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

## مولوی نظام الدین (برنی کے دادا):

مولوی نظام الدین کے بارے میں چند باتوں کے علاوہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ تو طے ہے کہ انھوں نے موضع ہیرانوالہ تحصیل وزیر آباد سے موضع جنڈیالہ ڈھاب والا، ضلع گوجرانوالہ سے ہجرت کی۔ عظمت اللہ سلیم صاحب نے ایک فارسی مثنوی ''مخزن اسرار'' کی فوٹو کاپی یہ کہ کر راقم کو بہ صیغہ ڈاک ارسال کی کہ مذکورہ مثنوی مولوی نظام الدین کی ہے۔ تحقیق سے پتا چلا کہ یہ مثنوی فارسی زبان کے معروف شاعر نظامی گنجوی (۷) کی ہے۔ مذکورہ مثنوی کی کتابت عظمت اللہ سلیم کے پردادا مولوی کرم الٰہی نے کی انھیں نام کی وجہ سے اشتباہ ہوا اور وہ سمجھے کہ یہ مثنوی ان کے والد مولوی نظام الدین نے تحریر کی ہے لہٰذا انھوں نے مثنوی کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ''تمام شد مخزن اسرار تصنیف مولوی حضرت نظام الدین گنجوی بدست خط فقیر حقیر کرم الٰہی ساکن موضع ہیراں والہ۔ تمام شد ۔۱۹۰۴ء''

ضیاء الدین برنی کے اپنے دادا کے بارے میں بیان کے علاوہ امام خان نوشہروی کے تحریر کردہ ایک مضمون سے بھی مولوی نظام الدین کے بارے میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں ''منشی صاحب [منشی محمد الدین] کے والد مولوی نظام الدین مرحوم نے تو برسوں مسندِ تدریس آراستہ رکھی۔ ان کے شاگردوں میں صرف دو نام معلوم ہو سکے۔ ۱۔ پیر صاحب مکان شریف ،۲۔ پیر صاحب دھونکل والے۔ جنڈیالہ میں تو آپ کے بے شمار شاگرد تھے۔'' (۸)

مولوی نظام الدین کے چار بیٹے تھے۔ کرم الٰہی، گنج بخش، رجب علی اور محمد الدین۔ (۹) اپنے دادا اور تایا کے متعلق ضیاء الدین احمد برنی لکھتے ہیں:

> میں نے اپنے دادا کو نہیں دیکھا لیکن ان کا نام نظام الدین تھا اور وہ بہت اچھے عالم دین تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ میرے والد منشی محمد الدین منجھلے بیٹے تھے اور ان سے بڑے میرے تایا مولوی گنج بخش تھے۔ یہ اپنے دور کے جید عالم تھے اور ان کی ساری عمر تعلیم و تعلم میں گزری۔ اگر چہ انھوں نے جنڈیالہ (ضلع گوجرانوالہ) جیسے چھوٹے گاؤں میں اپنی پوری زندگی گزار دی مگر ان کا فیض دور دور تک جاری تھا۔ (۱۰)

ضیاء الدین احمد برنی نے ۱۸ اگست ۱۹۶۸ء کی دوپہر ۲ بجے ''میرے خاندانی اور ذاتی حالات'' کے عنوان سے چند اہم یادداشتیں محفوظ کروائی تھیں۔ خاندان اور ذات کے متعلق ان کا بیان ہے:

> مجھے اپنے بزرگوں کا حال معلوم نہیں، لیکن والد کہا کرتے تھے کہ ان کا تعلق کھوکھر راجپوتوں

کے خاندان سے ہے۔ایک زمانے میں وہ اپنے نام کے ساتھ کھوکھر لکھا کرتے تھے لیکن یہ بہت پرانے زمانے کی بات ہے۔ ہمارے خاندان کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پنجاب کے اکثر شہروں اور دیہات میں ہمارے بزرگ آباد ہیں۔ویسے ددیالی رشتہ جنڈیالہ(ضلع گوجرانوالہ) سے اور ننھیالی رشتہ سنبھڑیال (ضلع سیالکوٹ) سے ہے۔میں نے اپنے نانا کو دیکھا ہے مگر اپنے دادا کو نہیں دیکھا۔(۱۱)

اپنے بزرگوں کے متعلق برنی کی معلومات ناکافی اور مختصر ہیں۔جس قدر باتیں معلوم بھی ہیں وہ یقناً انھوں نے اپنے والد منشی محمد الدین سے سنی ہوں گی۔برنی کے سوا خاندان کے کسی اور فرد نے اس جانب اتنی توجہ نہیں دی۔عظمت اللہ سلیم صاحب جو ضیاءالدین احمد برنی کے بڑے تایا(کرم الٰہی) کے پڑپوتے ہیں،اس ضمن میں دل چسپی رکھتے ہیں حتی المقدور تعاون بھی فرماتے رہے ہیں۔

## منشی کرم الٰہی:

منشی کرم الٰہی ،مولوی نظام الدین کے فرزند اکبر تھے۔اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔(۱۲)

## مولوی گنج بخش:

عمر کے لحاظ سے مولوی گنج بخش منشی کرم الٰہی سے چھوٹے تھے۔ان کے بارے میں بھی ہماری رہ نمائی سب سے پہلے ضیاءالدین احمد برنی کی تحریر کرتی ہے۔گزشتہ اقتباس میں مولوی گنج بخش کے متعلق برنی نے لکھا ہے کہ''وہ اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ان کی تمام عمر جنڈیالہ میں گزری تاہم ان کا فیض دور دور تک تھا۔''

۱۰/اپریل ۲۰۰۶ءکو راقم گوجرانوالہ گیا۔ضیاءالدین احمد برنی کے عزیزوں سے ملاقات کی۔جنڈیالہ ڈھاب والا بھی گیا۔اس خاندان کے پرانے مکانات دیکھے۔قبرستان گیا،جہاں مولوی گنج بخش آسودہء خاک ہیں۔لوح مزار کی عبارت اس طرح ہے:

کتبہ مولوی گنج بخش

اللہ لا الہ اللہ محمد الرسول اللہ محمد

آخری آرام گاہ

حضرت مولانا گنج بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الحدیث والتفسیر فقیہ استاد العلماء

محدث

حضرت مولانا مولوی گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ

تاریخِ وصال

اکتوبر ۱۹۲۴ء (۱۳)

مذکورہ قطعہ تاریخ اور کتبہ مزار سے پتا چلتا ہے کہ وہ شیخ الحدیث، فقیہ اور استاد العلماء تھے۔ کیپٹن منظور حسن نے تو انھیں داتا گنج بخش کا ہم رتبہ کہا ہے۔ وہ دار العلوم دیو بند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی تمام عمر تعلیم و تعلم میں گزری۔ وہ اپنے گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا کی جامع مسجد ہی میں درس و تدریس کے سلسلے سے وابستہ رہے۔ (۱۴) ان کے طرز زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شہرت پسند نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود، فیض عام ہونے کے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے رسالے "مہک" کے گوجرانوالہ نمبر ۱۹۸۲ء میں بھی ان کا تذکرہ نہیں آیا۔ (۱۵) "تاریخ فقہائے ہند" کے مصنف محمد اسحاق بھٹی نے بھی گوجرانوالہ میں ان کی موجودگی سے لاعلمی ظاہر کی۔ (۱۶) اسی طرح ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے بھی ناواقفیت ظاہر کی۔ ضیاءالدین احمد برنی نے انھیں مولانا ظفر علی خاں کے والد منشی سراج الدین کا استاد لکھا ہے۔ (۱۷)

ان کا انتقال اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ ان کی قبر آج بھی مرجع خلائق ہے۔ عقیدت مند ان کی قبر کی مٹی کو آنکھوں سے لگاتے ہیں اور ان کی قبر کے سرہانے لگے بیری کے درخت کے پتے بہ غرض شفا لے جاتے ہیں۔ (۱۸)

## مولوی رجب علی:

مولوی رجب علی کے پڑپوتے عبدالقیوم بقید حیات ہیں اور لاہور میں سکونت پذیر ہیں راقم کی اپریل ۲۰۰۶ میں ان سے کئی ملاقاتیں رہی ہیں۔ وہ اپنے پڑدادا مولوی رجب علی کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں بتا سکے کہ وہ ماہر خطاط تھے۔ جب کہ اپنے دادا منشی عبدالقادر ولد مولوی رجب علی کے متعلق یہ معلومات فراہم کیں:

> منشی عبدالقادر مولانا ظفر علی خاں کے مشہور زمانہ اخبار روزنامہ "زمیندار" کے ہیڈ کاتب تھے
> اور انھیں "جواہر رقم" کا خطاب دیا گیا تھا۔ (۱۹)

عندالملاقات عبدالقیوم صاحب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر، مولانا ظفر علی خاں کے اخبار زمیندار سے علاحدہ ہوئے تھے تو منشی عبدالقادر بھی ان کے ساتھ علاحدہ ہو گئے تھے۔ یہ وہی منشی عبدالقادر ہیں جو اپنے تایا منشی محمد الدین کے ہم راہ جنڈیالہ سے دہلی گئے تھے اور مرزا حیرت کے "مطبع کرزن پریس" میں کام کرتے رہے۔ مرزا حیرت نے کام کی نوعیت نہیں لکھی ہے ممکن ہے کتابت کے علاوہ بھی پریس کے کام کرتے ہوں۔ منشی محمد الدین کے ہم راہ ان کے چار بھتیجے منشی غلام رسول ولد مولوی گنج بخش، منشی عبدالقادر اور منشی محمد حسین ولد مولوی رجب علی اور منشی عبداللہ ولد مولوی گنج بخش تھے۔ (۲۰)

> منشی عبدالقادر اور منشی محمد حسین آپس میں بھائی تھے۔ شواہد سے پتا چلتا ہے کہ دونوں بھائیوں
> نے کرزن پریس کے بعد روزنامہ "زمیندار" لاہور میں کام کیا۔ (۲۱) یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ
> کس زمانے میں وہ دہلی سے لاہور منتقل ہوئے تاہم برنی کے بیان سے یہ بات سامنے آتی

ہے کہ انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کے والد منشی سراج الدین کے زمانے سے ''زمیندار'' میں کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے شذرے سے یہ پتا چلتا ہے کہ منشی محمد حسین نے ۱۹۰۳ء میں روزنامہ ''زمیندار'' کے پہلے پرچے کی کتابت کی۔ (۲۲) یہ شذرہ مولانا ظفر علی خاں نے ان کی وفات پر اپنے روزنامے ''زمیندار'' لاہور، میں ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ مطابق ۳۰ اگست ۱۹۱۳ء کو لکھا تھا۔ ان دنوں ان کا قیام لاہور کے ڈپٹی سردار احمد پینشنر ڈپٹی کلکٹر کے جدید مکانات میں سے کرائے کے ایک مکان میں تھا۔

مولوی محمد حسین اپنی وفات ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء تک ''زمیندار'' سے وابستہ رہے۔ ان کی وفات پر مولانا ظفر علی خاں نے اپنے شذرے میں ان کی خدمات دیرینہ کو اس شعر سے سراہا ہے۔

آفریں داغ تجھے، خوب نبھائی تو نے — مرحبا کوچۂ دلدار سے مرکر نکلا

مولانا نے ان کی بیوی کے لیے دس روپے ماہوار بہ طور پینشن، تاحیات دینے کا اعلان کیا۔ (۲۳) منشی محمد حسین لاولد تھے۔ (۲۴)

منشی رحیم اللہ خان ولد کرم الٰہی ضیاءالدین احمد برنی کے چچازاد بھائی تھے۔ وہ بھی خطاط تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار ''زمیندار'' میں خوش نویس تھے۔ تین بیٹوں کی یکے بعد دیگرے وفات نے اتنا رنجیدہ کر دیا کہ نوکری چھوڑ کر اپنے گاؤں جنڈیالہ ہی کے ہو کر رہ گئے۔ ۲ دسمبر ۱۹۶۶ء میں تقریباً ۱۱۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ جنڈیالہ ڈھاب والا ہی میں اپنے آبائی قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔ (۲۵)

امان اللہ نسیم ولد مولوی رحمت اللہ، مولوی کرم الٰہی کے خاندان سے ہیں۔ عظمت اللہ سلیم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ امان اللہ نسیم خطاطوں کے اس خاندان کے وہ واحد شخص ہیں جن پر یہ خاندانی فن آخری سانسیں لے رہا ہے۔ وہ ۲۴ اپریل ۱۹۵۶ء کو جنڈیالہ میں پیدا ہوئے ۱۹۵۷ء میں میٹرک کیا اور دستگیر آئیڈیل اسکول، گوجرانوالہ میں بہ حیثیت استاد خطاطی ملازم ہیں۔ خطاطی ان کا شوق بھی ہے اور پیشہ بھی۔ امان اللہ نسیم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب اس فن کی قدر وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ عام آدمی کا رجحان کمپیوٹر کمپوزنگ کی جانب ہو گیا ہے، تاہم انھوں نے اپنے اس خاندانی فن کو اپنے شوق کے باعث زندہ رکھا ہوا ہے۔ وہ فارغ اوقات میں خطاطی کے علاوہ ڈیزائننگ کا کام بھی کرتے ہیں۔ حال ہی میں جنڈیالہ ڈھاب والا کی وہ مسجد جسے اس خاندان کے بزرگوں نے تعمیر کیا اس کی دیواریں امان اللہ نسیم کی لکھی ہوئی قرآنی آیات سے مزین ہیں۔ قرآنی آیات کو جدید طریقوں سے ٹائلوں پر نقل کیا گیا ہے۔ امان اللہ نسیم اپنے آبائی گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا ہی میں سکونت پذیر ہیں۔ (۲۶)

## منشی محمد الدین (ضیاءالدین احمد برنی کے والد):

### نام اور پیدائش:

اُن کا نام دو طرح سے ملتا ہے محمد الدین اور محمد دین تاہم وہ منشی (۲۷) محمد الدین کے نام سے معروف ہوئے۔ضیا ءالدین احمد برنی نے اپنے والد کا نام منشی محمد الدین لکھا ہے (۲۸) جب کہ ملا واحدی نے ان کا نام منشی محمد دین لکھا ہے۔() برنی کے خاندان کے ایک بزرگ قیوم صاحب کا بھی کہنا ہے کہ "ان کا نام محمد دین تھا" گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے رسالے مہک میں بھی ان کا نام منشی محمد دین درج ہے۔(۳۰) غالباً محمد الدین کا رواج خطاطی میں عربی طرز پر لکھنے کی وجہ سے ہوا، یا ان کے والد کے نام نظام الدین کی مناسبت سے لکھا جانے لگا۔"تذکرہ خطاطین" میں محمد یوسف دہلوی کی خطاطی کے ایک نمونے کا عکس دیا گیا ہے جس پر محمد یوسف دہلوی نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے: "کتبہ محمد یوسف بن محمد الدین" (۳۱)۔اپنے والد پر مضمون میں اضافہ کر کے برنی نے ایک مقام پر لکھا ہے "ٹائیٹل پیج پر والد بالعموم 'کتبہ محمد الدین یا 'کتبہ ابو یوسف' لکھ دیا کرتے تھے۔یہ الفاظ ان کی لکھی ہوئی کتابوں پر ایک گوشے میں ملیں گے"۔(۳۲) ضیاءالدین احمد برنی کے ۱۹۰۲ کے ایک اپر پرائمری سرٹیفکیٹ پر ان کے والد کا نام انگریزی میں Mohammad Din (محمد دین) لکھا ہوا ہے۔حافظ عبدالستار بیگ (جن کے ہاں مولانا الطاف حسین حالی کی کتابیں چھپتی تھیں) کے نام مولانا الطاف حسین حالی کے ایک مکتوب محررہ ۱۷/اکتوبر ۱۹۱۳ء میں مولانا نے برنی کے والد کا نام منشی محمد الدین ہی لکھا ہے۔یہ مکتوب غیر مطبوعہ ہے۔بعض تحریروں میں ان کا نام منشی محمد الدین بھی ملتا ہے۔پنڈی بہاءالدین ضلع گجرات سے ملک محمد الدین کی ادارت میں جاری ہونے والے ماہ نامہ "صوفی" میں ایک مختصر مضمون "مدنی پیا کی یاد میں" منشی محمد الدین ہی کے نام سے اُن کی زندگی ہی میں شایع ہوا تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنا نام منشی محمد الدین ہی لکھا کرتے تھے۔

مندرجہ بالا شہادتوں کی موجودگی میں ضیاءالدین احمد برنی اور محمد یوسف دہلوی کی شہادتوں کو اہمیت دی جانی چاہیے۔برنی نے "عظمتِ رفتہ" ۱۹۶۰ میں شایع کی اُس میں ان کا نام محمد الدین ہی تحریر کیا ہے۔نظر ثانی شدہ ایڈیشن (غیر مطبوعہ) میں بھی برنی نے اُن کے نام میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔علاءالدین خالد نے بھی جہاں کہیں ان کا نام استعمال کیا ہے منشی محمد الدین ہی تحریر کیا ہے، چناں چہ ان کا نام "محمد الدین" ہی ہونے پر یقین کیا جانا بہتر ہے۔

منشی محمد الدین کے ضلع گوجرانوالہ کے گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا میں پیدا ہونے سے متعلق کوئی دست آویز تو دست یاب نہیں ہو سکی تاہم عظمت اللہ سلیم اور ان کے برادر خرد امان اللہ نسیم (امان اللہ نسیم اس وقت منشی محمد الدین کے آبائی گاؤں میں مقیم ہیں) نے راقم کے دورہ گوجرانوالہ کے دوران اُسی محلے میں وہ مکان بھی دکھایا جس میں، اُن کے مطابق، منشی محمد الدین رہا کرتے تھے اور وہ ان کا آبائی مکان تھا۔تذکرہ نویسوں کے اُن اقوال سے بھی اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ ان کا تعلق جنڈیالہ ڈھاب والا سے تھا۔ان کی کنیت "ابو یوسف" تھی۔وہ خود بھی اپنے اصل نام کے بجائے اپنی کنیت لکھ دیا کرتے تھے۔بعض کتابوں میں اسی کنیت سے انھیں یاد کیا گیا ہے۔دہلی سے محبت کے باعث اپنے نام کے بعد "ثم الدہلوی" لکھنے کو پسند کرتے تھے۔(۳۳) ضیاءالدین احمد برنی نے اُن کے لباس کے متعلق اس طرح لکھا ہے "والد نے ساری عمر ایک ہی وضع کا لباس پہنا یعنی سفید تہبند، سفید کرتا اور سفید صافہ۔جاڑے میں روئی دار نیم آستین استعمال کرتے تھے اور اوپر سے گاڑھے کی چادر یا شال وغیرہ اوڑھ لیتے تھے۔" (۳۴)

**تعلیم:**

اس زمانے کے رسم ورواج کے مطابق منشی محمد الدین نے اردو، عربی اور فارسی کی مروجہ تعلیم گھر پر حاصل کی۔ضیاء الدین احمد برنی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> میرے والد نے اردو، عربی اور فارسی کی مروجہ گھریلو تعلیم پانے کے بعد جنڈیالہ کے میدان کو اپنے لیے ناکافی سمجھ کر ملتان کا رخ کیا اور اس کے بعد دہلی کا۔ یہ واقعہ ۱۸۸۶ء کا ہے۔(۳۵)

اُن کی تعلیم کے متعلق اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا تاہم تذکرہ نویسوں اور مورخین نے انھیں عالمِ دین لکھا ہے ابو سلمان شاہجہاں پوری کے قول کے مطابق "ایک طرف تو کتابت کرتے دوسری طرف علوم و معارفِ قرآنی پر مولاناؒ (ابوالکلام آزاد) سے گفتگو فرماتے۔"(۳۶) مولانا امداد صابری نے بھی انھیں عالمِ دین لکھا ہے۔

دست آیزات کی عدم موجودگی کی صورت میں قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے علم دین اپنے والد سے سیکھا ہوگا ازاں بعد ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے ذاتی کوششوں سے اپنی استعداد میں اضافہ کیا ہوگا۔ذہانت وفطانت اور نکتہ سنجی ان کی فطری خوبیاں تھیں۔

## آبائی گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا سے ہجرت:

بعض محققین کو منشی محمد الدین کے سلسلے میں چند غلط فہمیاں ہیں ایک یہ کہ منشی محمد الدین اپنے گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا سے براہ راست دہلی روانہ ہوئے۔دوسرے یہ کہ جب وہ دہلی روانہ ہوئے تو اس وقت ان کے سب چھوٹے بیٹے منشی محمد یوسف ان کے ہم راہ تھے اور ان کی عمر اس وقت پندرہ سولہ برس تھی (۳۷) درج ذیل سطور میں ان امور کا تحقیقی جائزہ لیا جائے گا۔

منشی محمد الدین کا اصل وطن جنڈیالہ ڈھاب والا (۳۸) تھا۔وہ ۱۸۸۶ء میں دہلی چلے گئے تھے مگر ان کی جائیداد جنڈیالہ میں تھی،اس جائیداد کے لیے اور عزیزوں سے ملاقات کے لیے وہ جنڈیالہ آیا کرتے تھے۔ضیاء الدین احمد برنی کی ولادت ۱۸۹۰ء میں دہلی میں ہوئی اس کے بعد منشی محمد الدین جنڈیالہ آئے اور اتنا عرصہ جنڈیالہ میں رہے کہ برنی کو عارضی طور پر وزیر آباد کے ایک اسکول میں داخل کروایا۔(۳۹) اسی طرح وہ ایک مرتبہ محمد یوسف کی دہلی میں ولادت کے بعد ۱۸۹۴ء میں جنڈیالہ آئے تھے۔اس زمانے میں محمد یوسف ان کے ساتھ تھے اس پھیرے میں بھی وہ زیادہ وقت کے لیے جنڈیالہ میں رکے اس لیے کہ انھوں نے محمد یوسف کو گوجرانوالہ کے ایک قصبے "دھونکل" کے کسی اسکول میں داخل کروایا تھا۔(۴۰) دھونکل وزیر آباد سے دو کوس کے فاصلے پر ہے۔(۴۱)

## دہلی میں مستقل قیام سے قبل لاہور اور ملتان میں عارضی قیام:

منشی محمد الدین نے اردو عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جنڈیالہ ڈھاب والا سے ترک وطن کیا اور پہلے لاہور اور پھر ملتان میں قیام کیا۔برنی کی کسی تحریر سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ منشی محمد الدین نے اپنا وطن کب چھوڑا؟ یقیناً مزید علم کی جستجو،اچھے روزگار کی تلاش اور اپنے فن کی پذیرائی انھیں جنڈیالہ جیسے چھوٹے گاؤں سے نکال کر پہلے پنجاب کے مرکزی شہر لاہور لائی

اور پھر ملتان تا آں کہ یہ سفر دلی پہنچ کر تمام ہوا۔ اسی شہر میں انھوں نے زندگی کا سفر بھی تمام کیا اور اسی خاک کا پیوند ہوئے۔

اپنے والد کے لاہور میں قیام کے متعلق ضیاءالدین احمد برنی نے کچھ نہیں لکھا۔ تاہم بعض دیگر تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف لاہور میں قیام کیا بلکہ جنڈیالہ سے نکل کر زیادہ عرصہ لاہور اور دہلی میں گزارا۔

منشی محمدالدین کے لاہور میں قیام کے متعلق انور حسین نفیس رقم کی تحریر ہماری رہ نمائی کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ لاہور اور دہلی میں بسر کیا۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں وفات پائی اور وہیں آسودہء خاک ہوئے۔'' (۴۲)

راقم نے جب منشی محمدالدین کے لاہور میں قیام کے متعلق معروف محقق ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے ٹیلی فون پر دریافت کیا تو انھوں نے انور حسین نفیس رقم کے بیان کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا کہ منشی محمدالدین نے لاہور میں قیام کیا اور دورانِ قیام تاج کمپنی کے لیے کلام مجیدوں کی کتابت بھی کی۔ (۴۳)

راقم نے جب محمد راشد شیخ مصنفہ ''تذکرہء خطاطین'' (۴۴) سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے بھی انور حسین نفیس رقم سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ منشی محمدالدین نے اُسی زمانے میں علامہ عنایت اللہ مشرقی کی کتاب ''تذکرہ'' تحریر کی۔ (۴۵)

اس ضمن میں جب راقم نے عظمت اللہ سلیم صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ یقیناً اچھے روزگار ہی کی تلاش میں انھوں نے لاہور، ملتان اور دہلی میں قیام کیا۔ (۴۶)

## دہلی آمد اور مختلف محلوں میں قیام:

ضیاءالدین احمد برنی نے اپنے والد کے ملتان سے دہلی تک کے سفر کی تفصیل نہیں لکھی تاہم امداد صابری ایک جگہ سفر کی تفصیل اور ملتان سے دہلی آمد اور دہلی کے محلے ''چوڑی والاں'' گلی حکیم جی والی میں ان کے ابتدائی قیام کے متعلق تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں:

> منشی صاحب اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم پانے کے بعد جنڈیالہ سے ملتان گئے۔ دہلی آنے کا واقعہ یہ ہوا۔ حافظ عمر صاحب کتب فروش کو قرآن مجید لکھنے والے اچھے خوش نویس کی ضرورت پڑی، انھوں نے منشی محمدالدین صاحب کا شہرہ سنا کہ وہ بہت اچھے خوش نویس ہیں۔ ملتان میں رہتے ہیں، چناں چہ ان کا پتہ کسی سے معلوم کیا اور ملتان پہنچے، اگست ۱۸۹۰ میں منشی صاحب کو دہلی لے آئے۔ حافظ صاحب کا پریس اس وقت دریبہ کلاں میں گلاب گندی کی دکان کے سامنے ایک تنگ گلی میں تھا۔ منشی صاحب گلی حکیم جی والی محلہ چوڑی والان میں آکر مقیم ہوئے، اور ایسے مقیم ہوئے کہ دہلی کے ہو گئے۔ (۴۷)

جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ برنی نے منشی محمدالدین کی دہلی آمد ۱۸۸۶ء لکھی ہے۔ ملا واحدی نے بھی ان کی دلی آمد اپنی ولادت (۷ مئی ۱۸۸۸ء) سے قبل کی لکھی ہے۔ برنی کی ولادت کا سال ۱۸۹۰ء ہے اور برنی نے اپنی ولادت دہلی کے محلے

مٹیا محل میں لکھی ہے چناں چہ منشی محمد الدین کی دہلی آمد ۱۸۸۶ء ہی درست ہے۔

منشی محمد الدین ۱۸۸۶ء میں جب دہلی پہنچے تو پہلے انھوں نے محلہ چوڑی والاں کی گلی حکیم جی میں قیام کیا۔ یہ محلہ جامع مسجد دہلی کے عقب میں واقع تھا۔ بشیر الدین احمد مولف ''واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی'' نے محلہ چوڑی والاں میں جن گلیوں کی نشان دہی کی ہے ان میں گلی حکیم جی کے متعلق لکھا ہے کہ ''بازار چوڑی والوں میں یہ گلیاں ہیں۔..... بائیں طرف کارخانہ لالہ پھانامل گلزاری مل لوہیے۔ حویلی ڈپٹی محمد سلطان خاں صاحب جس میں حکیم صاحب کا مدرسہ طبیہ ہے۔ حمام سیتل داس۔ گلی منہاریوں والی۔ گلی جوتے والاں اور گلی حکیم جی والی جس میں حکیم علی احمد خاں [برنی نے ''میری زندگی کے بارے میں'' علی رضا خاں لکھا ہے، جنھوں نے ان کے چھوٹے بھائی کا علاج کیا تھا۔] صاحب دوجانے والے مطب کرتے ہیں۔''(۴۸)

اس کے بعد وہ محلہ ''مٹیا محل''(۴۹) میں آبسے۔ یہ محلہ جامع مسجد کے جنوب میں واقع ہے۔ ضیاء الدین احمد برنی نے اپنی ولادت ۱۸۹۰ء اسی محلے کی لکھی ہے۔(۵۰)

اس کے بعد غالباً وہ کوچہ چیلاں (۵۱) میں آکر آباد ہوگئے۔ اس سلسلے میں ملا واحدی کے الفاظ سند کے طور پر نقل کیے جاسکتے ہیں ''نظام المشائخ نکلا [۱۹۰۹ء] تو اس کی کتابت از راہ شفقت منشی محمد دین نے اپنے ذمے لے لی کیوں کہ میں ان کے بیٹے مسٹر برنی کا ہم جماعت تھا اور میرا مکان جس سڑک پر تھا اس کے سامنے کی گلی میں گھستے ہی ان کا مکان تھا۔''(۵۲)

برنی کی وفات کے بعد ملا واحدی نے جو مضمون لکھا تھا اس میں منشی محمد الدین کی قیام گاہ کی نشان دہی اس طرح کی ہے:

> برنی صاحب دلی میں پلے بڑھے تھے، کوچہ چیلاں میں میرے مکان کے قریب ان کا مکان تھا۔ کچھ عرصہ میرے ہم جماعت بھی رہے تھے۔ انٹرنس کا امتحان میں نے اور انھوں نے ساتھ دیا تھا۔ میں فیل ہوگیا تھا وہ سینٹ اسٹیفنز مشن کالج پہنچ گئے، جہاں انھیں سی ایف اینڈریوز جیسے مشہور زمانہ اور یگانہ پروفیسروں کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا لیکن چوں کہ ہم محلہ تھے ملنا جلنا جاری رہا۔(۵۳)

بیگم ذاکر اعجاز، برنی کے عزیز دوست سید سجاد دہلوی اور سید شوکت دہلوی کی بھانجی نے، برنی کے انتقال پر اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> وہ دلّی کے محلے کوچہ چیلاں میں مسجد کالے خاں کے پاس رہتے تھے، یہیں ہمارا مکان بھی تھا۔ بعد میں وہ مفتی والوں میں اُٹھ گئے جو کوچہ چیلاں کے قریب ہی تھا۔(۵۴)

مفتی والاں ایک گلی کا نام ہے جو کوچہ چیلاں ہی میں واقع تھی اور جھمہ لال میاں اسی گلی میں غالباً کوئی جگہ تھی۔ ملا واحدی نے مفتی والاں کے بارے میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ ''گلی مفتی والاں میرے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر تھی''۔(۵۵)

ٹمیا محل میں لکھی ہے چناں چہ منشی محمد الدین کی دہلی آمد ۱۸۸۶ء ہی درست ہے۔

منشی محمد الدین ۱۸۸۶ء میں جب دہلی پہنچے تو پہلے انھوں نے محلہ چوڑی والاں کی گلی حکیم جی میں قیام کیا۔ یہ محلہ جامع مسجد دہلی کے عقب میں واقع تھا۔ بشیر الدین احمد مولف ''واقعاتِ دارلحکومتِ دہلی'' نے محلہ چوڑی والاں میں جن گلیوں کی نشان دہی کی ہے ان میں گلی حکیم جی کے متعلق لکھا ہے کہ ''بازار چوڑی والوں میں یہ گلیاں ہیں۔.... بائیں طرف کارخانہ لالہ پھانا مل گلزاری مل لوہیے۔ حویلی ڈپٹی محمد سلطان خاں صاحب جس میں حکیم صاحب کا مدرسہ طبیہ ہے۔ حمام سیتل داس۔ گلی منہاریوں والی۔ گلی جوتے والاں اور گلی حکیم جی والی جس میں حکیم علی احمد خاں [برنی نے ''میری زندگی کے بارے میں'' علی رضا خاں لکھا ہے، جنھوں نے ان کے چھوٹے بھائی کا علاج کیا تھا۔] صاحب دو جانے والے مطب کرتے ہیں۔'' (۴۸)

اس کے بعد وہ محلہ ''ٹمیا محل'' (۴۹) میں آبسے۔ یہ محلہ جامع مسجد کے جنوب میں واقع ہے۔ ضیاء الدین احمد برنی نے اپنی ولادت ۱۸۹۰ء اسی محلے کی لکھی ہے۔ (۵۰)

اس کے بعد غالباً وہ کوچہ چیلاں (۵۱) میں آ کر آباد ہو گئے۔ اس سلسلے میں ملا واحدی کے الفاظ سند کے طور پر نقل کیے جا سکتے ہیں ''نظام المشائخ نکلا [۱۹۰۹ء] تو اس کی کتابت از راہ شفقت منشی محمد دین نے اپنے ذمے لے لی کیوں کہ میں ان کے بیٹے مسٹر برنی کا ہم جماعت تھا اور میرا مکان جس سڑک پر تھا اس کے سامنے کی گلی میں گھستے ہی ان کا مکان تھا۔'' (۵۲)

برنی کی وفات کے بعد ملا واحدی نے جو مضمون لکھا تھا اس میں منشی محمد الدین کی قیام گاہ کی نشان دہی اس طرح کی ہے:

> برنی صاحب دلی میں پلے بڑھے تھے، کوچہ چیلاں میں میرے مکان کے قریب ان کا مکان تھا۔ کچھ عرصہ میرے ہم جماعت بھی رہے تھے۔ انٹرنس کا امتحان میں نے اور انھوں نے ساتھ دیا تھا۔ میں فیل ہو گیا تھا وہ سینٹ اسٹیفنز مشن کالج پہنچ گئے، جہاں انھیں سی ایف اینڈ ریوز جیسے مشہور زمانہ اور یگانہ پروفیسروں کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا لیکن چوں کہ ہم محلہ تھے ملنا جلنا جاری رہا۔ (۵۳)

بیگم ذاکر اعجاز، برنی کے عزیز دوست سید سجاد دہلوی اور سید شوکت دہلوی کی بھانجی نے، برنی کے انتقال پر اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> وہ دلّی کے محلے کوچہ چیلاں میں مسجد کالے خاں کے پاس رہتے تھے، یہیں ہمارا مکان بھی تھا۔ بعد میں وہ مفتی والوں میں اُٹھ گئے جو کوچہ چیلاں کے قریب ہی تھا۔ (۵۴)

مفتی والاں ایک گلی کا نام ہے، جو کوچہ چیلاں ہی میں واقع تھی اور جھنڈال میاں اسی گلی میں غالباً کوئی جگہ تھی۔ ملا واحدی نے مفتی والاں کے بارے میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ ''گلی مفتی والاں میرے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر تھی''۔ (۵۵)

۲۲ مئی ۱۹۱۵ء میں اقبال نے ضیاء الدین احمد برنی کو جو، جوابی خط لکھا تھا۔ اس پر پتا 'دہلی، چھتہ لال میاں' درج ہے۔(۵۶) ''واقعات دہلی'' میں بشیر الدین احمد نے محلّہ چھتہ لال میاں کا محل وقوع اس طرح لکھا ہے ''اسی سڑک پر جو دلی دروازے کو جاتی ہے یہ مقامات ہیں: کوچہ تاراچند، لال میاں کا چھتہ، کوچہ جلال بخاری، گلی گنّا مقر''۔(۵۷)

دست یاب حوالوں کی مدد سے منشی محمد الدین کے دہلی کے مختلف محلوں میں قیام سے متعلق معلومات کو ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ترتیب درست ہے، تاہم یہ بات طے ہے کہ وہ دہلی میں قیام کے دوران محلے بدلتے رہے۔

منشی محمد الدین کے دہلی میں قیام کے متعلق ایک دل چسپ واقعہ میمونہ صاحبہ (۵۸) نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران بیان کیا۔ انھوں نے کہا:

> وہ (منشی محمد الدین) جب دہلی پہنچے تو انھیں کسی نے کرائے کا مکان نہیں دیا کہ دیا کہ ہم پنجابیوں کو مکان نہیں دیتے۔ بہت اصرار کرنے پر کہا کہ محلے میں ایک خالی مکان پڑا ہے سنا ہے اس میں جن ہیں، اس میں رہ سکتے ہو تو رہو۔ منشی صاحب خود اور ان کی بیوی یعنی ہماری دادی بزرگوں کے خاندان سے تھیں۔ ان کے والد سنمبڑیال ضلع سیال کوٹ میں پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ انھیں کئی علوم میں دست رس تھی۔ ہماری دادی قرآن پاک کی تلاوت بہت ہی شان دار کیا کرتی تھیں۔ وہ نہایت دین دار خاتون تھیں۔ ہمارے دادا بھی بہت زیادہ نفاست پسند اور دین دار شخص تھے۔ انھیں بھینسوں اور ان کے گوبر کی بو سخت نہ پسند تھی۔ ان کے جنڈیالہ چھوڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ ان کی یہ نفاست پسندی ان کے لباس سے بھی ظاہر ہوتی تھی کہ ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہنا۔ وہ اس مکان میں پہنچے۔ اس کی صفائی کی دھویا۔ نماز پڑھی۔ صبح ہماری دادی نے تلاوت شروع کردی۔ فجر کی نماز کے لیے جانے والوں نے جب خالی مکان میں روشنی دیکھی اور عورت کی آواز سنی تو حیران ہوئے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ کوئی منشی محمد الدین صاحب پنجاب سے آئے ہیں۔ آگاہ کرنے کے باوجود اس مکان میں رہنے پر تیار ہوگئے۔ رات سے انھی کا قیام ہے۔ لوگوں نے ان سے ملنا شروع کردیا۔ چناں چہ لوگ ان کی دلیرانہ طبیعت، دین داری اور خوش اخلاقی سے بہت متاثر ہوئے۔ اس طرح منشی صاحب کی واقفیت دہلی میں بڑھتی چلی گئی۔(۵۹)

ضیاء الدین احمد برنی نے اس واقع کے پسِ پردہ حقائق پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> شروع شروع میں دہلی والوں نے والد کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ غدر کے بعد وہ سکھوں اور پنجابی فوجیوں کی روش سے متنفر تھے اور چوں کہ والد بھی انھی کا سا

لباس پہنتے تھے اس لیے اہل دہلی کے جذبات کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ مگر رفتہ رفتہ غیریت دور ہوتی گئی اور لوگ ان کے گرویدہ ہوتے گئے۔ (۶۰)

انھیں دہلی سے ایسی محبت ہوئی کہ وہ اپنے نام کے ساتھ ثم الدہلوی لکھنا پسند کرتے تھے۔ (۶۱) برنی کی والدہ نے بھی دہلی ہی میں دفن ہونا پسند کیا۔ چناں چہ دونوں بزرگوں کی آخری آرام گاہیں سرزمینِ دہلی میں ہیں۔ دہلی میں مستقل قیام سے پیشتر منشی محمد الدین کا اپنے بزرگوں کے گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا، گوجرانوالہ، جانا آنا رہتا تھا۔

## منشی محمد الدین کا دینی شغف اور علم و فضل:

منشی محمد الدین عقیدے کے اعتبار سے سنی مسلمان تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ قرآنِ پاک کی تلاوت باقاعدگی سے کیا کرتے تھے۔ اُن کی عربی فارسی دانی سے متعلق برنی لکھ ہی چکے ہیں۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:

> منشی صاحب مرحوم عربی و فارسی کے فاضل تھے۔ ترجمان القرآن کی پہلی جلد، طبع اوّل کی کتابت انھیں نے کی تھی۔ ایک طرف تو کتابت کرتے دوسری طرف علوم و معارفِ قرآنی پر مولاناؒ سے گفتگو فرماتے۔ اگر چہ مولانا آزادؒ سے عمر میں بہت بڑے تھے لیکن مولاناؒ کا حد درجہ احترام فرماتے۔ مولانا بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ (۶۲)

امداد صابری ان کے عقائد اور خیالات کی پاکیزگی کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

> منشی صاحب خیالات و عقائد کے اعتبار سے بہت پختہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کوئی ایسی کتاب تحریر نہیں کی جو ان کے خیالات کے خلاف اور اخلاق سوز ہوتی تھی۔ (۶۳)

وہ اپنے عقائد میں نہایت پختہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی جو ان کے عقائد کے خلاف یا ضمیر کے منافی ہو یا جو مخرب الاخلاق یا سوقیانہ ہو۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی کتاب کی کتابت شروع کی اور جوں ہی معلوم ہوا کہ ان کے عقائد کے خلاف ہے، اسے یہ کہ کر واپس کر دیا کہ میرے عقائد سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ضیاء الدین احمد برنی نے ایک واقعہ عظمتِ رفتہ میں درج کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ایک مرتبہ انھوں نے آدھی کتاب لکھ کر باقی واپس کر دی یہ کہ کر کہ وہ ان کے عقائد کے خلاف ہے۔ لکھے ہوئے حصے کی اجرت بھی انھوں نے نہیں لی۔ (۶۴)

ابوسلمان شاہجہاں پوری ان کے عقیدے کی پختگی سے متعلق لکھتے ہیں:

> وہ محض ایک کاتب اور خوش نویس ہی نہ تھے بلکہ ادبی اور دینی ذوق بھی رکھتے تھے اور بڑے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ کبھی اپنے عقیدے کے خلاف کوئی کتاب نہیں لکھی۔ (۶۵)

ملا واحدی ان کے باضمیر ہونے کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

منشی محمد دین ضمیر کے خلاف نہیں لکھتے تھے۔ لالہ جنیشور پرشاد مائل کا ماہ نامہ ''زبان'' انھوں نے اسی بنا پر لکھنا چھوڑ دیا تھا کہ مائل صاحب نے کوئی مضمون نا مناسب لکھنے کو دے دیا تھا۔(٦٦)

منشی محمد الدین سے متعلق عبدالستار چودھری کے یہ جملے بھی مذکورہ بیانات کی تصدیق کرتے ہیں ''منشی محمد الدین صاحب عالم بھی تھے اور یکتائے زمانہ خوش نویس بھی۔ منشی صاحب ایک ناشر بھی تھے اور بے باک صحافی بھی۔''(٦٧)

ضیاءالدین احمد برنی اپنے والد کی علمی ادبی لیاقت سے متعلق لکھتے ہیں:

میرے والد کا قاعدہ تھا کہ وہ پہلے تو مسودے کا بہ غور مطالعہ فرماتے اور پھر لکھنے بیٹھتے۔ اس طریقے سے انھیں موقع ملتا تھا کہ وہ فاضل مصنفین کو بتا سکیں کہ فلاں فقرے کی بندش ست ہے یا فلاں لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہے یا فلاں واقعہ غلط طریقے سے پیش کیا گیا ہے، وغیرہ۔ خواجہ حالی کو تو والد پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ ان کی ترمیم و تنسیخ کو بلا چون و چرا تسلیم کر لیتے تھے۔(٦٨)

ان کے اس علمی درک کا اعتراف ملا واحدی نے بھی ایک مقام پر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

میرا گھر منشی محمد دین کی نشست گاہ تھا۔ پانچ سال مسلسل منشی محمد دین نے نظام المشائخ کی کتابت کی منشی محمد دین میرے کاتب ہی نہیں تھے، میرے استاد بھی تھے۔ میری تحریروں میں اور دوسرے مضمون نگاروں میں کتابت کرتے کرتے اتنی اچھی اصلاح دیتے تھے کہ پانچ سال میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا، جو میں نے یا خواجہ صاحب نے اصلاح کو غلط کہا ہو۔(٦٩)

علاءالدین خالد ولد منشی عبدالقدیر دہلوی اپنے دادا کی عالمانہ حیثیت اور خوش نویسی میں امتیازی شان کے متعلق رقم طراز ہیں:

منشی محمد الدین صاحب جنڈیالوی ثم الدہلوی عالم دین تھے۔ صحافی اور بلند پایہ خوش نویس بھی۔ خوش نویسی مسلمانوں کی تہذیب وعلم کی بنیاد تصور ہوتی تھی۔ منشی صاحب اپنے زمانے کے یکتائے روزگارِ زمانہ میں سے تھے۔ بڑے بڑے عالمِ دین اس فن میں ان کے شاگرد تھے۔(٧٠)

## شرافت، قناعت اور وضع داری:

منشی محمد الدین نے اپنی متعدد خوبیوں کے پیشِ نظر دہلی اور دہلی کے باہر ایک بڑے حلقے میں اپنی شناخت پیدا کر لی تھی۔ وہ عام کاتبوں سے مختلف مزاج کے آدمی تھے۔ انھوں نے کبھی روپے پیسے کی خاطر کتابت نہیں کی۔ ان کی طبیعت میں استغنا

اور قناعت بہت زیادہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی طے شدہ اجرت سے بھی کم معاوضہ وصول کر لینے میں بھی عار محسوس نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ضیاءالدین احمد برنی نے ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ایک مرتبہ افسرالملک حیدرآباد سے تشریف لائے۔ انھیں ایک دو لفظ لکھوانے تھے۔ وہ بہ نفس نفیس گھر پر والد سے ملنے کے لیے آئے اور اپنے سامنے وہ لفظ لکھوائے اور بہ طور اجرت ایک اشرفی عنایت کی، حالانکہ والد یہ کہتے رہ گئے کہ ''آپ جیسے معزز مہمان سے میں کچھ بھی نہیں چاہتا۔ آپ کا اتنی دور سے تشریف لانا ہی میری محنت کا کافی معاوضہ ہے۔'' مگر افسرالملک نہ مانے۔(۷۱)

ان کے مزاج اور وضع داری کے متعلق ملا واحدی لکھتے ہیں:

> منشی محمد دین اپنے گھر میں بیٹھ کر کام کرتے تھے، کام لینے بھی ڈپٹی نذیر احمد کے سوا کسی کے گھر نہیں جاتے تھے۔ مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ تک کو کام دینے منشی محمد دین کے گھر آنا پڑتا تھا۔(۷۲)
>
> لالہ جنیشور پرشاد مائل کا ماہ نامہ ''زبان'' انھوں نے اسی بنا پر لکھنا چھوڑ دیا تھا کہ مائل صاحب نے کوئی مضمون نامناسب لکھنے کو دے دیا تھا۔(۷۳)

## منشی محمد الدین اور فنِ خوش نویسی و خطاطی:

منشی محمد الدین بنیادی طور پر کاتب اور خوش نویس تھے۔ یہ فن ان کے خاندان میں کوئی تین سو سال سے چلا آ رہا تھا۔(۷۴) وہ جس زمانے میں اپنے آبائی گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا میں تھے اسی زمانے میں اس فنِ لطیف کے باعث ان کی شہرت ہو گئی تھی۔

گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے رسالے ''مہک'' کے گوجرانوالہ نمبر میں ان کی شہرت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> اس گاؤں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں پر پیدا ہونے والے محمد دین جنڈیالوی نے الفی قرآن لکھ کر خطاطی میں ایک امتیازی مقام پیدا کیا۔ یہ قرآن ۱۸۴ صفحات پر مشتمل تھا اور مطبع دہلی میور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔(۷۵)

اس سلسلے میں کوئی واضح ثبوت تو نہیں ملتا کہ انھوں نے یہ فن باقاعدہ کسی ماہرِ فن سے سیکھا ہو قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ انھوں اس فن خوش نویسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد نظام الدین سے حاصل کی ہو۔ علاء الدین خالد کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ وہ خط نسخ میں عبدالرشید ایلمی کے اور نستعلیق میں امام ویردی کے پرستار تھے۔ ایلمی شاہ جہاں بادشاہ کے عہد سے تعلق رکھتا تھا، دہلی کی جامع مسجد کی محرابوں پر فارسی اشعار بہ خط نسخ اسی باکمال فن کار کے قلم کے نتیجہ ہیں۔(۷۶)

اس فن میں ان کی شہرت ہی کے باعث انھیں علامہ عنایت اللہ مشرقی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور سید احمد دہلوی جیسے مشاہیر کی کتابوں کی کتابت کا اعزاز حاصل ہوا۔

برنی اپنی معروف تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں لکھتے ہیں کہ ''مشرقی صاحب نے انھیں [اپنی کتابوں کی کتابت کے لیے] پشاور بلالیا تھا'' (۷۷)۔ بہ قول ڈاکٹر وحید قریشی مشہور زمانہ مطبع تاج کمپنی نے قرآن مجیدوں کی کتابت کے لیے ان کا انتخاب کیا۔

ملتان سے دہلی کی جانب ہجرت محض روزگار ہی کی تلاش کا معاملہ نہیں تھا بلکہ فن کتابت میں ان کی شہرت اس کا باعث تھا۔ اس واقعے کو امداد صابری نے اپنی کتاب دہلی کی یادگار ہستیاں میں اس طرح رقم کیا ہے:

> دہلی آنے کا واقعہ یہ ہوا، حافظ محمد عمر صاحب کتب فروش کو قرآن مجید لکھنے والے اچھے خوش نویس کی ضرورت پڑی، انھوں نے منشی محمد الدین صاحب کا شہرہ سنا کہ وہ بہت اچھے خوش نویس ہیں۔ ملتان میں رہتے ہیں؛ چناں چہ ان کا پتہ کسی سے معلوم کیا اور ملتان پہنچے، اگست ۱۸۹۰ء میں منشی صاحب کو دہلی لے آئے۔ حافظ صاحب کا پریس اس وقت دریبہ کلاں میں گلاب گندی کی دکان کے سامنے ایک تنگ گلی میں تھا۔ منشی صاحب گلی حکیم جی والی محلّہ چوڑی والان میں آ کر مقیم ہوئے اور ایسے مقیم ہوئے کہ دہلی کے ہو گئے۔ انھوں نے اٹھارہ سپارے لکھے تھے کہ حافظ صاحب کا انتقال ہو گیا اور قرآن مجید طبع نہ ہو سکا۔ (۷۸)

امداد صابری نے منشی محمد الدین کا ورودِ دہلی ۱۸۹۰ء لکھا ہے جب کہ برنی نے عظمتِ رفتہ کے اول ایڈیشن میں محض یہ لکھا ہے کہ ''یہ واقعہ کو ۷۵ سال پہلے کا ہے''عظمتِ رفتہ کے نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن (غیر مطبوعہ) کے مطابق یہ واقعہ ۱۸۶۰ء کا ہے اور یہی درست ہے، کیوں کہ برنی نے عظمتِ رفتہ کے سابقہ بیان کو قلم زد کر کے ۱۸۶۰ء تحریر کیا ہے۔

مذکورہ اقتباس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ منشی محمد الدین کی شہرت جنڈیالہ ڈھاب والا سے لاہور، ملتان اور دہلی تک ہو گئی تھی یہی وجہ تھی کہ حافظ محمد عمر مالک پریس خود چل کر دہلی سے ملتان آئے اور انھیں دہلی میں اپنے پریس میں قرآن کی کتابت کا کام سونپا۔

گزشتہ صفحات میں ضیاءالدین احمد برنی کی بھتیجی اور منشی محمد الدین کی پوتی یعنی منشی عبدالقدیر دہلوی کی صاحب زادی میمونہ اختر صاحبہ کے حوالے سے اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ جب منشی محمد الدین دہلی پہنچے تو جلد ہی انھوں نے اپنی شرافت، خوش اخلاقی، دین داری اور نفاست پسندی جیسے اوصاف کے باعث عام آدمی کے دل میں بھی ان مٹ نقوش ثبت کر دیے۔ حافظ عمر صاحب کے پریس میں کام کرنے کے دوران انھوں نے اپنی اچھی شہرت کے باعث دہلی کے نہ صرف دیگر پریسوں سے بلکہ اس عہد کی معروف شخصیات سے بھی تعلقات استوار کر لیے تھے۔

اس ضمن میں ضیاءالدین احمد برنی لکھتے ہیں:

دہلی پہنچتے ہی انھوں نے وہاں کے بڑے بڑے پریسوں سے اپنا تعلق پیدا کرلیا۔اس زمانے میں انصاری پریس عربی فارسی اور اردو کی معیاری ادبی ومذہبی کتابیں شائع کرنے میں پیش پیش تھا۔...ایک اور بڑا پریس مطبع مجتبائی تھا جس کے مالک خان بہادر مولوی عبدالاحد تھے۔اس پریس کا دہلی میں وہی درجہ تھا جو لکھنؤ میں نولکشور پریس کو حاصل تھا۔ان چھاپہ خانوں کے علاوہ چند اور نامی پریس تھے جن سے میرے والد کے گہرے تعلقات تھے اور وہیں سے انھیں کام بھی ملتا تھا۔موخرالذکر میں مطبع انصاری، افضل المطابع، مطبع فاروقی اور میور پریس خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔آخر میں دہلی پرنٹنگ پریس سے تعلقات قائم ہوگئے تھے۔اس کے مالک لالہ ٹھاکر داس اور ان کے صاحب زادے لالہ شمبو ناتھ والد کے بے حد قدر دان تھے۔(۷۹)

حافظ محمد عمر صاحب کے انتقال کے بعد منشی محمد الدین کا سلسلہ روزگار ان کے پریس سے ختم ہوگیا۔دہلی میں مرزا حیرت دہلوی، ان کے اخبار کرزن گزٹ اور ان کے پریس کرزن پریس کا بھی خاصا شہرہ تھا۔

برنی کے مذکورہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق ایک ہی پریس سے نہیں تھا بلکہ کئی پریسوں سے انھیں کام ملتا تھا۔تاہم جب وہ کرزن پریس سے متعلق ہوئے تو پریس اور اخبار کا ہر چھوٹا بڑا کام ان کے سپرد ہوگیا۔اس طرح ان کا اور ان کے خاندان کے کئی افراد کا روزگار اس سے وابستہ ہوگیا۔یہی وہ پریس ہے جس میں کام کرکے ان میں اخباری صنعت کی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی۔یقیناً مذکورہ پریس سے وابستگی نے بھی ان میں اردو صحافت کا شوق وشغف پیدا کیا۔

۱۵ مئی ۱۹۰۲ء کے کرزن گزٹ میں مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

منشی محمد دین صاحب میرے مطبع میں عرصے تک کام کرتے رہے، نہ [صرف] منشی صاحب [بلکہ] ان کا کل کنبہ جو دہلی میں موجود ہے یعنی ان کے چار بھتیجے منشی غلام رسول، منشی عبدالقادر، منشی محمد حسین، منشی عبداللہ ......منشی غلام رسول صاحب نے میرے مقدمہ تفسیر القرآن کا بہت بڑا حصہ لکھا۔پھر وہ چلے گئے۔اس کے بعد عزیزی منشی عبدالقادر شاید میرے مطبع میں کام کرتے رہے۔منشی محمد حسین صاحب نے کامل ایک سال تک یا اس سے زیادہ کرزن گزٹ لکھا۔منشی عبداللہ صاحب مدرسہ میں پڑھتے تھے اور چھٹی کے بعد میرے مطبع میں چٹوں کی کاپیاں لکھا کرتے تھے.....پھر خود منشی صاحب تشریف لائے صبح کو مطبع میں آتے تھے اور شام کو تشریف لے جاتے تھے۔اول پریسوں کی نگرانی یعنی چھپائی وغیرہ کو دیکھنا اور پریس مینوں کو سیاہی، گوند اور کھٹائی تقسیم کرنا اور جب وہ کاغذ چھاپ چکیں تو ان کاغذوں کو خود گن لینا یا گنوا کے مزدوری کا بل بنا کے مجھے دے دینا۔دوسرے جو فرمائشیں

غیر مطبع کی کتابوں کی باہر سے آتیں وہ بازار سے لے آتے اور ان کے پیکٹ بنا کر ڈاک سے روانہ کرنا۔ تیسرے اخبار کی اشاعت کے دن اگر ضرورت ہو تو اخبار پر چٹیں یا ٹکٹ چسپاں کرنا۔ ان کاموں کے علاوہ کتابت کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرنا۔ مطبع سے قطع تعلق ہونے کے بعد منشی صاحب کو مطبع سے کام دیتا رہا، چناں چہ خلافت عثمانی ان ہی کے مبارک ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہے۔(۸۰)

کیا وجہ ہوئی کہ منشی محمد الدین نے کرزن پریس سے تعلق ختم کر لیا۔ کیا اس قطع تعلقی کے پس پردہ کوئی رنجش تھی جس نے بعد میں ایک نزاع کی صورت اختیار کر لی اور منشی محمد الدین نے جب ۱۹۰۱ء میں دہلی سے ''دار العلوم'' نامی اخبار نکالا تو کرزن گزٹ اور دار العلوم میں چشمک رہی اور مخالفانہ مضامین شائع ہوئے۔ تفصیل آگے آئے گی۔ اس قطع تعلقی کا سبب معلوم نہیں ہو سکا۔

منشی محمد الدین خط نسخ اور خط نستعلیق میں مسلم الثبوت استاد تھے۔ چناں چہ جس پریس کو بھی اچھے اور ماہر خوش نویس کی ضرورت پڑتی تو وہ ان ہی کی خدمات حاصل کرتا۔ اس فنِ لطیف میں اُن کی مہارتِ تامہ کے متعلق برنی لکھتے ہیں:

والد کے لکھنے کی ایک خوبی یہ تھی کہ ان سے کوئی لفظ چھٹنے نہیں پاتا تھا اور نہ کوئی اور غلطی ہونے پاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھ کر لکھتے تھے اور دوسرے کاتبوں کی طرح مکھی پر مکھی نہیں مارتے تھے۔ انھوں نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ اندھا دھند صفحے کے صفحے بھرتے چلے جائیں۔ وہ لکھتے کم تھے مگر جتنا کچھ لکھتے تھے اسے محنت اور یکسوئی کے ساتھ لکھتے تھے اور اکثر اوقات خود ہی تصحیح بھی کر لیتے تھے۔(۸۱)

منشی محمد الدین کی فنِ خوش نویسی کے متعلق ملا واحدی کا بیان بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی شہادت کئی حوالوں سے استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ ان کے دوست مسٹر ضیاء الدین احمد برنی کے والد تھے، دوسرے یہ کہ اُن کے ہم محلہ تھے اور تیسرے یہ کہ جب انھوں نے ''نظام المشائخ'' جاری کیا تو انھوں (منشی محمد الدین) نے ہی اس کی کتابت کی۔ اور چوتھے یہ کہ منشی محمد الدین اپنے اس فن کے باعث خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

ملا واحدی لکھتے ہیں:

منشی محمد دین خوش نویسی کے استاد تھے۔ دلی میں ان کی ٹکر کا کوئی خوش نویس نہیں تھا۔ منشی ممتاز علی مہاجر مکی، جن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے قرآن مجید ہاتھوں ہاتھ ہدیہ ہوا کرتے تھے اور ان کے فرزند منشی عبد الغنی اور منشی مشتاق علی ضرور خط نسخ میں منشی محمد دین سے اکیس تھے، لیکن نستعلیق میں صفر۔ منشی محمد دین کو دونوں خطوں میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ منشی محمد دین کو دلی پہنچتے ہی شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد نے کام دے دیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کی کتابیں لکھتے لکھتے منشی محمد دین خاصے مولوی بن گئے تھے اور اردو زبان انھیں خوب آگئی تھی۔ منشی محمد دین کی عام تحریر

بھی نہایت خوب ہوتی تھی۔ عام تحریر میں بھی موتی سے جڑے تھے۔ عموماً کاتب صاحبان عام خط پر کم توجہ کرتے ہیں۔(٨٢)

امداد صابری، خوش نویسی میں اُن کی فنی مہارت کے متعلق لکھتے ہیں:

منشی صاحب کو یہ کمال حاصل تھا کہ تمام خطوں میں خواہ وہ نستعلیق ہو، خواہ شکستہ ہو یا نسخ مہارتِ تامہ رکھتے تھے اور جلی لکھنے میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔(٨٣)

انھوں نے جہاں معروف شخصیات کی کتابوں کی کتابت کی وہاں معروف زمانہ اخبارات ''ہمدرد''، ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں بھی اپنے فن خوش نویسی کے جوہر دکھائے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری ان کی ان خدمات کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

منشی محمد الدین ہمدرد کے مستقل کاتب نہیں تھے لیکن ہمدرد کی لوح اور اس کے مستقل کالموں کے عنوان ان کے قلم نفاست رقم کے شاہ کار ہیں۔ یہی وہ ماہر فن خوش نویس ہیں جنھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ کی لوح اور اس کے مستقل صفحات کی سرخیاں لکھی تھیں۔(٨٤)

منشی محمد الدین کی وجہ شہرت محض فنِ کتابت میں طاق ہونا ہی نہیں تھی بلکہ انھوں نے اپنے کمالِ فن کے باعث دو ایسے کلام پاک تحریر کیے جو آج بھی خطاطی کی تاریخ میں محفوظ و یادگار ہیں۔

انھوں نے ایک ایسا قرآن مجید تحریر کیا جس کی ہر سطر ''الف'' سے شروع ہوتی ہے۔ یہ قرآن مجید امرتسر سے شائع ہوا۔ دوسرا قرآن مجید جو انھوں نے تحریر کیا اُس کی ہر سطر ''ک'' پر ختم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے متعدد کلامِ پاک تحریر کیے جو خطاطی کا عظیم الشان نمونہ ہیں۔(٨٥)

علاء الدین خالد ولد منشی عبدالقدیر دہلوی، لکھتے ہیں:

انھوں نے قرآن مجید کا ایک ایسا نسخہ بھی تیار کیا جس کی ہر سطر ''الف'' سے شروع ہوتی تھی۔ یہ نادر نسخہ ربیع الاول ١٣١٢ھ مطابق ١٨٩٤ء میں [ لالہ بلاقی داس کے مطبع انصاری پریس ] دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس کی صحت مفتی کفایت اللہ صاحب کی زیر نگرانی حافظ رحیم بخش صاحب، حافظ نجم الدین صاحب، حافظ اسمٰعیل خان صاحب، حافظ ذاکر بیگ اور حافظ عاشق علی صاحب مصححین نے کی تھی۔(٨٦)

مذکورہ بالا تحریر کے تسلسل میں علاء الدین خالد نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ''یہ نادر نسخہ لاہور کے عجائب گھر پنجاب پبلک لائبریری کی زینت ہے۔'' جب کہ علاء الدین خالد ہی ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ یہ نسخہ ان کے پاس محفوظ ہے۔(٨٧)

محمد راشد شیخ مصنفہ ''تذکرہ خطاطین'' کا بیان ہے کہ ان کا تحریر کردہ الفی قرآن مجید میور پریس دہلی سے ١٩١١ء

میں لالہ بلاقی داس نے چھاپا۔ جس کا ایک نسخہ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور کے شعبہء بیت القران میں محفوظ ہے اور ایک نسخہ کتب خانہء سالار جنگ، حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔ (۸۸) یقیناً یہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہوگا۔

۱۹۳۲ء میں جب کہ حکومت سعودی عرب اور مصر کے تعلقات کشیدہ تھے تو پہلی مرتبہ برصغیر کو غلاف کعبہ کی خطاطی کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس عظیم اور بابرکت کام کے لیے منشی محمد الدین کا انتخاب کیا گیا۔ یہ منشی محمد الدین اور ان کے خاندان کے لیے شرف و اعزاز کا باعث تھا۔

برنی اپنے والد کے اس کارنامے کا تذکرہ عظمتِ رفتہ میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اُجرت کے معاملے میں والد بہت بے پروا واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اشخاص پر رقمیں رہ گئیں۔ غلاف کعبہ کی تیاری کی سعادت ہندوستان کے حصے میں صرف ایک بار آئی اور اس غلاف، کعبہ پر قرآنی سورتیں والد نے لکھیں۔ والد نے چھ مہینے کی محنت شاقہ کے بعد غلافِ کعبہ تیار کیا تھا مگر انھیں اپنی محنت کا پھل نہ مل سکا۔ اس محنت کا معاوضہ سعودی حکومت نے اسمٰعیل غزنوی کو دیا تھا جسے وہ ہضم کر گئے۔ یہ آخری خدمت تھی جو خداتعالیٰ نے ان سے لی۔ اس کے بعد ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ (۸۹)

انھوں نے قصور اور علی گڑھ کی جامع مسجدوں میں باری تعالیٰ کے نام اور صورتیں بھی لکھیں۔ (۹۰) دہلی کے قطب مینار پر عبارات بھی انھی کے ہاتھ کی ہیں۔ (۹۱)

فنِ خوش نویسی میں مہارت، مسودے کا بہ غور مطالعہ، علم و فضل اور نیک سیرتی کے باعث اکثر اہل علم حضرات کو ان پر اس قدر اعتماد ہوگیا تھا کہ وہ ان کی اصلاح کو بلاچون و چرا تسلیم کرلیا کرتے تھے۔ (۹۲)

سید احمد دہلوی نے مولانا الطاف حسین حالیؔ کے انتقال پر ایک مضمون لکھا تھا، جو رسالہ ''تمدن'' دہلی کے شمارہ، مارچ ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ مولانا حالیؔ منشی محمد الدین پر کس قدر اعتماد کیا کرتے تھے اور ان دونوں حضرات کے تعلقات کیسے تھے۔ سید احمد دہلوی اُن کے صحیح قدردان تھے۔ انھوں نے منشی محمد الدین کو ''سرتاج خوش نویسانِ ہند'' کے پُرشکوہ لقب سے یاد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مرنے سے دو یا تین مہینے پیشتر [حالیؔ] دہلی میں تشریف لائے منشی کرم اللہ خاں صاحب کے مکان پر فروکش ہوئے۔ اس وقت دہلی میں تشریف لانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ آپ منشی محمد الدین صاحب سرتاج خوش نویسان ہند کے خط اور ان کی اغلاط سے پاک کتابت کو بہت پسند فرماتے تھے۔ منشی محمد الدین درحقیقت ایک نستعلیق اور زود فہم آدمی ہیں۔ دیوان کا جدید ایڈیشن لکھوا چکے تھے مگر سابقہ کلام و دیگر مضامین کا بھی جلد چھپوا دینا منظور خاطر تھا، گویا موت کی خبر لا چکے تھے۔ (۹۳)

منشی محمد الدین کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ انھوں نے اپنے تمام بچوں میں بھی اس فن کی تربیت کی، تاہم دو بچوں نے اس فن کو باقاعدہ اختیار کیا۔ ایک بیٹی اور دوسرے محمد یوسف۔ شاگردوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں تاہم چند شاگردوں کا ذکر ضیاء الدین احمد برنی نے عظمتِ رفتہ میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> خوش نویسی میں والد کے یوں تو سیکڑوں شاگرد ہوں گے مگر میں چند کے نام درج کرتا ہوں، نہ صرف اس لیے کہ انھوں نے فن خطاطی میں نام پیدا کیا بلکہ اس میں چار چاند لگا دیے اس ضمن میں سب سے پہلے میں اپنی بڑی ہمشیرہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے خط نسخ میں کمال پیدا کیا۔ دوسرے شاگرد میرے چھوٹے بھائی محمد یوسف ہیں، جو خط نستعلیق میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ دوسرے شاگردوں میں مفتی کفایت اللہ، نواب سراج الدین احمد خاں سائل، عبدالخالق، محمد فردوس، محمد برکت اللہ، نور احمد، شفاعت احمد، امام الدین وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔
>
> میرے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر نے بھی والد سے خوش خطی سیکھی تھی۔ بڑھاپے کے باوجو آج بھی ان کا خط بہت اچھا ہے۔ (۹۴)

ملا واحدی نے منشی محمد الدین کے شاگردوں کے حوالے سے لکھا ہے:

> منشی محمد دین کے لاتعداد شاگرد تھے۔ ان میں منشی محمد احمد سب سے نمایاں تھے۔ ابھی موجود ہیں۔ کراچی میں ہیں۔ اسّی سے اوپر عمر ہے۔ منشی عبدالمجید، منشی محمد یوسف ابن محمد دین کے شاگرد ہیں اور بہت کامیاب نام ور خوش نویس ہیں۔ (۹۵)

مولانا امداد صابری نے تاریخ صحافتِ اردو میں ان کے شاگردوں کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی تعداد کافی ہے تاہم چند قابلِ ذکر ہیں۔ اُن میں بیٹی فاطمۃ الکبریٰ اور بیٹے محمد یوسف دہلوی کے علاوہ عبدالخالق، محمد فردوس، برکت اللہ، نور احمد شفاعت احمد اور امام الدین وغیرہ (۹۶)

علاء الدین خالد نے ان کے دو اور شاگردوں منشی عبدالحمید محمد صدیق الماس رقم اور بے خود دہلوی کی نشان دہی کی ہے۔ (۹۷)

ان کی کتابت کی ہوئی متعدد کتابوں میں سے چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

> دیوانِ حالی (پہلا ایڈیشن)، الحقوق و الفرائض (پہلا ایڈیشن)، ادعیۃ القرآن، قرآن مجید (مترجمہ مولوی نذیر احمد)، حمائل شریف، رموز اعظم و اکمل، ''لکچروں کا مجموعہ'' (مصنفہ مولوی نذیر احمد)، لمعات نور، ترجمان القرآن (پہلا حصہ مولفہ مولانا ابوالکلام آزاد)، قصیدہ بردہ (مترجمہ مولوی محمد حسین خان عارف، جج ہائی کورٹ جموں

دکشمیر)، مرزا حیرت دہلوی کی ''خلافت عثمانی'' علاوہ ازیں ان کے آغا شاعر قزلباش کی بعض تخلیقات کی کتابت بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ (۹۸)

انھوں نے ملا واحدی کے نظام المشائخ کی کتابت ایک عرصے تک کی۔ مولانا محمد علی کے اخبار ''ہمدرد'' کی سرخیاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبارات ''الہلال'' اور البلاغ'' کی چھوٹی بڑی ساری سرخیاں انھی کے ہاتھ کا کمال ہیں۔ (۹۹)

## منشی محمد الدین کے تعلقات دہلی کے اکابر و مشاہیر سے:

منشی محمد الدین نے دہلی میں اپنے ورود کے ابتدائی زمانے ہی میں اپنے اخلاقِ کریمانہ اور کمالِ فن کے باعث بہت جلد دوستی اور اعتماد کی فضا پیدا کر لی تھی۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سکھ سپاہیوں کے رویے نے دہلی کے مسلمانوں کو پنجابی بولنے والوں سے برگشتہ کر دیا تھا۔

برنی ان کے تعلقات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> دہلی کا کوئی قابل اور فاضل شخص مشکل سے ایسا ہوگا جس سے والد صاحب کے مراسم نہ ہوں۔ ان حضرات میں مولوی نذیر حسین محدث دہلوی، میر شاہ جہاں، مولوی کرامت اللہ، مولوی تلطف حسین، قاری محمد اسمٰعیل میرٹھی، خواجہ عبدالرحیم، نواب محمد حسن خان، مولوی عبدالمجید، نواب فیض احمد خاں، مولوی عبدالحق (صاحب تفسیر حقانی) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔...... اسی طرح مشکل سے دہلی کا کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا ہوگا جو والد کے نام سے ناآشنا ہو۔ ویسے ان کے خصوصی دوستوں اور ہم مشربوں کا حلقہ محدود تھا لیکن جو کچھ بھی تھا ستھرے اور باذوق اشخاص پر مشتمل تھا۔
>
> والد کو جتنے مشاہیر قدر دان میسر آئے، اتنے غالباً کسی اور خوش نویس کو میسر نہ آئے ہوں گے۔ (۱۰۰)

مولانا امداد صابری نے ان کے تعلقات کے ذیل میں ایک مقام پر لکھا ہے:

> دہلی کا کوئی اہلِ علم ایسا ہوگا جس سے منشی صاحب کے مراسم نہیں ہوں۔ ان کے مولوی کرامت اللہ، مولوی عبدالحق صاحب تفسیر مقانی، قاری محمد اسماعیل میرٹھی میر شاجہاں، مولوی نذیر احمد، مولوی تلطف حسین، خواجہ عبدالرحیم، نواب محمد حسن خاں، نواب فیض احمد، مولوی عبدالمجید، مفتی محمد کفایت اللہ اور حکیم اجمل سے گہرے تعلقات تھے آپ ان حضرات کی محفلوں میں شرکت کرتے اور ان کی صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے۔ ان کی مقبولیت اس قدر تھی کہ دہلی کا تعلیم یافتہ ان کے نام سے واقف تھا۔ (۱۰۱) آغا شاعر قزلباش سے بھی اُن کے گہرے مراسم تھے۔ (۱۰۲)

## منشی محمد الدین اور غبارِ خاطر کا مقدمہ:

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری نے ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' میں ایک مقام پر یہ انکشاف کیا ہے کہ ابوالکلام آزاد نے اپنی معروف تصنیف ''غبارِ خاطر'' کا مقدمہ علاء الدین خالد کی خواہش واصرار پر تصنیف کیا۔

یہ وہ مقدمہ ہے جو شائقین ادب کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔اس پر مصنفہ کے طور پر حکیم اجمل خاں کا نام درج ہے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری نے مکاتیب ابوالکلام آزاد میں بہ عنوان ''ترتیب ومقدمہ'' مختلف مستند حوالوں سے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ یہ مقدمہ ''کلامِ ابوالکلام'' ہے۔اُن کے الفاظ اس طرح ہیں ''اس انکشاف کے بعد اگر ہم غبارِ خاطر کے مقدمے کا عنوان 'مولانا آزاد خود اپنی نظر میں' قرار دیں تو یہ حقیقت سے زیادہ قریب ہوگا۔'' (۱۰۳)

مولانا آزاد اور منشی محمد الدین کے مراسم وتعلقات کا تذکرہ قبلاً آچکا ہے۔ایک تو یہ سبب کے منشی صاحب نے آزاد کی تصنیف ''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد، طبع اوّل کی کتابت کی، ان کے اخبارات کی لوحیں اور سرخیاں لکھیں دوسرے یہ کہ مولانا آزاد ان کے علوم ومعارفِ قرآنی سے متاثر تھے۔اسی نسبت سے مولانا آزاد علاء الدین خالد کو بھی عزیز رکھتے تھے۔اس پر مستزاد علاء الدین خالد نے اپنے اخلاص اور نیازمندی سے مولانا کے دل میں جگہ پیدا کرلی تھی چناں مولانا آزاد علاء الدین خالد کی خواہش و اصرار کو رد نہیں کرسکے۔کہا جاسکتا ہے کہ مقدمہ غبارِ خاطر جیسی نادر تحریر منشی محمد الدین کے سبب سے وجود میں آئی۔

ایک مقام پر برنی نے اُن مراسم پر روشنی ڈالی ہے:

> مولانا آزاد سے والد کے گہرے مراسم تھے۔وہ ان تعلقات کا خاص خیال رکھتے تھے۔
> چناں چہ جب میرے بھتیجے علاء الدین خالد (حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی) نے ''غبارِ خاطر'' کے پہلے ایڈیشن کے چھاپنے کی اجازت چاہی تو مولانا نے انھی تعلقات کے پیشِ نظر انھیں دوسرے پبلشروں پر ترجیح دی۔(۱۰۴)

غالباً علاء الدین خالد کی ملکیت میں ''حالی پبلشنگ ہاؤس'' بھی منشی محمد الدین کے حالی مرحوم سے غیر معمولی تعلقات کے سبب سے آئی۔اسی ''حالی پبلشنگ ہاؤس'' دہلی سے ''غبارِ خاطر'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں پانچ ہزار کی تعداد میں شائع کیا گیا تھا۔ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایڈیشن ختم ہوگیا۔(۱۰۵) رائلٹی کے طور پر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے مولانا آزاد کو تیرہ ہزار تین سو تینتیس روپے پانچ آنے ادا کیے تھے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری نے اُس دور میں حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی کی جانب سے دی جانے والی رائلٹی کی قدر و قیمت کو کتنے اچھے الفاظ میں سراہا ہے:

> قلعہ احمد نگر کی قید و بند کی زندگی کے تین برس میں بیس مہینے نواب صدر یار جنگ مرحوم کی خیالی صحبت میں بسر ہوئیں۔غبار خاطر اس کی یادگار ہے۔پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں زمانہ قید کے انیس مکتوبات تھے۔رائلٹی کی رقم کو اگر انیس مکتوبات یا انیس صحبتوں پر تقسیم کیا

> جائے تو سات سو روپے سے زائد ہر صبح کی بزم آرائی کا حاصل ہوتا ہے اور اگر کتاب کی سطروں پر رائلٹی کو تقسیم کیا جائے تو تقریباً ڈھائی روپے فی سطر پڑتا ہے بس یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو کی کوئی کتاب اتنی مقبول نہیں ہوئی نہ کسی اردو مصنف نے غبار خاطر جیسی مختصر اور اپنی دوسرے درجے کی تصنیف کی اتنی بڑی قیمت حاصل کی ہوگی۔ (۱۰۶)

منشی محمد الدین اس اعتبار سے نہایت خوش قسمت تھے کہ انھیں مولوی ذکاءاللہ، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، مرزا حیرت، مولوی محمد حسین عارف منشی، سید احمد مؤلف فرہنگ آصفیہ، مفتی محمد کفایت اللہ، خواجہ حسن نظامی، آغا شاعر قزلباش اور علامہ مشرقی وغیرہ جیسے مشاہیر کی کتابیں کتابت کرنے کو ملیں۔ (۱۰۷)

## منشی محمد الدین کا صحافت اور سیاست سے تعلق:

منشی محمد الدین کا جس عہد سے تعلق تھا اس میں بالخصوص صحافت، سیاست اور ادب ساتھ ساتھ اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ اس امتزاج کی کئی مثالیں اسی دور سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور البلاغ'' محمد علی جوہر کا روزانہ'' ہمدرد''ملا واحدی کا'' نظام المشائخ'' آگے چل کر حسرت موہانی کے ''اردوئے معلیٰ'' اور مولانا ظفر علی خاں کے'' زمیندار'' نے اسی نوع کی مثالیں قائم کیں۔ یہ مثالی اخبار ہیں جنھیں صحافتی، سیاسی اور ادبی تینوں پہلوؤں سے اہمیت دی جاتی ہے۔

یہی وہ دور ہے جس میں کوئی ذی شعور، حساس اور غیرت مند مسلمان اپنے اظہار جذبات کے بہ غیر نہیں رہ سکا۔ منشی محمد الدین محض ایک نیک سیرت مسلمان ہی نہیں تھے بلکہ ذی فہم اور پر جوش ہونے کے علاوہ نہ صرف قوم کے سماجی اور سیاسی مسائل سے پورے طور پر آگاہ تھے بلکہ اس کے اظہار کی قوت بھی رکھتے تھے۔ اگر چہ وہ کوئی با قاعدہ صحافی، سیاست داں یا ادیب تو نہیں تھے تاہم ان تینوں میدانوں میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا مقدور بھر اظہار ضرور کیا اور واضح کر دیا کہ وہ اسلام اور ملت اسلامیہ کی مخالف قوتوں کو جواب دینے کی بھر پور صلاحیت رکھتے ہیں۔'' دارالعلوم'' بند ہو جانے کے بعد بھی وہ اخبارات کے مطالعے اور ملکی حالات سے باخبر رہ کر اپنے شوق کی تکمیل کرتے رہے۔

جنگِ عظیم اوّل ۱۹۱۴ء کے بعد پوری دنیا ایک ہیجان اور کشمکش کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ ہر مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ فروغ پا رہا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی غلامی کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ بھی آزادی کے لیے کوشاں اور سرگرم تھے۔ ضیاءالدین احمد برنی نے اس صورتِ حال پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> ۱۹۱۷ اور ۱۹۱۸ کے دو سال سارے ہندوستان کی تاریخ میں بہت ہی ہنگامہ پرور تھے۔ جنگ کی وجہ سے ویسے کافی ہیجان موجود تھا۔ ٹرکی کی شرکتِ جنگ نے مسلمانوں میں تردد پیدا کر دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ ترکی کے مستقبل کے بارے میں بہت مشوش تھے۔ ادھر ملک کا ایک بڑا طبقہ حکومت ہند کی جنگی پالیسی سے سخت ناراض تھا اور کوشاں تھا کہ حکومت کلک کے

مستقبل کے متعلق کوئی ایسا اعلان کرے جس کی بنا پر باشندگانِ ہند کی سیاسی تمنائیں بھی پوری ہو جائیں اور وہ جنگ میں مقدور بھر حصہ بھی لے سکیں۔(۱۰۸)

چند واقعات سے منشی محمد الدین کی ملکی سیاست میں دل چسپی ،حق گوئی اور دور اندیشی کا پتا چلتا ہے۔ وہ کبھی کبھی پبلک جلسوں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے اور تقریر بھی کیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ عربک ہائی اسکول دہلی کو کالج بنانے کے سلسلے میں سب سے پہلا جلسہ مسجد فتح پوری میں ہوا۔اس جلسے کی صدارت اس زمانے کے قومی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری اس جلسے کے صدر تھے۔ڈاکٹر انصاری نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا''اس کالج سے بڑے بڑے فضلا پیدا ہوں گے۔یہیں سے ابن رشد، امام غزالی اور ابن بیطار اٹھیں گے، وغیرہ''منشی محمد الدین نے اپنی تقریر میں کہا''یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس کالج سے غزالی اور ابن رشد کی قبیل کے فضلا پیدا ہوں گے۔ایسے فضلا کبھی کبھار دنیا میں آتے ہیں اور پیدا نہیں کیے جاتے۔ڈاکٹر صاحب کو یوں کہنا چاہیے کہ سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کے کل پرزے اسی کالج میں تیار کیے جائیں گے۔یہ کہنا دھوکا اور فریب ہے کہ یہ کالج اس لیے قائم کیا جا رہا ہے تا کہ یہاں سے غزالی، عمر خیام اور ابن رشد کے ہم پایہ فضلا پیدا ہوں گے۔''(۱۰۹)

۱۹۱۵ء میں علی برادران کی نظر بندی کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت بھی ڈاکٹر انصاری نے کی۔اس زمانے میں انگریز حکومت کا خوف اس قدر غالب تھا کہ احتجاجی جلسے شاذ ہوا کرتے تھے۔یہ جلسہ بھی بہت عرصے بعد ہوا اور وہ ایک صاحب کے مکان میں جس میں گنتی کے آدمی شریک ہوئے۔منشی محمد الدین نے اس جلسے میں بھی تقریر کی انھوں نے اپنی تقریر میں حکومت سے سوال کیا تھا کہ''ہمیں بتایا جائے کہ علی برادران کا قصور کیا ہے جس کی بنا پر انھیں نظر بند کیا گیا ہے۔''اس موقع پر انھوں غالب کے ایک شعر کے ذریعے حکومتِ وقت پر بھر پور طنز کیا تھا۔

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق  
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا (۱۱۰)

جب اس جلسے کی اطلاع چھندواڑا میں مولانا محمد علی کو ہوئی تو انھوں نے ضیاءالدین احمد برنی کو ایک خط میں لکھا ''اپنے بہادر باپ سے میرا سلام کہنا۔''(۱۱۱)

فنِ خوش نویسی اور ادب وصحافت سے وابستگی اور دہلی میں رہنے بسنے سے ان کی اردو زبان اس قدر اچھی ہو چکی تھی کہ وہ بعض مسودوں میں اصلاح دیا کرتے تھے اور اہلِ قلم ان کی اصلاح کو پسند کرتے تھے۔

مولانا امداد صابری نے ایک مقام پر اس پہلو کی جانب اس طرح اشارہ کیا ہے''مولانا الطاف حسین حالی کو تو منشی صاحب پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ ان کی ترمیم وتنسیخ کو بلا چوں وچرا قبول کر لیا کرتے تھے۔''(۱۱۲)

انھیں مطالعے کا شوق تھا۔وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا''الہلال'' نہ صرف باقاعدگی سے پڑھتے تھے بلکہ آزاد کے پرزور اداریوں پر خط کے ذریعے مبارک باد لکھ کر بھیجتے تھے۔(۱۱۳) مولانا محمد علی کا''ہمدرد'' اور مولانا ظفر علی خاں کا''زمیندار'' بھی ہمیشہ سے ان کے مطالعے میں رہے۔(۱۱۴)

### ہفتہ وار "دارالعلوم" دہلی، کا اجراء:

گزشتہ صفحات میں مرزا حیرت دہلوی کے ایک بیان سے یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ منشی محمد الدین کرزن پریس میں محض کتابت کا کام ہی نہیں کیا کرتے تھے بلکہ پریس کے متعدد کاموں پر مامور تھے جس میں مرزا حیرت کا اخبار "کرزن گزٹ دہلی" بھی شامل تھا۔ یقیناً ان میں صحافت سے دل چسپی اسی دوران پیدا ہوئی ہوگی اور تربیت کا سامان بھی یہیں سے مہیا ہوا ہوگا جس کی تکمیل انھوں نے اپنا اخبار "دارالعلوم" نکال کر کی۔

ضیاءالدین احمد برنی لکھتے ہیں:

> والد نے ۱۹۰۱ء میں "دارالعلوم" نام کا ایک ہفتہ وار علمی ادبی پرچہ نکالا تھا جو تقریباً تین سال تک جاری رہا۔ اس کے قلمی معاونین میں مولوی نذیر احمد، مولانا عبدالقدیر اور منشی سید احمد جیسے اکابر شامل تھے۔ اس اخبار میں مرزا حیرت کے مضامین کی تردید بھی چھپتی تھی۔ (۱۱۵)

برنی کے اس بیان کے برخلاف ملا واحدی نے ایک اور جواز "دارالعلوم" سے متعلق پیش کیا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ لکھتے ہیں:

> ڈپٹی نذیر احمد سے امراؤ مرزا حیرت ایک دفعہ الجھ پڑے تھے۔ مرزا حیرت کو جواب دینے کے واسطے منشی محمد دین نے ہفتہ وار اخبار جاری کر دیا۔ اس طرح وہ صحافیوں کی جماعت میں بھی شمار کیے جا سکتے ہیں۔ (۱۱۶)

ملا واحدی کے مذکورہ بیان سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ منشی محمد الدین کا صحافت کی جانب رجحان، محض مرزا حیرت اور ڈپٹی نذیر احمد کی رنجش سے پیدا ہوا۔ ممکن ہے کہ یہ بات درست ہو کیوں کہ منشی محمد الدین اور ڈپٹی نذیر احمد کے اچھے تعلقات رہے ہیں اور انھوں نے یہ برداشت نہ کیا ہو کہ ان کے دوست کے خلاف کوئی لکھے اور اسے جواب نہ دیا جائے۔ تاہم یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ منشی محمد الدین مرزا حیرت کے کرزن پریس میں کام کر چکے تھے۔ اس سے قطع تعلقی پر بھی غور کیا جا چکا ہے اور بعض واقعات کے پیشِ نظر ایک ہی سبب تک خیال رسائی کر سکا ہے، جس کے باعث منشی محمد الدین کو کرزن پریس چھوڑنا پڑا یعنی مرزا حیرت کی بدمزاجی۔ یقیناً مرزا حیرت اور منشی محمد الدین کے مزاج کے اختلاف نے ان کے درمیان رنجش کو جنم دیا ہوگا۔ چناں چہ ایک تو وہ رنجش اور دوسرے ڈپٹی نذیر احمد سے مرزا حیرت کے الجھ پڑنے نے اس رنجش کو دونا کر دیا ہو۔

ایک اور واقعے سے پتا چلتا ہے کہ ایک مرتبہ مرزا حیرت نے مسیح الملک حکیم اجمل خاں کو بھی کانٹوں میں گھسیٹنے کی کوشش کی تھی۔

ملا واحدی نے اس واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

> مرزا حیرت نے حکیم اجمل خاں اور ان کی پارٹی کے خلاف ایک محاذ قایم کر دیا تھا۔ مرزا حیرت بڑے طرار انسان تھے۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں

نے ٹھیک طریقے سے پڑھ لکھ لیا ہوتا اور اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال کیا ہوتا تو ہندوستان بھر میں ان کا جواب نہ تھا۔ مرزا حیرت نے اپنے اخبار کرزن گزٹ میں اجمل خاں پارٹی کے خلاف تابڑتوڑ مضامین شایع کیے۔ (۱۱۷)

ممکن ہے کہ ان واقعات کی ناپسندیدگی نے انھیں مجبور کیا ہو کہ وہ ان باتوں کا جواب دیں جو کرزن گزٹ میں ان کے اور ان کے دوستوں کے خلاف لکھی جاتی تھیں۔

مولانا امداد صابری نے کرزن گزٹ اور دارالعلوم کی باہمی مخالفت کی جانب بڑا واضح اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں ''مرزا حیرت ایڈیٹر کرزن گزٹ دہلی کے خیالات سے اس اخبار [دارالعلوم] کو اختلاف تھا اس لیے اس میں زیادہ مرزا حیرت کی مخالفت کی جاتی تھی غیر ملکی اور ملکی خبریں بہت کم شایع ہوتی تھیں۔'' (۱۱۸)

ملا واحدی نے منشی محمد الدین کے اخبار ''دارالعلوم'' میں شائع ہونے والا ایک شعر درج کیا ہے جس سے مرزا حیرت اور منشی محمد الدین کے درمیان اختلاف کا پتا چلتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

بنا مترجم قرآن پھرے ہے اتراتا ۔۔۔ وگر نہ شہر میں حیرت کی آبرو کیا ہے

(۱۱۹)

اسی طرح ایک مرتبہ کرزن گزٹ دہلی میں منشی محمد الدین کے خلاف ایک نظم شائع کی گئی۔ جس کا ایک مصرع یہ تھا۔ ع وہی تہبند گاڑھے کا جو پہلے تھا سو اب بھی ہے (۱۲۰)

اس ہفتہ وار اخبار کی کیفیت اور اس کے مزاج اور اس کی اہمیت کے متعلق امداد صابری ''تاریخِ صحافتِ اردو'' میں رقم طراز ہیں:

> دہلی حویلی اعظم خاں سے ۱۷، اکتوبر ۱۹۰۱ء کو یہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ جو ہر مہینے کی ۳، ۱۰، ۱۷، اور ۲۵ کو شائع ہوتا تھا۔ ابتداء میں چھوٹے سائز پر شائع ہوا۔ ۳ دسمبر ۱۹۰۱ء سے بڑے سائز پر آٹھ صفحہ پر نکلنے لگا۔ ایڈیٹر و مالک منشی محمد دین تھے۔ سالانہ چندہ دو روپے چار آنہ تھا۔ ناظر پریس دہلی حوض قاضی میں چھپتا تھا۔ مرزا حیرت ایڈیٹر کرزن گزٹ دہلی کے خیالات سے اس اخبار کو اختلاف تھا اس لیے اس میں زیادہ مرزا حیرت کی مخالفت کی جاتی تھی۔ غیر ملکی اور ملکی خبریں بہت کم شائع ہوتی تھیں۔ اس اخبار کو آزاد خیال تو نہیں کہا جا سکتا البتہ حکومت کی وفاداری کی آڑ میں صحیح بات کہنے سے نہیں چوکتا تھا۔......اس اخبار کے مضمون نگار ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شاہ عبدالقدیر اور مولوی سید احمد مؤلفِ فرہنگ آصفیہ تھے۔
>
> اس اخبار کی عمر تین سال کی تھی اس کے بعد بند ہو گیا (۱۲۱)

امداد صابری نے مذکورہ مضمون میں ''دارالعلوم'' سے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں۔ ان اقتباسات کی مدد سے مدیر

اخبار کی حق گوئی اور بے با کی نمایاں ہوتی ہے۔

علاءالدین خالد خلف منشی عبدالقدیر اس اخبار کے بند کیے جانے کے متعلق رقم طراز ہیں:

''دارالعلوم'' اور منشی صاحب کی شخصیت ایک ہی تصویر کے دو نام تھے۔ سامراجی اور ٹوڈی عناصر کی بیخ کنی دونوں کا نظریہ ءزندگی تھا..... یہ اخبار غیر ملکی سامراجیت کی دشمنی میں حکومت نے بند کر دیا اور پریس بحق سرکار ضبط ہو گیا۔ (۱۲۲)

دہلی کے مشہور اور بڑے پریسوں سے ان کا تعلق تھا۔ جن میں انصاری پریس، مطبع مجتبائی، افضل المطابع، مطبع فاروقی، میور پریس اور دہلی پرنٹنگ پریس قابلِ ذکر ہیں۔ (۱۲۳)

لاہور، ملتان اور دہلی کے پریسوں سے ان کے تعلقات کی نوعیت تو معاشی تھی مگر دارالعلوم، غنی المطابع اور الماس نامی پریس انھوں نے اپنی صحافتی اور سیاسی دل چسپیوں کے پیش نظر خود قایم کیے۔ اُن کی حق گوئی، بے باکی اور انقلابی فکر کے باعث ان کے پریس کئی مرتبہ انگریزی حکومت کی جانب سے ضبط بھی ہوئے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ان کا اخبار بھی ان کے انھی خیالات کے باعث ضبط ہوا۔ (۱۲۴)

## منشی محمد الدین کا انتقال:

ان کا انتقال ۱۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو دہلی میں ہوا۔ (۱۲۵) برنی صاحب کے گھر سے برآمد ہونے والی ڈائری، جس کے ضروری صفحات کی نقل راقم کے پاس محفوظ ہے اس طرح درج ہے ''۳۰ جنوری ۱۹۴۳ء مطابق ۱۲ محرم الحرام بہ روز ہفتہ ۱۰ بج کر ۱۰ منٹ پر ارون ہسپتال میں۔ صرف سات دن ہسپتال میں رہے اور آٹھویں دن [الفاظ پڑھے نہیں جا سکے] آ کا بھائی [منشی محمد الدین] اس وقت انبالہ جیل میں تھے۔ بھائی میاں بارہ بنکی اور چھوٹے بھائی میاں جھانسی۔ خالد [علاءالدین خالد] دفتر اور جمال [جمال برنی] چچی کو چھوڑنے اسٹیشن۔ [منشی محمد الدین کو] دہلی دروازہ کے باہر جیل کے سامنے نئے قبرستان [مہندیاں] میں سپرد خاک کیا گیا۔''

## حسن بیگم (ضیاءالدین احمد برنی کی والدہ):

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ منشی محمد الدین کی شادی کب ہوئی تاہم مطبوعہ تحریروں سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی بیگم کا نام حسن بیگم تھا اور ان کا تعلق تحصیل سنبھڑیال ضلع سیالکوٹ سے تھا۔

میمونہ اختر بنت منشی عبدالقدیر کے انٹرویو کا ایک اقتباس قبلاً نقل کیا جا چکا ہے اس میں حسن بانو یعنی ضیاءالدین احمد برنی کی والدہ سے متعلق ان کے الفاظ یہ ہیں:

ہماری دادی بزرگوں کے خاندان سے تھیں۔ ان کے والد سنبھڑیال ضلع سیال کوٹ میں پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ انھیں کئی علوم میں دست رس تھی۔ ہماری دادی قرآن پاک کی تلاوت

بہت ہی شان دار کیا کرتی تھیں۔۔وہ نہایت دین دار خاتون تھیں (۱۲۶)

ان سے متعلق کسی قدر تفصیل سے ضیاء الدین احمد برنؔی نے عظمت رفتہ میں لکھ دیا ہے۔مزید معلوم نہیں ہوسکا ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے۔وہ نہایت عبادت گزار تھیں باقاعدگی سے تلاوت کیا کرتی تھیں۔

وہ جس جس محلے میں رہیں باعث خیر و برکت رہیں۔انھوں نے محلے کی لڑکیوں کو قرآن مجید بھی پڑھایا۔ان کے گھر کی پاکیزگی کو پسند کیا جاتا تھا۔فقراء کی بے حد معتقد تھیں۔انھیں خواجہ نظام الدین اولیا (حضرت سلطان جی) سے گہری عقیدت تھی۔اسی عقیدت کا اثر تھا کہ انھوں نے خواجہ حسن نظامی کے خاندانی قبرستان میں دفن ہونے کو پسند کیا۔

اگرچہ ان کی تعلیم معمولی تھی تاہم اخبارات ورسائل ان کے مطالعے میں رہا کرتے تھے۔انھیں پنجابی زبان پر مکمل عبور تھا۔دہلی میں رہنے بسنے سے اردو بول چال بھی اچھی ہوگئی تھی۔وہ ان کے والد کی صحیح معنی میں بہترین رفیقِ حیات تھیں۔بچوں کو اچھی تعلیم دلوانے میں اپنے شوہر کی بھرپور مدد کی۔وہ ایک اچھی ماں ہی نہیں مثالی ساس بھی تھیں۔

انھیں اچار ڈالنے اور پراٹھے بنانے میں ملکہ حاصل تھا۔خواجہ حسن نظامی کو ان کے ہاتھوں کے پراٹھے مرغوب تھے۔برنؔی نے اکثر ایسی دعوتوں کا ذکر کیا ہے جس میں پراٹھے برنؔی کے گھر سے جایا کرتے تھے۔آخری عمر میں انھیں دمے کا مرض لاحق ہوگیا تھا جو ان کی موت کا باعث بنا۔ان کا انتقال ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو دہلی میں ہوا۔(۱۲۷)

دریافت شدہ ڈائری میں ان کے انتقال سے متعلق اس طرح لکھا ہوا ہے:

> ۱۳ رمضان المبارک ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۸ نومبر ۱۹۳۶ء بہ روز ہفتہ دوپہر ۲ بج کر ۲۵ منٹ پر والدہ صاحبہ نے اس جہان فانی سے کوچ کیا۔خواجہ مرزئی نظامی کے قبرستان درگاہ نظام الدین کے احاطہ میں سپرد خاک ہوئیں۔عظمتِ رفتہ میں ۳۰ نومبر ہے۔(۱۲۸)

## منشی محمد الدین کی اولاد:

شجرے (۱) کے مطابق منشی محمد الدین کی چھے اولاد تھیں۔جن کے نام عمر کی ترتیب سے درج کیے جاتے ہیں:

۱۔منشی عبدالقدیر دہلوی

۲۔فاطمۃ الکبریٰ

۳۔ضیاءالدین احمد برنی

۴۔آمنہ بیگم

۵۔منشی محمد یوسف دہلوی

۶۔محمد احمد

## منشی عبدالقدیر دہلوی:

ان کا اصل نام عبدالقدیر تھا۔ وہ ۱۸۷۵ء میں اپنے آبائی قصبے جنڈیالہ ڈھاب والا ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔(۱۳۰) اگر چہ ملا واحدی نے بھی ان کی ولادت پنجاب ہی کی لکھی ہے تاہم جگہ نشان دہی نہیں کی وہ لکھتے ہیں ''فقط منشی عبدالقدیر پنجاب نژاد ہیں باقی تمام اولاد دلی میں پیدا ہوئی۔'' (۱۳۱) ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے ایک طویل مضمون میں منشی عبدالقدیر کی زندگی کے چشم دید واقعات سے ان کے مرقعہ حیات تشکیل دیے ہیں۔ انھوں نے بھی منشی عبدالقدیر کی پیدائش پنجاب ہی کی لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں ''منشی جی جنڈیالہ ڈھاب والا تحصیل وزیرآباد ضلع گجرانوالہ [گوجرانوالہ] پنجاب کے رہنے والے ہیں کم عمری میں اپنے والد کے ساتھ دہلی آگئے۔'' (۱۳۲) عظمت اللہ سلیم نے اپنے انٹرویو میں منشی محمد الدین کے سسرالی خاندان میں ایک ایسی روایت کی نشان دہی کی ہے، جس کے تحت بچے کی ولادت میکے میں ہوتی ہے۔ چناں چہ ولادت سے کچھ عرصہ قبل لڑکیاں اپنے میکے چلی جاتی ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ منشی عبدالقدیر اور فاطمۃ الکبریٰ کی ولادت منشی محمد الدین کے سسرال سنبھڑیال، ضلع سیالکوٹ میں ہوئی۔ میمونہ اختر بنت منشی عبدالقدیر نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں، ان کی ولادت پنجاب ہی کی بتائی ہے تاہم جگہ کی نشان دہی وہ بھی نہیں کر سکیں۔ جب کہ محمد راشد شیخ نے اپنی تالیف ''تذکرۂ خطاطین'' میں ان کی ولادت دہلی کی تحریر کی ہے۔(۱۳۳) مذکورہ شواہد کی روشنی میں زاہدہ خاتون کے بیان کو فوقیت دی جائے گی۔

منشی عبدالقدیر منشی محمد الدین کے فرزندِ اکبر تھے۔ انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔(۱۳۴) میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ لیا ہی تھا کہ فوج میں ملازمت مل گئی چناں چہ تعلیم کو خیر باد کہ کر فوج میں چلے گئے۔(۱۳۵) اپنے مزاج بعض اسلامی عادات کے باعث بار بار انگریز افسران نے سزائیں دیں۔ انگریزوں سے نہ نبھ سکی۔(۱۳۶) خلیق انجم نے ان کی اخیر عمر کا حلیہ اس طرح تحریر کیا ہے:

> اسکول آتے جاتے اردو بازار میں ایک عجیب و غریب قسم کے سکھ بزرگ کو دیکھتا۔ سر سے پیر تک سفید براق، سفید پگڑی بلکہ پگڑ، سفید ڈاڑھی، سفید ابرو، چھوٹا سا قد گٹھا ہوا جسم، کھدر کا لمبا سا سفید کرتا اور سفید کھدر کی تنگ گھیر اور چھوٹی موری کی شلوار۔(۱۳۷)

اپنی ہم شیر کی طرح فن خوش نویسی میں وہ بھی اپنے والد کے شاگرد تھے۔ اگر چہ اپنے والد یا اپنی بہن فاطمۃ الکبریٰ اور بھائی منشی محمد یوسف دہلوی کی طرح کلیتاً اس فن کو اختیار تو نہیں کیا تاہم ایک زمانے میں کچھ عرصے کے لیے بہ طور پیشہ اسے اختیار کیا۔ ۱۹۰۱ء میں منشی محمد الدین نے ہفتہ وار اخبار ''دارالعلوم'' جاری کیا تو وہ والد کے ساتھ ان کے اخبار میں کام کرنے لگے۔ منشی عبدالقدیر کے فرزند علاء الدین خالد اس اخبار سے ان کی وابستگی اور صحافت سے دل چسپی کے متعلق لکھتے ہیں:

> اسی اخبار میں ان کے بڑے لڑکے منشی عبدالقدیر نے تربیت صحافت پائی۔ ان کے خون میں بھی حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ صداقت، بے باکی اور جراءت انھیں ورثے میں ملی تھی۔(۱۳۸)

۱۹۰۴ء میں محکمہ بندوبست میں ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۰۶ء میں مذکورہ ملازمت سے مستعفی ہو کر انڈین آرمی سے وابستہ ہو گئے۔(۱۳۹) جب کہ خلیق انجم نے ۱۹۰۸ء میں فوجی ملازمت سے وابستہ ہونا لکھا ہے۔(۱۴۰) پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴) کے دوران ۱۹۱۷ء میں فوج کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لیا۔ مذکورہ ملازمت کے دوران وہ انگلینڈ اور فرانس کے علاوہ چند اور ممالک میں بھی رہے۔(۱۴۱) فوجی ملازمت چھوڑتے وقت ایک انگریز افسر نے ہمدردی سے پوچھا ''آپ نوکری چھوڑ کر جا رہے ہیں، اب کیا کریں گے؟'' انھوں نے جواب دیا ''اب تک نوکر رہا ہوں اب نوکر رکھوں گا۔'' (۱۴۲) اس کے بعد انھوں نے کبھی ملازمت نہیں کی بلکہ اس کے مخالف ہی رہے۔(۱۴۳) ڈاکٹر اعظم چودھری لکھتے ہیں کہ وہ ''فوجی ملازمت چھوڑنے کے بعد دوبارہ اخبار ''دارالعلوم'' دہلی میں کام کرنے لگے۔'' (۱۴۴) جب کہ خلیق انجم لکھتے ہیں کہ فوجی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد انھوں نے خوش نویسی کا پیشہ اپنا لیا اور کچھ عرصے تک قطعے لکھ کر امراء و روٴسا کی خدمت میں پیش کرتے رہے۔(۱۴۵)

مندرجہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے انھوں نے اخبار ''دارالعلوم'' میں بھی کام شروع کر دیا ہو اور خوش نویسی کو بہ طور پیشہ بھی اپنا لیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے ''دارالعلوم'' میں بھی بہ طور خوش نویس کام شروع کر دیا ہو۔

۱۹۲۱ء میں انھوں نے مالی وسائل مجتمع کر کے ایک ہفتہ وار اخبار ''قاصد'' جاری کیا۔(۱۴۶) اس اخبار پر بہ طور ایڈیٹر منشی محمد یوسف کا نام درج تھا۔ امداد صابری اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> یہ روزنامہ اخبار ستمبر ۱۹۲۲ کو دہلی سے شائع ہوا۔ ۴ صفحوں پر مشتمل تھا۔ ایڈیٹر منشی محمد یوسف صاحب تھے۔ سالانہ چندہ آٹھ روپے تھا۔ فی پرچہ ایک پیسہ قیمت تھی۔ دارالعلوم پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوتا تھا۔
>
> یہ اخبار انگریزوں کے غلامی کے خلاف لکھتا تھا اور ملک کی آزادی کا زبردست حامی تھا۔ محمد یوسف صاحب جو اس اخبار کے ایڈیٹر تھے یہ منشی عبدالقدیر صاحب والاخوان کے بھائی ہیں۔ جنھوں نے ملک کی آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیا اور جیلوں میں عمر کا بڑا حصہ گزارا۔(۱۴۷)

مذکورہ کوائف کے بعد امداد صابری نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں ''مسئلہ گائے کشی'' پر اخبار کی رپورٹ پیش کی ہے۔ جس کے ذریعے انھوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کس نظریے کے تحت نکلتا تھا۔ امداد صابری خود آزادی کی تحریکوں میں حصہ لے چکے تھے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو منشی عبدالقدیر کے نام کے ساتھ ان کا نام آیا ہے۔

''قاصد'' کے مقاصد میں اس دور کی سرگرم تحریکوں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کی حمایت اور وکالت بھی شامل تھی لہٰذا اس اخبار کی طباعت سے عام مطابع گریز کرتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے ''غنی المطابع'' کے نام سے اپنا مطبع قائم کیا۔(۱۴۸) اخبار کے ساتھ ساتھ اس مطبع سے ایسے سیاسی لٹریچر کی اشاعت ہوتی تھی جو برعظیم کی آزادی یا مسلمانوں کے بین الاقوامی اور ملی معاملات سے متعلق ہوتا۔ ہندو مسلم اتحاد، ترکوں کی ہمدردی، تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات، کھدر کے فروغ،

ہندوستان کی مکمل آزادی اور ایسے ہی قومی مسائل میں عوامی نمائندگی کا اہم کردار ادا کرتا تھا۔(۱۴۹)

یہی زمانہ ہے جب وہ کانگریس سے وابستہ ہوئے۔ خلیق انجم لکھتے ہیں:

> جب اس کام (خوش نویسی) سے دل اچاٹ ہوا تو انھوں نے ایک پریس کھول لیا۔ اس زمانے میں وہ کانگریس میں شریک ہوئے اور پریس کا تمام خفیہ کام ان کے ذمے ٹھہرا۔ (۱۵۰)

وہ کانگریس ہائی کمانڈ ٹریبونل کے ۱۹۴۹ء تا ۱۹۶۹ء آنریری چیئرمین رہے۔(۱۵۱) مولانا ماہر القادری نے ان کی کانگریس سے وابستگی کو ایک جملے میں اس طرح واضح کیا ہے "سر سے پیر تک اور دل سے نگاہ تک 'کانگریس' بن کر رہ گئے تھے۔" (۱۵۲) ملا واحدی نے انھیں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور مسٹر آصف علی کا ہاتھ پاؤں قرار دیا ہے۔(۱۵۳)

قومی تحاریک میں شمولیت کے باعث انھیں قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ "قاصد" ان کے نظریات اور افکار کا ترجمان ہونے کے علاوہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا علم بردار تھا۔ قومی مسائل میں عوام کی ترجمانی و رہنمائی اس اخبار کا طرہء امتیاز تھا، چناں چہ حکومت وقت نے نہ صرف اس پر پابندیاں عائد کیں بلکہ اسے مکمل طور پر بند کر دیا اور پریس بحق سرکار ضبط کر لیا۔ منشی عبدالقدیر نظر بند کر دیے گئے۔ نظر بندی اور رہائی کا سلسلہ ہر تحریک آزادی سے وابستہ رہا۔(۱۵۴)

اخبار بند اور پریس "غنی المطابع" ضبط ہو جانے کے بعد انھوں نے ایک اور پریس "الماس پریس" قائم کیا مگر اخبار کے لیے ڈیکلریشن میں ناکامی کے سبب سے پریس بھی بند کرنا پڑا۔(۱۵۵)

حکومت کے اس سخت رویے کے باوجود ان کے عزم میں کسی طرح کا بھی ضعف پیدا نہیں ہوا بلکہ انھوں نے حکومتِ وقت کے خلاف احتجاج اور اپنے جذبات کا اظہار ایک نئے اور انوکھے انداز سے شروع کیا۔ اپنے خیالات عوام تک پہنچانے کے اس انوکھے انداز کے متعلق علاءالدین خالد لکھتے ہیں:

> آخر کار ۱۹۳۱ء میں انھوں نے ایک ایسی انوکھی ترکیب نکالی جس سے اپنے خیالات عوام تک موثر انداز میں پہنچ سکیں اخبار نکالا اور قانونی گرفت بھی نہ ہو سکی۔ اخبار نکالنے کے لیے پرنٹر ہونا ضروری ہوتا ہے، ایک طابع ہوتا ہے اور ایک ایڈیٹر۔ یہ سب قانون کے تحت حکومت کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ منشی عبدالقدیر نے ایک ٹھیلہ بنوایا جس پر پورا اخبار جلی خط میں خوش خط لکھ کر چسپاں کر دیا جاتا تھا۔ ہفتہ بھر کی چیدہ چیدہ خبریں ان پر تنقید، اداریہ، مضامین، فکاہات الغرض اس میں سب کچھ ہوتا۔ بعض اوقات کارٹون بھی ہوتے۔ بے پناہ مقبولیت کی وجہ سے اسے اشتہارات بھی ملنے لگے۔ اس اخبار کا نام "چلتا پھرتا اخبار" تھا۔ دہلی مسلم اوقاف کے قیام میں اس کے اداریوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

جمعرات کی رات کو اخبار ٹھیلے پر چسپاں کیا جاتا تھا اور نماز جمعہ سے دو گھنٹہ پہلے وہ شائع ہوتا یعنی وہ جامع مسجد پہنچتا۔ جہاں ایک مجمع اس کے استقبال کے لیے جمع رہتا۔ کوئی ایک شخص بلند آواز سے پڑھتا اور سینکڑوں لوگ کھڑے سنتے رہتے۔ روزانہ یہ چلتا پھرتا اخبار دہلی کے مختلف مقررہ علاقوں پر پہنچتا اور منتظر لوگ اسے پڑھتے۔ اس کی غیر معمولی مقبولیت نے حکومت کو پریشان کر دیا۔ بلا اجازت اخبار کی زبان بندی کے لیے کسی قانون کا سہارا ضروری تھا اور اخبار اور اس کا ایڈیٹر دونوں مروجہ قانون کی دست رس سے باہر تھے۔ نہ وہ کسی پریس میں چھپتا تھا اور نہ اس کا کوئی پرنٹر و پبلی شر ہی تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے ملازمین کو کئی بار مضامین نقل کرتے وقت عوام نے زدو کوب بھی کیا۔ حکومت اس ٹھیلے اور اس پر چسپاں اخبار کی تصاویر ثبوت کے لیے کھنچواتی مگر ماہرین قانون قابل دست اندازیِ قانون نہ پاتے۔ ٹھیلے بھی غائب کیے جاتے مگر نیا ٹھیلہ بن جاتا۔ بعض لوگ اسے جاری رکھنے کے لیے مالی اعانت کرنے لگے۔ آخر کار حکومت ہند نے منشی جی ہی کو گرفتار کر لیا اور اس طرح وہ نرالا ''چلتا پھرتا اخبار'' دو سال باقاعدگی سے چلنے کے بعد خود بہ خود بند ہو گیا۔ منشی جی رہا ہوتے رہے اور گرفتار ہو کر جیلوں میں حکومت کے مہمان بھی بنتے رہے۔ یہاں تک کہ برِ عظیم پاک و ہند آزاد ہوا۔ وہ دار و رسن کی آزمائشوں سے بڑی کامیابی اور شان و شوکت سے نکلے۔ ایسے ہی بزرگوں کے دم سے غلامی کو آزادی سے ہم کناری ہوئی۔ (۱۵۶)

خلیق انجم نے جنگِ آزادی میں ان کی پیہم اور جہدِ مسلسل کی کہانی اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کی ہے:

جنگِ آزادی میں ان کی جدوجہد کی کہانی بہت طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ انھیں بارہا جیل جانا پڑا اور عمر عزیز کا اچھا خاصا حصہ تنگ و تاریک کوٹھریوں کی نذر ہو گیا۔ آخری بار ان کی گرفتاری ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔ الزام یہ تھا کہ کانگرس کے ایک مخالف مولوی مظہرالدین کے قتل میں ان کا ہاتھ تھا۔ پانچ مہینے تک مقدمہ چلا اور منشی جی بری ہو گئے۔ (۱۵۷)

انھوں نے ایک مکتبہ ''میسرز عبدالقدیر والاخوان تاجران و ناشران کتب'' کے نام سے ۱۹۲۱ء میں دہلی میں قائم کیا، جو ۱۹۳۴ء تک قائم رہا۔ عبدالستار چودھری نے اس مکتبے سے متعلق لکھا ہے:

[ان کے پریس بہ حق سرکار ضبط ہو گئے] اب منشی صاحب نے پبلشنگ اور سٹیشنری کے کاروبار کے لیے ایک نئی فرم ''عبدالقدیر والاخوان'' کے نام سے جامع مسجد دہلی کے سامنے قایم کی اس فرم کی شہرت نے دہلی کے اس بازار کو بالآخر اردو بازار بنا ڈالا۔ (۱۵۸)

اسی طرح انھوں نے دہلی ہی میں، ۱۹۳۶ء میں ایک اور ادارہ ''خالد کمپنی'' کے نام سے قائم کیا، جو ۱۹۴۲ء تک قایم

رہا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے مضمون ''مولانا محمد علی جوہر کی تدفین اور سر شیخ عبدالقادر کی روایت'' میں منشی عبدالقدیر کو حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر، دہلی کا بانی اور مالک قرار دیا ہے۔(۱۵۹) یہ درست نہیں۔ علاء الدین خالد حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کے روح و رواں تھے۔(۱۶۰) علاء الدین خالد اپنے ایک انٹرویو میں بھی، جس کی تفصیل آگے آئے گی، لکھا ہے ''۱۹۴۵ء میں، میں نے مکتبہ [مکتبہء جامعہ] چھوڑا اور بدرالحسن مرحوم کے ساتھ حالی پبلشنگ ہاؤس میں کام شروع کر دیا۔''

منشی عبدالقدیر ۱۹۱۷ء میں فوج کی ملازمت ترک کر کے آزادیِ ہند جدوجہد میں عملاً شریک ہوگئے۔ انھوں نے نمایاں طور پر جن تحاریک میں حصہ لیا ان میں تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ آزادیِ ہند۔ وہ ہندو پاک کی آزادی تک برابر جدوجہد کرتے رہے۔ وہ ہندو اور مسلمان کے اتحاد کے قائل تھے اور اسی کے لیے کوشاں رہے۔ وہ انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔

انھیں اپنی جدوجہد کے دوران کئی بار جیل جانا پڑا۔ انھوں نے لال قلعہ دہلی، ڈسٹرکٹ جیل دہلی، نئی جیل دہلی، فروز پور، انبالہ، ملتان، لائل پور، اور اسپیشل جیل گجرات میں ایامِ اسیری گزارے۔(۱۶۱) قید و بند کا سلسلہ جاری تھا کہ ان ایسے جاں بازوں اور جاں نثاروں کی قربانیاں رنگ لائیں اور ہندوستان غیر ملکی تسلط سے آزاد ہوگیا۔ آزادی کے بعد منشی عبدالقدیر دہلی ہی میں رہے۔ زندگی کے اخیر ایام دہلی کی سیاسی و سماجی خدمت کرتے گزرے۔ خلیق انجم اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا وہ سیاست سے کنارہ کش ہوگئے۔ بغاوت منشی جی کا مسلک ہے۔ جب تک ہندوستان میں انگریز تھے وہ انگریزی حکومت کے خلاف رہے، بلکہ جنگِ آزادی میں جان ہتھیلی پر لیے رہے۔ جب ان کی محنت بار آور ہوئی اور انگریز ہندوستان سے چلے گئے تو منشی جی کانگریس کو ناپسند کرنے لگے۔ انھیں کانگریسی حکومت پر کیا اعتراضات ہیں؟ اس کا تو شاید انھیں خود بھی علم نہیں، لیکن کسی رو رعایت یا لاگ لپیٹ کے وہ ڈنکے کی چوٹ کانگریس کو برا بھلا کہتے ہیں۔(۱۶۲)

دہلی میں رہتے رہتے انھیں کوئی سات دہائیاں گزر گئی تھیں۔(۱۶۳) انھیں اپنے دہلوی ہونے پر فخر تھا۔ بعض لوگ کہا کرتے تھے کہ منشی جی سو سال بھی دہلی میں رہ لیں تب بھی دہلوی نہیں ہو سکتے اور ثبوت کے طور پر ان کے پہناوے یعنی شلوار کی جانب اشارہ کرتے۔(۱۶۴) حقیقتاً انھیں دہلی سے بہت محبت تھی۔ ان کا سارا خاندان ہندوستان سے پاکستان آ گیا۔ اگر وہ یہاں آ کر رہتے تو یہاں کس چیز کی کمی تھی مگر وہ دہلی کی محبت میں گرفتار رہے۔ کہا کرتے تھے ''جس ملک کو آزاد کرانے کے لیے میں جان پر کھیلا ہوں اسے چھوڑ جاؤں؟''(۱۶۵)

آخری زمانے میں وہ دہلی کے بوسیدہ مکان میں تنہا رہے مگر وطنِ عزیز ترک کرنا گوارا نہیں کیا۔(۱۶۶) عزیزوں سے ملنے پاکستان آتے رہے مگر واپس چلے گئے۔

ملا واحدی نے دلی سے ان کی شیفتگی کو کیسے دل پذیر الفاظ میں بیان کیا ہے:

موجودہ دلّی میں نمایاں مسلمان خالص دہلوی تو صرف چار ہیں۔ایک مسٹر نورالدین بیرسٹر،دوسرے میر مشتاق احمد،تیسرے حکیم عبدالحمید اور چوتھے خواجہ حسن ثانی ابن خواجہ حسن نظامی۔باقی نمایاں مسلمان یوپی اور صوبہ بہار کے ہیں۔یا دو پنجابی دلّی کے قطب بنے بیٹھے ہیں۔ایک منشی عبدالقدیر ابن منشی محمد دین خوش نویس دوسرے چودھری احمد بخش۔(۱۶۷)

منشی عبدالقدیر کے دلّی مرحوم سے عشق پر ملا واحدی کے ان الفاظ کا جواب نہیں۔منشی جی کے عشق کے لیے اس سے بڑی اور اتنی اچھی سند نہیں لائی جا سکتی:

حقیقتاً منشی عبدالقدیر صاحب پنجابیوں میں سب سے بڑھ کر دلّی کے عاشق تھے۔ان کے بیٹے لاہور اور کراچی میں مرفہ الحال ہیں مگر منشی عبدالقدیر صاحب دلّی کی خاطر درویشانہ زندگی گزارتے رہے۔

منشی عبدالقدیر کا مؤلد پنجاب تھا۔وضع قطع سے ٹھیٹھ پنجابی تھے لیکن دلی کے عشق کے معاملے میں ان سے میں آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔(۱۶۸)

منشی عبدالقدیر بہ یک وقت کتنے ہی اوصاف حمیدہ سے متصف تھے۔جیسا کہ اوپر یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ انھوں نے قومی تحریکات کے سلسلے میں قید و بند کی سعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔چناں چہ ایسے ہی ایک موقعے پر کہ امداد صابری بھی بہ حیثیت قومی کارکن ان کے ساتھ جیل میں تھے۔امداد صابری نے جہاں انھیں جیل کے اپنے اہم ساتھیوں میں شمار کیا ہے وہاں ان تمام اوصاف کو مختصراً نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

نڈر،حق گو،مصیبت سے محبت کرنے والے،جیل میں دوڑ دوڑ کے جانے والے،اصول پسند،پکے قوم پرست،محکومیت کے دشمن اور بہترین جغرافیہ داں ہیں۔ان سے جیل کے افسران پناہ مانگتے تھے۔دائم المریض ہیں اور جیل والوں کی غفلت سے کم زور ہو گئے ہیں۔(۱۶۹)

درحقیقت ان کی قومی خدمات اور ان کے جذبۂ جاں نثاری اور جاں فروشی،ان کی،زبانِ اردو سے شدید محبت اور اس پر ان کی زبان دانی،ان کا دہلی سے چمٹے رہنا اور اپنے بچوں اور عزیزوں کی محبت پر ترجیح دینا،یاد رکھے جانے کے قابل ہیں۔

زاہدہ خاتون بنتِ ظہیر الدین بن منشی عبدالقدیر نے لکھا ہے کہ''سودیسی تحریک کے باعث انھوں نے ہمیشہ کھدر پہنا۔انگریزوں سے مخالفت کا یہ عالم تھا کہ گھر میں جتنا بدیسی مال اور کپڑا تھا سب کو آگ لگا دی۔اردو تحریک میں شمولیت کے اور اردو سے اپنی محبت کے باعث گھر میں اور باہر اردو بولا کرتے تھے۔گھر میں کسی کو ہندی،پنجابی بولنے کی اجازت نہیں تھی سب اردو بولتے تھے۔''(۱۸۰)

''ایک مہذب اور کڑھے ہوئے سماجی کارکن اور انسانیت کے ایک نیک نام اور نام ور خادم'' (۱۸۱) کی زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہونی چاہیے۔ ''انتقال سے کچھ عرصہ قبل ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ دہلی کے بسمہ اللہ ہوٹل والے نے نگہ داشت کی تاہم جاں بر نہ ہو سکے۔'' (۱۸۲) ۲۵ جنوری ۱۹۶۹ء بہ وقت صبح ۴ بجے، بہ ہمدرد کلنک یزدانی ترکمانی دروازہ، میں خالق حقیقی سے جا ملے اور تدفین قبرستان نزد کوٹلہ فیروز شاہ بیرون دہلی دروازہ، دہلی میں ہوئی۔ (۱۸۳)

سید محمد ارتضی دہلوی (م:۱۹۷۶ء) معروف بہ ملا واحدی، ضیاءالدین احمد برنی اور منشی عبدالقدیر کے دوستوں میں سے تھے۔ ایک مقام پر انھوں نے اپنے دیگر دوستوں کے علاوہ، جنھیں وہ ۱۹۴۷ء کی ہجرت کے بعد دہلی میں چھوڑ آئے تھے، منشی عبدالقدیر کو یاد کرتے ہوئے یہ شعر اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے پیش کیا ہے۔

جیسے تیشے سے کوئی ٹکڑے کرے فولاد کے
اس طرح کاٹے ہیں ہم نے دن تمھاری یاد میں (۱۸۴)

انھوں نے ۹۴ سالہ زندگی میں آٹھ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے:

ارضِ فلسطین، جیل میں دو برس، تاریخ آزاد ہند فوج، کشمیر جنت نظیر، نقشہ جنگِ افغانستان، نقشہ جنگِ حبشہ اٹلی، خان بہادر کا جنازہ اور تسہیل الاملا، بیس جلدوں پر مشتمل اردو لغت کی تیاری ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشن تھا۔ افسوس کہ وہ نامکمل رہا اور زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ (۱۸۵)

## ظہیرالدین احمد:

بشیرالدین سے چھوٹے ظہیرالدین تھے۔ ظہیرالدین احمد ۱۹۱۱ء میں جہلم میں پیدا ہوئے۔ وہ انڈین ریلوے میں ملازم تھے۔ یہ ملازمت ضیاءالدین احمد برنی کو کوششوں سے حاصل ہوئی تھی۔ ان کی تعلیم و تربیت پر بھی برنی نے بڑی توجہ صرف کی تھی۔ ان کی شادی ضیاءالدین احمد برنی کی سالی سعیدہ بیگم سے ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں بھی برنی کی کوششوں کو دخل تھا۔ سعیدہ بیگم کا انتقال کراچی میں ۱۹ فروری ۱۹۸۶ء کو ہوا۔ وہ ڈیفنس کے قبرستان میں دفن ہیں۔ (۱۸۶)

صفدر ادیب اور عبدالستار چودھری کی تحریروں (۱۸۷) سے پتا چلتا ہے کہ ظہیرالدین احمد نہایت بلند اخلاق کے حامل شخص تھے۔ ان کی مہمان نوازی مثالی ہوا کرتی تھی۔ چوں کہ اردو صحافت اور اشاعت سے ان کے خاندان کا بڑا قدیم رشتہ تھا چناں چہ ظہیرالدین احمد نے بھی نہایت خوبی اور جوش و خروش سے اشاعتی کام کا آغاز کیا ''ذکر حالی'' پہلی کتاب اردو مرکز سے شایع کی جس کی کتابی دنیا میں بہت دھوم ہوئی اور انھیں بہت داد ملی۔ اردو مرکز کا کام بعض وجوہ کی بنا پر جاری نہیں رہ سکا چناں چہ بند کرنا پڑا۔ ان کا انتقال لاہور میں ۱۲ ستمبر ۱۹۷۳ کو بہ وقت ۳ بجے دن حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب ہوا۔ گلبرگ لاہور کے قبرستان میں آسودہء خاک ہیں۔ ان کی اولا گوجرانوالہ میں آباد ہے۔

## صلاح الدین احمد:

صلاح الدین احمد سے متعلق معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب سے اتنا معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے خواجہ حسن نظامی پر تحقیقی کام کا ارادہ کیا تھا بہت سا مواد خواجہ حسن ثانی نظامی سے دہلی سے منگوایا بھی گیا تھا مگر وہ اسے کر نہیں سکے۔

## علاءالدین خالد:

علاءالدین خالد (۱۹۲۰ء۔۱۹۹۸ء) نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں تعلیم حاصل کی۔(۱۸۸) بہ حیثیت استاد پہلی ملازمت بھی جامعہ ملیہ ہی میں کی۔۱۹۳۸ تک جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔(۱۸۹) اس کے بعد وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے اصرار پر جامعہ کے نشرو اشاعت کے ادارے ''مکتبہ جامعہ'' سے وابستہ ہوگئے۔اس وقت حامد علی خاں انتظامی امور دیکھا کرتے تھے۔۱۹۳۹ء میں عارضی طور پر مکتبہ کی تمام تر ذمے داری انھی کے سپرد ہوگئی۔۱۹۴۴ میں ان کی ذمے داریاں مکتبہ کی جامع مسجد کی دکان میں منتقل کردی گئیں۔کتابوں کی فروخت بڑھانے کے لیے وہ دہلی کی گلیوں میں گھر گھر جا کر کتابیں فروخت کیا کرتے تھے۔(۱۹۰)

۱۹۴۵ء میں انھوں نے مکتبہ جامعہ چھوڑ کر حالی پبلیشنگ ہاؤس دہلی کے تمام حصص خرید لیے اور نشرو اشاعت کا کام شروع کردیا۔تقسیم برصغیر کے بعد علاءالدین خالد اپنے بھائیوں اور بہن کے ساتھ پاکستان آگئے۔انھوں نے کراچی میں اردو اکیڈمی سندھ کے نام سے اشاعتی ادارہ قایم کیا۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں کراچی شہر کے ناشران وتاجرانِ کتب نے اپنے مسائل کی تفہیم اور ان کے حل کے لیے باہمی ربط وتعلق سے ایک انجمن ''انجمنِ ناشران وتاجرانِ کتب، کراچی'' قائم کی۔اس انجمن کے بنیادی ارکان میں ضیاءالدین احمد برنی، علاءالدین خالد، حافظ وصی اشرف، سراج الدین ظفر، رازق الخیری، ارشاد احمد اور کرمانی کے نام لیے جاتے ہیں۔(۱۹۱) ارکانِ انجمن کو متحد کرنے، ان کے اصل مقاصد اور مسائل کو سامنے لانے کے علاوہ علم وادب کی ترویج واشاعت کی غرض سے، بہ طور نقیبِ انجمن دسمبر ۱۹۵۵ میں علاءالدین خالد اور ضیاءالدین برنی کی کوششوں سے ماہنامہ ''کتابی دنیا'' گیدول لیکھراج روڈ، کراچی سے جاری کیا گیا۔اس کے ناشر ضیاءالدین احمد برنی اور طابع فیروز سنز تھے۔ابتداء میں ۱۶ صفحات پر شائع ہوتا تھا۔وقتاً فوقتاً ان میں اضافہ ہوتا رہا۔قیمت فی پرچہ ایک آنہ تھی اور سالانہ چندہ ایک روپیا۔رسالے کا اداریہ علاءالدین خالد ہی لکھا کرتے تھے۔برنیؔ کے انتقال کے بعد علاءالدین خالد کی ادارت میں رسالہ نکالا مگر وہ برنیؔ جیسا تسلسل برقرار نہیں رکھ سکے۔

آخر وقت تک علاءالدین خالد کا تعلق علم وادب سے رہا۔تدریسی، علمی اور ادبی کتابوں کی چھپائی اور تقسیم کے حوالے سے ان کی بڑی خدمات ہیں۔ان کا تعلق جس گھرانے سے تھا اس حوالے سے ان کے بھی علمی وادبی اور خاص طور پر تعلیم کے موضوع پر متعدد مضامین رسائل میں بکھرے پڑے ہیں ضرورت ان کے جمع کیے جانے کی ہے۔

## میمونہ بیگم:

میمونہ اختر منشی عبدالقدیر کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ وہ علاء الدین خالد سے چھوٹی ہیں۔ لاہور میں مقیم ہیں۔ اس باب کے اختتام پر راقم کا لیا ہوا ان کا انٹرویو دیکھا جاسکتا ہے جو لاہور میں ان کے گھر پر لیا گیا تھا۔

## فاطمۃ الکبریٰ:

منشی محمد الدین کی سب سے بڑی صاحب زادی ہیں۔ ان کا اصل نام فاطمۃ الکبریٰ تھا تاہم آپا یا بڑی آپا کے نام سے مشہور تھیں۔ وہ اپنے ننھیال سمبڑیال (ضلع) سیالکوٹ میں ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئیں۔ (۱۹۲) ان کی ابتدائی تعلیم کے متعلق معلوم نہیں ہوسکا۔ خیال ہے کہ انھوں نے جتنی بھی تعلیم حاصل کی گھر ہی پر حاصل کی ہوگی۔ ایک تو اس زمانے کے تقاضے کہ لڑکیوں کو باہر پڑھنے کے لیے بھیجنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، اس پر مستزاد ان کا گھرانہ بھی اس طرز کی تعلیم کا قایل دکھائی نہیں دیتا۔ (۱۹۳) سمبڑیال ہی کے ایک شریف گھرانے کے فرد سردار محمد سعید سے ان کی شادی ہوئی (۱۹۴)۔ محمد سعید انڈین ریلوے میں ملازم تھے۔ چناں چہ انھیں اپنی ملازمت کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں قدرت کی طرف سے اولاد کی نعمت عطا نہیں ہوئی۔ منشی عبدالقدیر کی بیٹی میمونہ اختر (میمونہ آپا) کو بچپن میں گود لے لیا تھا۔ ان کی پرورش اپنی اولاد ہی کی طرح کی۔ وہ جہاں جہاں رہیں میمونہ اختر بھی ان کے ساتھ رہیں (۱۹۵) جب وہ بڑی ہوئیں تو ان کی شادی بڑے اہتمام سے سیالکوٹ کے ایک شریف گھرانے کے ایک لائق رکن حکیم غلام حسین قریشی، مستند طبیہ کالج دہلی، سے کردی۔ (۱۹۶) بہ قول میمونہ اختر:

> جب میں تقریباً ایک سال کی تھی کہ میری والدہ فوت ہوگئیں۔ پھوپھی صاحبہ نے جنھیں سب بڑی آپا کہتے تھے، مجھے تو پہلے ہی گود لے لیا تھا۔ اب میرے (بن ماں کے) بھائیوں کے ساتھ بھی ان کی شفقت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوگیا۔ بڑی آپا کتابت کے علاوہ کپڑے پر کڑھائی کے فن میں بھی ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ نواب سراج الدین احمد خاں سائل نے (جو خود بھی کڑھائی کے فن میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے) بڑی آپا کی کڑھائی کے بے حد مداح تھے بڑی آپا نے مجھے بھی کتابت اور کڑھائی کے فن سکھائے۔ نواب سائل نے ایک مرتبہ میری کڑھائی دیکھی تو بہت خوش ہوئے اور اس کی بہت تعریف و تحسین کی۔ بڑی آپا بہت پرہیزگار اور دردمند خاتون تھیں اور مخلوقِ خدا کی خدمت کرنے میں روحانی مسرت محسوس کرتی تھیں۔ اپنے غریب رشتہ داروں اور دوسرے حاجت مندوں کی اس طریقے سے مدد کیا کرتی تھیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ (۱۹۷)

۱۹۳۳ء میں سردار محمد سعید کا انتقال ہوگیا۔ (۱۹۸) شوہر کے انتقال کے بعد اپنے والد منشی محمد الدین کے گھر دہلی آگئیں۔ باقی تمام عمر انھوں بیوگی ہی میں گزاری۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے بعد یہ خاندان بھی دہلی سے کراچی ہجرت کرگیا چناں چہ بھی دہلی سے کراچی آگئیں۔

کو ابتدائی عمر ہی سے سماجی اور انسانی بہبود کے کاموں سے دل چسپی رہی تھی۔ انھوں نے اس عہد کی فلاحی کاموں

اور تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔(۱۹۹) ان کے ساتھ جن خواتین نے ان کاموں میں حصہ لیا ان میں لیڈی سر عبدالقادر اور بیگم اکرام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

انھوں نے اسلامی تعلیمات کے فروغ کے لیے زندگی وقف کر رکھی تھی۔ وہ انگریزی سامراج کی شدید مخالف تھیں۔ ان کی عمرِ عزیز کے آخری تیس سال دین اسلام کی تبلیغ میں گزرے۔(۲۰۰)

انھیں ننھیال اور ددھیال دونوں جانب سے دین داری، پاک بازی اور خدمتِ خلق جیسے اوصافِ حمیدہ ورثے میں ملے۔ اس پر ان کی تربیت وطبیعت نے ان میں طہارت، عبادت گزاری، خداترسی، فیاضی اور انسانی ہمدردی جیسی اعلا انسانی خصوصیات درجہ کمال پر پہنچادیں۔ وہ پردے کی سخت پابند تھیں۔

فنِ خوش نویسی میں اپنے والد منشی محمد الدین کی شاگرد تھیں۔ انھوں نے جس عہد میں نام پیدا کیا اس زمانے میں فن خوش نویسی میں بڑے بڑے باکمال ہندوستان اور خاص دہلی میں موجود تھے۔ محترمہ کے نسوانی قلم کی لچک نے خطِ نسخ کو ایک خاص حسن ورعنائی بخشی جو اعجاز تصور کی گئی۔(۲۰۱)

ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تین حمائل شریف طبع ہوچکی ہیں۔ ایک ''فتح الحمید'' کے نام سے مشہور ہوئی، دوسری ان کے ایک عزیز نے طبع کروائی تھی۔ تیسری انھوں نے خود چھپوائی۔ ان کے علاوہ انھوں نے بہت سے پنجسورے اور دہ سورے بھی لکھے تھے اور بہت سے قرآن مجید ان کے قلم سے تحریر ہوئے۔(۲۰۲) ۱۳۵۴ھ میں شاہ عبدالقادرؒ کے اردو ترجمے اور موضح القرآن کے ساتھ انھوں نے حمائل شریف خود لکھی اور خود ہی شائع کی۔ اس حمائل کی فنی خوبیوں کی وجہ سے مکتبہء جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اسے اپنی مطبوعات میں شامل کرلیا تھا۔(۲۰۳)

علاءالدین خالد مرحومہ کی قدردانی اور عزت افزائی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ایک اور موقعے پر کہ جب ۱۹۲۷ء میں میر عثمان علی خاں نظام دکن ''نظام پیلس'' کے افتتاح کے لیے نئی دہلی جارہے تھے تو راستے میں جھانسی [ان دنوں میں مرحومہ کے شوہر سردار محمد سعید تبادلہ ہوکر جھانسی میں قیام پذیر تھے] ریلوے اسٹیشن پر ٹرین رکواکر شرف باریابی بخشا۔ محترمہ نے سونے کے پانی سے اپنے لکھے ہوئے قطعات اور پنج سورہ شریف پیش کیا۔ ہزاگزالٹڈ ہائی نس نے ان کے فن کی پذیرائی کرتے ہوئے تاحیات گراں قدر ماہانہ وظیفہ مقرر فرمایا۔
>
> اسی طرح ہر ہائی نس بیگم سلطان جہاں والی بھوپال سے جب مرحومہ کی ملاقات ہوئی تو ہر ہائی نس نے از راہ قدردانی اپنی قیمتی جڑاؤ پہنچیاں ان کے ہاتھ میں پہنادیں ساتھ ہی وظیفہ بھی جاری کیا۔(۲۰۴)

حقیقت میں برعظیم کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے بہ طور خطاط اور قرآن نویسی میں اتنا نام کمایا۔(۲۰۵) انھیں،

اعتراف فن کے طور پر متعدد مرتبہ نقرئی اور طلائی تمغوں سے نوازا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ۱۹۱۸ء میں سورت، ۱۹۲۸ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور اور دیگر اسلامی اداروں کی جانب سے۔ اسی طرح ریاست ہائے ٹونک، دتیہ، مانا ودار، مانگرول، جونا گڑھ وغیرہ نے بھی ازراہ خسروانہ ہمت افزائی کی۔ (۲۰۶) ان کے بھانجے علاءالدین خالد ان کی آخری تمنا، کمالِ فن اور تکمیلِ تمنا کے متعلق رقم طراز ہیں:

> موصوفہ کی تمنا تھی کہ وہ معریٰ کلام پاک جلی حروف میں اس طرح لکھیں کہ وہ روایتی اسلوب نگارش کا بھی حامل ہو اور ساتھ ساتھ قاری کے پڑھنے میں بھی آسانی کا موجب ہو۔ معریٰ اور جلی قلم میں یہ کلام پاک مع آٹھ پاروں کے ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے جو ۱۹۴۷ء میں اس وقت پایہء تکمیل کو پہنچے جب دہلی کو انسانیت سوز فسادات نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ دلی کے اجڑنے کے ساتھ محترمہ بھی اپنے چھوٹے بھائی مشہور زمانہ استاد محمد یوسف کے ساتھ پاکستان ہجرت کر کے کراچی چلی آئیں (۲۰۷)۔ سالہا سال کی محنت شاقہ سے کتابت کردہ مذکورہ قرآن پاک کی کاپیاں اور پلیٹیں دلی پرنٹنگ ورکس میں خوش قسمتی سے محفوظ رہیں جو پاکستان ہائی کمیشن کے ذریعے پہنچ گئی ہیں۔ یہ نادر تحفہ جلد ہی اردو اکیڈمی سندھ کے زیر اہتمام زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آجائے گا۔ (۲۰۸)

راقم جب ۱۱ر اپریل ۲۰۰۶ء کو گوجرانوالہ کے علمی دورے پر تھا تو منشی محمد الدین کے گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا بھی خصوصی طور پر گیا۔ وہاں ان کے خاندان کے افراد کے پاس مرحومہ کی وہ حمائل شریف دیکھنے کی سعادت حاصلہ ہوئی جس پر تکمیل کا ۱۳۵۲ھ درج ہے۔ اندرون سرورق پر عنوان اس طرح ہے:

''مترجم حمائل شریف محشیٰ مع فوائد موضح القرآن'' مقام اشاعت ہے ''مکان نمبر ۹۴ چھتہ لعل میاں دہلی، ناظم اشاعت علاءالدین خالد''۔ اس حمائل کے متعلق اپنے خیالات انھوں بہ عنوان التماس حمائل کے آخر میں پیش کیے ہیں وہ لکھتی ہیں:

> مدت مدید کے بعد آج مجھے اس امر کی سعادت نصیب ہوئی ہے کہ میں خود اپنے ہاتھ کی حمائل شائع کروں۔ ہر چند کہ اس سے قبل میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی حمائل شائع ہو چکی ہے لیکن میری دیرینہ آرزو کہ میں خود اس کی اشاعت کی ذمے دار بنوں۔ خدا کے فضل و کرم سے صرف اب پایہء تکمیل کو پہنچی ہے اور میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ خدا نے اپنے کلام کی طباعت کے سلسلے میں مجھ سے یہ خدمت لی۔
>
> منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنم　　　منت شناز ازو کہ بہ خدمت گذاشت
>
> قرآن کریم کی اشاعت کی صرف ایک غرض ہوا کرتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان امر و نواہی سے واقف ہو جائیں اور اپنی زندگیوں کو خدائی تعلیم کے مطابق ڈھال لیں۔ خدا کرے کہ اس

حمائل شریف کی اشاعت سے یہ فرض بہ درجہ اتم پورا ہو۔

اس حمائل میں جو ترجمہ دیا گیا ہے وہ حضرت مولٰنا شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ہے اس کے بارے میں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی اولیت کے اعتبار سے دوسرے تراجم سے کس قدر فوقیت رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی زبان آج کی زبان سے ذرا مختلف ہو لیکن کلام خدا کو جس طریقے سے انھوں نے پیش کیا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ اس حمائل شریف کو پڑھتے وقت اپنی دعاؤں میں مجھے بھی یاد رکھیں۔

ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ الفقیر ۃ الفانیہ

چھتہ لال میاں دہلی (بنت منشی محمد الدین صاحب خوشنویس) (۲۰۹)

اسی حمائل شریف کے متعلق علاء الدین خالد قدر تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں:

۱۳۵۲ھ میں شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے اردو ترجمے مع موضح القرآن انھوں نے حمائل شریف نہ صرف یہ کہ خود لکھی بلکہ خود ہی شائع کی تھی۔ اس طرح وہ پہلی ''خاتون ناشر قرآن'' بھی تھیں۔ (۲۱۰)

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد اور خان بہادر منشی ذکاء اللہ جیسے نابغہ روزگاران کے کمال فن کے بے حد مداح اور قدردان تھے۔ (۲۱۱)

رفیق خاور نے اپنے مضمون سفیر خیال، خطاطی میں مرحومہ کے اوصاف وکمالات پر اس طرح روشنی ڈالی ہے ''منشی محمد یوسف کی ہمشیرہ اپنے نام کی عظمت کے ساتھ فن کی عظمت اور تابانی لیے ہوئے ہیں۔'' (۲۱۲)

سید یوسف بخاری نے اپنی تصنیف ''خطاطی اور ہمارا رسم الخط'' میں مرحومہ کے فن پر مختصراً اظہار خیال فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

موجودہ دور ترقی میں ہماری خواتین بھی مردوں کے دوش بہ دوش نظر آتی ہیں۔ بالخصوص شعر و ادب میں لیکن فن خطاطی میں مخدرات تیموریہ کے سوا آپ نے اب تک کسی خاتون کا نام نہ سنا ہوگا۔ اس فن لطیف میں بھی ہمارے پاکستان میں دو باکمال خوش نویسہ موجود ہیں۔ اول یوسف صاحب کی حقیقی بہن دہلوی ہیں جو خط نسخ میں قرآن مجید لکھتی ہیں۔ (۲۱۳)

مرحومہ نے ۸۴ سال کی عمر پائی۔ وہ ۱۹ دسمبر ۱۹۶۷ء بہ روز منگل مطابق ۱۶ رمضان المبارک بہ وقت ساڑھے بارہ بجے رات کراچی میں یوم بدر کو اس دار فانی سے رخصت ہوئیں۔ (۲۱۴)

ان کے انتقال پُر ملال کی خبر کو ملک اور بیرون ملک کے نشریاتی اداروں اور اخبارات ورسائل نے نشر و شائع کیا۔

ان کی وفات پر ریڈیو پاکستان کراچی کا نشریہ اس طرح تھا:

برصغیر کی مشہور خوش نویس خاتون کو آج تیسرے پہر کراچی میں سپرد خاک کر دیا گیا، ان
کا گزشتہ رات انتقال ہوا تھا، ان کی عمر تقریباً چوراسی سال تھی۔ برصغیر کی پہلی خوش نویس
خاتون تھیں جنھوں نے کئی قرآن مجید لکھے۔ ان کے کمال فن کے اعتراف کے طور پر انھیں
کئی اعزاز اور تمغے ملے تھے۔ (۲۱۵)

## آمنہ بیگم:

آمنہ بیگم کی پیدائش دہلی کی ہے۔ انھوں باوجود خاندانی مخالفت کے اسکول کی تعلیم حاصل کی۔ وہ اردو زبان کا بہت اچھا شعری ذوق رکھتی تھیں۔ ان کی شادی اپنے تایا مولوی گنج بخش کے خاندان کے ایک فرد محمد فاضل کے ساتھ ہوئی۔ محمد فاضل اگر چہ میٹرک پاس تھے تاہم ان کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ ان کے جرنل ہیڈ کوارٹر پاکستان میں سول آفیسر رہے۔ ان کے دوستوں میں مسلمان، سکھ، ہندو، انگریز (عیسائی) سبھی تھے۔ ان کا انتقال ۲۷ نومبر ۱۹۶۱ء مقام شاد باغ مکان حکیم غلام حسین قریشی، تدفین قبرستان میانی صاحب لاہور میں ہوئی۔ (۲۱۶)

## محمد یوسف دہلوی:

ان کا اصل نام محمد یوسف تھا، مگر انھوں نے منشی محمد یوسف دہلوی کے نام سے شہرت پائی۔ (۲۱۷) وہ جنڈیالہ ڈھاب والا ضلع گوجرانوالہ میں ۳ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مطابق ۳ ستمبر ۱۸۹۴ء کو بہ روز پیر پیدا ہوئے۔ (۲۱۸) اس سلسلے میں کوئی دست آویزی ثبوت تو نہیں ہے کہ وہ گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ممکن ہے حسب روایت اپنے ننھیال سنبھڑیال، ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ہوں تاہم عظمت اللہ سلیم نے ان بیانات کی تردید کی ہے جن میں ان کی پیدائش دہلی ظاہر کی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ محمد یوسف صاحب کی ولادت گوجرانوالہ کی ہے اور انھوں نے دھونکل وزیر آباد کے کسی اسکول میں ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی۔ اسی حقیقت کے پیش نظر مارچ اپریل ۱۹۸۶ء ''المعارف'' کے خصوصی شمارے میں صاحب مضمون لکھتے ہیں:

> بیسویں صدی کے آغاز میں ضلع گوجرانوالہ کے نواحی موضع جنڈیالہ سے محمد الدین مرحوم دہلی
> تشریف لے گئے۔ ان کے صاحب زادے محمد یوسف جو اس وقت پندرہ سولہ سال کے تھے
> ، ان کے ہم راہ دہلی گئے۔ (۲۱۹)

منشی محمد الدین کے ذیل میں ضیاء الدین احمد برنی کا بیان اوپر نقل ہو چکا ہے کہ منشی محمد الدین نے ۱۸۸۶ء میں ملتان سے دہلی ہجرت کی۔ عظمت اللہ سلیم کے قول کے مطابق دہلی ہجرت کر جانے کے بعد ان کا کئی مرتبہ اپنے گاؤں آنا ہوا۔ ۱۸۹۰ء میں ضیاء الدین احمد برنی دہلی میں پیدا ہوئے۔ دست آویز سے پتا چلتا ہے کہ برنی کو پہلے دہلی میونسپل بورڈ کے اسکول میں داخل کروایا گیا۔ منشی محمد الدین کسی ضرورت کے تحت گوجرانوالہ آ گئے تو برنی کو وزیر آباد کے ایک اسکول وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول میں داخل کروایا گیا۔ یہاں انھوں نے ۱۹۰۶ تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد منشی محمد الدین دہلی چلے گئے اور باقی تمام تعلیم دہلی میں ہوئی۔

۱۹۰۵ کے بعد منشی محمد الدین گوجرانوالہ سے دہلی گئے ہوں گے تو محمد یوسف کی عمر ۱۱ سال ہوگی۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کا تذکرہ رسالہ "المعارف" کے مذکورہ شمارے میں آیا ہے اور جس میں محمد یوسف کی عمر پندرہ سولہ سال ظاہر کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں محمد راشد شیخ کا بیان ہے:

> محمد یوسف دہلوی مرحوم کی جائے پیدائش اور عمر سے متعلق کئی غلط فہمیاں موجود ہیں۔ راقم الحروف کی نظر سے بعض ایسی تحریریں گزری ہیں جن میں مذکور ہے کہ یوسف صاحب کی پیدائش گوجرانوالہ میں ہوئی اور تقریباً پندرہ برس کی عمر میں وہ اپنے والد گرامی کے ہم راہ دہلی منتقل ہو گئے۔ اسی طرح ان کے بعض تلامذہ اس بات کے قائل ہیں کہ انتقال کے وقت ان کی عمر سو سال ہو چکی تھی۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق یہ دونوں باتیں خلافِ حقیقت ہیں۔ یوسف صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے ان کے برادرزادے جناب علاء الدین خالد (فرزند منشی عبدالقدیر) ہیں۔ خالد صاحب کے بہ قول نہ صرف یوسف صاحب بلکہ منشی محمد الدین کی تمام اولاد کی جائے پیدائش دہلی ہے۔ اور یوسف صاحب کی درست تاریخ پیدائش ۳، ربیع الاول ۱۳۱۲ھ مطابق ۴، ستمبر ۱۸۹۴ء ہے۔ اس کی تصدیق خالد صاحب کی [کندہ، کے] پاس موجود اس تاریخی بیاض سے بھی ہوتی ہے جس میں منشی محمد الدین کے خانوادے کے افراد کی درست تاریخ ہائے پیدائش و دیگر تفصیلات درج ہیں۔ اس کے علاوہ خالد صاحب اور یوسف صاحب کے معروف تلامذہ محمد رضی دہلوی اور نسیم الحق عثمانی نے اپنے مضامین میں ان کی جائے پیدائش و تاریخ پیدائش وہی لکھی ہے جو ہم نے متن میں درج کی ہے۔ (۲۲۰)

مذکورہ اقتباس میں چند باتیں غور طلب ہیں بہ قول علاء الدین خالد منشی محمد الدین کی تمام اولاد دہلی میں پیدا ہوئی مبنی بر حقیقت نہیں۔ راقم گزشتہ صفحات میں منشی عبدالقدیر اور کے حوالے سے ثابت کر چکا ہے کہ دونوں کی ولادت اپنے ننھیال سنبھڑیال ضلع سیالکوٹ میں ہوئی۔

ضیاء الدین احمد برنی اپنی تصنیف "عظمت رفتہ" اول ایڈیشن میں اپنے والد منشی محمد الدین کے ورودِ دہلی کا نہیں لکھا تاہم دوسرے ایڈیشن (ترمیم شدہ، غیر مطبوعہ) میں، جو انھوں نے خاصی عمر میں ترتیب دیا تھا، ان کا ورودِ دہلی ۱۸۸۶ء لکھا ہے جو قابلِ اعتبار ہے۔ چناں چہ منشی عبدالقدیر کی ولادت ۱۸۷۵ء اور فاطمۃ الکبریٰ کی ولادت ۱۸۸۳ء میں ہوئی دہلی میں کس طرح ممکن تھی۔

مذکورہ اقتباس میں جس خاندانی بیاض کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے وہ صفحات جن میں منشی محمد الدین کے خاندان کے بعض افراد کے انتقال اور بعض کے پیدائش کے ــــ درج ہیں، راقم کے پاس ان صفحات کی نقل موجود ہے۔ ان میں محمد یوسف کی

پیدائش کا نہ تذکرہ ہے اور نہ جائے پیدائش اور نہ تاریخِ پیدائش درج ہے، تاہم انتقال کے متعلق یہ عبارت درج ہے ''۲۱ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ، ۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو کار کے حادثہ میں سڑک عبور کرتے ہوئے مولوی مسافر خانہ بندر روڈ کراچی، جاں بحق ہوئے۔ رات کو تخی حسن قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔''

نسیم الحق عثمانی اور محمد رضی دہلوی تلامذہء محمد یوسف دہلوی کے مضامین بالترتیب ''فن خطاطی کا محسنِ اعظم.... یوسف دہلوی'' اور بابائے خطاطی استاد محمد یوسف دہلوی'' کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، جلد ۱۸، شمارہ ۱۲ میں شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین میں کسی بات کے لیے کوئی تحقیقی حوالہ نہیں دیا گیا، جس سے واضح ہو کہ فلاں بات کی کیا سند ہے۔ خدا معلوم کون سی بات کہاں سے نقل کی گئی ہے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

دونوں مضامین سے قبل صفحہ ۴ پر ''خطاطِ اعظم محمد یوسف دہلوی'' کے عنوان سے ایک صفحے پر ان کے حالات دیے گئے ہیں۔ گمان ہے کہ یہ حالات مدیر رسالہ کی جانب سے دیے گئے ہیں اور مدیرِ رسالہ علاء الدین خالد تھے۔ اس میں بھی ان کی جائے ولادت دہلی لکھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی دست آویزی ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔

گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے رسالے ''مہک'' کے گوجرانوالہ نمبر میں ان کی ولادت جنڈیالہ ڈھاب والا ضلع گوجرانوالہ ظاہر کی گئی ہے۔ (۲۲۱)

ان کی ابتدائی تعلیم کے متعلق معلومات دست یاب نہیں۔ انھوں نے دہلی کے مشہور انگریزی کالج سینٹ اسٹیفنز کالج سے ۱۹۱۱ء میں بی اے کیا۔ (۲۲۲) یہاں ان کے اساتذہ میں شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن، سی۔ ایف۔ اینڈ یوز، مولوی ذکاء اللہ، لارنس آف عربیا کے بھائی ٹی ایس لارنس شامل ہیں۔ (۲۲۳) ان کے بیشتر استاد انگریز تھے جو اپنے وقت کے بہترین ماہر تعلیم شمار ہوتے تھے۔ ان اساتذہ کی تربیت کا ان پر بڑا گہرا اثر ہوا۔ (۲۲۴) ان کی والدہ انھیں خوش نویسی سے دور رکھنا چاہتی تھیں اسی لیے انھوں نے گریجویشن کی تعلیم دہلی کے مشہور سنیٹ اسٹیفن کالج میں حاصل کی۔ (۲۲۵)

ان کے والد منشی محمد الدین میں بھی استغنا بلا کا تھا۔ چناں چہ یافت اتنی نہیں ہوتی تھی۔ اسی باعث والدہ کی خواہش تھی کہ محمد یوسف کسی اور شعبے میں اپنی صلاحیتیں صرف کریں۔ وہ بچپن میں جب قلم سے مشق کرتے تو ان کی والدہ قلم توڑ دیا کرتی تھیں۔ (۲۲۶) ان کے والد بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ محض خوش نویس بن کر رہ جائیں۔ (۲۲۷) انھوں نے اپنی کم آمدن کے باوجود انھیں دہلی کے بڑے اور مشہور کالج میں تعلیم دلوائی۔

ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ محمد یوسف فطرتاً علم وفن کا شوق و شغف رکھتے تھے۔ انھوں نے ان دو شعبوں میں اپنے ذوق وشوق، محنت و ریاضت اور انہماک سے اعلا مدارج طے کیے اور انتہائی منزلوں کا سر کیا۔ ان کے علمی شغف اور استعداد کے متعلق ان کے شاگرد نسیم الحق عثمانی رقم طراز ہیں:

> یوسف صاحب نہ صرف نہ اردو بلکہ تیرہ زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ انگلش زبان پر ان کو اپنی مادری زبان سے زیادہ دست رس اور عبور تھا۔ اس میں وہ انگلش تلفظ اور لہجے کو زیادہ زور

دیتے تھے۔ انگریزی داں ان کی زبان پر عش عش کرتے، وہ آج کے انگریزی بولنے والوں
پر طنز کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ "یہ اردو بول رہا ہے"۔ (۲۲۸)

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں یہ بات رقم ہو چکی ہے کہ کتابت یا خوش نویسی اس خاندانی کا قدیمی پیشہ ہی نہیں فن رہا ہے۔ چناں چہ محمد یوسف میں بچپن ہی سے اس فن کی جانب رغبت کوئی انوکھی بات نہیں۔ ملا واحدی اور علاءالدین خالد کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے خوش نویسی اپنے والد سے سیکھی۔ تاہم ایک مقام پر ان کے شاگرد نسیم الحق عثمانی محمد یوسف کا بیان اس سلسلے میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> یوسف صاحب نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ اول تو اس فن میں میرا کوئی استاد نہیں ہے اور اگر کوئی شخص میرا استاد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ "رشید دیلمی" ہے۔ (۲)

ممکن ہے انھوں نے ابتدائی خوش نویسی والد ہی سے سیکھی ہو۔ مگر بہ طور فن رشید دیلمی (۲۳۰) کے نمونوں سے سیکھا ہو۔ رشید دیلمی شاہجہانی دور کا مشہور خطاط تھا۔ (۲۳۱) اس کے فن کے نمونے کتبوں کی صورت میں دہلی کے لال قلعے اور جامع مسجد اور آگرے کی تاریخی عمارات میں آج بھی موجود ہیں۔ (۲۳۲) وہ لال قلعے اور جامع مسجد میں استاد دیلمی کے کتبوں کا اکثر مشاہدہ اور مطالعہ کرتے تھے۔ (۲۳۳) اس ضمن میں نسیم الحق عثمانی لکھتے ہیں:

> یوسف صاحب نے بتایا کہ "میں لال قلعہ جاتا اور دیر تک ان کتبوں اور طغروں کو دیکھتا رہتا اور پھر گھر آ کر ان کی مشق کرتا رہتا" اور اسی نسبت کے سبب یوسف صاحب رشید دیلمی کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔ (۲۳۴)

سینٹ اسٹیفنز کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے کچھ عرصے بعد انھوں نے محکمہ ڈاک میں پوسٹ ماسٹر کی ملازمت بھی کی۔ (۲۳۵) اس کے علاوہ انھوں نے وا‌سرائے لاج دہلی کے عجائب گھر میں ملازمت اختیار کی اور عالمی شہرت یافتہ مصور فیضی رحیمن کے ساتھ عجائب گھر کے لیے حافظ اور سعدی کی رباعیات لکھیں، جن کو سنگ مرمر پر اٹلی کے سنگ تراشوں نے کندہ کیا تھا۔ (۲۳۶) یہ ملازمتیں انھوں نے زیادہ عرصہ نہیں کیں۔ ان کا مزاج پابند ہو کر کام کرنے کا نہیں تھا۔ وہ آزاد فضا میں رہ کر کام کرنا پسند کرتے تھے۔

۱۹۵۲ء میں ان کے بھتیجے (منشی عبدالقدیر کے صاحب زادگان) انھیں کراچی لے آئے۔ (۲۳۷) یوں بہادر شاہ ظفر کی دہلی مرحوم سے رخصت ہوکر وہ بہادر شاہ مارکیٹ کے ایک کمرے میں متقل ہو گئے تھے۔ (۲۳۸)

بہادر شاہ مارکیٹ میں ان کے قیام اور اپنے فن سے ان کی دل چسپی کے متعلق احمد حسین صدیقی لکھتے ہیں:

> یوسف دہلوی سے سلام ودعا کی حد تک کی ملاقات کا اعزاز راقم الحروف کو بھی حاصل تھا۔
> ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک میں بہادر شاہ مارکیٹ میں تیسری منزل پر ایک فلیٹ میں مقیم تھا۔
> میونسپل کارپوریشن کا ملازم ہونے کی حیثیت میں یہ فلیٹ مجھے میونسپل کارپوریشن کی طرف

سے دیا گیا تھا۔ بہادر شاہ مارکیٹ کی دوسری منزل پر دفاتر تھے جو مختلف لوگوں کو کرائے پر دیے گئے تھے۔ ان ہی دفاتر میں ایک دفتر میں جناب یوسف دہلوی کی رہائش تھی۔ دن میں وہ سڑھیوں کے سامنے کھلی جگہ پر پلنگ پر بیٹھے اپنے فن خطاطی میں مشغول نظر آتے تھے۔(۲۳۹)

پاکستان آنے کے بعد وہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، جو اُن کے برادرِ اکبر زادوں (منشی عبدالقدیر کی اولاد) کی ملکیت تھی، سے متعلق ہو گئے۔ علاء الدین خالد کے مطابق ''اردو اکیڈمی سندھ کو ان کی سر پرستی کا فخر حاصل رہا ہے۔''(۲۴۰) انھوں نے اردو اکیڈمی سندھ سے شائع ہونے والی متعدد کتابوں کے ٹائٹل بنائے۔ چند کے نمونے کتابی دنیا، کراچی کی مختلف اشاعتوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

محمد یوسف دہلوی کی اصل شہرت خوش نویسی سے ہے تاہم وہ فٹ بال اور ہاکی کے بہت اچھے کھلاڑی، بڑے شکاری، اچھے تیراک، غُلیل اور تیر انداز ہونے کے ساتھ ساتھ پٹہ بازی اور پہلوانی میں درک رکھتے تھے۔ انھیں ہندوستانی موسیقی بھی بے حد پسند تھی۔(۲۴۱) محمد راشد شیخ نے بہ روایت علاء الدین خالد لکھا ہے کہ ان کا فٹبال کے ینگ مین کلب، دہلی سے ہمیشہ تعلق رہا۔(۲۴۲) کہا جاتا ہے کہ انھیں مچھلی کے شکار کا اس قدر شوق تھا کہ جب وہ لیاقت علی خان کے اصرار پر پاکستان آئے تو ان کی مچھلی کے شکار کی چھڑیں ان کے ساتھ آئیں۔ ہاکی کا تو انھیں نوعمر سے بہت شوق تھا۔ ایک مرتبہ باتیں باتیں کرتے کرتے محمد یوسف دہلوی نے مسعود احمد برکاتی سے پوچھا ''میں کیسا لکھ لیتا ہوں؟'' مسعود احمد برکاتی نے جواب دیا کہ آپ تو خوش نویسی کے استاد اور امام ہیں، آپ کا خط اور آپ کا فن کسی کی تحسین سے بالاتر ہے۔ فرمانے لگے ''تو بس سمجھ لو کہ میں ایسی ہاکی بھی کھیلتا ہوں۔''(۲۴۳) انھیں سینما بینی کا بھی شوق تھا۔ مسعود احمد برکاتی کے قول کے مطابق ''اکثر یہ خطاطِ اعظم کسی سینما گھر پر سب سے کم ٹکٹ والی لائن میں لگا ہوا اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوتا تھا۔''(۲۴۴)

انھیں انگریزی، فارسی اور اردو زبانوں پر عبور تھا۔ ہزار ہا اشعار زبان زد تھے۔ مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قرآنِ حکیم کے خوش الحان قاری تھے۔(۲۴۵) ان کے شاگرد رضی دہلوی ان کے مطالعے کے متعلق لکھتے ہیں:

> ان کی ساری زندگی مطالعے میں گزری، انھوں نے ہزاروں کتابیں ہندوستان سے ہجرت کرتے وقت ورثہ میں چھوڑیں۔ پاکستان میں بھی جو کچھ کماتے اس میں سے بیشتر رقم کتابوں پر خرچ ہوتی۔(۲۴۶)

اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ بہت اچھے انسان تھے۔ بیشتر لکھنے والوں نے ان کے اس وصف کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ تمام لکھنے والوں نے جہاں ان فن پر قلم اٹھایا ہے وہاں ان کی شخصیت کے اس اہم پہلو پر بھی جم کر لکھا ہے۔

ان کے برادر زادے علاء الدین خالد ان کے شخصی اوصاف پر اس روشنی ڈالتے ہیں:

> وہ بڑے رحم دل، رقیق القلب، انسان دوست، فیاض، دریا دل، دوسروں کے کام آنے

والے، خود بھوکا رہ کر دوسرے کو کھانا کھلانے میں خوشی محسوس کرتے۔ بہت سی بیواؤں کا مہینہ مقرر کیے ہوئے تھے۔ نہ کسی کی عیب جوئی کرتے نہ سنتے۔ غرض عجب آزاد صفت انسان تھے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ان کا حلقہ بہت وسیع تھا وہ ان لوگوں میں سے تھے جو دنیا سے کچھ لیتے نہیں لیکن جانے سے پہلے کچھ دے جاتے ہیں اور اس صفحۂ ہستی پر اپنے خوب صورت نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ (۲۴۷)

ان کے شاگرد رضی دہلوی اپنے استادِ گرامی کے اوصاف حمیدہ کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

یوسف صاحب کی زندگی سادہ، پاک صاف، ریاکاری اور بناوٹ سے کوسوں دور تھی۔ انسان دوستی ان کے رگ و پے میں جاری وساری تھی۔ وہ سب کا بھلا چاہتے تھے، برائی کسی کی نہیں۔ لوگوں کی کم زوریوں کا نظر انداز کرتے اور خوبیوں کو اجاگر کرتے تھے۔ وہ امن کے پرستار تھے۔ بہ ظاہر ان کو دیکھ کر نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ اتنے بڑے فن کار ہیں.....وہ اپنی ذات نہایت قلیل رقم خرچ کرتے۔ وہ قدرت کی ہر شے سے محبت کرتے تھے۔ طبیعت میں لالچ بالکل نہیں تھی۔ طبیعت میں قلندرانہ ادائیں تھیں۔ مہربان ہوتے تو بلا معاوضہ کام کر دیتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے کام پر طبیعت مائل نہ ہوتی تو گراں قدر معاوضے کی پیش کش پر بھی اس کام پر توجہ نہ دیتے۔ اگر یوسف صاحب کی انسان دوستی اور انسانی اقدار سے محبت کا ذکر کیا جائے تو ان کی زندگی کی تابناکی کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ ذکی الحس تھے انسانی ہمدردی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ کسی کی دل آزاری انھیں مقصود نہ تھی۔ وہ ہر ایک کے دکھ میں شریک رہتے۔ دامے، درمے سخنے وہ دوسروں کی مدد اور دل جوئی کرتے۔ راستے میں کوئی پتھر کتنا ہی بھاری کیوں نہ ہو پڑا نظر آتا تو اسے اٹھا کر ایک طرف رکھتے تا کہ راہ گیر کو ٹھوکر نہ لگے۔ کاغذ کا تقدس اتنا کہ اگر کوئی راستے میں پڑا مل جاتا تو اسے اٹھا کر کسی محفوظ جگہ رکھ دیتے۔ کوئی معمولی شناسا بھی اگر بیمار ہو جاتا تو اس کی عیادت ضرور کرتے۔ کوئی ضرورت مند ملتا تو اس کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ (۲۴۸)

ان کے طبیعت میں خودداری، استغنا اور انسانی ہمدردی کا جذبہ بلا کا تھا۔ ان کی انھی صفات کے ایک گواہ مسعود احمد برکاتی ہیں جنھوں نے دو واقعات کے ذریعے محمد یوسف دہلوی کی بہت سی خوبیوں میں سے چند کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

کہتے ہیں کہ غلام محمد مرحوم گورنر جنرل نے اسی [پاکستانی کرنسی کے] سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے ان کو بلایا۔ یوسف صاحب کہنے لگے "جب فرصت ہوگی آجائیں گے۔" ایک دن

مو‌ڈ ہوا پہنچ گئے لیکن گورنر جنرل کے سکریٹری صاحب ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر شایانِ شان استقبال نہیں کر سکے فوراً چلے آئے کہ تم جیسے لاکھوں پیدا ہوں گے لیکن یوسف کا کوئی ثانی نہیں ہوگا۔ ادھر جب غلام محمد صاحب کو خبر ہوئی کہ منشی یوسف صاحب ناراض ہو کر واپس ہو گئے تو سکریٹری کو بے نقط سنائیں اور اس کو اس گدا نما شہنشاہِ فن کے غریب خانے پر حاضر ہو کر معافی تلافی کرنی پڑی۔ (۲۴۹)

ان کے عقیدت مندوں اور اس دنیائے فن کے شناساؤں نے انھیں "خطاطِ اعظم"، "فنِ خطاطی کا محسنِ اعظم"، "بابائے خطاطی"، "شہنشاہِ فن اور استادِ فنِ خطاطی" کے القابات سے یاد کیا ہے۔ انھیں خوش نویسی کا میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ بھی کہا گیا ہے۔ (۲۵۰) وہ اپنے وقت کے ماہر خوش نویس و خطاط تھے ان کے فن کے نمونے ہندوستان اور پاکستان میں ان کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ دہلی میں ان کی خدمات کا مختصراً جائزہ ان کے شاگرد محمد رضی دہلوی نے اس طرح لیا ہے:

نئی دہلی کی سرکاری عمارتیں، جب تعمیر ہو رہی تھیں تو اس وقت حکومت برطانیہ نے خاص خاص عمارتوں کو مغلوں کی طرح مختلف زبانوں میں فنِ خطاطی اور آرٹ سے مزین کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سر ہربرٹ، سر ایڈون لیون اور سر والٹر جارج نے نئی دہلی کی ترتیب دی تھی۔ انھوں نے تمام ہندوستان کے خوش نویسوں اور خطاطوں کے فن کا مشاہدہ کیا اور آخر میں جناب یوسف دہلوی پر نظرِ انتخاب پڑی۔ نئی دہلی کا وائسریگل لاج (جواب راشٹر پتی بھون) کہلاتا ہے، پارلیمنٹ ہاؤس اور انڈیا گیٹ، نارتھ اور ساؤتھ بلاک سکریٹریٹ میں ان کے فن کے زندہ جاوید نقش ہمیشہ ان کے فن کی عظمت کی یاد دلاتے رہیں گے۔ سنہری حروف میں کندہ بعض کتبے آج اس طرح محسوس ہوتے ہیں کہ آج ہی قلم سے نکلے ہیں۔ مختلف اونچی اونچی محرابوں پر قرآن، بائبل، تورات، گیتا اور دوسری مقدس کتابوں کی آیات، اقتباسات اور اقوالِ زریں اردو، انگریزی، بنگالی، فرنچ، سنسکرت، مرہٹی، تامل، عربی، فارسی وغیرہ تیرہ زبانوں میں کندہ ہیں۔ بعض کتبے نامکمل رہ گئے تھے، کیوں کہ چیف انجینئر سے استاد یوسف کا اختلاف ہو گیا تھا اور اس کے بعد انھوں نے کام بند کر دیا۔ حکومت نے انھیں پورا کرنے کی کوشش کی تو ملک بھر کا کوئی ہم عصر ان کے قلم سے قلم نہ ملا سکا۔ حکومت نے بالآخر کتبوں کو عمارت میں نامکمل حیثیت ہی میں شامل کر لیا۔ (۲۵۱)

پاکستان کی کرنسی پر عربی میں حکومتِ پاکستان کا طغریٰ اور ایک، دو، پانچ، دس اور پچاس روپے کے نوٹوں پر نستعلیق عبارات انھوں نے پاکستان ہجرت کرنے سے پیشتر لکھی تھیں۔ (۲۵۲) اس سلسلے میں اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے ڈاکٹر ذاکر حسین (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) کو خط لکھا انھوں نے اپنے رسوخ کے باعث انھیں اس کام کے لیے آمادہ

کرلیا اور یوں یہ کام تکمیل کو پہنچا۔(۲۵۳) اسی سلسلے کا پچاس اور ایک سو روپے والا کرنسی نوٹوں اور طغرے اور خطاطی کا بقیہ کام کراچی آکر مکمل کیا۔(۲۵۴) علاوہ ازیں نظام دکن اور ولی عہد دکن کی سرکاری مہریں بھی انھی کے قلم کا خوب صورت نمونہ ہیں۔(۲۵۵) محمد یوسف دہلوی فن خوش نویسی کو آرٹ کا مکمل اور اہم ترین شعبہ قرار دیتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ اچھا خطاط بننے کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔(۲۵۶) انھیں خوش نویس سے بڑھ کر فن کار یا مصورِ خطاط کہا جائے تو ٹھیک ہوگا۔(۲۵۷)

محمد یوسف دہلوی نے اپنے شوق اور محنت کے باعث فن کو جن بلندیوں پر پہنچادیا تھا انھیں کوئی اور نہیں چھوسکا۔درحقیقت انھوں نے فن خطاطی ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ اردو زبان پر بھی ان کے احسانات ہیں۔انھوں نے اپنی فنی نزاکتوں اور لطافتوں سے اردو حروف کو جو حسن و جمال عطا کیا اسی کا باعث ہے کہ تقسیم کے بعد پاکستان میں اردو کی مقبولیت بڑھانے والوں میں ان کا نام بھی سرفہرست ہے۔ان کے فن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاسکتا ہے، چوں کہ وہ میرے دائرۂ تحقیق سے باہر ہے اس لیے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

پاکستان آکر ان کی شادی ہوئی مگر وہ لاولد رہے۔ایک روز وہ مولید ینا مسافر خانہ کے قریب بندر روڈ پار کررہے تھے کہ ایک موٹر کی جھپٹ میں آگئے۔ان کا انتقال ۲۰ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۱ مارچ ۱۹۷۷ء کو (۲۵۸) بہ روز ہفتہ، ہوا۔

ان کے انتقال پر محشر بدایونی نے قطعہ تاریخ وفات کہا تھا:

چل بسے منشی محمد یوسف    جن سے آراستہ تھی فن کی بساط
ان کی رحلت کی ہے ہجری تاریخ    "آج جنت میں ہیں یوسف خطاط"

۱۳۹۷ھ (۲۵۹)

ان کی وفات حسرت آیات پر روزنامہ جنگ کراچی، روزنامہ امن کراچی اور روزنامہ اعلان کراچی کے علاوہ ملک اور بیرون ملک دیگر اخبارات ورسائل نے نہ صرف خبریں شائع کیں بلکہ مضامین بھی شائع کیے:

> برصغیر کے عظیم ترین خوش نویس جناب محمد یوسف دہلوی ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق ہوگئے ان کی موت کے ساتھ پاکستان میں فن خطاطی کی ایک تاریخ ختم ہوگئی۔(۲۶۰)

> برصغیر پاک و ہند کے نام ور خوش نویس اور آرٹسٹ جناب یوسف دہلوی آج بندر روڈ پر ایک حادثے میں زخمی ہوئے اور نماز جمعہ کے وقت سول اسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا۔مرحوم فن خطاطی میں اپنی طرز کے موجد اور امام تھے پاکستان کے نوٹ اور سکوں پر ان کے قلم کا اعجاز ہمیشہ قائم رہے گا۔(۲۶۱)

> برصغیر کے نام ور خوش نویس محمد یوسف دہلوی آج سول اسپتال میں انتقال کرگئے۔مرحوم کی عمر ۸۳ سال تھی۔(۲۶۲)

**محمد احمد:**

منشی محمد الدین کے یہ سب سے چھوٹے بیٹے تھے جن کا انتقال نو جوانی میں اٹھارا برس کی عمر میں ہو گیا تھا۔ ان سے متعلق تفصیل معلوم نہیں ہوئیں۔ (۲۶۳)

یہ وہ پس منظر ہے جس میں برنی کی ذہنی ،فکری اور اخلاقی تربیت ہوئی۔ اس کے بہ غیر برنی کی فکر اور ان کی خدمات کو درست زاویے سے نہیں دیکھا جا سکے گا۔ لہذا اس منظر نامے کو بنیاد بنا کر آئندہ کے ابواب میں برنی کی شخصیت، کردار، فکر، سوانح اور ان کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

## حواشی و تعلیقات:

۱۔ تاریخ گوجرانوالہ از فقیر محمد فقیر، مرتبہ محمد جنید اکرم، بزم فقیر پاکستان، ۱۹۹۷ء، ص ۱۳۵۔

۲۔ ایضاً، ص ۳۔

۳۔ بہ قول عظمت اللہ سلیم جنڈیالہ ایسے درخت کو کہتے ہیں جس میں سرخ رنگ کے پھول کھلتے ہیں یہ درخت اب جنڈیالہ گاؤں میں تو ناپید ہیں تاہم گوجرانوالہ میں کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں کسی زمانے میں اس گاؤں میں کثرت سے تھے۔ حافظ آباد کے ایک گاؤں کا نام چنڈالی ہے۔ اس کا قدیم نام جنڈوالی تھا جو، اب چنڈالی ہو گیا۔ اس کی وجہ تسمیہ بھی یہ بتائی گئی ہے کہ پرانے زمانے میں جہاں ایک بڑا جنڈ کا درخت ہوا کرتا تھا، آہستہ آہستہ وہاں آبادی ہوگئی اور گاؤں جنڈوالی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ (دیکھیے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کا رسالہ ''مہک''، گوجرانوالہ نمبر، ص: ۲۷) ڈھاب والا کی وجہ تسمیہ یہ بتائی کہ اس گاؤں کے اطراف میں پانی کے جوہڑ تھے، جس کی وجہ سے ڈھاب والا کہا گیا۔ جنڈیالہ شیر خاں ضلع شیخوپورہ، جنڈیالہ باغوالا مشرقی پنجاب میں ہے۔

۴۔ برنی نے عظمتِ رفتہ میں صرف اپنے دادا کا نام لکھا ہے۔ جب کہ راقم کی ذاتی کوششوں سے جس میں گوجرانوالہ اور لاہور جا کر اس خاندان کے بعض بزرگوں سے ملاقات کرنا، خطوط لکھنا اور ٹیلی فون پر رابطہ رکھنا شامل ہے، اس خاندان کا شجرہ مکمل ہو سکا ہے۔ پہلی مرتبہ میں شجرہ نامکمل تھا اور اس میں چند خامیاں تھیں۔ چناں چہ راقم کے توجہ دلانے سے نہ صرف مکمل کیا گیا بلکہ خامیاں بھی دور کی گئیں۔ مذکورہ شجرے کو محترم عظمت اللہ سلیم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی امان اللہ صاحب نے نہایت سلیقے اور اہتمام سے تیار کیا۔ اس سلسلے میں عبدالقیوم صاحب بھی نہایت جامع اور مستند معلومات رکھتے ہیں۔ وہ بھی مدد کر رہے ہیں۔

۵۔ ۲۲ اپریل ۱۹۶۹ء کو رات ۸ بجے ضیاءالدین احمد برنی نے ''میرے خاندانی اور ذاتی حالات'' (غیر مطبوعہ) کے عنوان سے مختصراً زندگی کی اہم باتیں لکھوائی تھیں۔ جس میں انھوں نے بیان کیا ہے'' مجھے اپنے بزرگوں کا حال معلوم نہیں.... لیکن والد کہا کرتے تھے کہ ان کا تعلق کھوکھر راجپوتوں کے خاندان سے ہے۔ برنی نے کھوکھر راجپوت لکھا ہے جب کہ ''راجپوت کھوکھر'' درست ہے دیکھیے: تاریخ راجپوت کھوکھر مرتبہ رانا محمد سرور خاں، کینال ویو کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی ملتان روڈ، لاہور، ۲۰۰۲ء۔

۶۔ مولوی نظام الدین کے بیٹے کرم الٰہی نے ۱۹۰۴ء میں فارسی کے مشہور شاعر نظامی گنجوی کی مثنوی ''مخزن الاسرار'' خطِ شکستہ میں لکھی مثنوی کے آخر میں خود کو موضع ہیراں والہ کا رہنے والا لکھا ہے۔ اس مثنوی کو کرم الٰہی نے اپنے والد کی تخلیق سمجھا چناں چہ جب انھوں نے اس مثنوی کی خطاطی کی تو مثنوی کے اختتام پر شاعر کے نام کے طور پر ''نظام الدین گنجوی'' لکھ دیا۔ ان کی اس عبارت آرائی سے اُن کے خاندان میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولوی نظام الدین فارسی زبان کے شاعر تھے حال آں کہ وہ خطاط تھے، تاہم ان کے شعری ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مثنوی کے چند صفحات عظمت اللہ سلیم صاحب نے گوجرانوالہ سے ۲۸ جون ۲۰۰۶ء کو راقم کو ارسال فرمائے۔ یہ صفحات ضمیمے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

۷۔ نظامی (۱۱۴۱ء۔۱۲۰۳ء) کا تعلق آذربائیجان کے شہر گنجہ سے تھا۔ وہ اس کی پانچ مثنویاں ''گنجینہ اسرار'' (۱۱۷۹)، ''خسرو اور شیریں'' (۱۱۸۰)، ''لیلیٰ مجنوں''، ''ہفت پیکر'' (۱۱۹۶)، ''اسکندر نامہ'' (۱۲۰۱)۔ سویت یونین میں نظامی کی مثنویوں کی تقریباً ۸۰۰،۰۰۰ جلدیں ۸۲ ایڈیشنوں کی شکل میں شایع ہو چکی ہیں۔ آذربائیجانی اپنے عظیم قومی شاعر کو نہایت احترام سے یاد کرتے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: ماہنامہ کتابی دنیا، کراچی ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۱۳)

۸۔ امام خان نوشہروی کی تحریر کا عنوان ہے ''منشی محمد الدین'' یہ مضمون خطِ شکستہ میں کوئی ساڑھے تین صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں مولوی

نظام الدین کے متعلق مذکورہ معلومات کے علاوہ منشی محمد الدین کا تذکرہ ہے۔ علاوہ ازیں خاندان کے دیگر افراد کا بھی مختصر مختصر احوال درج ہے۔ یہ مضمون محترم ضیاءاللہ کھوکھر صاحب نے گوجرانوالہ سے مرحمت فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں اخلاق احمد دہلوی کی کتاب "یادوں کا سفر" سے بھی ایک مضمون "نیا انسان بنانے کی مشین کا نسخہ" بھی ارسال فرمایا ہے۔

۹۔ یہ ترتیب عمر کی مناسبت سے رکھی گئی ہے۔ مذکورہ شجرے میں یہ ترتیب اسی طرح ہے۔ چناں چہ اسی ترتیب کو پیش نظر رکھ کر نام تحریر کیے گئے ہیں۔

۱۰۔ ضیاءالدین احمد برنی: عظمتِ رفتہ، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۶۱ء، ص ۴۵۳۔

۱۱۔ برنی کی انتقال سے کچھ عرصہ پہلے کی تحریر "میرے خاندانی اور ذاتی حالات"، غیر مطبوعہ

۱۲۔ ضمیمے میں دیے گئے شجرے سے منشی کرم الٰہی کا اپنے بزرگوں سے تعلق اور ان کی اولاد کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۳۔ کتبے کی یہ عبارت راقم نے خود ۱۱ اپریل ۲۰۰۶ء کی شام مغرب سے کچھ دیر قبل ان کی قبر سے نقل کی تھی۔ سنگ مرمر کا یہ کتبہ ظاہر کرتا ہے کہ زیادہ پرانا نہیں ہے۔ غالباً کتبہء اول ضائع ہو گیا ہو یا پہلے اویزاں ہی نہ کیا گیا ہو۔ مہینہ انگریزی میں لکھا ہوا ہے۔ یہ بعد کے زمانے کا چلن ہے۔ ۱۹۲۴ء میں مسلمانوں میں اسلامی مہینہ اور سال لکھنے کا رجحان زیادہ تھا۔

۱۴۔ راقم کے نام خط مرقومہ عظمت اللہ سلیم، ۲۸ جون ۲۰۰۶ء۔ اسی سلسلے میں امریکا سے برنی کی چھوٹی بہن آمنہ خاتون کی بیٹی رضیہ چودھری نے بھی بعض معلومات ای میل کے ذریعے فراہم کی ہیں۔ ان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں دست گاہ رکھتے تھے۔ اپنے علم و فضل کے باعث ان کی بہت عزت کی جاتی تھی۔ ایک زمانے میں انگریزی حکومت کی جانب سے وزیرآباد میں انھیں ڈپٹی کیمشنر کے مرتبے کی ملازمت کی پیش کش کی گئی مگر انھوں نے اسے قبول نہیں کیا۔

۱۵۔ دیکھیے: گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ رسالہ مہک کا "گوجرانوالہ نمبر"، ۱۹۸۲ء۔

۱۶۔ اسحاق بھٹی صاحب سے ۲۶ مارچ ۲۰۰۷ کو راقم نے فون نمبر: 042-7220592 پر تفصیلی بات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی کتاب میں بھی ان کا تذکرہ نہیں ہے اور تا حال انھوں نے اس پائے کے کسی شخص کا تذکرہ نہیں سنا۔ راقم نے اس ضمن میں اور بھی حضرات کو خطوط لکھے تاہم بعض نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب دورہء لاہور کے دوران ملاقات بھی ہوئی اور قبلاً فون پر بات بھی ہوئی انھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔

۱۷۔ عظمتِ رفتہ، ص ۴۴۲۔

۱۸۔ بہ روایت عبدالقیوم۔ عبدالقیوم، ضیاءالدین احمد برنی کے تایا مولوی رجب علی کے پرپوتے ہیں۔ لاہور میں مقیم ہیں۔

۱۹۔ مکتوب بہ نام راقم، محررہ ۲۸ اگست ۲۰۰۶ء۔

۲۰۔ دیکھیے: امداد صابری: "جناب منشی محمد الدین صاحب ایڈیٹر دارالعلوم دہلی" دہلی کی یادگار ہستیاں، کامل صدیقی و ریاض صدیقی، دہلی، جمال پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۷۔

۲۱۔ عظمتِ رفتہ، ص ۴۴۲۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۹۰۔

۲۳۔ ایضاً۔

۲۴۔ دیکھیے: شجرہ ضمیمے میں۔

۲۵۔ بہ روایت عظمت اللہ سلیم، گوجرانوالہ۔

۲۶۔ یہ معلومات دورہ گوجرانوالہ کے دوران جنڈیالہ ہی میں امان اللہ نسیم اور عظمت اللہ سلیم صاحب سے حاصل ہوئیں۔ اسی دوران مذکورہ مسجد دیکھی

اور عصر کی نماز ادا کی۔

۲۷۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر)، اردو لغت بورڈ کراچی، جلد جلد دہم ص ۸۱۳ پر منشی لفظ سے متعلق یہ معلومات ملتی ہیں: ۱۔آغاز کرنے والا، پیدا کرنے والا، نشو و نما کرنے والا، خالق، موجد، سربلند خطاب۔۲۔تحریر میں ادائے مطالب پر قدرت رکھنے والا، مضمون نگار، انشا کا فن جاننے والا، انشا پرداز، کلرک، محرر، پیش کار۔۳۔ایک خطاب جو عموماً اردو فارسی کے تعلیم یافتہ اشخاص یا اہلِ قلم کے نام کے ساتھ اضافہ کیا جاتا ہے۔۵۔اردو فارسی وغیرہ کا استاد (خصوصاً وہ جو انگریزوں کو پڑھاتا ہو)

ملا واحدی منشی کے معنی لکھتے ہیں ''منشی سے مطلب اردو کا کلرک (محرر) مت سمجھیے گا۔منشی کے معنی ہیں انشا پرداز۔صاحب قلم۔(ملا واحدی: میرے زمانے کی دلی، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰، ص:۱۲۱) ابوالفضل جیسے فاضل کو اہل ایران منشی ہند لکھا کرتے تھے۔(ایضاً، ص:۲۳۶) ''انگریزوں کو مشرقی زبانوں کے پڑھانے والے معلمین جن کو عموماً منشی کہتے ہیں۔'' (دیکھیے: ماہ نامہ معارف، اپریل ۱۹۲۴ء دارالمصنفین، اعظم گڑھ، انڈیا ص:۳۲۰)۔بشیر الدین احمد منشی ذکاء اللہ دہلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے منشی کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ''منشی اور یہ لفظ تھا بھی بہت موزوں اتنا بڑا منشی یعنی لکھاڑ کوئی دیکھنے میں نہیں آیا۔(واقعات دارالحکومت دہلی، حصہ دوم، اردو اکادمی دہلی، ص ۱۷۱)

۲۸۔ عظمتِ رفتہ، ص ۴۵۳۔

۔ ''دلی کے تین پنجابی عاشق''، کراچی، روزنامہ جنگ، ۲۰ دسمبر ۱۹۶۸ء۔

۳۰۔ ''فن کتابت کے مختلف مکاتب'' گوجرانوالہ نمبر، رسالہ مہک، ۱۹۸۲ء، ص ۳۰۵۔

۳۱۔ تذکرہ خطاطین، محولہ بالا۔

۳۲۔ عظمتِ رفتہ ترمیم شدہ، غیر مطبوعہ ص ۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۵۳۔

۳۴۔ عظمتِ رفتہ، ص ۴۶۲۔

۳۵۔ ضیاء الدین احمد برنی: عظمتِ رفتہ ترمیم شدہ، غیر مطبوعہ، ص: ۴۵۳۔

۳۶۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد، ترتیب و مقدمہ ابوسلمان شاہجہاں پوری، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۸ء، ص ۱۵۔

۳۷۔ المعارف، خصوصی شمارہ، ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ، لاہور، مارچ۔اپریل ۱۹۸۶ء، ص ۷۳۔

۳۸۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری نے سہواً چھنڈیالہ لکھ دیا ہے۔ترکِ وطن کے سلسلے میں بھی ان سے سہو ہوا ہے انھوں نے ۱۸۸۰ء تحریر کیا ہے۔دیکھیے: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، مولانا محمد علی اور ان کی صحافت، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی، دسمبر ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۶۔

۳۹۔ اس کی تصدیق برنی کے اسکول کے گڈ ہینڈ رائٹنگ کارڈ اور عظمت اللہ سلیم کے انٹرویو سے ہوتی ہے۔

۴۰۔ محمد یوسف کے دھونکل میں تعلیم حاصل کرنے کی تصدیق عظمت اللہ سلیم کے ایک انٹرویو سے ہوتی ہے جو گوجرانوالہ میں قیام پذیر ہیں یہ انٹرویو ان کے گھر پر لیا گیا تھا۔(عظمت اللہ سلیم کا انٹرویو اور تصاویر ضمیمے میں دیکھی جاسکتی ہیں)

۴۱۔ ''گوجرانوالہ نمبر''، مہک، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ، ص ۶۰۔

۴۲۔ سید انور حسین نفیس رقم [یہ بزرگ لاہور کے رہنے والے ہیں] ''خطاطانِ قرآن'' سیارہ ڈائجسٹ، قرآن نمبر جلد اول، لاہور، ص ۸۱۹۔۸۲۰۔

۴۳۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا تعلق بھی گوجرانوالہ سے ہے اور ان کی ایک تحریر انگریزی میں گوجرانوالہ کے متعلق ''اورینٹل کالج میگزین'' میں شائع ہو چکی ہے۔

۴۴۔ راشد شیخ محمد، ''تذکرہ خطاطین''، کراچی، ادارہ علم وفن، الفلاح ہاؤسنگ پروجیکٹ، ملیر ہالٹ، اول، ۱۹۹۸ء۔

۴۵۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی کی وفات پر برنی نے اپنی تحریر میں جہاں والد سے ان کے تعلق پر روشنی ڈالی ہے وہاں ان کی دو کتابوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔ ''میرے والد اُن کی کتابوں بالخصوص 'تذکرہ' اور 'اشارات' کی کتابت کر چکے تھے۔'' کتابی دنیا، وفاتیات، ستمبر ۱۹۶۳ء، ص ۶۔

۴۶۔ انٹرویو (دیکھیے ضمیمہ)۔

۴۷۔ امداد صابری، ''دہلی کی یادگار ہستیاں'' محولہ بالا، ص: ۳۶۷۔

۴۸۔ بشیرالدین احمد: واقعات دارالحکومت دہلی، حصہ دوم، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۰ء ص ۱۸۸۔

۴۹۔ جامع مسجد کے جنوبی دروازے کے سامنے جو سڑک چلی گئی ہے وہ مٹیا محل کا بازار کہلاتا ہے۔ یہاں یہ جانب دست راست اس نام کا ایک بڑا محل تھا۔ سابق میں کچھ مکانات امراء کے بھی رہے ہوں گے۔ اب تو معمولی لوگ رہتے ہیں اور یہ سارے کا سارا محلہ مٹیا محل کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ مٹیا محل کی وجہ تسمیہ کچھ معلوم نہیں ہوتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب قلعہ بن رہا تھا تو شاہ جہاں بادشاہ کی عارضی اقامت کے لیے مٹیا محل بنایا گیا تھا۔ بعد میں یہ محل نواب عزیز آبادی بیگم کو جو کسی شاہزادے کی بیگم تھیں دے دیا گیا اور اسی سبب سے آگے چل کر وہ عزیز آبادی کی حویلی کہلانے لگا۔ کیوں کہ مٹیا محل ہی کے سامنے عزیز آبادی بیگم کی حویلی تھی جو مدت تک نواب مغل بیگ خاں کے تصرف میں رہی۔ اس حویلی کے احاطے میں ایک شکستہ مسجد تھی جس کو مولوی صدرالدین خاں صاحب صدر الصدور نے بہ صرفہ کثیر درست کرا کے ایک کنواں بھی کھدوایا۔ یہ مسجد وسعت میں اچھی خاصی ہے جس کا ایک گنبد اور دو مینار ہیں لیکن اس مسجد کا کوئی خاص نام نہیں ہے البتہ حویلی اور وہ احاطہ جس میں یہ حویلی ہے تاریخی لحاظ سے ایک بڑا مقام ہے کیوں کہ اس کے احاطے میں بعض بہت پرانی عمارتوں کے کھنڈر ہیں اور لوگ انھیں کو مٹیا محل کا بچا کھچا حصہ بتلاتے ہیں۔ الغرض بہادر شاہ ثانی نے یہ حویلی اپنے کسی پوتے کو دیدی۔ غدر کے بعد تمام مکانات شاہی ضبط ہوئے اور پھر فروخت کیے گئے تو نواب صاحب دوجانہ نے اس حویلی کو خرید لیا اور مٹیا محل اور عزیز آبادی کی حویلی دونوں نام جا کر اب یہ احاطہ نواب صاحب دوجانے کے نام سے مشہور ہے۔ (بشیرالدین احمد: واقعات دارالحکومت دہلی، حصہ دوم، اردو اکادمی، دہلی، فروری ۱۹۹۰ء ص ۱۴۸۔۱۴۷)

۵۰۔ ''میری زندگی کے بارے میں'' (غیر مطبوعہ) از برنی مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء، ص ا۔

۵۱۔ بشیرالدین احمد ''واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی''، حصہ دوم میں لکھتے ہیں ''کوچہ فولاد خاں میں داخل ہونے کے بعد کوئی پچاس قدم چل کر دائیں ہاتھ کو کوچہ چیلاں ہے۔ اصل میں اس کا نام چہل کوچہ تھا کیوں کہ اس میں متعدد کوچے تھے عوام میں چیلوں کا کوچہ مشہور ہو گیا۔'' (بشیرالدین احمد ''واقعاتِ دارالحکومتِ دہلی''، حصہ دوم، اردو اکادمی، دہلی، فروری ۱۹۹۰ء ص ۱۷۱۔)
ملا واحدی ''میرے زمانے کی دلی'' میں لکھتے ہیں ''کوچہ چیلاں کا نام دراصل کوچہ چہل امیراں (یہ نام مجھے مصلح الدین نے بتایا تھا جو دلی کی بولتی تاریخ مانے جاتے تھے) تھا۔ جس طرح کوچہ ناتواں کا کوچہ نٹوان بن گیا۔ یا جس طرح بوعلی شاہ بختیاری کی رہائش گاہ کو بھوری بھٹیاری کے محل کہنے لگے، اسی طرح کوچہ چہل امیراں کو کوچہ چیلاں کہنے لگے۔ کوچہ چیلاں میں کبھی صرف چالیس امراء کے مکانات تھے۔ اُن امراء کے جنھیں بادشاہ کے قریب رہنا چاہیے تھا۔ کوچہ چیلاں قلعے کے بالکل نزدیک ہے'' (ملا واحدی ''میرے زمانے کی دلی''، کراچی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۶۔)

۵۲۔ ملا واحدی، دلی کے تین پنجابی عاشق، کراچی، روزنامہ جنگ، ۲ دسمبر ۱۹۶۸ء۔

۵۳۔ ضیاءالدین کے انتقال پر ملا واحدی کا مضمون، ۱۱ مئی ۱۹۶۹ء جنگ، کراچی۔

۵۴۔ بیگم ذاکر اعجاز، ''عظمتِ رفتہ کا مصنف خود عظمتِ رفتہ بن گیا'' سنڈے ایڈیشن، جنگ، کراچی، ۱۶ جون ۱۹۶۹ء۔

۵۵۔ ملا واحدی، ''میرے زمانے کی دلی''، کراچی، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۳۔

۵۶۔ دیکھیے: مکاتیب اقبال جلد اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی ۱۹۹۴ء اردو اکادمی، دہلی ص ۳۷۹۔

۵۷۔ واقعات دارالحکومتِ دہلی، حصہ دوم، اردو اکادمی، دہلی، فروری ۱۹۹۰ء ص:۶۔۱۷۔

۵۸۔ میمونہ صاحبہ (المعروف میمونہ آپا) جن کی عمر کوئی ۸۰ سال سے زیادہ ہے۔ منشی عبدالقدیر، ضیاءالدین احمد برنی کے برادر بزرگ، کی بڑی بیٹی ہیں اور صلاح الدین، کمال کبریا اور علاءالدین خالد کی بہن ہیں۔

۵۹۔ یہ انٹرویو راقم نے ۹ را پریل ۲۰۰۶ء کو میمونہ صاحبہ کے گھر کشمیر بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں لیا۔

۶۰۔ ضیاءالدین احمد برنی: عظمتِ رفتہ، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۶۱ء، ص ۴۶۲۔

۶۱۔ دیکھیے عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۳۔

۶۲۔ مکاتیب ابوالکلام آزاد، ترتیب و مقدمہ ابوسلمان شاہجہاں پوری، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۸ء، ص ۱۵۔

۶۳۔ امداد صابری، تاریخ صحافتِ اردو، ص ۱۴۶۔

۶۴۔ ضیاءالدین احمد برنی: ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا ص ۴۵۷۔

۶۵۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری: مولانا محمد علی اور ان کی صحافت، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی، دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۱۱۶۔

۶۶۔ ملا واحدی، ''دلی کے تین پنجابی عاشق''، دلی جو ایک شہر تھا، کراچی، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، اول، ۲۰۰۳ء، ص ۹۳۔

۶۷۔ عبدالستار چودھری، ''ظہیر الدین احمد''، ماہنامہ کتاب، لاہور، جلد ۸، شمارہ ۲ نومبر ۱۹۷۳ء، ص ۳۴۔ ظہیر الدین احمد ولد منشی عبدالقدیر، اردو مرکز، لاہور کے بانی اور مالک تھے۔

۶۸۔ ضیاءالدین احمد برنی، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۴۔

۶۹۔ ملا واحدی، ''دلی کے تین پنجابی عاشق'' محولہ بالا، ص ۹۳۔

۷۰۔ علاءالدین خالد، پشتِ سرورق، ماہنامہ کتابی دنیا، کراچی، اپریل مئی ۱۹۹۰ء۔

۷۱۔ ضیاءالدین احمد برنی: ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۷۔۴۵۶۔

۷۲۔ ملا واحدی: ''دلی کے تین پنجابی عاشق''، دلی جو ایک شہر تھا، کراچی، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، اول، ۲۰۰۳ء، ص ۹۳۔

۷۳۔ ملا واحدی، ''دلی کے تین پنجابی عاشق'' محولہ بالا، ص ۹۳۔

۷۴۔ نقاد، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۷ء

۷۵۔ سالنامہ مہک، گوجرانوالہ نمبر ۱۹۸۲ء، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ ص ۶

۷۶۔ علاءالدین خالد: محترمہ فاطمۃ الکبریٰ رحمۃ اللہ علیہا، کراچی، جنگ، س۔ن۔

۷۷۔ ضیاءالدین احمد برنی، عظمتِ رفتہ، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۶۱ء، ص ۴۵۵۔

۷۸۔ امداد صابری، ''جناب منشی محمد الدین صاحب ایڈیٹر دارالعلوم دہلی'' دہلی کی یادگار ہستیاں، کامل صدیقی و ریاض صدیقی، چوڑی والان، دہلی، ص ۳۶۷۔

۷۹۔ ضیاءالدین احمد برنی: ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ، (ترمیم شدہ) غیر مطبوعہ، ص: ۴۵۳۔۴۵۴

۸۰۔ امداد صابری: ''منشی محمد الدین صاحب'' تاریخ صحافتِ اردو.........، ص ۳۶۸۔

۸۱۔ ضیاءالدین احمد برنی: ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ محولہ بالا، ص: ۴۵۵۔

۸۲۔ ملا واحدی، دلی کے تین پنجابی عاشق، کراچی، روزنامہ جنگ، ۲ دسمبر ۱۹۶۸ء، ص ۹۳۔۹۲۔

۸۳۔ امداد صابری، دہلی کی یادگار ہستیاں، محولہ بالا، ص ۳۶۹۔

۸۴۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، مولانا محمد علی اور ان کی صحافت، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی، دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۱۱۵۔۱۱۶۔

۸۵۔ رسالہ مہک، ''گوجرانوالہ نمبر''، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ ۱۹۸۲ء ص: ۳۰۵۔

۸۶۔ علاءالدین خالد، پشتِ سرورق، کتابی دنیا، اپریل مئی، ۱۹۹۰ء، کراچی۔ یہ نسخہ علاءالدین خالد نے اردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے فوٹو آفسٹ پیپر پر دوبارہ شائع کیا۔ پشتِ سرورق کی یہ تحریر بہ طور اشتہار دی گئی ہے۔ کتابی دنیا، اپریل مئی ۱۹۹۰ء کے ٹائٹل پر اُس نادر نسخے کے صفحہ اول کا عکس دیا ہے۔ اندرون ٹائٹل پر اس الفی قرآن پاک کی سورہ فاتحہ اور پشتِ سرورق کے اندرون سورہ بقرہ کی چند آیات بالترتیب دی گئی ہیں۔ رسالے کی پشت پر ''قرآنِ مجید صنعتی الف'' کا اشتہار دیا گیا ہے۔

۸۷۔ علاءالدین خالد، محترمہ فاطمۃ الکبریٰ رحمۃ اللہ علیہا، کراچی، جنگ، س۔ن۔

۸۸۔ محمد راشد شیخ، تذکرہ خطاطین، کراچی، ادارہ علم و فن، ۱۹۹۸ء، ص ۷۹۔

۸۹۔ ضیاءالدین احمد برنی، عظمتِ رفتہ، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۶۱ء، ص ۴۶۱۔

۹۰۔ امداد صابری، ''جناب منشی محمد الدین صاحب ایڈیٹر دارالعلوم دہلی'' دہلی کی یادگار ہستیاں، محولہ بالا، ص ۳۶۹۔

۹۱۔ انٹرویو: عظمت اللہ سلیم۔

۹۲۔ ضیاءالدین احمد برنی، ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۴۔

۹۳۔ مولوی سید احمد دہلوی، ''خواجہ حالی علیہ الرحمہ کا پُر سہ اور باہمی تعلقات کا قابلِ ذکر تذکرہ'' تمدن، مارچ، ۱۹۱۵ء، ص ۳۱۔

۹۴۔ ضیاءالدین احمد برنی، ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۶۰۔۴۵۹۔

۹۵۔ ملا واحدی، دلی کے تین پنجابی عاشق، محولہ بالا، ص ۹۲۔

۹۶۔ امداد صابری، تاریخ صحافتِ اردو، محولہ بالا، ص ۱۴۸۔۱۴۹۔

۹۷۔ کتابی دنیا، محولہ بالا اپریل مئی ۱۹۹۰ء، ص۔

۹۸۔ ضیاءالدین احمد برنی: ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۵۔

۹۹۔ ایضاً، ص ۴۵۷۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۴۵۶۔

۱۰۱۔ امداد صابری، تاریخ صحافتِ اردو، محولہ بالا، ص ۱۴۵۔

۱۰۲۔ ضیاءالدین احمد برنی: ''آغا شاعر قزلباش''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۲۵۔

۱۰۳۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پور، ترتیب و مقدمہ، مکاتیبِ ابوالکلام آزاد، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۔

۱۰۴۔ ضیاءالدین احمد برنی، ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۶۰۔۴۵۸۔

۱۰۵۔ ایضاً، ص ۹۔

۱۰۶۔ ایضاً، ص ۱۰۔

۱۰۷۔ امداد صابری، تاریخ صحافتِ اردو، محولہ بالا، ص ۱۳۵۔

۱۰۸۔ ضیاءالدین احمد برنی: ''جناح میموریل ہال کیسے بنا؟''، کراچی، ماہ نو، نومبر ۱۹۴۸ء، ص ۵۵۔

۱۰۹۔ ضیاءالدین احمد برنی: ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۸۔

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۴۵۹۔

۱۱۱۔ ایضاً۔

۱۱۲۔ امداد صابری، تاریخ صحافتِ اردو، محولہ بالا، ص ۱۴۶۔

۱۱۳۔ ایسے ہی ایک خط کا تذکرہ، عندالملاقات ڈاکٹر ابوسلمان شہجہاں پوری صاحب نے بھی کیا تھا۔ وہ خط ان کے ذخیرے میں موجود ہے مگر باوجود راقم کے بے حد اصرار تلاشِ بسیار کے بازیافت نہیں ہو سکا۔

۱۱۴۔ ضیاءالدین احمد برنی: ''منشی محمد الدین''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۹۔

۱۱۵۔ ایضاً

۱۱۶۔ ملا واحدی: ''دلی کے تین پنجابی عاشق''، دلی جو ایک شہر تھا!، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، اول، ۲۰۰۳ء، ص ۹۲۔

۱۱۷۔ ملا واحدی، میرے زمانے کی دلی، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۰۔

۱۱۸۔ امداد صابری: ''جناب منشی محمد الدین صاحب ایڈیٹر دارالعلوم دہلی'' دہلی کی یادگار ہستیاں، محولہ بالا، ص ۳۷۰۔

۱۱۹۔ ملا واحدی: ''دلی کے تین پنجابی عاشق''، دلی جو ایک شہر تھا!، محولہ بالا، ص ۹۲۔

۱۲۰۔ ضیاءالدین احمد برنی، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۶۲۔

۱۲۱۔ امداد صابری، تاریخ صحافتِ اردو، محولہ بالا ۱۳۵، ۱۴۳۔۱۴۲۔

۱۲۲۔ علاء الدین خالد: ''برعظیم میں ہماری سیاست''، صحافت اور جمہوریت، مترجمہ: نیر علوی، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ستمبر ۱۹۶۸ء، ص ا۔ اسی بیان کو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بھی اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ دیکھیے: ''منشی عبدالقدیر اور ان کی نایاب کتاب'' مشمولہ شخصیات اور ادبیات، لاہور، مکتبہ عالیہ، اردو بازار، اول، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲۳۔

۱۲۳۔ ضیاءالدین احمد برنی، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۵۴۔

۱۲۴۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری: مولانا محمد علی اور ان کی صحافت، محولہ بالا، ص ۱۱۶۔

۱۲۵۔ ضیاءالدین احمد برنی، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۶۵۔

۱۲۶۔ یہ انٹرویو ۱۹ اپریل کی رات میمونہ اختر کے گھر واقع کشمیر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور میں رات گیارہ سے بارہ بجے کے درمیان راقم نے لیا۔

۱۲۷۔ ایضاً، ص ۴۶۵۔۴۶۴۔

۱۲۸۔ یہ وہ ڈائری ہے جس میں خاندان کے کئی افراد کی ولادت اور وفات کی تاریخیں درج ہیں۔ خیال ہے کہ یہ تاریخیں علاءالدین خالد نے تحریر کیں۔ اب یہ ڈائری علاءالدین خالد کے صاحب زادے عزیز خالد کے پاس محفوظ ہے۔

۱۔ یہ شجرہ راقم کے اصرار پر اس خاندان کے دو بزرگ قیوم صاحب اور عظمت اللہ سلیم صاحب نے اپنی یادداشتوں کی بنیادوں پر ترتیب دیا ہے۔ راقم نے گوجرانوالہ میں ان بزرگوں کے ساتھ بیٹھ کر مذکورہ شجرے کی ترتیب کا آغاز کروایا۔ اس شجرے کی ترتیب میں ضیاءالدین احمد برنی کی ایک عزیزہ حال مقیم امریکا سے بھی کسی قدر مدد لی گئی۔ درست اور صحیح شجرے کی ترتیب میں آجانے کے لیے قیوم صاحب اور عظمت اللہ سلیم اور ان کے خاندان کے بعض افراد کو بار بار خطوط لکھے گئے۔ ریاض احمد برنی صاحب کو بھی کراچی میں دکھایا گیا۔ انھوں نے بعض مقامات پر تصحیح کی۔

۱۳۰۔ یہ معلوم محترمہ زاہدہ خاتون بنت ظہیر الدین بن منشی عبدالقدیر نے ایک خط کے ذریعے فراہم کیں۔ راقم گوجرانوالہ میں عظمت اللہ سلیم کے گھر پر ان سے ملاقات کر چکا ہے۔

۱۳۱۔ ''دلی کے تین پنجابی عاشق''، کراچی، روزنامہ جنگ، ۲۰ دسمبر ۱۹۶۸ء۔

۱۳۲۔ ڈاکٹر خلیق انجم، ''منشی عبدالقدیر''، ماہ نامہ ساقی، کراچی، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۳۴۔

۱۳۳۔ محمد راشد شیخ، حاشیہ ''تذکرہ خطاطین''، کراچی، ادارہ علم و فن، الفلاح ہاؤسنگ پروجیکٹ، ملیر ہالٹ، اول، ۱۹۹۸ء، ص ۸۰۔

۱۳۴۔ ڈاکٹر محمد اعظم چودھری (مرتب)، منشی عبدالقدیر، تعارف، آزاد ہند فوج، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، جنوری ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۷۔

۱۳۵۔ یہ معلوم محترمہ زاہدہ خاتون بنت ظہیر الدین بن منشی عبدالقدیر نے ایک خط کے ذریعے فراہم کیں۔

۱۳۶۔ ایضاً۔

۱۳۷۔ خلیق انجم، منشی عبدالقدیر، محولہ بالا، ص ۳۲۔

۱۳۸۔ علاء الدین خالد، ''برعظیم میں ہماری سیاست''، صحافت اور جمہوریت، مترجمہ: نیر علوی، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ستمبر ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۸۔ اسی بیان کو ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بھی اپنے مضمون میں نقل کیا ہے۔ دیکھیے: ''منشی عبدالقدیر اور ان کی نایاب کتاب'' مشمولہ شخصیات اور ادبیات، لاہور، مکتبہ عالیہ، اردو بازار، اول، ۱۹۹۵ء ص ۲۲۳۔

۱۳۹۔ ڈاکٹر محمد اعظم چودھری (مرتب)، منشی عبدالقدیر، محولہ بالا، ص ۱۵۷۔

۱۴۰۔ خلیق انجم: منشی عبدالقدیر، محولہ بالا، ص ۳۴۔

۱۴۱۔ ایضاً۔

۱۴۲۔ ایضاً۔

۱۴۳۔ ایضاً۔

۱۴۴۔ محولہ بالا، ص ۱۵۷۔

۱۴۵۔ محولہ بالا، ص ۳۴۔

۱۴۶۔ علاء الدین خالد، ''برعظیم میں ہماری سیاست''، محولہ بالا، ص ا۔

۱۴۷۔ امداد صابری، تاریخ صحافت اردو، جلد ۵، ۱۹۸۳ء ص ۸۴۷۔

۱۴۸۔ علاء الدین خالد، ''برعظیم میں ہماری سیاست''، محولہ بالا، ص ا۔

۱۴۹۔ ایضاً۔

۱۵۰۔ خلیق انجم: منشی عبدالقدیر، محولہ بالا، ص ۳۴۔

۱۵۱۔ منشی عبدالقدیر کے بارے میں سنگل پیپر۔ حوالہ عظمت اللہ سلیم سے معلوم کرنا ہے۔

۱۵۲۔ مولانا ماہر القادری: ضیاء الدین احمد برنی، مشمولہ ''یادِ رفتگاں''، طالب ہاشمی (مرتب)، طبع اول، لاہور، البدر پبلی کیشنز، مارچ ۱۹۸۴ء، حصہ اول، ص: ۳۸۳۔

۱۵۳۔ ملا واحدی، میرے زمانے کی دلّی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۷۔

۱۵۴۔ ایضاً۔

۱۵۵۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری نے اپنی تالیف ''مولانا محمد علی اور ان کی صحافت''، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۶، میں تحریر کیا ہے کہ منشی محمد الدین نے دار العلوم، غنی المطابع اور الماس پریس کے نام سے مختلف اوقات میں پریس بھی قایم کیے۔ یہ درست نہیں ہے۔ غنی المطابع اور الماس پریس منشی عبدالقدیر دہلوی نے قایم کیے تھے۔ عبدالستار چودھری نے بھی انھیں مذکورہ دونوں پریسوں کا مالک قرار دیا ہے۔ دیکھیے: ''ظہیر الدین احمد، ماہنامہ کتاب، لاہور، نومبر ۱۹۷۳ء، ص ۳۴۔ علاء الدین خالد کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ دیکھیے: صحافت اور جمہوریت، اردو

اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ا۔

۱۵۶۔ علاء الدین خالد: ''برعظیم میں ہماری سیاست''، صحافت اور جمہوریت، محولہ بالا، ص ا۔۱۳۱۔

منشی عبدالقدیر کی عادات، فن خوش نویسی سے دل چسپی، اردو زبان پر سند ہونے کا فخر، ان کی سیاسی جدوجہد اور قید و بند سے متعلق معلومات کے لیے دیکھیے: یادوں کا سفر از اخلاق احمد دہلوی،

۱۵۷۔ خلیق انجم، منشی عبدالقدیر، محولہ بالا، ص ۳۴۔

۱۵۸۔ عبدالستار چودھری، ظہیر الدین احمد، ماہنامہ کتاب، لاہور، نومبر ۱۹۷۳ء، ص ۳۴۔

۱۵۹۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ''مولانا محمد علی جوہر کی تدفین اور سر شیخ عبدالقادر کی روایت''، شخصیات اور ادبیات، مکتبہ عالیہ اردو بازار ،لاہور، اول، ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۶۔

۱۶۰۔ صفدر ادیب، اردو مرکز، ماہنامہ کتاب، لاہور، جنوری ۱۹۶۸ء، ص ۵۔

۱۶۱۔ عظمت اللہ سلیم صاحب حوالہ بتائیں گے۔ ایک صفحہ منشی عبدالقدیر کے حالات۔

۱۶۲۔ خلیق انجم، ''منشی عبدالقدیر''، ماہ نامہ ساقی، کراچی، ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۳۴۔

۱۶۳۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۱۶۴۔ ایضاً۔

۱۶۵۔ ایضاً۔

۱۶۶۔ ایضاً۔

۱۶۷۔ ملا واحدی، ''دلی کے تین پنجابی عاشق''، محولہ بالا، ص ۹۶۔

۱۶۸۔ ملا واحدی، ''ملا واحدی کے قلم سے'' روزنامہ جنگ کراچی، مئی ۱۹۶۹ء۔

۱۶۹۔ امداد صابری: تاریخ جرم و سزا، جلد اول کا دوسرا حصہ، ۱۹۴۶ء دہلی، ص ۹۔

۱۸۰۔ یہ معلومات انھوں نے راقم کے خواہش پر فراہم کیں۔

۱۸۱۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن: ''مولانا محمد علی جوہر کی تدفین اور سر شیخ عبدالقادر کی روایت''، شخصیات اور ادبیات، مکتبہ عالیہ اردو بازار ،لاہور، اول، ۱۹۹۵ء، ص ۲۱۶۔

۱۸۲۔ یہ معلومات انھوں نے راقم کے خواہش پر فراہم کیں۔

۱۸۳۔ انتقال کی یہ تاریخ اس ڈائری سے نقل کی گئی ہے جس میں خاندان کے کئی افراد کی ولادت اور وفات کی تاریخیں درج ہیں۔ خیال ہے کہ یہ تاریخیں علاء الدین خالد نے تحریر کیں۔ اب یہ ڈائری علاء الدین خالد کے صاحب زادے عزیز خالد کے پاس محفوظ ہے۔

۱۸۴۔ ملا واحدی، ''میرے زمانے کی دلّی'' محولہ بالا، ص ۴۲۔

۱۸۵۔ منشی عبدالقدیر، ڈاکٹر محمد اعظم چودھری (مرتب)، تعارف، آزاد ہند فوج، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، جنوری ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۷۔

۱۸۶۔ زاہدہ خاتون کی تحریر۔

۱۸۷۔ (الف) عبدالستار چودھری، ''ظہیر الدین احمد''، ماہنامہ کتاب، لاہور، قومی کتاب مرکز پاکستان، جلد ۸، شمارہ ۲، نومبر ۱۹۷۳ء،
(ب) صفدر ادیب، ''اردو مرکز'' کتاب، لاہور، قومی کتاب مرکز پاکستان، جنوری ۱۹۶۸ء۔

۱۸۸۔ میمونہ اختر کا انٹرویو، ۱۹ اپریل ۲۰۰۶ء۔ انھوں نے اپنے انٹرویو میں یہ بھی بتایا تھا کہ ہم بہن بھائیوں کو برنی صاحب ہی کالجوں میں داخل

کروایا۔ بھائیوں کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اپنے شوق سے برنی صاحب ہی نے داخل کروایا تھا۔

۱۸۹۔ ایضاً۔

۱۹۰۔ ایضاً۔

۱۹۱۔ سید یوسف بخاری: ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' کتابی دنیا دسمبر ۵۵ء ص ۱۱۔

۱۹۲۔ سید انور حسین نفیس رقم، ''خطاطانِ قرآن'' سیارہ ڈائجسٹ، قرآن نمبر جلد اول، لاہور، ـــــ ، ص ۸۲۱۔ جب کہ علاءالدین خالد نے ان کی پیدائش دہلی کی لکھی ہے۔ دیکھیے۔ علاءالدین خالد: محترمہ فاطمۃ الکبریٰ رحمۃ اللہ علیہا، کراچی، جنگ، س۔ن۔ ضیاءالدین احمد برنی نے عظمت رفتہ (ترمیم شدہ) میں منشی محمد الدین کا دہلی میں ورود کا ـــــ ۱۸۸۶ء لکھا ہے۔ چناں چہ سید انور حسین نفیس رقم کے بیان پر یقین کیا جاسکتا ہے۔ ملا واحدی نے ایک مقام پر ان کی پیدائش دہلی تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''منشی محمد دین میری پیدائش [۱۷ مئی ۱۸۸۸ء] سے پہلے دلی پہنچے تھے۔ پھر دلی میں ایسے جے کہ مرکر دلی ہی میں دفن ہوئے۔ فقط منشی عبدالقدیر پنجاب نژاد ہیں باقی تمام اولاد دلی میں پیدا ہوئی۔'' دیکھیے: ''منشی محمد دین''، دلی جو ایک شہر تھا!، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، اول، ۲۰۰۳ء

، ص ۹۲۔ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے رسالے ''مہک'' کے گوجرانوالہ نمبر میں ان کی ولادت جنڈیالہ ڈھاب والا ضلع گوجرانوالہ کی ظاہر کی گئی ہے۔ دیکھیے: رسالہ مہک، ''گوجرانوالہ نمبر''، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ، ۱۹۸۲ء، ص: ۳۰۶۔ عظمت اللہ سلیم صاحب کا بھی یہی کہنا ہے کہ وہ اپنے ننھیال میں پیدا ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں عظمت اللہ سلیم صاحب نے ایک ایسی روایت کا ذکر کیا ہے جس کے تحت بچے کی ولادت کے زمانے میں ماں اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی روایت کی نشان دہی ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے اپنی تصنیف ''علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن (حیات وافکار)'' اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اول، ۱۹۸۱ء ص ۲۴، میں، سید میر حسن کی پیدائش کے تذکرے کے ذیل میں بھی کی ہے وہ لکھتے ہیں: ''.....انھوں نے اپنی والدہ ماجدہ چراغ بی بی بنت حرمت علی شاہ سے خود سنا تھا کہ میر صاحب اپنے ننہال موضع فیروز والا ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے۔ میر صاحب کی والدہ ماجدہ فیروز والا کی رہنے والی تھیں۔ پہلے بچے کی پیدائش کے موقع پر لڑکی عام طور پر اپنے میکے جایا کرتی ہے۔'' غالباً ان دنوں منشی محمد الدین ملتان میں ہوں گے۔ برنی کے قول کے مطابق وہ ۱۸۸۶ء میں دہلی گئے۔

۱۹۳۔ میمونہ اختر نے بھی اپنے انٹرویو میں کہا ہے کہ ہمارے گھر میں لڑکیوں کو باہر تعلیم کے لیے نہیں بھیجا جاتا تھا، مگر برنی صاحب نے مجھے اسکول میں داخل کروایا اور وظیفہ دلوایا تھا، وہ روشن خیال تھے اور چاہتے تھے کہ لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کریں۔

۱۹۴۔ میمونہ اختر کا انٹرویو، ۱۹ اپریل ۲۰۰۶ء، لاہور، بہ مقام کشمیر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، گیارہ اور بارہ بجے کی درمیانی شب۔

۱۹۵۔ ایضاً

۱۹۶۔ طالب ہاشمی: ''آپا فاطمۃ الکبریٰ'' مشمولہ تاریخ اسلام کی سو نام ور خواتین، ص ۶۷۲۔

۱۹۷۔ میمونہ اختر کا انٹرویو۔

۱۹۸۔ جب کہ ''آپا فاطمۃ الکبریٰ'' مشمولہ تاریخ اسلام کی سو نام ور خواتین از طالب ہاشمی میں ان کے انتقال ۱۳۵۳ھ بہ مطابق ۱۹۳۴ء درج ہے جب کہ سید انور حسین نفیس رقم نے بھی ان کا انتقال ۱۹۳۳ء لکھا ہے۔ دیکھیے: سید انور حسین نفیس رقم، ''خطاطانِ قرآن'' سیارہ ڈائجسٹ، قرآن نمبر جلد اول، لاہور، ـــــ ، ص ۸۲۱۔

۱۹۹۔ علاءالدین خالد، اداریہ، کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء۔

۲۰۰۔ ایضاً۔

۲۰۱۔ ایضاً۔

۲۰۲۔ رسالہ مہک، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ، ص ۳۰۵۔

۲۰۳۔ علاءالدین خالد، اداریہ، کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء۔

۲۰۴۔ علاءالدین خالد: محترمہ فاطمۃ الکبریٰ رحمۃ اللہ علیہا، کراچی، جنگ، س۔ن۔

۲۰۵۔ علاءالدین خالد، اداریہ، کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء۔

۲۰۶۔ ایضاً

۲۰۷۔ رسالہ مہک میں مضمون نگار لکھتے ہیں: ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد وہ لاہور چلی آئیں۔ دو سال یہاں رہنے کے بعد کراچی منتقل ہوگئیں۔ کراچی میں ان کا قیام ناظم آباد والے مکان میں تھا۔

۲۰۸۔ ایضاً

۲۰۹۔ فاطمۃ الکبریٰ: مترجم جمائل شریف، چھتہ لال میاں دہلی، ۱۳۵۴ھ، ص ۸۱۶۔

۲۱۰۔ کتابی دنیا، کراچی، اپریل مئی ۹۰۔ تاریخ خطاطی از اعجاز راہی، ادارہ ثقافتِ پاکستان، ۱۹۸۶ء، میں کا تعارف ''حافظ محمد یوسف دہلوی'' سے کرایا گیا ہے۔ جب کہ یہ نام رسالہ ''شمع'' دہلی کے ایڈیٹر کا تھا۔ مماثلت کی وجہ سے التباس ہوا۔

۲۱۱۔ طالب ہاشمی: ''آپا فاطمۃ الکبریٰ'' مشمولہ تاریخ اسلام کی سو نامور خواتین، ص ۶۷۴۔

۲۱۲۔ رفیق خاور: ''سفیر خیال، خطاطی''، ماہِ نو، کراچی، ستمبر ۱۹۶۲ء، ص ۴۹۔

۲۱۳۔ سید یوسف بخاری: خطاطی اور ہمارا رسم الخط، کراچی، ایچ، ایم، سعید کمپنی، ناشران و تاجران کتب، مئی ۱۹۵۹ء، ص ۶۹۔

۲۱۴۔ علاءالدین خالد، اداریہ، کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۶۷ء۔

۲۱۵۔ محترمہ فاطمۃ الکبریٰ کی وفات پر تعزیت نامے، کتابی دنیا، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۷ء، ص ۲۲۔

۲۱۶۔ علاءالدین خالد کی ڈائری۔ تفصیل دیکھیے حوالہ نمبر ۱۳۰۔ آمنہ بیگم کی بیٹی رضیہ چودھری نے ان کا انتقال راولپنڈی میں لکھا ہے اور تاریخ انتقال ۱۱ اپریل ۱۹۷۲ء لکھی ہے۔ آمنہ بیگم سے متعلق بیشتر معلومات جو اس مقالے میں درج کی جا رہی ہیں، ان کی بیٹی نے میل کے ذریعے ریاض احمد برنی صاحب کو میری درخواست پر ارسال کی تھیں۔

۲۱۷۔ خوش نویسی کے باعث والد منشی محمد الدین اور برادرِ اکبر منشی عبدالقدیر دہلوی کی طرح لفظ ''منشی'' کے لاحقے سے ان کے نام کا بھی جزو بن گیا۔ ان کے والد منشی محمد الدین نے اپنی نام کے ساتھ ثم الدہلوی لکھنا اور کہلوانا پسند کیا منشی عبدالقدیر کو بھی دلی سے حد درجہ محبت تھی چناں چہ انھیں بھی دہلوی لکھنا اور کہلوانا پسند تھا، ضیاءالدین احمد برنی کو خواجہ حسن نظامی دہلوی لکھا کرتے تھے تاہم لفظ دہلوی ان کے نام کا جز نہیں بن سکا بلکہ وہ برنی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ بہ عینہ یوسف دہلوی کی عمر کا ایک بڑا حصہ دہلی میں گزرا چناں چہ انھیں بھی محمد یوسف دہلوی نام سے پکارا گیا۔ وہ اس نام ایسے مشہور ہوئے کہ آج تک اسی نام سے یاد کیے جاتیں ہیں۔

۲۱۸۔ محمد راشد شیخ: تذکرہ خطاطین، کراچی، ادارہ علم و فن، ۱۹۹۸ء، ص ۹۷۔ اگر ہجری تاریخ کو درست مان لیا جائے تو اس کے مطابق عیسوی تاریخ ۳ ستمبر ۱۸۹۴ء ہوگی۔ محمد راشد شیخ صاحب نے ۴ ستمبر ۱۸۹۴ء درج کی ہے۔

۲۱۹۔ المعارف، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۸۶ء، ص ۷۳۔

۲۲۰۔ محمد راشد شیخ: تذکرہ خطاطین، کراچی، ادارہ علم و فن، ۱۹۹۸ء، ص ۸۲۔

۲۲۱۔ رسالہ مہک، ''گوجرانوالہ نمبر''، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ، ۱۹۸۲ء، ص: ۳۰۶۔

۲۲۲۔ آہنگ، کراچی میں لکھا ہے کہ انھوں نے جامعہ دہلی سے بی اے کیا۔ دیکھیے: ''منشی محمد یوسف دہلوی'' ریڈیو پاکستان کا رسالہ ''آہنگ''

کراچی، یکم سے ۱۵ اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۲۳۔ ملا واحدی لکھتے ہیں کہ انھوں نے بی اے تک پڑھا ضرور ہے مگر پاس نہیں کیا۔ دیکھیے: برنی پر تعزیتی مضمون "ملا واحدی کے قلم سے"، رونامہ جنگ کراچی، مئی ۱۹۶۹ء۔

۲۲۳۔ علاءالدین خالد: خطاط اعظم محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۴۔

۲۲۴۔ محمد رضی دہلوی: بابائے خطاطی استاد محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۔

۲۲۵۔ ایضاً

۲۲۶۔ محمد راشد شیخ: تذکرہ خطاطین، کراچی، ادارہ علم وفن، ۱۹۹۸ء، ص ۹۷۔

۲۲۷۔ نسیم الحق عثمانی: فن خطاطی کا محسن اعظم۔ یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۸۔

۲۲۸۔ ایضاً، ص ۹۔

۲۔ ایضاً، ص ۸۔

۲۳۰۔ یوسف بخاری، سید نے اپنی تصنیف "خطاطی اور ہمارا رسم الخط" میں دیلمی کا نام "آغا عبدالرشید ویلمی" لکھا ہے، جب اکثر لکھنے والوں نے "د" کی جگہ "ذ" لکھا ہے خیال ہے کہ یہ سہو کاتب سے ہوا ہے۔ اس کتاب میں ویلمی کے شاگردوں کا تذکرہ بھی ہے۔ دیکھیے: "خطاطی اور ہمارا رسم الخط"، کراچی، ایچ، ایم، سعید کمپنی، ناشران وتاجران کتب پاکستان چوک، مئی ۱۹۵۹ء، ص ۹۷۔

۲۳۱۔ محمد رضی دہلوی: بابائے خطاطی استاد محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۱۲۔

۲۳۲۔ ایضاً۔

۲۳۳۔ ایضاً۔

۲۳۴۔ نسیم الحق عثمانی: فن خطاطی کا محسن اعظم۔ یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۹۔

۲۳۵۔ محمد راشد شیخ: تذکرہ خطاطین، کراچی، ادارہ علم وفن، ۱۹۹۸ء، ص ۹۷۔

۲۳۶۔ ن، د: منشی محمد یوسف دہلوی، آہنگ، کراچی، یکم تا ۱۵ اپریل، ۱۹۷۷ء، ص ۲۳۔

۲۳۷۔ محمد راشد شیخ: تذکرہ خطاطین، کراچی، ادارہ علم وفن، ۱۹۹۸ء، ص ۸۷۔

۲۳۸۔ نسیم الحق عثمانی: فن خطاطی کا محسن اعظم۔ یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۔

۲۳۹۔ احمد حسین صدیقی: دبستانوں کا دبستان کراچی، حصہ اول محمد حسین اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۴۳۰۔

۲۴۰۔ علاءالدین خالد: خطاط اعظم محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۴۔

۲۴۱۔ ایضاً۔

۲۴۲۔ محمد راشد شیخ: تذکرہ خطاطین، کراچی، ادارہ علم وفن، ۱۹۹۸ء، ص ۸۷۔

۲۴۳۔ مسعود احمد برکاتی: خطاط اعظم منشی محمد یوسف مرحوم، روزنامہ جنگ، کراچی، جنگ پریس، کراچی، بدھ ۶ اپریل، ۱۹۵۵ء۔

۲۴۴۔ ایضاً۔

۲۴۵۔ علاءالدین خالد: خطاط اعظم محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۴۔

۲۴۶۔ محمد رضی دہلوی: بابائے خطاطی استاد محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۔

۲۴۷۔ علاءالدین خالد: خطاط اعظم محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۴۔

۲۴۸۔ محمد رضی دہلوی: بابائے خطاطی استاد محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۔

# باب سوّم

## ضیاءالدین احمد برنی کے سوانح اوران کی علمی وادبی خدمات

☆۔ برنی کا اصل نام، لقب اور ولادت
☆۔ تعلیم
☆۔ برنی کے اساتذہ
☆۔ زمانۂ طالب علمی میں علمی وادبی سرگرمیاں
☆۔ برنی کی علمی وادبی زندگی کا آغاز
☆۔ برنی کے ہم جماعت اور دوست
☆۔ برنی اور خواجہ حسن نظامی
☆۔ برنی اور مولانا محمد علی جوہر
☆۔ برنی اور علامہ اقبال
☆۔ برنی کی شخصیت
☆۔ برنی کی ملازمتیں
☆۔ برنی کی صحافت سے وابستگی
☆۔ برنی کی فارسی زبان سے دل چسپی
☆۔ انجمنوں اور سوسائٹیوں سے وابستگی
☆۔ برنی کی ازدواج اور اولاد
☆۔ برنی کی دوسری بیگم آمنہ بانو
☆۔ ضیاءالدین احمد برنی کی اولاد
☆۔ برنی کی پاکستان آمد
☆۔ برنی کی علالت اور وفات
☆۔ قطعۂ تاریخ وفات
☆۔ برنی کا ذکر اردو کتب میں
☆۔ برنی کا ذکر انگریزی کتب میں

۲۴۹۔ مسعود احمد برکاتی: خطاط اعظم منشی محمد یوسف مرحوم، روزنامہ جنگ، کراچی، جنگ پریس، کراچی، بدھ ۱۶ اپریل، ۱۹۵۵ء۔

۲۵۰۔ محمد رضی دہلوی: بابائے خطاطی استاد محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۔

۲۵۱۔ ایضاً، ص ۱۳۔

۲۵۲۔ ایضاً۔

۲۵۳۔ ایضاً۔

۲۵۴۔ محمد راشد شیخ: تذکرہ خطاطین، کراچی، ادارہ علم و فن، ۱۹۹۸ء، ص ۸۷۔

۲۵۵۔ محمد یوسف دہلوی، مہک، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ ۸۲۔۱۹۸۴ء، ص ۲۰۶۔

۲۵۶۔ محمد رضی دہلوی: بابائے خطاطی استاد محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۱۴۔

۲۵۷۔ علاء الدین خالد: خطاطِ اعظم محمد یوسف دہلوی، کتابی دنیا، کراچی، فروری، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۴۔

۲۵۸۔ مسعود احمد برکاتی: خطاط اعظم منشی محمد یوسف مرحوم، کراچی، روزنامہ جنگ، جنگ پریس، کراچی، بدھ ۱۶ اپریل ۱۹۷۷ء۔

اس سلسلے میں راقم ان کی پیدائش اور انتقال کی تاریخیں ہجری کیلنڈر کی ویب سائٹ: www.rabiah.com پر جانچ چکا ہے اور انھی کے مطابق لکھی ہیں۔

۲۵۹۔ محشر بدایونی: قطعہ تاریخ وفات، آہنگ، ریڈیو پاکستان کا رسالہ، کراچی یکم سے ۱۵ اپریل ۱۹۷۷ء، ص ۲۳۔

۲۶۰۔ روزنامہ امن، کراچی، ۱۱ر مارچ ۱۹۷۷ء۔

۲۶۱۔ روزنامہ جنگ، کراچی، ۱۲ر مارچ ۱۹۷۷ء۔

۲۶۲۔ روزنامہ اعلان، کراچی، ۱۱ر مارچ ۱۹۷۷ء۔

۲۶۳۔ برنی نے اپنی خودنوشت ''میری زندگی کے بارے میں'' میں ان سے متعلق ایک واقعہ درج کی ہے جس سے ان کی نوجوانی میں ناگہانی موت کا پتا چلتا ہے اور یہ کہ برنی کو ان سے کس قدر محبت تھی۔

# باب سوّم

## ضیاء الدین احمد برنی کے سوانح اور ان کی علمی و ادبی خدمات

☆۔ برنی کا اصل نام، لقب اور ولادت

☆۔ تعلیم

☆۔ برنی کے اساتذہ

☆۔ زمانہ طالب علمی میں علمی و ادبی سرگرمیاں

☆۔ برنی کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز

☆۔ برنی کے ہم جماعت اور دوست

☆۔ برنی اور خواجہ حسن نظامی

☆۔ برنی اور مولانا محمد علی جوہر

☆۔ برنی اور علامہ اقبال

☆۔ برنی کی شخصیت

☆۔ برنی کی ملازمتیں

☆۔ برنی کی صحافت سے وابستگی

☆۔ برنی کی فارسی زبان سے دل چسپی

☆۔ انجمنوں اور سوسائٹیوں سے وابستگی

☆۔ برنی کی ازدواج اور اولاد

☆۔ برنی کی دوسری بیگم آمنہ بانو

☆۔ ضیاء الدین احمد برنی کی اولاد

☆۔ برنی کی پاکستان آمد

☆۔ برنی کی علالت اور وفات

☆۔ قطعہ تاریخ وفات

☆۔ برنی کا ذکر اردو کتب میں

☆۔ برنی کا ذکر انگریزی کتب میں

# باب سوّم:

# ضیاء الدین احمد برنی کے سوانح اوران کی علمی وادبی خدمات

## برنی کا اصل نام، لقب اور ولادت:

اُن کا اصل نام ضیاء الدین احمد تھا اور قلمی نام ضیاء الدین احمد برنی۔ علاوہ ازیں ان کی بعض تحریں ضیاء الدین احمد برنی بی اے کے نام سے بھی شایع ہوئیں۔ بیشتر کتابوں پر ان کا یہی نام درج ہے۔ بمبئی کی زندگی میں وہ زیڈ اے برنی کے نام سے مشہور رہے۔ تاہم انھوں نے ضیاء الدین احمد برنی کے نام سے شہرت پائی۔ ''برنی'' لقب خواجہ حسن نظامی (م:۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء) نے عطا کیا۔(۱) وہ ۳ فروری ۱۸۹۰ء کو دہلی کے مشہور محلے ٹیا محل (۲) میں پیدا ہوئے۔(۳)

## تعلیم:

برنی کے حسنِ سلیقہ کے باعث ان کے بعض تعلیمی دست آویزات محفوظ رہے۔ ان دست آویزات میں ان کے میونسپل پرائمری اسکول دہلی کا پاس سرٹیفکیٹ اور ڈسکرپٹو رول(Descriptive Roll)، وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول وزیرآباد، ضلع گوجرانوالہ، گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی کا میٹریکولیشن کا پاس سرٹیفکیٹ، سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی کے انٹرمیڈیٹ کا پاس سرٹیفکیٹ اور رپورٹ کارڈ اور بمبئی سول اینڈ ملٹری امتحانی کمیٹی جانب سے ''اورینٹل لینگویجز کی مدرسی'' کا جاری کیا جانے والا سرٹیفکیٹ، ہیں۔ ان دست آویز سے ان کے تعلیمی مدارج کو ایک خاص ترتیب میں لانے میں خاصی مدد حاصل ہوئی۔

## ابتدائی تعلیم:

ضیاءالدین احمد برنی کا گھرانہ علمی اور ایک لحاظ سے مذہبی گھرانہ تھا۔ ان کے والد نہ صرف دینی فرائض کے پابند تھے بلکہ مذہبی معاملات کی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ جس کے باعث انھیں بعض جگہ مذہبی عالم بھی لکھا گیا ہے۔ برنی کی والدہ حُسن بانو بھی دین دار خاتون تھیں۔ یقیناً برنی کے والدین نے ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسلامی گھرانوں کے روایتی طرز پر کی ہوگی۔

اس کے بعد برنی کو دہلی کے ایک مدرسے میں داخل کروایا گیا، جو محلّہ چھتہ شاہ جی (۴) میں واقع تھا۔ اس کا قدیم نام "مدرسہ ضلع" تھا جو بعد میں "میونسپل بورڈ اسکول" ہوگیا۔ اس میں میٹریکولیشن تک تعلیم دی جاتی تھی۔ (۵)

برنی اپنی ابتدائی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں:

> دلّی میں پرائمری تعلیم کا ایک بڑا مشہور سرکاری مدرسہ تھا جو چھتہ شاہ جی میں واقع تھا۔ میں نے اس میں ابتدائی تعلیم پائی۔ اس اسکول میں بعض بڑے بڑے لوگوں نے اپنے بچپن میں پڑھا ہے۔ مجھے اس زمانہ کے دو استاد اب تک یاد ہیں۔ ایک مولوی عبدالرزاق جو فارسی کے استاد تھے اور فارسی ایرانیوں کی طرح بولتے تھے، دوسرے تھے خلیفہ گھُن۔ یہ پرانی وضع کے پہلوان تھے مگر جدید قسم کی ڈرل وغیرہ سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ (۶)

اس اسکول سے حاصل ہونے والے دو دستاویز سے برنی کی ابتدائی تعلیم کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ایک "میونسپل پرائمری اسکول" دہلی کا پاس سرٹیفکیٹ اور دوسرا "ڈسکرپٹو رول" (Descriptive Roll)۔ دونوں سرٹیفکیٹ اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز کے دست خط سے جاری ہوئے ہیں۔ ڈسکرپٹو رول پر، جو کہ انگریزی زبان میں ہے، ڈسٹرکٹ اور تحصیل دہلی لکھا ہے۔ اسکول کا نام میونسپل بورڈ پرائمری اسکول دہلی (M.B Primary School,Delhi) (۷) تحریر ہے۔ طالب علم کی ذات کے خانے میں "شیخ" (Shaikh) لکھا ہوا ہے۔ (۸) اسکول چھوڑنے کی تاریخ اور اس وقت ان کی عمر بالترتیب ۳۰ ستمبر ۱۹۰۲ء اور بارھواں سال نواں مہینہ اور ستائیسواں دن درج ہیں۔ پاس سرٹیفکیٹ اپر پرائمری اسکول ایگزمینیشن (Uper primary School Examination) کی کامیابی کی صورت میں دیا گیا۔ یہ سرٹیفکیٹ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۲ء کو جاری ہوا۔ اس سرٹیفکیٹ سے پتا چلتا ہے کہ اس جماعت میں انھوں نے درج ذیل مضامین پڑھے جنھیں انگریزی ہی میں لکھا جاتا ہے:

1. Reading and 2. Writing in the URDU character

3. Arthmetic 4. English 5. Persian

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ ضیاءالدین احمد برنی نے ۱۹۰۲ء میں اَپر پرائمری اسکول یعنی پانچویں جماعت (۹) کا امتحان پاس کیا۔ انھی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اندازہ قائم کرسکتے ہیں کہ برنی کو ستمبر ۱۸۹۷ء کی کسی تاریخ کو مدرسے میں داخل کروایا گیا۔

کسی ذریعے سے یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ اس اسکول میں کون کون سے اساتذہ تعلیم دیا کرتے تھے، اور ان کا کیسا مزاج تھا اور وہ اپنے شاگردوں سے کس طرح پیش آیا کرتے تھے تاہم برنؔی کے مذکورہ بیان سے دو اساتذہ کے نام کا پتا چلتا ہے۔ جن

میں ایک فارسی کے لائق اور فائق استاد تھے۔

برنی نے اپنے ان ابتدائی اساتذہ کے حسنِ سلوک کو عمر کے آخری ایام تک یاد رکھا، جس کا تذکرہ وہ نہایت محبت سے کرتے ہیں: ''ہمارے اس اسکول میں ہندو اور مسلمان ٹیچر تھے اور بچوں سے بلا امتیازِ مذہب وملت بڑا پیار اور اخلاص رکھتے تھے''۔(۱۰) برنی کے رویے میں رواداری اور احترامِ انسانیت کے جو عناصر اخیر عمر تک رہے ان کی تعمیر و تشکیل میں یقیناً اس مدرسے کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔

## مڈل اسکول کی تعلیم:

میونسپل بورڈ پرائمری اسکول، دہلی سے ۱۹۰۲ میں پانچویں جماعت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد، ضیاء الدین احمد برنی اور ان کا خاندان (۱۱) دہلی سے عارضی طور پر اپنے گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا، گوجرانوالہ چلا گیا۔ اس قیام کے متعلق منشی محمد الدین کے حوالے سے اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ان کے والد کی وہاں زمین جائداد تھی اور ان کے عزیز و اقارب بھی گاؤں میں تھے۔ چناں چہ اُن کا آنا جانا رہا کرتا تھا۔ یہ قیام تین سال یا اس سے کچھ کم مدت پر مبنی تھا۔ لہٰذا اس دوران ضیاء الدین احمد برنی کو ۱۹۰۳ء کی کسی تاریخ میں وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول، وزیر آباد میں داخل کروایا گیا۔ یہ اسکول اب بھی موجود ہے اور ان کے گاؤں جنڈیالہ ڈھاب والا سے کوئی ۸ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور نزدیک ترین ہے۔(۱۲) اگرچہ اُس دور میں وزیر آباد میں اسکاچ مشن اسکول بھی تھا جو ۱۸۶۳ء میں قائم ہو گیا تھا۔(۱۳)

ضیاء الدین احمد برنی اس ضمن میں لکھتے ہیں ''والدین کو کچھ عرصے کے لیے پنجاب جانا پڑا اور میں وزیر آباد کے وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔''(۱۴)

وزیر آباد کے اس اسکول کے متعلق ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین (۱۵) ہمیں یہ معلومات فراہم کرتے ہیں:

> سیال کوٹ ضلع میں ۱۴ اپریل ۱۸۹۷ء کو ملکہ معظمہ کی ڈائمنڈ جوبلی بڑے شاندار طریقے سے منائی گئی بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کو اعلیٰ پیمانے پر منایا گیا۔ اس خوشی کے موقع پر اور یادگار کے طور پر سرکاری اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے تعلیمی اداروں کے نام بھی تبدیل کر کے ڈائمنڈ جوبلی کے نام سے منسوب کیا۔
>
> وزیر آباد کے گورنمنٹ ہائی اسکول کا نام وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول ہوا۔ اسی طرح سیال کوٹ کے گورنمنٹ ہائی اسکول کا نام بھی وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول ہوا۔ ساٹھ سالہ تخت نشینی کے موقع پر۔(۱۶)

مذکورہ اسکول سے برنی نے ۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۶ء تعلیم حاصل کی اور چھٹی، ساتویں اور مڈل یعنی آٹھویں جماعتیں پاس کیں۔ اگرچہ وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول، وزیر آباد کا کوئی سرٹیفکیٹ تو دست یاب نہیں ہو سکا، تاہم ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء، یکم دسمبر ۱۹۰۵ء اور ۳۱ جولائی ۱۹۰۶ء کے "Card of Good Hand Writing"(۱۷) دست یاب ہو سکے ہیں اور وہی ہمارے پیشِ نظر ہیں۔

ان کارڈوں میں سے دو پر ان کا نام ایک پر Ziauddin Ahmed اور دوسرے پر Zia-ud-din Ahmed اور کلاس کے خانے میں III اور .Dep کے خانے میں Middle درج ہے۔ ۲۵ نومبر ۱۹۰۵ء کو دیا جانے والا کارڈ انگریزی کی خوش خطی کے ذیل میں First Prize کے طور پر دیا گیا تھا۔ اس کارڈ پر اس وقت کے ہیڈ ماسٹر رشی رام کے دست خط ہیں۔ دوسرا کارڈ یکم دسمبر ۱۹۰۵ کو منیجر کے دست خط سے جاری ہوا۔ اس پر اوپر کی سطر میں First Good Degree اور دوسری سطر میں Awarded for regular attendance, diligence تحریر ہے۔ تیسرا کارڈ ۳۱ / جولائی ۱۹۰۶ء کو ہیڈ ماسٹر رشی رام کے دست خط سے جاری ہوا۔ یہ کارڈ بھی برنی کو انگریزی کی خوش خطی کے ذیل میں First Prize کے طور پر دیا گیا۔

ان کارڈوں سے ہمیں یہ پتا نہیں چلتا کہ برنی نے کون کون سے مضامین پڑھے اور ان کے کون کون سے اساتذہ تھے۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے اپنی تصنیف ''اقبال کی ابتدائی زندگی'' میں اس سے کچھ قبل کے زمانے مڈل کے سالانہ امتحان کے متعلق ہماری اس طرح رہنمائی کی ہے:

> ابتداء میں مڈل کا سالانہ امتحان ڈائرکٹر مدارس، سررشتہ تعلیم کے تحت ہوا کرتا تھا۔ ۱۸۸۲۔۸۳ء میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ اب یہ امتحان پنجاب یونی ورسٹی کے تحت ہو۔ کیوں کہ لاہور میں پنجاب یونی ورسٹی ۱۴/ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو قائم ہو چکی تھی۔ پہلے سال ہر طالب علم سے امتحان کے لیے ایک روپیہ فیس لی گئی۔ ۱۸۸۵ء میں دو روپے امتحانی فیس کر دی گئی اور ساتھ ہی ۱۸۸۶ء کے لیے تین روپے کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۸۸۷ء میں اس میں اور اضافہ کر دیا گیا اور پانچ روپے فیس ہو گئی۔
>
> ....انگریزی، اردو، ہندی یا گرمکھی (پنجابی) میں سے کسی ایک زبان میں طالب علم پرچہ حل کر سکتا تھا۔ چھ سے زیادہ مضامین لینے کی اجازت نہیں تھی۔ چار لازمی دو اختیاری۔ (۱۸)

ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، راقم کے نام ایک مکتوب میں کلاس Middle III کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

> ورنیکلر۔ مڈل؛ III۔ کلاس مڈل کی تھرڈ کلاس یعنی آٹھویں جماعت۔ چھٹی کو مڈل کی I۔ کلاس اور ساتویں کو مڈل کی II۔ کلاس کہتے تھے۔ (۱۹)

۱۸۹۰ء اور غالباً اس کے بعد تک آٹھویں جماعت میں عام طور پر یہ مضامین پڑھائے جاتے تھے: انگریزی، اردو، فارسی، عربی، ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ۔ (۲۰)

برنی نے جس زمانے میں تعلیم حاصل کی اس زمانے تک پنجاب میں دو طرح کی تعلیم دی جاتی تھی ایک ورنیکلر (Vernacular) اور اینگلو ورنیکلر (Anglo Vernacular)۔ (۲۱)

راقم کے ایک استفسار پر ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے ورنیکلر اور اینگلو ورنیکلر طرز تعلیم کی وضاحت کی اور ہر ممکن

کوشش کے بعد پنجاب گزٹ دیکھ کر ضیاء الدین احمد برنی کے آٹھویں جماعت کے نصاب اور ان تین کلاسوں کے نتائج کے متعلق یہ معلومات فراہم کیں:

> پنجاب گزٹ ۱۹۰۶ء میں صرف ورنیکلر مڈل امتحان ۱۹۰۶ء کا رزلٹ ہے یعنی ان مڈل اسکولوں کا رزلٹ ہے جہاں انگریزی کی تدریس نہیں ہوتی تھی۔ آپ نے وزیر آباد کا حوالہ دیا تو میں دوبارہ گزٹ دیکھنے گیا۔ وزیر آباد اسکول کا ذکر نہیں ملا۔ ورنیکلر مڈل امتحان منعقدہ میں ضلع سیالکوٹ رول نمبر ۱۳۰۶۔۱۳۷۹، ضلع گوجرانوالہ ۱۲۶۷۔۱۳۰۶ اور ضلع گجرات ۱۰۹۵۔۱۱۵۸۔ ان اضلاع میں وزیر آباد کے اسکول کا ذکر نہیں۔ وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں تھا اور ہے، اس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ برنی نے یونی ورسٹی کا امتحان نہیں دیا تھا بلکہ وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول وزیز آباد کا ہی آٹھویں جماعت کا امتحان ۱۹۰۶ء میں پاس کیا تھا۔
>
> مڈل میں انگریزی پڑھنے والوں کو اینگلو ورنیکلر کہا جاتا تھا۔ گزٹ میں اینگلو ورنیکلر ۱۹۰۶ کا رزلٹ نہیں۔ کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ (۲۲)

مذکورہ دلائل سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ضیاء الدین احمد برنی نے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول وزیز آباد سے ۱۹۰۶ء میں آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔

برنی کی ایک تحریر سے ہمیں اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے مزاج، طالب علموں کے ساتھ خاص کر ان کے ساتھ ایک اعلا افسر کے اچھے رویے اور یہ کہ ان کی اچھی کارکردگی اور اچھے اخلاق کے باعث وظیفہ جاری ہونے کا پتا چلتا ہے۔ برنی لکھتے ہیں:

> وہاں کے ہیڈ ماسٹر لالہ رشی رام بڑے سخت گیر اور بارعب آدمی تھے۔ انھی دنوں میں انسپکٹر آف اسکولز (خواجہ سجاد حسین) معائنے کے لیے ہمارے اسکول میں تشریف لائے۔ یہ مولانا حاؔلی کے صاحبزادے تھے اور غالباً والد نے میرے متعلق انھیں پہلے سے کہہ دیا ہوگا اس لیے کہ وہ خاص طور پر مجھ سے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے، اس گفتگو سے میں سب کی نگاہوں میں آ بھی گیا اور کچھ عرصے بعد میرا چار روپے ماہوار وظیفہ بھی ہو گیا۔ (۲۳)

اس واقعے کو ضیاء الدین احمد برنی کی سادگی ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے وظیفہ جاری ہونے کو خواجہ سجاد حسین کی شفقت اور ان کی خاص توجہ کو والد کے تعلقات سے جوڑ دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ منشی محمد الدین کے خواجہ الطاف حسین حاؔلی سے گہرے مراسم تھے لہٰذا خواجہ سجاد حسین کی خاص توجہ کا ایک سبب یہ بھی ہوگا تاہم وظیفہ محض تعلقات کی بنیاد پر نہیں دیا جا سکتا اُس میں ان کی لیاقت اور اچھے اخلاق و کردار کو بھی دخل ہوگا۔ اس سلسلے میں اسکول سے انھیں ملنے والے کارڈ بھی رہ نمائی کرتے ہیں۔

راقم نے مکتوب کے ذریعے ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین سے درخواست کی کہ اگر وہ کسی طرح مذکورہ اسکول سے

۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۶ء تک کا ریکارڈ حاصل کر سکیں تو ممنون رہوں گا۔ میری دو درخواست پر انھوں نے بہ جائے خط کتابت کے ۲۶ر جنوری ۲۰۰۴ کو لاہور سے وزیر آباد کے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول، خود جانے کی زحمت گوارا کی۔ اس دورے کی تفصیل راقم کو انھوں نے دو خطوں میں اس طرح تحریر فرمائی:

وزیر آباد [وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی] اسکول گیا تو ہیڈ ماسٹر [چوہدری محمد عارف] صاحب نے بڑے فخر سے کہا کہ باہر برآمدے میں ہمارے سکول کی تاریخ لکھی ہے وہ ایک نظر دیکھ لیں۔ وہ درست نہ تھا۔ میں نے لاہور آ کر تحقیق کی تو انھیں خط میں لکھا کہ آپ کا سکول ۱۸۹۷ کے لگ بھگ ہائی ہوا تھا۔ ۱۸۹۹ میں یہاں کے طلبا کا میٹرک کا رزلٹ گزٹ میں ملتا ہے۔ ملکہ کے ساٹھ سالہ تخت نشینی کے موقع پر ۱۸۹۷ میں پنجاب کے ڈسٹرکٹ بورڈز ہائی اسکولوں کو وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی سکولوں کا نام دیا گیا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں نہیں۔ (۲۴)

وقت نکال کر اور دل پر جبر کر کے میں خود آج وزیر آباد گیا۔ وزیر آباد کے قدیم ترین ہائی اسکول گیا۔ صد افسوس اس وقت کا ریکارڈ یعنی داخلہ رجسٹر وغیرہ نہیں مل سکا۔ ۱۹۷۳ء میں سیلاب آیا تھا۔ ۳۔۳،۴۔۴ فٹ پانی اسکول میں داخل تھا اور سارا پرانا ریکارڈ تلف ہو گیا۔ (۲۵)

## میٹرک کی تعلیم:

۱۹۰۶ء ہی کے کسی مہینے میں یہ خاندان دوبارہ دہلی چلا گیا اور مٹیا محل کے بہ جائے کوچہ چیلاں میں مسجد کالے خاں (۲۶) کے پاس کسی مکان میں جا کر آباد ہوا۔ (۲۷) جہاں ضیاء الدین احمد برنی کو دہلی کے مشہور اسکول گورنمنٹ ہائی اسکول (۲۸) واقع کشمیری دروازہ میں داخل کیا گیا۔ اس حوالے سے برنی لکھتے ہیں:

کچھ عرصہ بعد ہمارے گھر کے لوگ دلی واپس آ گئے اور مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول واقع کشمیری دروازہ میں داخل کر دیا گیا، جہاں سے میں نے ۱۹۰۸ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ میرے زمانے میں واؤٹرز (Vowters) ہیڈ ماسٹر تھے۔ اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر ایک ہندو تھے۔ (۲۹)

ضیاء الدین احمد برنی نے گورنمنٹ ہائی اسکول، دہلی میں ۱۹۰۶ تا ۱۹۰۸ دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ (۳۰) اس زمانے میں دہلی کے گورنمنٹ اسکول اور کالج پنجاب یونی ورسٹی سے ملحق تھے اور وہی اس کا امتحان لینے اور نتیجہ ظاہر کرنے کی مجاز تھی، بلکہ کالج کے امتحان دینے کے لیے طالب علموں کو لاہور جانا پڑتا تھا۔

برنی کے دست یاب تعلیمی کاغذات میں سے ایک میٹریکولیشن کا پاس سرٹیفکیٹ بھی ہے، جو کیم جون ۱۹۰۸ء کو پنجاب یونی ورسٹی کی جانب سے جاری کیا گیا۔ مذکورہ سرٹیفکیٹ پر برنی کا نام Zia-ud-din ahmad اور والد کا نام

M.Mohammad Din لکھا ہے۔اسکول کا نام گورنمنٹ ہائی اسکول، دہلی درج ہے۔

ضیاءالدین احمد برنی نے یہ امتحان تیسرے درجے یعنی Third Division میں پاس کیا تھا۔اس سرٹیفکیٹ پر اس وقت کے رجسٹرار جی۔سی۔بٹ کے دست خط ہیں۔(۳۱)

میٹرک کا امتحان دینے کے لیے پنجاب یونی ورسٹی کی جانب سے درخواست دینے کی آخری تاریخ ۴ جنوری ۱۹۰۸ مقرر کی گئی تھی،اس شرط کے ساتھ:

Student will those completed this 15th year on or before 1st April of the Calender year of the Examination.(۳۲)

یہ امتحان مارچ ۱۹۰۸ء کے پہلے پیر کو شروع ہوا۔پاس ہونے کے لیے ۳۳ فیصد اور اورل کے لیے ۲۵ فیصد نمبروں کی حد مقرر کی گئی تھی۔فرسٹ ڈویژن کے لیے ۵۰۷۳ نمبر،سیکنڈ دویژن کے لیے ۲۵۰ نمبر اور تھرڈ ڈویژن کے لیے ۲۵۰ سے کم نمبروں کا لینا ضروری تھا۔(۳۳) ۱۹۰۸ء میں میٹرک کے امتحان میں کُل ۳۵۳۵ طلبا نے حصہ لیا۔(۳۴)

کُل پرچوں کی تفصیل اس طرح ہے:

لازمی (Fixed) مضامین چار تھے؛

۱۔انگریزی۔کل نمبر ۱۵۰

۲۔کلاسیکی زبان: سنسکرت،لاطینی،یونانی،عربی،HEBREW یا فارسی۔کل نمبر ۱۵۰

۳۔ریاضی۔کل نمبر ۱۵۰

۴۔تاریخ وجغرافیہ۔کل نمبر ۱۰۰

درجِ ذیل اختیاری مضامین میں سے صرف ایک مضمون لیا جاسکتا تھا۔

۱۔کلاسیکی زبانیں: اردو، ہندی، بنگالی، پشتو

۲۔فلاسفی اور ہائی جن

۳۔فزکس یا کیمسٹری

۴۔سیکنڈ کلاس لینگویج

۵۔ڈرائنگ۔(۳۵)

ہر پرچے کے لیے تین گھنٹے کا وقت مقرر تھا۔انگریزی کے پرچوں (A,B&Oral) پر ممتحن: لالہ جیا رام ،ایم۔اے،عربی کے پرچوں (A & B) پر حاجی مولوی مفتی محمد عبداللہ،ایس۔یو،فارسی کے پرچوں (A & B) پر مولوی جلال الدین حیدر،ایم۔اے،ریاضی کے پرچوں (A & B) پر بھائی گوپال سنگھ چاؤلہ،ایم۔اے،تاریخ کے پرچے پر لالہ ہنس راج،بی۔اے،جغرافیہ کے پرچے پر ای۔ٹائیڈمین (E.Tydeman,Esq) اور اردو کے پرچوں (A & B) پر شاہ

عبدالقادر، بی۔اے، بارایٹ لا، کے نام درج ہیں۔(۳۶)

اس امتحان کا نتیجہ ۱۴ر اپریل ۱۹۰۸ کو جاری ہوا۔ضیاء الدین احمد برنی نے یہ امتحان رول نمبر ۱۴۴ کے تحت دیا۔ انھوں نے اس امتحان میں کُل ۲۴۹ نمبر حاصل کیے اور تھرڈ ڈویژن رہے۔امتحان دیتے وقت ان کی عمر ۱۸ سال اور ایک ماہ تھی۔(۳۷)

یکم اکتوبر ۱۹۰۸ کو A.C.WOOLNER,Registrar,Punjab University کی جانب سے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ جاری کیا گیا جس پر یہ عبارت درج ہے:

This to certify that ZIAUDDIN AHMED has been registered as a Student of (۳۸)the Punjab University. His Registered Roll No.is **H.S.27**

ضیاء الدین احمد برنی کے متعلق ملا واحدی کا تحریر کردہ، وہ واقعہ نقل کرنا بے محل نہ ہوگا کہ جو برنی کے اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جب وہ انٹرنس کا امتحان دے چکے تھے اور نتیجہ نہیں آیا تھا اور جس سے ایک طرح برنی کے حال اور مستقبل کا پتا چلتا ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

> نواب اکبر علی خان کے سب سے چھوٹے بیٹے شوکت علی خان میرے اور مسٹر ضیاء الدین احمد برنی کے ہم جماعت تھے۔انھوں نے دونوں سے کہا''چلو تمھیں امیر صاحب [حبیب اللہ خاں، امیر افغانستان] کے عطا کردہ تحائف دکھائیں۔''
>
> ہم ان کے ہاں اس سے پہلے نہیں گئے تھے۔جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک صاحب تیس بتیس برس کی عمر، ننگے سر، تہ بند باندھے، ایک کندھے پر چھوٹے سے بچے کو بٹھائے آتے دکھائی دیے۔شوکت علی خان نے زور سے پکارا، آیئے بابو جی! بڑے اچھے وقت پر آئے۔بتایئے ہم تینوں پاس ہوں گے یا نہیں۔ہم تینوں نے انٹرنس (میٹرک) کا امتحان دے رکھا تھا۔(۳۹) بابو کرامت علی شوکت علی خان کو تو جانتے تھے، ہم دونوں سے بالکل ناآشنا تھے۔ہم دونوں کے چہروں پر انھوں نے غور کی نظر ڈالی اور اول مسٹر ضیاء الدین سے مخاطب ہوئے۔بولے، میاں تم پاس ہو جاؤ گے، انٹرنس کیا، بی اے بھی پاس کرلو گے۔پھر شوکت علی خان سے کہا، جناب فیل ہوں گے، اور دوبارہ امتحان نہیں دیں گے۔پڑھنے لکھنے پر لعنت بھیجیں گے مگر گھوڑا عمر بھر زانو تلے رہے گا۔یہ خدا کو معلوم کہ اس گھوڑے کے مالک ہوں گے یا چابک سوار۔۔۔۔شروع میں میرے فیل ہونے کی خوش خبری تھی۔پھر اگلا ہی نہیں پچھلا بھی حال۔پچھلا حال چوں کہ صحیح تھا میں نے وہ تاڑ شکریے کے ساتھ لے لیا اور اسے ستمبر ۱۹۴۷ء تک محفوظ رکھا۔
>
> پیش گوئیاں بابو کرامت علی کی صحیح نکلیں۔مسٹر ضیاء الدین برنی انٹرنس پاس کرکے کالج میں

داخل ہوئے اور بی اے کیا۔(۴۰)

## انٹرمیڈیٹ اور کالج کی تعلیم:

۱۹۰۸ء میں انٹرنس کرنے کے بعد ضیاء الدین احمد برنی نے دہلی کے مشہور انگریزی کالج ''سینٹ اسٹیفنز کالج''، دہلی (۴۱) میں اپنے دوست اور ہم محلّہ مسٹر آصف علی (م:۱۹۵۳)(۴۲) کے مشورے سے داخلہ لیا۔ برنی اس ضمن میں لکھتے ہیں ''اس کے بعد میں بہ مشورہ آصف علی سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی میں داخل ہوگیا۔''(۴۳) برنی نے اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ میں اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

> آصف علی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۰۶ یا ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔ ہم دونوں ہم محلّہ بھی تھے۔ میں نے ۱۹۰۸ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت آصف علی سینٹ اسٹیفنز کالج میں تھرڈ ایر میں پڑھتے تھے۔ انھی کے مشورہ سے میں نے بھی اسی کالج میں داخلہ لے لیا۔(۴۴)

اسی بات کا تذکرہ انھوں نے اپنی تصنیف (ترجمہ) سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی تمہید میں بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ۱۹۰۸ میں گورمنٹ ہائی اسکول (دہلی) سے انٹرنس کا امتحان پاس کرتے ہی میں داخلہ کے لیے سینٹ اسٹیفنز کالج پہنچا۔ اس زمانے میں اس کالج میں مسلم طلبا کی تعداد بہت کم تھی، اتنی کم کہ اسے انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا۔(۴۵)

ضیاء الدین احمد برنی نے سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی میں انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کی تعلیم حاصل کی یوں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۳ء تک وہ کالج سے وابستہ رہے۔ ان کی کالج کی زندگی کئی لحاظ سے بھرپور زندگی رہی۔ یہاں انھوں نے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ کھیلوں میں بھی حصہ لیا۔ انھوں نے کالج کے میگزین میں مضامین بھی لکھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ترجمہ نگاری کی طرف بھرپور توجہ دی۔ اسی کالج میں ان کے تعلقات اپنے اساتذہ سے ایک مشفق استاد اور ایک لائق شاگرد کے طور پر قائم ہوئے۔

۱۴راپریل ۱۹۰۸ کو انٹرنس کا نتیجہ جاری ہوا۔ یکم جون ۱۹۰۸ء کو برنی نے پنجاب یونی ورسٹی سے پاس ہونے کی سند حاصل کی۔ یقیناً انھوں نے جون کے مہینے میں کالج میں داخلہ لیا ہوگا۔ سینٹ اسٹیفنز کالج کے انٹرمیڈیٹ کے رپورٹ کارڈ سے بھی اس کی کسی قدر تصدیق ہوتی ہے۔ مذکورہ کارڈ سے پتا چلتا ہے کہ انٹرمیڈیٹ کا امتحان جولائی ۱۹۱۰ء کی کسی تاریخ کو شروع ہوا۔ اس سے ہم یہ اندازہ قائم کرسکتے ہیں کہ جولائی ۱۹۰۸ میں کالج میں تعلیم کا آغاز ہوا ہوگا، یوں انھوں نے جولائی ۱۹۰۸ء سے جولائی ۱۹۱۰ء میں دو سال مکمل کر کے امتحان دیا۔

ہمارے پاس ضیاء الدین احمد برنی کے انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے سلسلے میں دو عدد رپورٹ کارڈ، پاس سَرٹفکیٹ، ان کے امتحانی پرچے اور اُن کا رزلٹ ہے۔

انٹرمیڈیٹ میں صرف تین مضامین تھے۔ پاس ہونے کے لیے ۳۳ نمبروں کا ہر پرچے میں حاصل کرنا ضروری

تھا۔فرسٹ ڈویژن کے لیے ۳۴۰ یا اس سے زائد، سیکنڈ ڈویژن کے لیے ۲۵۰ یا اس زائد اور تھرڈ ڈویژن کے لیے ۲۵۰ یا اس سے کم کی حد مقرر تھی۔(۴۶) ضیاءالدین احمد برنی نے جو پرچے دیے ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔انگریزی: کل نمبر ۱۵۰

۲۔فلاسفی: کل نمبر ۱۵۰

۳۔کلاسیکی زبان: فارسی؛ کل نمبر ۱۲۰

ہر پرچے کے لیے تین گھنٹے کا وقت مقرر تھا۔انگریزی پرچوں میں سے A(I&II) پرچوں پر ممتحن کا نام ای۔ٹائیڈ مین، ای۔ایس۔کیو، بی اے(E.Tydeman,Esq.,B.A)،B(I&II) پر ایم۔یو۔مور، ای۔ایس۔کیو، ایم اے(M.U.Moore,Esq.,M.A)اور اورل(Oral) پر ای۔ٹائیڈ مین، ای۔ایس۔کیو، بی اے(E.Tydeman,Esq.,B.A)،فلاسفی کے پرچے A پر ریوڈ۔سی۔بی۔ینگ، ایم اے(Revd.C.B.Young,M.A)اور پرچہ B پر پی۔سی مکرجی (P.C.Mukerji,Esq) اور فارسی کے پرچے A پر مولوی محمد دین، بی اے اور پرچے B پر ایم۔سید عبدالباقی، ایم اے درج ہیں۔(۴۷)

۱۹۱۰ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں ۶۹۶ طالب علموں نے حصہ لیا۔فرسٹ ڈویژن میں ۲۰ طلبا پاس ہوئے تھے۔سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی کا ایک طالب علم پرمانند جین ۳۷۹ نمبر حاصل کر کے فرسٹ آیا تھا۔جب کہ مذکورہ امتحان میں یونی ورسٹی بھر میں فرسٹ آنے والا S.Bede کالج شملہ کا ایک طالب علم MILA E.WEIGARTNER ۴۴۴ نمبر حاصل کر کے اول (فرسٹ) آیا تھا۔(۴۸)

ضیاءالدین احمد برنی کو سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے جو رپورٹ کارڈ ۱۶ر نومبر ۱۹۱۰ء کو حاصل ہوا اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ان کا انٹرمیڈیٹ کا امتحان جولائی ۱۹۱۰ء میں ہوا۔نتیجہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ برنی نے انگریزی میں ۱۵۰ نمبروں میں سے ۵۴ نمبر حاصل کیے ریمارکس "فیل"، فارسی میں ۱۵۰ نمبروں میں سے ۱۱۱ نمبر حاصل کیے اور کامیاب رہے، جب کہ فلاسفی میں کل ۱۵۰ نمبروں میں سے ۶۵ نمبر لیے ریمارکس "Weak" دیے گئے۔......ان رپورٹ کارڈ سے یہ بھی پتا چلتا ہے وہ کرکٹ، ٹینس اور فٹ بال کے بہ جائے ہاکی کھیلا کرتے تھے۔

اس امتحان میں ضیاءالدین احمد برنی کا رول نمبر ۴۹ تھا۔وہ ۲۷۸ نمبر لے کر سیکنڈ ڈویژن رہے۔اس گزٹ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ امتحان انھوں نے ۱۹ سال اور ۱۰ ماہ کی عمر میں دیا۔

۱۹۱۱ء میں انھوں نے تیسرے سال(III Year) کا امتحان دیا۔پنجاب یونی ورسٹی گزٹ سے بھی اس کی تصدیق ہوجاتی ہے۔اس سال برنی نے تین پرچے دیے: انگریزی، فارسی اور فلسفہ۔اس سال وہ فلسفے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔(۴۹)

بی اے کا امتحان دینے کے لیے پنجاب یونی ورسٹی کی جانب سے درخواست جمع کروانے کی آخری تاریخ ۱۰ مارچ ۱۹۱۳ء مقرر

کی گئی۔امتحان ۵رمئی ۱۹۱۳ء کو شروع ہوا۔امتحانی مرکز صرف لاہور ہی تھا۔اس درجے میں صرف تین مضامین تھے:انگریزی (لازمی)، دوسرے مضامین تھے:(i) کلاسیکی لینگوجز:سنسکرت۔عربی۔فارسی (ii) ریاضی۔ تاریخ۔پولیٹیکل اکانمی۔فلاسفی۔فزکس یا کیمسٹری۔۹رجون ۱۹۱۳ء کو یونی ورسٹی نے نتیجے کا اعلان کیا۔(۵۰) ضیاء الدین احمد برنی نے انگریزی کے علاوہ فارسی اور فلاسفی کا انتخاب کیا تھا۔انھوں نے بی اے کا امتحان سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے ۱۹۱۲ء میں دیا تاہم ایک مضمون میں رہ جانے کی وجہ سے بی اے میں تھرڈ ڈویژن میں کامیابی کی سند ۱۹۱۳ء میں حاصل کی۔(۵۱)

برنی جب بی اے کا امتحان دینے ۱۹۱۲ء میں لاہور گئے تو پرچے دینے کے بعد علامہ اقبال سے ملاقات کی اس ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے انھوں نے اپنے پرچوں کا بھی ذکر کیا ہے:

> دہلی یونی ورسٹی کے قیام سے پیشتر دہلی کے طلبا اعلیٰ امتحانات کے لیے لاہور جاتے تھے۔چناں چہ ۱۹۱۲ء میں بی اے کے امتحان کے سلسلے میں میں لاہور گیا۔بی اے میں میرے تین مضامین تھے،انگریزی،فلسفہ اور فارسی۔آخری مضمون میں مجھے غالباً ۹۸ فی صد نمبر ملے ہوں گے۔(۵۲)

درج بالا معلومات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں برنی انگریزی کے پرچے میں کامیاب نہیں ہوسکے چناں چہ یونی ورسٹی کے انتظامات کے تحت انھوں نے یہ پرچہ ۱۹۱۳ء میں دیا جس کا نتیجہ ۹رجون ۱۹۱۳ء کو جاری ہوا اور وہ تیسرے درجے میں پاس ہوئے۔

برنی کے خودنوشت حالات سے بچپن اور نوجوانی کے زمانے کے وہ حالات گم ہیں جن سے اندازہ قایم کیا جاسکے کہ وہ کیا حالات رہے کہ وہ بعض پرچوں میں ناکامیاب ہوتے رہے یا کم زور رہے۔معاشی حالت کا اچھا نہ ہونا تو سامنے ہی کی بات ہے۔والد منشی محمد الدین کتابت کرکے روزی کماتے تھے۔بڑے بھائی منشی عبدالقدیر کی زندگی کا بیشتر وقت سیاست کی نذر ہو گیا۔جو بچ رہا وہ کوئی بہت اچھا نہیں گزرا۔

اخلاق احمد دہلوی منشی عبدالقدیر اور منشی محمد یوسف کے روزگار سے متعلق لکھتے ہیں:

> عبدالقدیر صاحب والا اخوان کی دکان دلی کی جامع مسجد کے سامنے زنگی فاؤنٹین والوں کے برابر تھی ---۔عبدالقدیر صاحب قلموں کے نیزے،پنسلیں،تختیاں،سلیٹیں،سلیٹ کی پنسلیں اور قلمیں،دواتیں بیچتے تھے اور اس دکان پر لڑکوں کو خوش نویسی سکھاتے تھے۔بھائی یوسف نے اپنے بڑے بھائی کی اس دکان کے باہر ایک پنسل بنانے کی مشین لگا رکھی تھی۔(۵۳)

یقیناً برنی کی تعلیم ان کے معاشی حالات سے بھی متاثر ہوئی ہوگی۔اس کا اظہار برنی نے اپنے خودنوشت حالات میں بھی کیا ہے۔کالج کے بعض اساتذہ نے معاشی زندگی سنوارنے میں ان کی مدد کی۔(۵۴)

## یونی ورسٹی کی تعلیم:

برنی نے قیام کانپور کے دوران جب کہ وہ تھیوسوفیکل ہائی اسکول میں بہ طور مدرس ملازم تھے، ۱۹۱۷ء میں الہ آباد یونی ورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کے پہلے سال کا امتحان پاس کیا۔ چوں کہ برنی ۱۹۱۸ء میں بہ سلسلہ ملازمت بمبئی چلے گئے تھے لہٰذا فائنل کا امتحان نہیں دے سکے۔(۵۵) یوں ان کا ایم اے نامکمل ہی رہا۔

۱۹۲۲ء میں انھوں نے اورینٹل لینگویجز کی مدرسی کا امتحان( Oriental Language Teachership Examination )پاس کیا۔ برنی کے دست آویزات میں ۳۰ مارچ ۱۹۲۲ کے بمبئی گورنمنٹ گزٹ کی نقل موجود ہے اور سول اینڈ ملیٹری امتحانی کمیٹی کی جانب سے جاری کردہ سند بھی شامل ہے جس سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

## برنی کے اساتذہ:

برنی کو جس جس استاد نے متاثر کیا اس کا ذکر انھوں نے نہایت نیاز مندانہ کیا ہے۔ وہ عمر کے اخیر عرصے تک ان حضرات کی محبت، شفقت اور اخلاص کے سحر میں گرفتار رہے۔ سب سے پہلے برنی نے اپنے مدرسے کے دو اساتذہ کا تذکرہ کیا ہے:

> مجھے اس زمانے کے دو استاد اب تک یاد ہیں۔ ایک مولوی عبدالرزاق جو فارسی کے استاد تھے اور فارسی ایرانیوں کی طرح بولتے تھے، دوسرے تھے خلیفہ خُتن یہ پرانی وضع کے پہلوان تھے مگر جدید قسم کی ڈرل وغیرہ سے بھی بہ خوبی واقف تھے۔ ہمارے اس اسکول میں ہندو اور مسلمان ٹیچر تھے اور بچوں سے بلا امتیازِ مذہب وملت بڑا پیار و اخلاص کرتے تھے۔(۵۶)

اسکول کی تعلیم کے دوران ۱۹۰۷ء میں برنی نے اپنے دوست ملّا واحدی کے ہم راہ دہلی کی معروف شخصیت استاذ الاساتذہ مولوی محمد اسحاق رام پوری سے فارسی اور ریاضی پڑھی۔ مولوی صاحب پر خاکے میں برنی نے ان کے دیگر منفرد اوصاف کے تذکرے کے علاوہ ان کی رواداری کی بہت تعریف کی ہے۔

۱۹۰۸ء میں برنی کا داخلہ دہلی کے مشہور انگریزی کالج سینٹ اسٹیفنز کالج میں ہوگیا۔ برنی نے کالج کے چند اساتذہ کا تذکرہ اپنے خودنوشت حالات میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> کالج میں مجھے سی ایف اینڈریوز اور چند دوسرے قابل اساتذہ کی صحبت میسر آئی جس کے نتیجے میں میرا ادبی ذوق دن بہ دن ترقی کرتا چلا گیا۔ اینڈریوز، ویسٹرن، ینگ اور رُدرا سے جو تعلقات قائم ہوئے وہ آخر وقت تک رہے۔ ان حضرات نے میری معاشی اور ادبی زندگی کو سنوارنے میں بڑی مدد دی۔(۵۷)

سینٹ اسٹیفنز کالج کے اساتذہ میں پروفیسر سی ایف اینڈریوز (۵۸) اور پروفیسر غلام یزدانی (۵۹) سے برنی کے تعلقات اخیر عمر تک رہے۔ ان دونوں اساتذہ کا جہاں جہاں ذکر آیا برنی نے نہایت نیاز مندانہ لہجہ اختیار کیا۔ ان دونوں حضرات کے

خطوط بھی برنی کے نام ہیں۔ پروفیسر غلام یزدانی کا تذکرہ برنی نے ہمیشہ ''استاذی'' کہ کر کیا۔ ان کا انتقال ۱۳ نومبر ۱۹۶۲ء کو ہوا تو دسمبر ۱۹۶۲ء کے ''کتابی دنیا'' میں برنی نے 'وفیات' کے ذیل میں اپنے قلبی جذبات کا اظہار ایک مختصر مضمون میں کیا ہے۔

اپنی تصنیف ''جہاں آرا بیگم'' کے دیباچے میں اپنے استاد غلام یزدانی کا شکریہ کرتے ہوئے لکھا کہ اردو میں اس قسم کا تذکرہ لکھنے کا خیال جہاں آرا پر ان کے فاضلانہ مضمون کو دیکھ کر آیا۔(۶۰)

برنی نے اپنے استاد سی ایف اینڈ ریوز سے محبت کا اظہار اپنے طالب علمی کے زمانے سے اخیر عمر کئی نوع سے کیا۔ ان کے متعدد مضامین کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ اس کے علاوہ اپنے ہم جماعت مسٹر بنارسی داس چترویدی کی انگریزی تصنیف ''سی ایف اینڈ ریوز'' کا اردو ترجمہ کیا اور سی ایف اینڈ ریوز کی تصنیف Zakaullah of Delhi کا ترجمہ ''تذکرہ مولوی ذکاء اللہ'' کے نام سے اور انھی کی تصنیف Mahtma Gandhi's Ideas including slections his Writing کا ترجمہ ''خیالاتِ مہاتما گاندھی'' کے عنوان سے، جس میں ان کی تحریرات کے منتخبات بھی شامل ہیں''، دو حصوں میں کیا۔

''سی ایف اینڈ ریوز'' کی تمہید میں برنی نے کالج کے ان اساتذہ کا تذکرہ نہایت مسرت کے ساتھ کیا ہے جن سے ان کے مخلصانہ تعلقات بعد تک قایم رہے:

> اینڈ ریوز صاحب شروع ہی سے ہماری جماعت کے ٹیوٹر تھے اور اس وجہ سے مجھے ان کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ میں کالج ہی کے زمانے سے ان کی خداداد قابلیتوں سے متاثر تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں ان کے ساتھ زیادہ وقت صرف کرتا تھا۔ کالج میں اور بھی کئی ایک انگریز اور ہندوستانی پروفیسر تھے اور خوش قسمتی سے ان میں سے بعض سے میرے مخلصانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ ان پروفیسروں میں سی۔ بی ینگ، پیڈی ڈے، سین (فلسفہ)، بکرجی، گھوش، خواجہ عبدالمجید (فارسی)، جے۔ ویسٹرن اور شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن (عربی) قابلِ ذکر ہیں۔(۶۱)

## زمانہءطالب علمی میں علمی وادبی سرگرمیاں:

جس ماحول میں برنی نے آنکھ کھولی تھی وہ دینی اور علمی ماحول تھا۔ ان کی کم سنی کے زمانے میں اُن کے والد ''دارلعلوم'' (۱۹۰۱) کے نام سے اخبار نکالا کرتے تھے۔ جیسا کہ برنی اپنے والدین کے حوالے سے لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں اخبارات ورسایل آیا کرتے تھے۔ چناں چہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا شوق کم سنی ہی سے ان کی طبیعت میں تھا، یہی وجہ رہی کہ انھوں نے اسکول اور کالج کے زمانے سے لکھنا شروع کردیا۔ اسکول کی تعلیم کے دوران انھوں نے ایک مضمون ''سقراط کا دمِ واپسیں'' لکھا جو امرتسر کے کسی رسالے میں شایع ہوا تھا۔ اسی مضمون سے ان کی ادبی زندگی کا آغاز بھی ہوا۔

برنی نے اپنی مختصر خودنوشت میں لکھا ہے'' طالب علمی کے زمانے میں میں نے متعدد مضامین رسالہ 'صوفی'' کے لیے لکھے جو منڈی بہاءالدین سے نکلتا تھا۔'' کالج کے زمانے میں، پائنیر (Poineer) اور لیڈر (Leader) جیسے مشہور انگریزی

اخبارات میں ان کے مراسلے شایع ہوا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں برطانیا سے لیبر پارٹی کے مشہور لیڈر ریمزے میکڈانلڈ دہلی آئے اور انھوں نے عمائدینِ شہر سے ایک جلسے میں خطاب کیا تو اس جلسے کی رپورٹ برنی ہی نے لکھی جو پائنیر (Poineer) میں شایع ہوئی۔(۶۳)

کالج ہی کے زمانے میں انھوں نے متعدد انگریزی مضامین لکھے جو کالج میگزین میں شایع ہوئے۔(۶۴) افسوس کہ وہ مضامین کوششِ بسیار کے باوجود حاصل نہیں ہو سکے(۶۵) سوائے ایک مضمون ''Sayings of Muhammad'' کے جو انھوں نے اس وقت لکھا تھا جب وہ IV Year کے طالب علم تھے۔ یہ مضمون ''St.Stephens College Mazine'' میں شایع ہوا تھا۔ یہ مضمون ان کے پرانے کاغذات سے برآمد ہوا ہے۔

اُسی زمانے میں ہندوستان کے مشہور رسائل ''تمدن''، ''نظام المشائخ''، ''زمانہ''، ''الناظر''، اور ''ادیب'' وغیرہ میں انھوں لکھنا شروع کر دیا تھا۔(۶۶) جیسا کہ برنی کے انٹرمیڈیٹ کے سرٹیفکیٹ سے ظاہر ہو چکا ہے کہ وہ کالج کے زمانے میں ہاکی کھیلا کرتے تھے۔ ان کے نام خواجہ حسن نظامی کے ایک خط مرقومہ ۱۲ ستمبر ۱۹۱۵ء سے پتا چلتا ہے کہ وہ قیام کانپور کے زمانے تک ہاکی کھیلا کرتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی لکھتے ہیں ''خوب ہاکی کھیلو اور طاقت بڑھاؤ''(۶۷)

## ہم نصابی مشاغل:

اپنی خودنوشت میں انھوں نے اپنے اثاثے میں قیمتی ٹکٹوں کے ہونے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جولائی ۱۹۱۴ء کے ''تمدن'' دہلی میں ان کا مضمون ''ٹکٹوں کا شوق'' شایع ہوا تھا جس میں انھوں نے ٹکٹ جمع کیے جانے کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ ٹکٹوں کی اہمیت اور افادیت اجاگر کی ہے اور ان کی تجارتی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ انھیں مشاہیر کی تصاویر جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ انیس شاہ جیلانی نے اپنے مضمون میں ان کی تحریر کی رائٹنگ ٹیبل کے شیشے کے نیچے ہٹلر کی تصویر ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ ریاض احمد برنی کے بیان کے مطابق ان مطالعے کے کمرے میں ہٹلر کے علاوہ دوتر کی رہنماؤں قہرمانِ حریت انور بے اور نیازی بے اور زرتشت کی تصاویر بھی ہوا کرتی تھیں۔ برنی تصویر کی اہمیت سے واقف تھے چناں چہ جب ''عظمتِ رفتہ'' شایع کرنے کا خیال آیا تو انھوں نے مشاہیر کو خطوط لکھے اور جن کے خاکے تحریر کیے خواہش ظاہر کی کہ اُن مرحومین کی تصاویر بھی شایع ہوں۔ اُن کے خطوط اس امر کے گواہ ہیں۔

## برنی کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز:

برنی کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۸ء میں ہوا جب کہ انھوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا۔ ان کا پہلا مضمون ''سقراط کا دمِ واپسیں'' امرتسر کے کسی رسالے میں شایع ہوا۔(۶۸) جون ۱۹۱۳ء میں سینٹ اسٹیفنز کالج میگزین میں برنی کا ایک مراسلہ ایڈیٹر کے نام اور ایک مضمون جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے شایع ہوا تھا۔ اُسی زمانے میں ''نظام المشائخ'' دہلی میں برنی کے دو مضمون ''دعا کی عظمت'' اور ''رسول کا تیسرا ساتھی'' شایع ہوئے۔ برنی ان مضامین کی بابت لکھتے ہیں:

زمانہ طالب علمی کا واقعہ ہے کہ میرے دوست اور ہم جماعت محمد الواحدی تصوف کے مشہور رسالہ ''نظام المشائخ'' نکالا کرتے تھے جو میرے محترم دوست خواجہ حسن نظامی کی سرپرستی میں شائع ہوا کرتا تھا۔ ایک دن خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اینڈریوز صاحب سے ہمارے رسالہ کے کے لیے کوئی مضمون لکھوا کر دو چناں چہ میری درخواست پر انھوں نے ''سیکریٹ آف پریئر'' لکھ کر دیا جس کا ترجمہ میں نے ''سرّ الدّعا'' کے عنوان سے کیا۔ پھر خواجہ صاحب کے ارشاد پر میں نے اینڈریوز صاحب سے ''نظام المشائخ'' کے ''رسولؐ نمبر'' کے لیے مضمون لکھوایا، انھوں نے واقعہء ہجرت پر نہایت خوب صورت انداز میں مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''رسول کا تیسرا ساتھی'' یعنی خدا۔ یہ مضمون بے حد پسند کیا گیا اور اس سے ظاہر ہو گیا کہ انھیں اسلام اور بانیِ اسلام سے کتنی گہری عقیدت ہے۔(۶۹)

''رسول غیروں میں مقبول'' مضمون بھی اُسی زمانے میں ''نظام المشائخ'' میں شایع ہوا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں مولوی ذکاء اللہ کا انتقال ہوا تو سی ایف اینڈریوز نے ان کی سوانح لکھنے کا ارادہ کیا۔ ۱۹۱۴ء سے قبل انھوں نے کتاب لکھ لی۔ اُسی زمانے میں اینڈریوز کی خواہش پر برنی نے مولوی ذکاء اللہ پر ایک طویل مضمون لکھا جس پر خوش ہو کر اینڈریوز نے انھیں ''سوآن پین'' تحفۃً دیا۔ افسوس کہ برنی کا یہ مضمون بھی دست یاب نہیں ہو سکا۔

جنوری اور اکتوبر ۱۹۱۳ء میں ''زمانہ'' کانپور میں ان کے دو مضمون ''نئی تہذیب کے کرشمے'' اور ''ہندی قومیت کا نصب العین'' شایع ہوئے۔ یہ دونوں ترجمہ تھے۔ جولائی ۱۹۱۴ء میں ''تمدن''، دہلی میں ان کا ایک طبع زاد مضمون ''ٹکٹوں کا شوق'' شایع ہوا تھا۔

برنی کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کا ادبی ذوق کس قدر بڑھا ہوا تھا اور یہ بھی کہ ترجمہ نگاری کے فن سے ان کی دل چسپی بھی طالب علمی کے زمانے ہی میں پیدا ہو گئی تھی۔

## برنی کے ہم جماعت اور دوست:

برنی کی یادداشتوں کا سرمایہ ان کے مضامین، وفیات کے ذیل میں مختصر اور طویل تحریریں ہیں یا ان کی کتابوں کے پیش لفظ اور تمہیدیں وغیرہ ہیں۔ ان میں ان کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' وہ کتاب ہے جس سے برنی کے حالات، اسفار، دوست احباب ،ہم عصروں اور بزرگوں سے مراسم و تعلقات وغیرہ کا کسی قدر پتا چلتا ہے۔

برنی نے خودنوشت حالات عمر کے اخیر زمانے میں تحریر کیے چناں چہ وہ نامکمل اور غیر منظم حالت میں ہیں۔ انھیں جیسے جیسے اور جو جو بات یاد آتی رہی وہ لکھتے یا لکھواتے گئے۔ ان کے نام مشاہیر کے خطوط سے بھی ان کے حالات، نظریات، تعلقات اور سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ درج بالا ماخذ سے تو برنی کے دوستوں کی ایک طویل فہرست تیار کی جا سکتی ہے کیوں کہ ان کی اسّی سالہ زندگی میں ان کے متنوع دوستوں کا حلقہ نہایت وسیع رہا ہے۔ انھوں نے اپنے طرزِ عمل اور حسنِ سلوک سے بہت سوں کو اپنا گرویدہ

بنالیا تھا، تاہم افسوس کہ اس سلسلے میں تمام شواہد دست رس میں نہیں آسکے ہیں جن کی بنیاد پر ثابت کیا جاسکے کہ اُن تمام افراد سے برنی کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی ان میں کتنے حقیقی دوست تھے اور کتنے محض تعلق دار۔

جیسا کہ ہوا کرتا ہے برنی کے دوستوں کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ چند وہ دوست ہیں جن کا تعلق ان کے بچپن سے ہے۔ ایسے دوستوں کی تعداد بھی کم نہیں جن کا تعلق ہے تو ان کے بچپن سے مگر وہ یا تو ان کے اساتذہ ہیں یا اسی عہد کے بزرگ ہیں۔ جہاں جہاں برنی نے ملازمتیں کیں وہاں ہی انھوں نے دوست بنائے۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد بھی جہاں ان کی پرانی دوستیاں برقرار رہیں وہاں نئے دوست بھی بنے۔ اس مقالے میں ان تمام افراد کا تفصیلی ذکر تو ممکن نہیں تاہم کہیں مختصر اور کہیں تفصیلی ذکر کیا جائے گا اور کہیں محض نام تحریر کیا جائے گا۔

تین چار اشخاص خاص طور پر ایسے ہیں جن سے برنی نے اپنی بچپن کی اور گہری دوستی ظاہر کی ہے اور ان کے ذکر میں برنی کے قلم سے حد درجہ خلوص اور محبت ٹپکتی ہے۔ ان افراد میں ملا واحدی، آصف علی، ڈاکٹر سید سجاد دہلوی، شوکت دہلوی اور مولانا عارف ہسوی کے نام نمایاں ہیں۔

## ملا واحدی:

ملا واحدی (م ۱۹۷۶ء) جن کا اصل نام محمد ارتضیٰ تھا، دہلی کے مشہور محلے کوچہ چیلاں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دہلی سے ۱۹۰۹ء میں خواجہ حسن نظامی کے ساتھ ''نظام المشائخ''، حکیم اجمل خاں کی زیر سرپرستی ۱۹۱۳ء میں اخبار ''طبیب'' جاری کیا۔ ۱۹۱۴ء میں ہفتہ وار ''خطیب''، منشی عبدالحمید کی شرکت میں ہفت روزہ ''درویش'' اور مسٹر فصیح الدین کی شرکت میں ماہ نامہ ''ادیب'' جاری کیا۔ اس کے علاوہ عارف ہسوی کی ادارت میں ہفت روزہ ''انقلاب'' خواجہ بانو (اہلیہ خواجہ حسن نظامی) کی ادارت میں رسالہ ''استانی'' اور نیاز صاحب کی زیر ادارت روزانہ ''رعیت'' جاری کیے۔ (۷۰) تقسیم کے فوراً بعد پاکستان آگئے یہاں بھی ان کی سرگرمیاں تصنیف و تالیف ہی رہیں۔

برنی نے انھیں اپنا بچپن کا دوست لکھا ہے۔ دونوں اسکول کے زمانے میں مولوی محمد اسحاق رامپور کے ہاں پڑھنے جایا کرتے تھے۔ جس کا تذکرہ برنی نے ''عظمت رفتہ'' میں مولوی اسحاق پر خاکے میں اور ملا واحدی نے اپنی تصنیف ''میرے زمانے کی دلی'' میں کیا ہے۔ جیسا کہ برنی اپنی تصنیف ''سی ایف اینڈ ریوز'' کی تمہید میں تحریر کر چکے ہیں کہ وہ ان کے دوست اور ہم جماعت رہے ہیں۔

ملا واحدی نے سہواً برنی کو اینگلو عربک ہائی اسکول، دہلی کا طالب علم لکھا ہے۔ (۷۱) برنی کے کسی دست آویز سے اس امر کی شہادت نہیں ملتی۔ ''میرے زمانے کی دلی'' میں انھوں نے ایک مقام پر لکھا ہے ''رائے بہادر لالہ پارس داس، گورنمنٹ ہائی اسکول میں میرے ہم جماعت تھے۔'' ان کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے کچھ وقت کے لیے برنی کے ساتھ مذکورہ اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ برنی کے انتقال پر انھوں نے جو مضمون سپرد قلم کیا تھا اس سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ انھوں نے بھی گورنمنٹ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں ''انٹرنس کا امتحان انھوں نے اور میں نے ساتھ دیا تھا میں فیل ہو گیا تھا۔ وہ سینٹ اسٹیفنز کالج پہنچ

گئے تھے۔" (۷۲)

ملا واحدی نے برنی کی لیاقت۔ کے حوالے سے ایک واقعہ تحریر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

ایک صاحب تھے بابو کرامت علی۔ فراش خانے میں رہتے تھے۔ وہیں نواب اکبر علی خاں اور نواب محمد علی خاں، دونوں بھائیوں کی بھی حویلیاں تھیں۔ نواب اکبر علی خاں کے سب سے چھوٹے لڑکے شوکت علی خاں کا اور میرا اسکول کا ساتھ تھا۔ ایک دن شوکت علی خاں مجھے اور ضیاء الدین احمد (برنی) کو اپنے گھر لے گئے۔ ہم ان کے ہاں بیٹھے تھے کہ بابو کرامت علی تہ بند باندھے اور کرتا کندھے پر ڈالے اور دوسرے کندھے پر پہلوٹی کے بیٹے کو بٹھائے تشریف لائے۔ میں اور ضیاء الدین انھیں نہیں جانتے تھے۔ شوکت علی خاں نے تعارف کرایا کہ "یہ بابو کرامت علی ہیں۔ انڈنٹ رائٹری (تجارتی خط وکتابت) ان کا پیشہ ہے۔ نمبر اول کے انڈنٹ رائٹر ہیں۔ لیکن خیر ہمیں انڈنٹ رائٹری سے کیا کام۔ ہم تو بابو جی کے دوسرے کمال کے قایل ہیں۔ ہاں بابو جی! بتاؤ تو دونوں کے اگلے پچھلے حالات یہ ۱۹۰۵ء کی بات ہے میں اور ضیاء الدین نے انٹرنس کا امتحان دے رکھا تھا۔ بابو جی فوراً بولے ضیاء الدین پاس ہو جائیں گے اور بی اے تک پہنچیں گے۔ مجھ سے کہا تم فیل ہو گے اور پڑھنا چھوڑ دو گے مگر پھر ساری عمر پڑھتے ہی رہو گے۔ اور تمھارا شمار اہلِ علم میں ہونے لگے گا۔ (۷۳)

برنی نے انتقال سے چند روز قبل ملا واحدی کو خط لکھا جس میں انھوں نے ملا واحدی سے ملنے کی شدید خواہش ظاہر کی تھی۔ برنی کے الفاظ اس طرح ہیں:

بھائی چل چلاؤ ہے۔ یہ غالباً میرا آخری خط ہو۔ تمنا ہے کہ مجھ پر بھی میرے بعد آپ دو سطریں لکھ دیں۔ جی چاہتا ہے میری آپ کی ایک ملاقات بھی ہو جائے۔ جلیل قدوائی صاحب وعدہ کرتے ہیں مگر آتے نہیں یہی مشفق خواجہ صاحب کی کیفیت ہے۔ خیر اس دنیا کو خدا حافظ۔

مخلص ضیاء الدین احمد برنی (۷۴)

اس خط کو نقل کرنے کے بعد ملا واحدی لکھتے ہیں:

واقعی میرے نام برنی صاحب کا یہ آخری خط تھا۔ میں سوا تین برس سے فالج زدہ ہوں۔ لکھنا پڑھنا اللہ کی قدرت سے کرتا ہوں۔ بہر حال اس خط نے تڑپا دیا اور میں جلیل قدوائی صاحب اور مولانا رازق الخیری صاحب کو بیساکھیاں بنا کر برنی صاحب کے پاس

گیا۔۔۔میرے جانے سے بہت متاثر ہوئے۔چشم پرآب ہو گئے۔ میں ان کے لڑکپن کا ساتھی تھا۔(۷۵)

سید اوصاف علی واحدی اس واقعے سے متعلق لکھتے ہیں:

پھر ان (برنی) کے مرنے کی خبر چھپ گئی۔ میں نے واحدی صاحب کو لکھا تھا کہ برنی صاحب کو آپ سے آخری ملاقات کی مسرت حاصل کرنے کی تمنا تھی جو آپ نے پوری کردی، اب ان کی دوسری دلی تمنا ''مرنے کے بعد مضمون لکھنے والی'' بھی پوری کردیجیے واحدی صاحب نے مجھے جواب میں ۱۰ مئی ۱۹۶۹ کو اپنے مختصر نامہ میں لکھا تھا ''عزیزم! برنی صاحب پر میں نے مضمون لکھ دیا ہے اور ابھی ابھی روزنامہ جنگ کو ذریعہ رجسٹرڈ پیکٹ بھیجا ہے۔'' اور یوں دوسری تمنا بھی پوری ہوگئی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور اپنی رحمت کی بارش کردے واقعی بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر وزبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

(۷۶)

بالآخر واحدی دہلوی بھی ۲۲ اگست ۱۹۷۶ء کو ملک راہی عدم ہوئے۔

## ڈاکٹر سید سجاد دہلوی:

سید سجاد دہلوی برنی اور ملا واحدی کے مشترکہ دوست تھے جس کا تذکرہ برنی نے عظمتِ رفتہ (۷۷) اور ملا واحدی نے اپنی تصنیف ''میرے زمانے کی دلّی'' (۷۸) میں کیا ہے۔

ان کا اصل نام سید سجاد حسین تھا۔ وہ ۷ مئی ۱۸۹۵ کو پیدا ہوئے ان کا خاندان دلّی کا ممتاز گھرانہ تھا۔ ان کے والد خواجہ سید محمد اسماعیل دہلوی بڑے متقی بزرگ تھے۔ وہ اور برنی ایک ہی محلے کوچہ چیلاں میں رہتے تھے۔ انھوں نے سینٹ اسٹفنز ہائی اسکول سے میٹرک، ۱۹۱۳ء میں اندور کالج سے انٹر پاس کیا اور سینٹ جانس کالج آگرہ سے بی اے پاس کیا۔

مسلم ہائی اسکول کانپور میں ان کی ملازمت ہوگئی تو وہ کانپور چلے گئے۔ اسی زمانے میں برنی کی ملازمت بھی کانپور کے اسکول تھیوسوفی ہائی اسکول میں ہوگئی تو دونوں دوست ایک ہی شہر میں رہے۔ دونوں نے الہ آباد یونی ورسٹی سے فارسی میں ایم اے کرنے کی غرض سے داخلہ لیا مگر برنی تو صرف ایم اے سال اول ہی کا امتحان دے سکے اور ان کی ملازمت بمبئی کے اسلامیہ ہائی اسکول میں ہوگئی اور وہ اسے نامکمل چھوڑ کر وہاں چلے گئے جب کہ سید سجاد نے ۱۹۱۸ء میں ایم اے فارسی کی سند لی۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں لندن یونی ورسٹی سے ''ہند آریائی فلسفے'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔(۷۹)

اسلامیہ ہائی اسکول سے انھیں مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد لے گئے۔ وہ تین سال تک اس وابستہ

رہے۔اس اثنا میں انھوں نے ای جی براؤن کی مشہور کتاب ''لٹریری ہسٹری آف پرشیا'' کی ابتدائی تین جلدوں کا اردو ترجمہ کیا۔اس کے علاوہ سر سائیکس کی ''تاریخِ ایران'' کی دونوں جلدوں کو اردو میں منتقل کیا۔انھوں نے انجمن کے لیے بڑی خدمات انجام دیں۔(۸۰)

جامعہ عثمانیہ سے مولوی عبدالحق کی سبک دوشی کے بعد ان کی جگہ بہ طور چیئرمین وہی مقرر کیے گئے۔ان کے تحقیقی کاموں میں ''نوطرز مرصع'' کا ایڈٹ کرنا اور ''تاریخ نثر اردو'' تحریر کرنا یادر کھے جانے کے قابل ہیں۔

برنی نے عظمتِ رفتہ میں ان کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔اس سلسلے میں ماہ نامہ سب رس، کراچی کا ''ڈاکٹر سید سجاد دہلوی نمبر'' (اگست ۱۹۸۰ء) قابلِ مطالعہ ہے۔اس نمبر میں بھی جابہ جا برنی اور سید سجاد دہلوی کی دوستی کے تذکرے ہیں۔(۸۱)

برنی اور ڈاکٹر سید سجاد دہلوی میں بڑی گہری دوستی رہی تھی چناں چہ دونوں جب تک ہندوستان میں رہے ایک دوسرے سے ہر طرح رابطے میں رہے۔پاکستان بننے کے بعد برنی اور سید سجاد پاکستان آگئے تو یہاں دونوں دوستوں کی ملاقتیں گھنٹوں رہا کرتی تھیں۔

برنی نے عظمتِ رفتہ میں ڈاکٹر سید سجاد دہلوی پر جو خاکہ لکھا۔وہ ان کا بے مثال خاکہ ہے۔جس کے لفظ لفظ سے برنی کی محبت ان کے لیے ظاہر ہوتی ہے۔ان سے متعلق برنی نے جو معلومات دے دی ہیں وہ ایک مخلص اور شدید محبت رکھنے والا دوست ہی دے سکتا تھا۔

دونوں کی دوستی کے حوالے سے ڈاکٹر سید سجاد دہلوی کی بھانجی اور بہو بیگم ذاکر اعجاز نے اپنے ایک مضمون ''عظمتِ رفتہ کا مصنف خود عظمتِ رفتہ بن گیا'' میں کیا ہے یہ مضمون ۱۶ جون ۱۹۶۹ء کو روز نامہ جنگ، کراچی، سنڈے ایڈیشن میں برنی کی وفات پر شایع ہوا تھا۔ایک مقام پر وہ لکھتی ہیں:

> میرے دونوں ماموؤں ڈاکٹر سید سجاد دہلوی اور سید شوکت دہلوی سے ان (برنی) کی گہری دوستی تھی، میرے منجھلے ماموں سید شوکت مرحوم مولانا محمد علی کے سکریٹری تھے، جب برنی صاحب ہمدرد سے منسلک ہوئے تو ان کا اور ماموں شوکت مرحوم کا ساتھ ہو گیا اور دونوں کی دوستی روز افزوں ترقی کرتی گئی۔لیکن برنی صاحب کو جو خلوص میرے منجھلے ماموں اور خسر ڈاکٹر سید سجاد دہلوی سے تھا وہ شاید ہی کسی سے رہا ہو۔وہ جب ان کا ذکر کرتے تھے تو ان کی آواز بھرا جاتی تھی اور وہ اکثر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔
>
> دونوں میں لڑکپن ہی سے دوستی کے رشتے میں استوار تھے اور دونوں اسکول میں ہم درس رہے تھے۔میرے منجھلے ماموں سید شوکت دہلوی مرحوم جن کا ذکر میں اوپر کر چکی ہوں کئی برس تک جالج کی وجہ سے صاحب فراش رہے۔وہ لاہور سے ہمارے ساتھ کراچی آئے تو

> برنی صاحب ان سے ملنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ لیکن وہ خود چوں کہ دل کے مریض تھے اس لیے اعجاز ٹال جاتے تھے۔
>
> جب ماموں شوکت کی حالت بہت زیادہ خراب ہوئی اور وہ بے ہوش ہوگئے تو برنی صاحب سے نہ رہا گیا۔ وہ آخر کسی نہ کسی طرح ہمارے ہاں آن پہنچے کچھ دیر تک ماموں کو باچشمِ نم دیکھتے رہے، پھر ان کے پاس بیٹھ کر کلامِ پاک کی تلاوت کی اور ان پر ایک الوداعی نظر ڈالتے ہوئے کہا ''چلو میاں شوکت! ہم بھی تمھارے پیچھے ہی پہنچتے ہیں''
>
> ان کی باتیں بڑی دل آویز ہوتی تھیں۔ دھیما دھیما لہجہ، ہر بات میں ایک ٹھہراؤ، ہر لفظ جچا تلا، سیدھا سادہ، واضح اور مؤثر۔ یہی ان کے طرزِ تحریر کی بھی خصوصیات ہیں۔ (۸۲)

ان کا انتقال ۲۴ فروری ۱۹۵۵ء کو کراچی میں ہوا۔ ان دنوں برنی بمبئی میں تھے، لہٰذا وہ ان کی بیماری کے زمانے میں ان کی خدمت سے محروم رہے اور ان کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکے۔ جس کا اظہار برنی نے ان الفاظ میں کیا ہے ''یہ میری بدقسمتی تھی کہ ان کی علالت کے دوران میں بمبئی میں مقیم تھا۔۔۔ اس طرح میں ان کی آخری خدمت کرنے سے محروم رہا جس کا افسوس مجھے تا زندگی رہے گا۔'' (۸۳) یہ وہ دوست ہیں جن کے انتقال کے بعد بھی برنی کے تعلقات ان کے خاندان سے اپنی زندگی تک رہے۔ (۸۴)

## عارف ہسوی:

ان کا اصل نام عارف حسن تھا تاہم وہ مولانا عارف ہسوی کے نام مشہور ہوئے۔ ان کا تعلق فتح پور ہسوے کے مشہور علمی اور مذہبی خاندان سے تھا۔ ان کے والد ہسوے کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ صوفی منش تھے۔ عارف ابتداء میں تصوف کی طرف مائل تھے تاہم والد کے انتقال کے بعد مولویت کا رنگ غالب آگیا۔ پھر ایک زمانہ ان کی زندگی میں ایسا کہ نہ تصوف ہی کا رنگ رہا نہ مولویت کا بلکہ رند بن گئے۔

غالباً ۱۹۱۳ء میں دہلی آئے اور ملا واحدی کے ہاں قیام کیا۔ یہی وہ زمانہ جب ان سے برنی کی ملاقات ہوئی جو تاعمر دوستی میں تبدیل ہوگئی (۸۵)۔ برنی ان سے اپنی پہلی ملاقات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> تیس چالیس سال پہلے کی بات ہے کہ دہلی میں خواجہ حسن نظامی کے یہاں ایک دبلے پتلے لمبے آدمی سے ملاقات ہوئی۔ یہ عارف ہسوی تھے۔ وہ اس وقت نئے نئے اپنے گاؤں سے آئے تھے۔ چند ہی دنوں میں ہم دونوں بے تکلف دوست ہوگئے۔ خدا جانے ان میں کیا بات تھی کہ میں نے انھیں ہمیشہ اپنے دل کے قریب پایا۔ (۸۶)

انھوں نے ''حریت''، ''انقلاب''، ''استقلال ہند'' اور ''مولوی'' جیسے مشہور اخبار نکالے۔ ''مولوی'' سے آخر تک وابستہ رہے۔ وہ صوفیانہ، مولویانہ اور رندانہ طرز زندگی ترک کر کے سیاست کے میدان کارزار میں داخل ہوگئے اور تاحیات اسی میں اپنی محنت وصلاحیت صرف کرتے رہے۔ سیاست سے دل چسپی ایک تو زمانے کا مقتضی تھا دوسرے جن دوستوں کی صحبت میں رہے وہ ادبی اور صحافتی ذوق

رکھنے والے تھے چناں چہ اس میں مبتلا ہوئے ہی بنی۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> اسی رندانہ زندگی کا اثر ہے کہ سوزش آباد سیاست میں پڑ گیا۔ گو صدق وخلوص کا نام نہیں ہے اور محض ہوس جاہ کام کر رہی ہے تاہم خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ عالم آشکارانہ پیشگی اور آزاد دفتری کی پر معصیت زندگی سے یہ حالت بہتر ہے اس لیے کہ باعتبار نتائج کے بہر حال مفید ہے۔ (۸۷)

وہ ساری زندگی قلم سے روزی کماتے رہے۔ برنی نے انھیں ''لکھاڑ'' لکھا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت کمیٹی قائم ہوئی تو وہ اس کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ سول نافرمانی تحریک میں گرفتار ہوئے اور چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں گرفتار ہوئے۔ دو سال کی سزا ہوئی۔ انھیں آگرہ جیل بھیج دیا گیا۔ آگرہ جیل میں ملاقات کا حال برنی نے عظمتِ رفتہ میں لکھا ہے:

> میں سیدھا جیل خانہ کے سپرنٹنڈنٹ سے ملا اور عارف سے ملنے کی اجازت مانگی وہ انگریز تھا۔ کہنے لگا کہ تم سرکاری ملازم ہو کر عدم تعاون کرنے والے کانگریسی سے ملتے ہو۔ میں نے کہا کہ ''ہماری دوستی سیاسی نوعیت کی نہیں ہے، بلکہ جو چیز ہم میں مشترک ہے وہ ہمارے ادبی مشاغل ہیں اور بس'' چناں چہ اس نے فوراً پندرہ منٹ کے لیے ملنے کی اجازت دے دی مگر ہماری ملاقات کا سلسلہ دو گھنٹہ تک جاری رہا۔ جیلر نے اسسٹنٹ جیلر میرے ساتھ کر دیا تھا۔
>
> جیل میں انھوں نے اپنے کانگریسی دوستوں سے ملایا اور پھر کہا ''خدا کا شکر ہے کہ آج اتنے عرصہ کے بعد ایک دوست کی صورت تو نظر آئی'' یہ کہتے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئے اور ہم دونوں میں اس وقت تک کشتم کشتا ہوتی رہی جب تک کہ ہم تھک نہ گئے۔ اسسٹنٹ جیلر اور عارف کے دوسرے رفقا حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ عارف نے کہا کہ ''یہ ہماری بے تکلفی کا کھلا ہوا مظاہرہ ہے۔'' اس کے بعد اطمینان کے ساتھ ہم مشترک دوستوں کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ (۸۸)

اس واقعے کو امداد صابری نے اپنی کتاب تاریخ صحافت اردو، جلد ۵ میں عارف ہسوی کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ عارف شاعر بھی تھے تاہم ان کا کلام تا حال مجتمع نہ ہو سکا۔ امداد صابری نے تاریخ صحافت اردو میں ان کی دو غزلیں نقل کی ہیں۔ برنی سے ان کی گہری دوستی کا اندازہ اس خط سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے کوئی اک ماہ پیشتر برنی کو لکھا تھا جو نہایت کرب انگیز باتوں سے پُر ہے۔ یہ خط برنی نے اپنی تصنیف عظمتِ رفتہ میں نقل کیا ہے مگر نا مکمل یہاں اسے اصل سے مکمل نقل کیا جاتا ہے:

کوچہ ءچیلاں دہلی

۲۹ر نومبر ۱۹۳۵ء

بھائی برنی۔ خدا تمکو خوش رکھے کہ تم نے ایک غریب الوطن کو زندگی کی آخری گھڑیاں سخت کرب والم میں گزار رہا ہے اُسکو نہ صرف یاد رکھا بلکہ اُس کی خیریت دریافت کی۔

برادرم! ڈاکٹروں کے قیاسات غلط نکلے۔ پہلے آپریشن کے بعد کچھ عرصہ تک حالت ٹھیک رہی اس کے بعد مرض نے پھر ایک ماہ سے ہسپتال ہی میں ہوں گو ایک دو روز کے بعد شہر جانے والا ہوں مگر حالات بد سے بدتر ہیں۔ مرض برابر بڑھ رہا ہے اور سوائے اس کے کہ خدا تعالیٰ اپنا فضل فرمائے، بظاہر چند ہفتوں یا چند مہینوں کا قصہ اور رہ گیا ہے۔ کیوں کہ اب تک کوئی علاج کارگر نہیں ہوا۔

امید ہے کہ تم میرے لیے دعا کروگے کہ اگر صحت میری قسمت میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ مرض کے آلام اور اس کی کرب و تکلیف برداشت کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے اور خاتمہ بخیر کرے۔ اگر اس زمانہء تعلق و دوستی میں مجھ سے کوئی تکلیف تمکو پہنچی ہو تو میں اس کے لیے معافی کی درخواست کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم مع الخیر ہوگے۔

نیاز مند عارف ہسوی (۸۹)

ایک عرصے تک مرض میں مبتلا رہنے اور تکلیفیں جھیلنے کے بعد وہ ۱۲، جنوری ۱۹۳۶ء کو دار فانی سے کوچ کر گئے۔ برنی نے انھیں عظیم شخصیات میں جگہ دی اور ان کا تذکرہ اپنی تصنیف ٫عظمتِ رفتہ٬ میں کیا۔

برنی کے ابتدائی اور دلی کے زمانے کے دوستوں میں مسٹر آصف علی، سفیر، وزیر کا نام بھی آتا ہے۔ دونوں نے سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ وہ برنی سے سینیر تھے۔ برنی نے اپنے استاد جو مسٹر آصف علی کے بھی استاد تھے، کی لائف "سی ایف اینڈریوز" کے نام سے کی تو انھوں نے مسٹر آصف علی سے درخواست کی کہ اینڈریوز کے بارے میں کچھ لکھ دیں تو وہ اسے بھی کتاب میں شامل کرلیں گے۔ چناں چہ انھوں نے ۱۹ اپریل ۱۹۵۲ میں ایک خط کے ذریعے وہ معلوم برنی کو لکھ بھیجیں۔ وہ اس وقت اڑیسہ کے گورنر تھے۔ برنی کے نام اُن کے کئی خط ہیں جو تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کا انتقال ۳ر اپریل ۱۹۵۳ کو برن (سوئٹزرلینڈ) میں ہوا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ برنی کے دوستوں کا حلقہ نہایت وسیع اور متنوع تھا۔ ان کے دوستوں میں ہر عمر اور ہر مذہب کے افراد تھے۔ ان افراد کا تعلق کسی ایک شہر سے نہیں ان کے تعلقات ہندوستان سے باہر انگلستان تک پھیلے ہوئے تھے۔

خواجہ حسن نظامی، محمد علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا ماہر القادری، احسن مارہروی اور علامہ راشد الخیری سے ان کے تعلقات خصوصی نوعیت کے تھے۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

**برنی اور خواجہ حسن نظامی:**

خواجہ حسن نظامی سے برنی کی پہلی ملاقات ۱۹۰۸ء میں ہوئی یہ زمانہ ان کی طالب علمی کا تھا۔(۹۰) ملا واحدی کے توسط سے خواجہ صاحب کی صحبت میں پہنچے تھے۔(۹۱) اس وقت جو تعلقِ خاطر قائم ہوا تھا وہ خواجہ صاحب کی زندگی تک اسی اخلاص اور محبت سے قائم رہا۔ برنی نے اس تعلق کو دوستی کا نام دیا ہے۔ وہ خواجہ صاحب کے مرید نہیں تھے۔ خواجہ صاحب ان سے مضامین لکھواتے اور بعد اصلاح کے اپنے پرچے ''نظام المشائخ'' میں شایع کرتے تھے۔ ڈائری لکھنے کی عادت بھی انھوں نے ہی ڈالی تھی۔

خواجہ حسن نظامی نے حلقہء نظام المشائخ قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ نوجوانوں میں تحریر وتقریر کا شوق پیدا کیا جائے۔(۹۲) برنی نے اس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ اس انجمن کا ایک مقصد درگاہوں کی اصلاح بھی تھا۔ چوں کہ برنی بھی کسی قدر خواجہ صاحب کے ہم مزاج تھے چناں چہ اس اجلاس میں شرکت سے ان کی روشن خیالی اور اصلاح پسند طبیعت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس اجلاس کے بعد خواجہ صاحب کی مخالفتیں شروع ہو گئیں کہ وہ وہابی ہو گئے۔ یہ برنی کی خواجہ صاحب سے محبت اور ہم مزاجی کا آغاز تھا۔

ملا واحدی نے ''سوانح عمری حضرت خواجہ حسن نظامی'' میں حلقہ نظام المشائخ کے ذیل میں لکھا ہے:

> ۱۹۰۸ میں خواجہ صاحب نے حلقہ نظام المشائخ قائم کیا یعنی مشائخ کی تنظیم کی انجمن۔ ہمایوں کے مقبرے میں شاہزدہ داف شکوہ کی قبر کے پاس حلقہ نظام المشائخ کے افتتاحی جلسے کی دعوت دی گئی تھی، فقط چھ آدمی اُس میں شریک ہوئے۔ میں تھا، مرزا یعقوب بیگ نامی تھے (جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر ہیں) سید وحید الرحمٰن عرفانی تھے (جو میرٹھ کالج میں پروفیسر ہیں) ضیاء الدین احمد برنی تھے، قاضی لطیف الدین پیرزادہ درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی تھے اور علاء الدین نصیری، پیرزادہ درگاہ حضرت چراغ دہلی تھے۔ ساتویں خود خواجہ صاحب تھے۔(۹۳)

برنی کا لقب انھی کا عطا کردہ ہے۔(۹۴) جو اُن کے اصل نام ضیاء الدین احمد کا جزو لاینفک بن گیا اور وہ ''ضیاء الدین احمد برنی'' کے نام سے ایسے مشہور ہوئے کہ تاعمر انھیں اسی نام سے یاد کیا جاتا رہا اور برنی اس میں بہت خوش تھے۔ آج جس طرح ملا واحدی کا خاندان فخر کے ساتھ خواجہ صاحب کا عطا کردہ لقب ''واحدی'' کو سر کا تاج بنائے ہوئے ہے۔ اسی طرح برنی کا خاندان بھی اس لقب کو اپنے نام کا حصہ بنانے میں نہ صرف خوشی محسوس کرتا ہے بلکہ فخر کرتا ہے۔

ضیاء الدین احمد برنی کو چوں کہ تاریخ اور بالخصوص اسلامی تاریخ سے دل چسپی تھی چناں خواجہ صاحب نے مشہور مؤرخ ضیاء الدین برنی (۹۵) سے مماثلت کے پیشِ نظر انھیں یہ لقب عطا کیا۔ اس سے جہاں برنی کا نام ان بڑی شخصیات میں شمار ہونے لگا جنھیں خواجہ صاحب القاب عطا کر چکے تھے۔ لیکن چوں کہ برنی کے سوانح مرتب نہ ہونے کی وجہ سے بعد میں ضیاء الدین احمد برنی اور ضیاء الدین برنی کے نام تذکروں، تاریخ اور بعض لائبریریوں کے ریکارڈ میں خلط ملط ہو گئے۔ اگر چہ دونوں کے نام میں ''احمد'' کا اختلاف موجود تھا۔(۹۶)

برنی چوں کہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے لہذا خواجہ صاحب انھیں ''دہلوی'' لکھا کرتے تھے، اگر چہ وہ پنجابی الاصل تھے۔ برنی کے نام خواجہ صاحب کے خطوط میں انھوں نے کثرت سے برنی کو دہلوی ہی لکھا ہے۔ ایک خط میں اصرار کیا کہ دہلوی کیوں نہیں لکھا ''شکریہ کہ آپ نے رضا کاری کا فارم مکمل کر کے بھیج دیا۔ مگر اس میں خود آپ درج نہیں۔ نہیں ہیں، میں نے پڑھا آپ بھی موجود ہیں مگر نام کے ساتھ دہلوی نہیں لکھا۔'' (محررہ ۱۷ جون ۳۵ء غیر مطبوعہ) جب برنی اور ملا واحدی کے مشترکہ دوست مرزا یعقوب بیگ نامی اس بات ناراض ہو گئے تو خواجہ صاحب نے کہا ''میں برنی کو دہلوی ہونے کی سند دیتا ہوں'' (۹۷)

برنی کانپور اور بمبئی کی ملازمتوں کے باعث دلی سے دور رہے مگر جب وہ دلی آتے تو خواجہ، ملا واحدی اور چند اور دوست مل کر مشترکہ دعوت کھایا کرتے۔ اس طرح کی دعوت میں خواجہ صاحب کی فرمائش پر پراٹھے برنی کے گھر سے آیا کرتے تھے چوں کہ ان کی والدہ پراٹھے بہت لذیذ بنایا کرتی تھیں۔ اس کا تذکرہ خواجہ صاحب نے اپنے روزناموں اور ملا واحدی نے اپنے ''تاثرات'' میں کیا ہے۔ ملا واحدی نے برنی کی وفات پر اپنے مضمون میں بھی اُس یادگار صحبت کا تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> برنی صاحب بمبئی سے دلی آتے تھے ہر دفعہ ان کی میں دعوت کرتا تھا، جس میں پراٹھے برنی صاحب (مہمان خصوصی) کا لانے پڑتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی، علامہ راشد الخیری علامہ نیاز فتح پوری، مولانا عارف ہسوی اور قاری عباس حسین اس دعوت میں شریک ہوتے تھے۔ برنی صاحب کی والدہ پراٹھے بڑے مزے کے پکاتی تھیں۔ (۹۸)

برنی نے بھی عظمت رفتہ میں اس قسم کی دعوت کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> جب کبھی میں چھٹیوں میں دہلی جاتا تو ایک ایسی دعوت ضرور ہوتی جس میں خواجہ صاحت اور دوسرے احباب بھی شریک ہوتے۔ یہ طریقہ برسوں قائم رہا۔ خواجہ صاحب کو ہمارے یہاں کے پراٹھے بے حد مرغوب تھے اور اس لیے ایسی دعوتوں میں پراٹھوں کا انتظام ہمیشہ میری طرف سے ہوتا تھا۔ (۹۹)

ان دعوتوں کا ذکر خواجہ صاحب کے رسالے ''منادی'' میں باقاعدگی سے ہوا کرتا تھا۔ (۱۰۰) اسی طرح کی صحبتوں کا تذکرہ رازق الخیری نے ''سوانح عمری علامہ راشد الخیری'' میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> واحدی صاحب کے ہاں خواجہ حسن نظامی مرحوم، بھیا احسان الحق مرحوم سے بھی کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی۔ عارف صاحب اور شیدا صاحب سے بے تکلفی تھی۔ چھوٹوں میں ضیاء الدین احمد برنی، قاری عباس حسین، سید شوکت اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ (۱۰۱)

برنی دلّی سے دور رہے مگر دونوں ایک دوسرے کے دل سے دور نہیں رہے۔ خواجہ صاحب کے نام برنی کے خطوط تو دست رس میں نہیں تاہم خواجہ صاحب کے خطوط کی ایک بڑی تعداد اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ انھیں برنی سے کس قدر محبت تھی اور یہ

محبت دونوں کی بے تکلفی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

برنی کی والدہ کی خواہش تھی کہ وہ خواجہ صاحب کے خاندانی قبرستان میں دفن ہوں چناں چہ انھوں نے برنی کو بمبئی خط لکھ کر تاکید کی کہ وہ خواجہ صاحب سے اس سلسلے میں بات کرلیں۔ چناں برنی نے خواجہ صاحب کو خط لکھا اور انھوں نے برنی کو لکھا کہ ''تمھاری والدہ کے لیے میرے خاندانی قبرستان میں جگہ محفوظ کردی گئی ہے۔''(۱۰۲) ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو حسب وعدہ انھیں اسی قبرستان میں سپردخاک کیا گیا۔

خواجہ حسن نظامی نے ۱۸۵۷ء کے واقعات پر مبنی کتابوں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس سلسلے میں خواجہ صاحب نے دو کتابیں ''غدر کی صبح شام'' اور ''محاصرہ دہلی کے خطوط'' برنی سے ترجمہ کروائی تھیں۔ اس کا تذکرہ برنی نے عظمتِ رفتہ میں کیا ہے۔(۱۰۳) ''محاصرہ دہلی کے خطوط'' پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں شایع ہوئی تھی میرے پیش نظر اس کا چوتھا ایڈیشن ہے جو جولائی ۱۹۴۰ میں شائع ہوئی۔ جب کہ ''غدر کی صبح شام'' مارچ ۱۹۲۶ء میں۔ یہ دونوں کتابیں خواجہ حسن نظامی نے کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی کی جانب سے شایع کیں۔ ''محاصرہ دہلی کے خطوط'' کے سرورق پر تاریخ غدر دہلی کا تیسرا حصہ اور ''غدر کی صبح شام'' کے سرورق پر غدر دہلی کے افسانوں کا دسواں حصہ تحریر ہے۔ دونوں کتابوں کے دیباچے خواجہ صاحب کے تحریر کردہ ہیں۔ اندرونی ہر صفحے پر غدر کی صبح شام از خوجہ حسن نظامی دہلی اور محاصرہ دہلی کے خطوط از خواجہ حسن نظامی درج ہے جس سے یہ شبہ جنم لیتا ہے کہ غدر دہلی کے افسانے کے سلسلے کی دیگر کتابوں کی طرح یہ تیسرا اور دسواں حصہ بھی خواجہ صاحب کا مصنفہ ہے جب کہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ وہ ان دونوں کتابوں کے مرتب یا پبلی شر ہو سکتے ہیں۔ غالباً انھوں نے حقِ مرتب ہی کے تحت اس سلسلے کی تمام کتابوں پر ''از خواجہ حسن نظامی'' لکھا ہے۔ یا ممکن ہے انھوں نے حفاظت کی غرض سے کہ برنی کو کوئی آنچ نہ آئے ایسا کیا ہے اور ''غدر کی صبح وشام'' کی بہ نسبت ''محاصرہ دہلی کے خطوط'' انگریزوں کے لیے زیادہ ضرررساں جانتے ہوئے۔ ثانی الذکر پر مترجم کا نام بھی نہ دیا ہو۔ ڈاکٹر سلمان شاہجہاں پوری نے ان کے اس عمل ایک اور طرح سے دیکھا ہے وہ ''مکتوباتِ رئیس الاحرار'' میں لکھتے ہیں ''بے شمار کتابیں ان کی اپنی لکھی ہوئیں اور دوسروں کی لکھی ہوئی اُن کے نام سے چھپ چکی ہیں۔''(۱۰۴) یہی وجہ ہے ملا واحدی نے تمام حصوں کو خواجہ صاحب کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔(۱۰۵)

یہ اس زمانے کے ترجمے ہیں جب برنی حکومتِ برطانیہ کے ملازم تھے اور ٹرانسلیٹر آفس، بمبئی میں بہ طور ٹرانسلیٹر خدمت انجام دے رہے تھے۔ حکومتِ برطانیہ کا ملازم ہوتے ہوئے کسی ایسی کتاب کا ترجمہ کرنا جو حکومت یا انگریزوں کے خلاف جاتی ہو نہایت مشکل اور خطرناک تھا۔ اس کی یہی صورت تھی مصنف، مترجم اور پبلی شر کا نام نہ دیا جائے اور اس زمانے کی برنی کی کئی کتابیں ہیں جن پر ان کا نام مصنف کی حیثیت سے بھی نہیں ہے۔

برنی کے نام خواجہ صاحب کے ایک خط سے بھی یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اگر خواجہ صاحب کسی کتاب کا ترجمہ کرواتے سب سے پہلے برنی ہی سے کرواتے۔ ان کے الفاظ اس طرح ہیں ''ہاں ترجمے کا کام شروع ہوگا تو سب سے پہلے تم میرے ذہن میں آؤ گے کہ اپنے ہو۔''(۱۰۶)

اور ایک خط میں تو یہ امر بہت ہی واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

دیکھو میری مستعدی۔ ۲۱ دن کے بعد خط کا جواب لکھتا ہوں اور دیکھو اپنی مستعدی کئی مہینے میں صرف ۲۵ صفحے کا ترجمہ کیا۔ جناب آپ جیسا ریل نویس آدمی تو اب تک چار کتابوں کا ترجمہ کر چکا ہوتا۔ (۱۰۷)

برنی کے نام بہت سے خطوط سے چند اقتباس ملاحظہ فرمائیے اور ان کے بعد انھی خطوط سے چند القابات۔ خواجہ صاحب اور برنی کے تعلقات اور دونوں کے درمیاں بے تکلف اور پر خلوص محبت پر کیسی اچھی روشنی پڑتی ہے۔

''علی اور روحہ کی شادیوں کی مبارکباد جس خلوص اور محبت کے الفاظ میں آپ نے بھیجی ہے وہ میرے اور خواجہ بانو کے دل پر نقش ہوگئی۔ ہم آپ کے دلی شکر گزار ہیں۔'' (۱۰۸)

''آپ کی سچی محبت جو کراچی میں آپ کے برتاؤ سے ظاہر ہوگئی، دل پر نقش ہے۔'' (۱۰۹)

''میں یہ خط خصوصیت کے ساتھ آپ کی خدمت میں اس لیے لکھتا ہوں کہ آپ کو قوم و ملک کی موجودہ حالت کا پورا احساس ہے اور آپ کے دل میں اصلاح و ترقی کا ایک خاص درد ہے۔ پس یہ خط اس لیے لکھتا ہوں کہ پہلے آپ کا مشورہ حاصل کر لیا جائے کہ آپ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ نہیں'' (۱۱۰)

القابات ملاحظہ فرمائیے: ''پیارے برنی'' ''برادرم برنی صاحب'' ''برنی صاحب'' ''محبی جناب برنی صاحب دہلوی'' ''مخلص نواز جناب مولوی ضیاء الدین احمد صاحب برنی'' ''برنی شاہ کو سلام'' ''ڈیر برنی'' ''اویو برنی!'' ''مائی ڈیر دہلوی برنی'' ''جناب مولانا برنی صاحب دہلوی'' ''پیارے بھائی برنی صاحب'' ''ہلو ہلو، مائی ڈیر برنی دہلوی''

یہ القابات برنی سے ان کی شفقت آمیز محبت کے علاوہ بے تکلفی اور کسی قدر شوخی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے انتقال ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء پر برنی نے اپنے قدیمی تعلق اور محبت کے پیشِ نظر انھیں مختصر تا ہم نہایت پر اثر الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

خواجہ حسن نظامی نے دہلی میں ۳۱ جولائی کی شام کو پونے آٹھ بجے اس دنیائے جاوداں کو رحلت کی۔ مرحوم نے اکیلے اردو کی جتنی خدمت کی اتنی کسی اور نے نہیں کی۔ انھوں نے مضامین لکھے، اخبار نکالے، رسالے شائع کیے، سفرنامے لکھے، تاریخی کتابیں شائع کیں اور ملک کے مذہبی لٹریچر میں مفید اضافہ کیا۔ ان کا ہندی ترجمہ قرآن ان کی زندگی کی آخری خدمت ہے۔ یہ کہنا مبالغے میں داخل نہ ہوگا کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کہ وہ سارے ملک کے اردو داں طبقے پر چھائے ہوئے تھے۔ انھوں نے اردو کی جس انوکھے طریقہ سے خدمت کی وہ ہمیشہ یادگار رہے گی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا ان کی کتابوں کی قدر

بڑھتی جائے گی۔ان کی موت سے ملک ایک البیلے ادیب اور انشاء پرداز کی خدمات سے
محروم ہوگیا ہے۔(۱۱۱)

## برنی اور مولانا محمد علی جوہر:

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں محمد علی جوہر سیاسی رہ نما، صحافی، ادیب، شاعر اور عاشق رسول کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔انھوں نے برصغیر کی ملی وقومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔صحافت میں ان کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف میدان صحافت میں کیا جا چکا ہے۔

ضیاءالدین احمد برنی کی محمد علی سے پہلی ملاقات ۱۹۱۱ء کی آخری سہ ماہی میں بہ روز جمعہ دہلی کی جامع مسجد میں ہوئی ۔اس وقت وہ طرابلس کے زخمیوں کے لیے چندہ جمع کررہے تھے۔(۱۱۲)ان دنوں برنی سینٹ اسٹیفنز کالج میں طالب علم تھے۔ابتدائی ملاقات کے بعد سے برنی کا تعلق ان سے تاحیات رہا۔۱۹۱۳ کالج سے بی اے کرنے کے بعد کہ ابھی نتیجہ نہیں آیا تھا، برنی مولانا کی خدمت میں پہنچے، بہ قول برنی محمد علی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ اخبار" ہمدرد" میں کام کریں۔چوں کہ اردو جرنلزم سے برنی کو شروع ہی سے لگاؤ تھا اور سرکاری ملازمت منتہائے نظر نہیں تھا لہذا اُس پیشکش کو فوراً قبول کرلیا اور بہ طور سب ایڈیٹر" ہمدرد" کے پہلے دور میں پندرہ مہینے کام کیا۔(۱۱۳)وہ لکھتے ہیں:

> چوں کہ جرنلزم سے مجھے شروع ہی سے لگاؤ تھا اور سرکاری ملازمت منتہائے نظر نہ تھی اس لیے میں نے بغیر کسی پس و پیش کے ان (مولانا محمد علی جوہر) کی اس پیشکش کو قبول کرلیا۔ پہلے مہینے مجھے تیس روپے دیے گئے دوسرے مہینے محمد علی نے خود ہی چالیس کردیے اور جب کچھ دنوں بعد انھیں بی۔اے کے امتحان میں میری کامیابی کا علم ہوا تو ملاقات کے کمرے سے باہر نکل کر اخبار کے سارے عملے کے سامنے چلا چلا کر مجھے مبارک باد دی اور اسی وقت میری تنخواہ بھی پچاس روپے کردی۔ان کی آواز میں جو محبت جلوہ گر تھی اس سے میرے کان آج تک لذت گیر ہیں۔میں کوئی سال سوا سال تک اس اخبار سے وابستہ رہا۔(۱۱۴)

برنی کی سب ایڈیٹری کے معاملے کو ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے شک کی نظر سے دیکھا ہے۔اگر چہ برنی نے متعدد جگہ اس سے متعلق لکھا ہے۔ابوسلمان شاہجہاں پوری لکھتے ہیں:

> برنی صاحب نے ہمدرد کی مجلس ادارت سے بہ حیثیت نائب مدیر اپنی وابستگی کا ذکر خود ہی کیا ہے۔ملا واحدی یا مولانا عبدالماجد دریابادی نے جو ہمدرد کی مجلس ادارت کے متعلق معلومات کا آج سب سے بڑا اور مستند ماخذ ہیں، ان کے بارے میں بالکل ذکر نہیں کیا۔(۱۱۵)

ملا واحدی نے برنی کی وفات پر جو مضمون لکھا تھا اس میں تحریر کرتے ہیں:

بی اے ہو جانے کے بعد برنی صاحب نے سال دو سال مولانا محمد علی جوہر کے روز نامہ ہمدرد اور ہفتہ روزہ کامریڈ (انگریزی) میں بحیثیت سب ایڈیٹر اور مترجم کام کیا۔(۱۱۶)

غالباً ملا واحدی کی یہ تحریر، بر مولانا عبدالماجد دریا کا تحریر کردہ ''عظمتِ رفتہ'' کا وہ پیش لفظ جس میں انھوں نے برنی کے بیان کی تردید نہیں کی، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری صاحب کی نظر سے نہیں گزرا۔ علاوہ ازیں برنی کے نام مشاہیر کے سیکڑوں خطوط میں ایک خط قاضی عبدالعزیز منصور پوری کا ہے۔ یہ ہمدرد کے دور اول کے سب ایڈیٹروں سے تھے۔ ان کا تذکرہ ابوسلمان شاہجہاں پوری نے ان الفاظ میں کیا ہے'' دوراوّل کے سب ایڈیٹروں میں قاضی عبدالغفار مرادآبادی، عارف ہسوی، قاری عباس حسین، محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری، قاضی عبدالعزیز منصور پوری کے نام آتے ہیں۔''(۱۱۷) انھی قاضی عبدالعزیز کا ۱۴ نومبر ۱۹۱۴ء کا محررہ ایک خط برنی کے نام ہے جس کی یہ عبارت'' آپ کی پریشانی حالت سے مجھے بہت صدمہ ہوا۔ میں نے آپ کو مدرسہ اسلامیہ کی ملازمت قبولنے پر توجہ دلائی تھی مگر آپ نے اس وقت اڈیٹری کی شان کو کبیر سمجھا۔ خیر اس میں بھی خدا کی مصلحت ہے۔''(۱۱۸) غالباً اس بات پر شاہد ہے کہ وہ ایڈیٹوریل بورڈ میں تھے۔ اس سلسلے میں ایک خط یا آفس آرڈ مزید پیش کیا جاسکتا ہے جس سے جہاں یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ برنی ایڈیٹوریل بورڈ میں تھے وہاں ایک معاملہ اور صاف ہو جائے گا جسے غالباً مصلحتاً برنی نے تاحیات ظاہر نہیں کیا وہ ہمدرد سے برنی کا تعلق ختم ہونے سے متعلق ہے۔

برنی نے عظمتِ رفتہ سے لے کر اپنے خودنوشت حالات ''میری زندگی کے بارے میں'' میں بھی یہی لکھا کہ ''۱۹۱۴ء کے وسط میں میرا تعلق ہمدرد سے ٹوٹ گیا۔'' اس ٹوٹ جانے کی وجہ انھوں نے کہیں بھی ظاہر نہیں کی۔ اپنی تصنیف ''اخباری لغات معروف بہ کلید اخبار بینی'' کے دیباچے میں صرف ایک جملے کے ذریعے اس جانب اشارہ کیا ہے غالباً یہ اشارہ محمد علی کی جانب ہے۔'' میرا اخباری تعلق (فردِ واحد کے استبدادی حکم کی بدولت) قطع ہوئے کچھ عرصہ گزرتا ہے۔'' جب کہ مذکورہ خط نما آفس آرڈر سے ظاہر ہوتا ہے کہ برنی کو ۱۰ رجون ۱۹۱۴ء کو ایک ماہ پیشتر مطلع کیا گیا کہ ایڈیٹوریل اسٹاف کو کم کرنے کی غرض سے فارغ کیا جاتا ہے۔ انھیں ایک ماہ بعد یعنی ۱۰ رجولائی ۱۹۱۴ء تک ان کی ذمے داریوں سے فارغ کر دیا جائے گا۔(۱۱۹) یقیناً اس کی وجہ مولانا محمد علی کا مزاج رہا ہوگا۔ جس کی جانب ایک اشارہ قاضی عبدالعزیز کے خط میں بھی ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> صحت کے لحاظ سے میرے حق میں یہ اچھا ہوا کہ ''ہمدرد'' سے قطع تعلق ہو گیا، مگر ہمدرد نے میرا کاروبار پٹیالہ کا سب ناس کر دیا۔ مسٹر محمد علی سے مجھے اس قدر بے رخی کی توقع نہ تھی۔ حقیقت میں جو لوگ انتظامی امور میں اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے وہ کبھی نیک و بد میں تمیز بھی نہیں کر سکتے۔(۱۲۰)

حیرت ہے کہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے اپنی تصنیف ''مولانا محمد علی اور ان کی صحافت'' میں جا بجا برنی کی کتاب ''عظمتِ رفتہ'' کا حوالہ دیا ہے اور برنی کے بیانات کو سند کا درجہ دیا ہے تاہم برنی کے مذکورہ بیان پر انھیں کیوں یقین نہیں آیا۔ انھوں نے ملا وحدی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کو قابل استناد قرار دیا ہے جب کہ عبدالماجد دریابادی کا تعلق ہمدرد کے دوسرے

دور (نومبر۱۹۲۴ء) سے تھا۔ اور ان کا وہ تعلق باقاعدہ تعلق نہیں تھا۔ ملا واحدی کا ہمدرد سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ تاہم انھیں چلتی پھرتی تاریخ کہا جا سکتا ہے اگر چہ وہ بھی انسان تھے اور بعض معاملات میں ان سے بھی سہو ہوا ہے۔

برنی نے ایک مقام پر نہیں بلکہ متعدد مقامات پر خود کو بلا تردید اور بلا خوف وخطر روزانہ ہمدرد کا اسسٹنٹ ایڈیٹر ہی لکھا اور کسی نے ان کے اس بیان کی تردید نہیں کی۔ مولانا عبدالماجد نے عظمتِ رفتہ کا ''پیش لفظ'' لکھا اس میں کہیں برنی کے اس بیان کی تردید نہیں کی برنی کے نام ان کے خطوط میں بھی برنی کے اس بیان پر کوئی تبصرہ یا تردید نہیں۔

مذکورہ بالا بحث اور شواہد سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ برنی کا بیان مبنی برحق اور انھوں نے ۱۰رجولائی ۱۹۱۴ء تک ہمدرد میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور پھر یہ تعلق بہ وجوہ ٹوٹ گیا۔

جس دہلی سازش کیس کا ذکر سید جالب دہلوی کے خط میں آیا ہے اور جسے برنی نے ان کے تذکرے کے ذیل میں عظمتِ رفتہ میں نقل کیا ہے۔ راقم نے لاہور کے عجائب گھر میں ''ہمدرد'' کی فائل میں وہ رپورٹیں دیکھی ہیں۔ وہ سید جالب دہلوی کے بیان کی تصدیق کرتی ہیں۔ جس جلد میں روزانہ ہمدرد کے وہ شمارے تھے وہ خستگی کے باعث اسٹور روم میں رکھ دی گئی تھی اور دکھانے کی اجازت نہیں تھی راقم بڑے اصرار کے بعد اجازت حاصل کی خود اسٹور میں، باوجود سخت گرمی کے وہ جلد تلاش کی اور اس میں ان رپورٹوں کا مطالعہ کیا۔ ہر رپورٹ پر برنی کا نام درج ہے۔

جیسا کہ ملا واحدی نے لکھا ہے کہ برنی نے کامریڈ میں مترجم کے طور پر کام کیا ممکن ہے برنی نے ترجمہ نگاری کا کام محض تکمیلِ شوق کی غرض سے کیا ہو اور اس کے اظہار کو در خورِ اعتنا نہ سمجھا ہو۔ تاہم ملا واحدی کے اس بیان کی تردید بھی نہیں کی جا سکتی کیوں کہ برنی کو ترجمہ نگاری سے نہ صرف شوق تھا بلکہ طالب علمی کے زمانے سے تجربہ بھی۔ برنی کے بڑے صاحب زادے اعجاز احمد برنی نے اپنی ایک تحریر اور انٹرویو میں بھی کہا ہے کہ وہ کامریڈ میں مترجم تھے۔

برنی نے ۱۹۱۷ میں راجہ غلام حسین کے ہفتہ وار انگریزی اخبار ''نیو ایرا'' لکھنؤ میں مولانا محمد علی کی رہائی کے بارے میں ایک طویل مراسلہ لکھا تھا جس کے شایع ہو جانے کے بعد مدراس کی ایک پبلشنگ فرم گنیش اینڈ کو نے انھیں خط لکھا کہ وہ مولانا کی زندگی کے بارے میں ایک کتاب لکھیں۔ چناں چہ برنی نے انگریزی میں ''Muhammad Ali:his life and services'' لکھی۔ جو ۱۹۱۸ میں مذکورہ پبلشنگ کمپنی نے مدراس سے شایع کی۔ چوں کہ برنی جولائی ۱۹۱۸ء، میں سرکاری ملازمت میں آ گئے تھے لہٰذا اس کتاب پر مصنف ان کا نام نہیں دیا گیا۔ (۱۲۱)

برنی کو یہ اعزاز اور فخر حاصل ہے کہ انھوں نے انگریزی زبان میں محمد علی جوہر کی پہلی سوانح عمری تحریر کی۔ ان کا بیان ہے کہ ''یہ مولانا محمد علی کی انگریزی میں پہلی مختصر Biography ہے اور مجھے فخر ہے کہ اس کی ابتدا مجھ سے ہوئی۔'' (۱۲۲) انھوں نے یہ کتاب کس شوق، جذبے اور محنت سے لکھی اور حقائق کو تحریر میں لانے کے لیے کن احتیاطوں کو پیش نظر رکھا۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

جس زمانے میں مولانا محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند تھے میں وہاں کے ڈپٹی کنشنر

جی۔ایل۔کاربیٹ کی اجازت سے تین دن تک ان کا مہمان رہا۔اس اثنا میں میں نے اپنی انگریزی کتاب جو مولانا کے حالاتِ زندگی پر مشتمل تھی، ان کے گوش گزار کردی اور جہاں جہاں انھوں نے تصحیح فرمائی میں نے اسے درست کرلیا۔یہ کتاب جولائی ۱۹۱۸ء میں شائع ہوگئی۔اس پر میرا نام نہیں ہے۔اس لیے کہ اس کی اشاعت کے وقت میں مدخولہء حکومت ہوچکا تھا۔(۱۲۳)

محمد علی جوہؔر پر انھوں نے اپنی دوسری تصنیف نہایت محنت اور تحقیق کے بعد ترتیب دی۔اس کا آغاز تو انھوں نے غالباً ۵۶۔۱۹۵۵ء میں کیا تھا تاہم اس کی تکمیل ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔اسی سال اس کی اشاعت اردو اکیڈمی سندھ سے ہونی تھی تاہم باوجوہ نہیں ہوسکی۔مارچ ۲۰۰۱ میں برنی کے انتقال کے بعد اردو اکیڈمی نے شایع کی۔برنی اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''مولانا محمد علی جوہؔر'' میں نے اپنی زندگی کے اس حصہ میں مکمل کی ہے جہاں سے عالم بالا اب کچھ زیادہ دور نہیں رہا۔میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کسی مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیا گیا۔واقعات جوں کے توں بیان کردیے گئے ہیں اور حتیٰ الامکان محمد علی کے اپنے الفاظ ہیں۔وہ جیسے کچھ بھی تھے میں ان اوراق میں انھی کو پیش کردیا ہے۔مگر اس کے باوجود یہ کتاب ان کی زندگی کے ہر واقعہ پر حاوی نہیں ہے۔

''مولانا محمد علی جوہؔر'' محبت وعقیدت کا ایک حقیر گل دستہ ہے جسے میں رفیق کار، دوست اور عقیدت مند کی حیثیت سے محمد علی کی روح پرفتوح کے حضور میں اور ملک وملت کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔خدا کرے اس ''عظمتِ رفتہ'' کی سی قبولیت حاصل ہو اگرچہ مجھے احساس ہے کہ یہ کتاب ویسی نہیں ہے جیسی میں پیش کرنی چاہتا تھا۔(۱۲۴)

محمد علی جوہر سے برنی کا محبت اور عقیدت کی بنیاد پر قائم ہونے والا تعلق ان وفات تک قائم رہا۔مولانا کی وفات کے بعد برنی نے تاریخی واقعات سے پردہ کشائی اور مولانا سے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار باقاعدگی کے ساتھ ہندو پاکستان کے اردو انگریزی رسائل واخبارات کے علاوہ ریڈیو پاکستان سے تقریروں کے ذریعے کیا۔

بمبئی کرانیکل، روزنامہ ملت، اجمل، ڈان، جنگ، ریاض کراچی، انجام کراچی، لیڈر، ڈیلی نیوز کراچی، عصمت کراچی، اور کتابی دنیا وغیرہ میں خاص طور پر ان کے مضامین شایع ہوتے رہے ہیں۔

عظمتِ رفتہ میں برنی کا خاکہ ''مولانا محمد علی جوہر'' کا ایک ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے۔یہ خاکہ نہ صرف مولانا کی شخصی تصویر کشی کرتا ہے بلکہ ان کے قومی وملی جذبات ونظریات کا واضح اظہار بھی کرتا ہے اور مولانا کی ایک حقیقی اور جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ایسی تصویر جو یادگار بھی ہے اور سبق آموز بھی۔یہ خاکہ مولانا سے برنی کے تعلق پر بڑی واضح روشنی ڈالتا ہے۔اس خاکے کی حقیقت پسندی اور ہر دل عزیزی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ خاکہ اپنی تاریخی اور شخصی اہمیت کے پیش نظر

مولانا محمد علی پر ترتیب پانے والی کتابوں میں بار بار جگہ پا رہا ہے۔

## برنی اور علامہ اقبال:

برنی اور اقبال کے تعلقات کی نوعیت ادبی تھی اور اس کی بنیاد محبت وعقیدت پر قائم تھی۔ یہ تعلق بھی برنی کے لیے باعث فخر رہا ہے۔ شاعر مشرق اقبال سے برنی کی محبت وعقیدت اُس عہد کا فطری تقاضا تھی۔ برنی نے اقبال کو پہلے پہل آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۱۱ء دہلی میں دیکھا تھا جہاں اقبال کو ''ترجمانِ حقیقت'' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔(۱۲۵) ان کی پہلی ملاقات اور تعلقات کا آغاز اس وقت ہوا جب برنی سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں بی اے کے طالب علم تھے اور امتحان دینے ۱۹۱۲ء میں لاہور گئے تھے۔(۱۲۶) اقبال سے ملاقات کے لیے برنی نے خواجہ حسن نظامی سے ایک تعارفی خط لے لیا تھا۔(۱۲۷) اس ملاقات کے بعد برنی کی اقبال سے نہ صرف کئی ملاقاتیں ہوئیں بلکہ انھوں نے خط کتابت کے ذریعے شاعر مشرق سے اس علمی تعلق کو قائم رکھا۔(۱۲۸)

اقبال سے برنی کی آخری ملاقات بمبئی میں اس وقت ہوئی جب اقبال ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آرہے تھے۔ ان کا قیام خلافت ہاؤس میں تھا۔(۱۲۹) برنی ان دنوں ٹرانسلیٹر آفس، بمبئی سیکریٹریٹ میں بہ حیثیت ٹرانسلیٹر ملازم تھے۔(۱۳۰) انھی دنوں عطیہ بیگم نے اقبال کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا جس میں دیگر احباب کے علاوہ برنی بھی مدعو تھے۔ اس تقریب کی تفصیل برنی نے عظمتِ رفتہ میں بیان کی ہے اور جہاں کہیں اقبال اور بمبئی کا تذکرہ ہوا ہے برنی ہی کے حوالے سے یہ واقعہ عظمتِ رفتہ سے نقل ہوا ہے۔

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں ''پنجابی ایسوسی ایشن'' کی جانب سے، جس کے برنی جوائنٹ سیکریٹری تھے، کاؤجی جہانگیر ہال میں ''یوم اقبال'' منایا گیا تھا۔ برنی نے اس کا مختصر حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

> لاہور کے انٹرمیڈیٹ کالجوں کے طلبا کی اپیل کے جواب میں ہم نے بھی بمبئی میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو ''یوم اقبال'' منایا تھا۔ یہ دن سارے متحدہ ہندوستان میں منایا گیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے حضور میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا جائے اور ان کی صحت کے لیے دعائیں مانگی جائیں۔ اس جلسے میں جو کاؤجی جہانگیر ہال میں منعقد کیا گیا تھا مسز نائیڈو نے بھی معرکۃ الآرا تقریر کی تھی۔(۱۳۱)

یہ امر اقبالیات کے ذیل میں برنی کی دل چسپی اور ان کی صلاحیت کو واضح کرتا ہے کہ اقبال کی زندگی اور بعد از وفات انھیں بمبئی کے معروف انگریزی اخبار Bombay Chronicle کی جانب سے اقبال کی زندگی اور خدمات پر لکھنے کی بار بار دعوت دی گئی۔(۱۳۲)

برنی کا ایک مضمون ''فلسفۂ قوتِ ارادی'' الناظر، لکھنؤ میں اگست ۱۹۱۲ء، زمانۂ طالب علمی میں شایع ہوا تھا جس پر الناظر کے مدیر نے علامہ اقبال کو متوجہ کرنے کے لیے یہ نوٹ لکھا تھا'' قابلِ ملاحظہ جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے، پی ایچ ڈی''۔

برنی نے اقبال کی شخصیت اور کلام پر مضامین اور تبصروں کی صورت میں اپنے خیالات اور تنقیدی فکر کا اظہار کیا ہے جو

مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شایع ہوئے ہیں۔

برنی نے جب ۱۹۱۵ء(۱۳۳) میں اخبار بین حضرات کے لیے ''کلید اخبار بینی'' لکھی اور اسے اقبال سے منسوب کرنا چاہا تو انھوں نے اس کی اجازت کے لیے اقبال کو خط لکھا اقبال نے انھیں ۱۷اپریل ۱۵ کو جواب میں لکھا ''میں اس عزت کا نہایت مشکور ہوں جو آپ مجھے دینا چاہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ میں اسے قبول کرنے سے قاصر ہوں اور اس وجہ سے کہ مجھے اس قسم کے نام ونمود سے قطعی اجتناب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معاف فرمادیں گے۔'' (۱۳۴) اقبال کے ایک اور خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ برنی اس سلسلے میں ایک اور خط لکھا ہوگا۔ اقبال نے ۲۰اپریل ۱۹۱۵ کو ایک خط کے جواب میں لکھا ''اگر کتاب کو میرے نام سے معنون کرنے سے اس کی قدر وقیمت میں کوئی اضافہ ہوسکتا جو آپ کی مالی منفعت یا کسی اور فائدہ کا باعث ہوتا تو ضرور اجازت دے دیتا مگر جہاں تک میں سوچتا ہوں اس کا یہ اثر نہیں ہوسکتا کیوں کہ مجھے اخباری دنیا یا اخبار نویسی سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر چوں کہ مصر ہیں اس واسطے میں اپنا پہلا خط واپس کرتا ہوں اور یہ عرض کرتا ہوں کہ کتاب دیکھ کر اس امر کا فیصلہ کروں گا۔'' (۱۳۵)

۲۲مئی ۱۹۱۵ کو اقبال برنی کو لکھتے ہیں ''آپ کی کتاب مفید ثابت ہوگی۔ اردو خوانوں کے لیے بالخصوص اس قسم کی کتاب کی ضرورت تھی۔ اگر آپ اس کتاب کے ڈیڈیکیشن سے مجھے معزز کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کی راہ میں حائل ہونا نہیں چاہتا۔ شوق سے ڈیڈیکیٹ کیجیے۔'' (۱۳۶)

تینوں خطوں کے اقتباسات سے یہ اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ کتاب کو دیکھ لینے کے بعد اقبال کے لہجے اور رویے میں کیسی تبدیلی آئی کہ کہاں تو وہ برنی کی عقیدت مندانہ خواہش کو مالی منفعت پر محمول کر کے خفا ہو رہے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کتاب ان کے نام معنون ہو مگر انھوں نے کتاب کے مطالعے کے بعد نہ صرف باخوشی اجازت دی بلکہ اس انتساب کو اپنے لیے باعث عزت قرار دیا۔

عطیہ بیگم نے جب ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے اقبال پر اپنی مشہور زمانہ انگریزی کتاب "Iqbal" شایع کی تو اس کے پیش لفظ "Raison D'etre" کی آخری سطور میں برنی کے لیے لکھا:

(۱۳۷) My thanks to Miss Hilla Vakeel and Ziauddin Burney for reading the manuscript.

برنی نے عطیہ بیگم کی کتاب ''اقبال'' کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ''اقبال'' ہی کے عنوان سے کیا جو اقبال اکیڈمی ،کراچی کی جانب سے پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۵۶ء میں شایع ہوا۔ دوسری مرتبہ مارچ ۱۹۶۹ء میں ایک ہزار کی تعداد میں شایع ہوا۔

برنی کو اس کتاب کے حوالے سے یہ اختصاص حاصل ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ عطیہ فیضی کی ڈائری کے صفحات کا اس میں ترجمہ کر کے اضافہ کیا۔ یہ ڈائری یکم اپریل ۱۹۰۷ء سے ۴ستمبر ۱۹۰۷ کی زمانی مدت کو محیط ہے۔

من جانب مترجم ''ایک بھولی ہوئی صحبت'' کے عنوان سے ایک مضمون شامل کتاب کیا گیا ہے جو انھوں نے ۲۷اپریل ۱۹۴۶ کو اقبال ڈے کے موقع پر انجمن ہائی اسکول بمبئی میں پڑھا تھا۔ یہ جلسہ نواب حسن یار جنگ بہادر کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے کو عطیہ فیضی نے ترتیب دیا تھا۔ (۱۳۸)

۱۹۵۵ء میں ماہنامہ کتابی دنیا جاری کیا تو اقبالیات کے موضوع پر مضامین، کتابوں پر تبصرے اور خبریں شایع کرنے میں

شاعر مشرق سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

اپریل ۱۹۶۶ میں کتابی دنیا کا ''اقبال نمبر'' جاری کیا۔ اس شمارے کی ضخامت عام شماروں سے زیادہ ہے۔
اس شمارے میں شاہ حسن عطا کے مضمون ''اقبال اور بیداری ایشیا'' کو نمایاں جگہ دی گئی ہے۔ جب کہ دوسرا مضمون ضیاءالدین احمد برنی کا ''بیا بہ مجلس اقبال'' ہے۔ منشی اختر وارثی کا مضمون ''آغا حشر کاشمیری'' اقبال کی یادگار کے طور پر شایع کیا گیا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں آغا حشر نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنی ایک نظم ''شکریہ یورپ'' سنائی تھی اس جلسے میں اقبال بھی موجود تھے اور اقبال نے اپنی پسندیدگی بھی ظاہر کی تھی۔

''فرمودات اقبال، تہذیب فرنگ کے بارے میں'' کے عنوان سے کلامِ اقبال سے ان کے اشعار مذکورہ موضوع پر دیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں اقبال اکادمی، کراچی کی فہرستِ کتب تفصیلاً شایع کی گئی ہے۔

اقبال پر اتنا مختصر مواد پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان دنوں برنی بیمار تھے ورنہ وہ اقبال پر خود بھی زیادہ لکھتے اور دیگر اہلِ قلم سے بھی لکھواتے۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً یہ نمبر ایک یادگار نمبر ہوتا۔

اقبال پر برنی کے چند مضامین کے عنوانات ملاحظہ فرمایئے:
''ڈاکٹر اقبال کی معیت میں چند لمحات''، (ماہ نو، کراچی، اپریل ۱۹۴۹)، ''ڈاکٹر اقبال'' (مشمولہ عظمتِ رفتہ، ۱۹۶۱) ''اقبال کی یاد میں'' (سیارہ ڈائجسٹ، لاہور، مارچ ۱۹۷۷) (۱۳۹)، ''اقبال، دیگر مشاہیر اور عطیہ فیضی'' (ماہ نو، کراچی، اپریل ۱۹۶۷ء) (۱۴۰)، ''ایک حدیث کی شرح اقبال کی زبانی'' (ریاض، کراچی، مئی ۱۹۵۳) وغیرہ۔

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ برنی کے تعلقات کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ اس وسعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جن حضرات سے ان کے خاص تعلقات تھے ان کا ذکر تفصیلاً کر دیا گیا ہے باوجود اس کے بہت سے اہم نام اور ہیں لہذا چند کے نام دیے جاتے ہیں: بھیا احسان الحق، فضل احمد شیدا، عزیز حسن بقائی، رازق الخیری، حفیظ سید، شیخ عبدالقادر، زیڈ اے بخاری۔ ان حضرات کے تذکرے برنی کی کتابوں میں ملتے ہیں۔

## برنی کی شخصیت:

شخصیت کی اگر تعریف کی جائے تو وہ شخصی کردار کے بغیر نامکمل ہوتی ہے۔ شخصیت اور کردار کی تعمیر میں جو قوتیں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں ان میں عقائد، نظریات، تصورات اور خیالات کے علاوہ اس کی اخلاقیات، جذبہء احترامِ انسانیت، رواداری، صلح کل، عادات واطوار، غصہ، محبت وشفقت، نفرت، اخلاص، ملنساری، تحمل و برداشت اور ہمدردی وغیرہ ہوتی ہیں۔

برنی کی شخصیت کا جائزہ اگر ان کی تحریرات اور ان پر لکھے جانے مضامین، ان کے اور ان کے نام خطوط اور انھیں دیکھنے والے افراد یعنی دوست احباب، اقارب اور اولاد کے بیانات کی روشنی میں لیا جائے تو ایک ایسے شخص کا خاکہ ابھر کا سامنے آتا ہے جو صرف اسلامی عقائد کا حامل ہی نہیں بلکہ ہر حالت اور ہر صورت میں اسلام کے دفاع کو اپنا فرض عین سمجھتا ہو۔ اسلام سے محبت کرنے اور اسلام پر جان دینے والوں پر جاں نثار۔ نیکی اور شرافت جس کی سرشت میں ہو۔ تحمل اور برداشت کا دامن جس سے کسی حالت میں نہ چھوٹتا ہو۔ احترام

انسانیت اور رواداری جس کا عقیدہ ہو۔ماں باپ کا احترام اور قدر کرنے والا ہو۔دوستوں کا دوست ہو اور بھائیوں سے شدید محبت کرنے والا ہو۔اولاد پر مہربان بھی نگہ دار بھی ہو۔علم وادب جس کا اوڑھنا بچھونا ہو اور اردو کا فروغ جس کا مشن ہو۔

برنی عقیدے کے اعتبار سے سنّی مسلمان تھے۔وہ احترام انسانیت کے قائل تھے۔ہندو مسلمان اتحاد کے حامی تھے۔فرنسز روبن سن (Francis Robinson) نے ان کا تعلق مسز اینی بیسنٹ کی ہوم رول مومنٹ (Home Rule Movement) سے جوڑا ہے۔(۱۴۱) اگرچہ برنی نے کہیں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔تاہم ان کے خیالات اور بعض تحریرات سے یہ ضرور ظاہر ہوا ہے کہ وہ رجعت پسندی کے بجائے روشن خیال اسلامی زندگی کے قائل تھے۔اس کا مطلب قطعی یہ نہیں ہے کہ وہ اسلام سے ہٹ کر کسی اور عقیدے یا گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کی اسلام پسندی کا اندازہ انیس شاہ جیلانی کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے:

> عیسائیت پر ایک معرکے کی کتاب لکھنے میں مصروف تھے ثابت یہ کیا جا رہا تھا کہ قرآن حضرت مسیح کے بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے اس کی پوری تائید موجودہ اناجیل سے بھی ہوتی ہے انھوں نے موجودہ عیسائی مذہب اور انجیل کی لغو باتوں اور خرابیوں پر بائبل کی آیات کی روشنی میں بحث کی ہے۔کئی عیسائی پادری اس کتاب کے ابواب سن کر چراغ پا تو بہت ہوئے لیکن جواب کسی سے نہ بن پڑا۔(۱۴۲)

ان کی تحریروں اور تصنیفات میں بھی اسلامی رنگ کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔قوم کے سچے ہمدرد تھے لہٰذا عورتوں کی تعلیم کو بہت ضروری خیال کرتے تھے۔برنی کے اپنے خاندان میں لڑکیوں کو تعلیم دینے کا رواج نہیں تھا۔منشی عبدالقدیر کی بیٹی میمونہ اختر اپنے انٹرویوں میں عرض کر چکی ہیں کہ خاندان کی مخالفت کے باوجود برنی نے انھیں اسکول اور کالج میں داخل کروایا اور تعلیم دلوائی۔

گزشتہ اوراق میں قیام کانپور کے ذیل میں ذکر آچکا ہے کہ انھوں اسلام کے موضوع پر مضامین لکھنے کے علاوہ وہاں مسلمانوں کی امداد کے لیے کوششیں بھی کیں۔یہ ذکر بھی ہو چکا ہے کہ غیر مسلموں کے اسلام پر الزامات اور رسول اللہ کی شان میں گستاخیوں کا وہ جواب بھی دیتے رہے۔اس کی تفصیل ان کی خودنوشت میں دیکھی جاسکتی ہے۔

انھیں ادب،صحافت اور تاریخ سے دل چسپی تھی۔انھیں ہر اچھی شے پسند تھی۔خواہ وہ کوئی لمحہ ہو،زمانہ ہو،شخص ہو،کتاب ہو یا کوئی اچھی بات ہو وہ اسے نہیں بھولتے۔ان کی یہ خوبی ان کے مضامین اور کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔''جہاں آرا''،''جمال الدین افغانی''،''سی ایف اینڈریوز''،''خیالات مہاتما گاندھی'' اور ''عظمتِ رفتہ'' جیسی کتابیں ان کی اسی پسندیدگی کی نظریں ہیں۔

ان کے جذبۂ احترامِ انسانیت کی صاف اور واضح تصویریں ''عظمتِ رفتہ'' میں نظر آتی ہیں۔برنی میں انسانی ہمدردی بلا کی تھی۔ان کے نام خطوط سے بھی ان کی اس خوبی کا پتا چلتا ہے۔

ان کے نام احسان مارہروی کے خطوط سے چند اقتباسات دیکھیے۔احسن کے جذبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتنے قلیل

عرصے میں برنی نے اپنے حسنِ سلوک سے احسنؔ کے دل میں ایک سچے اور حقیقی دوست کی جگہ پیدا کرلی تھی جس کے باعث احسن یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ ''اپنے چندروزہ سرسری تجربے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ جناب اپنے اخلاق خصوصی سے نمایاں امتیاز کے حامل ہیں۔'' (۱۴۳)، ''آپ کے خلوص اور بے لاگ شفقتوں نے گرویدہ کرلیا ہے۔اس لیے چاہتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آپ کو نہ بھولوں۔'' (۱۴۴) ''اگرچہ میرے خط میں کوئی خاص جواب طلب بات نہ تھی۔مگر آپ کی شفقت ومخلصانہ محبت آپ کو چھوڑتے نہیں دیتی۔اللھم زد فزد ولاشفقت۔'' (۱۴۵)

ان کے دوست بدر جلالی کے خط سے یہ الفاظ دیکھیے ''آپ نے تو کلا اپنی محبت ووابستگی کا اظہار فرمایا جو اس دور میں عنقا ہے۔کیوں نہ دعائیں دوں کیوں نہ شکریہ ادا کروں۔'' (۱۴۶)

برنی کی ایک اخلاقی خوبی یہ ہے کہ کسی کی مالی مدد کرتے ہیں اور کبھی ظاہر نہیں کرتے۔خطوط تو ایک طرف اپنی خود نوشت میں کہیں کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ امر ظاہر ہو۔بدر جلالی کے خطوط سے یہ اقتباسات دیکھیے۔''آپ کے ہدیہ محبت سے علاج کی کچھ سبیل ہوئی۔'' (۱۴۷) ''آپ کا تحفہ بہ صورتِ زر ابھی ملا ہے۔میرے لیے سب سے بڑی خوشی کا باعث ہوا اور میں نے اس کو سر آنکھوں پر رکھا۔یہ روپیہ نہیں ہے بلکہ جراحتِ دل کے لیے مرہم کے پھائے ہیں۔انھوں نے واقعی بڑا کام کیا ہے۔'' (۱۴۸)

مولانا ماہر القادری اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ''اس میں آپ میری رہنمائی اور ان کی مدد فرمائیں۔''دوسروں کے کام آنے سے بڑی اور کوئی نیکی نہیں۔ع کہ طاعت بجز خدمت خلق نیست۔اس نکتہ کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔'' (۱۴۹) ''آپ کی مصروفیت کے باعث ملاقات کا وقت ملتا نہیں،مگر میں اپنے کو آپ سے نہ جانے کیوں بہت قریب پاتا ہوں۔آپ کے دل کا بھی یہی عالم ہوگا۔'' (۱۵۰)

مولانا عبدالماجد ۱۹۵۵ء میں پاکستان آئے۔انھوں نے اپنے مضمون ''ڈھائی ہفتے پاکستان میں'' میں انھوں نے ان بے شمار لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جن سے پاکستان میں ان کی ملاقات ہوئی اور جن سے وہ ملنا چاہتے تھے تاہم ان سب میں برنی کا تذکرہ خصوصی طور پر اس طرح کیا ''کراچی کی صحبتوں کا ذکر اب ختم ہونے پر آرہا ہے۔بڑی ناشکری ہوگی اگر دو صاحبوں کا ذکر خیر خصوصی طور پر نہ کیا جائے۔ان میں سے ایک خواجہ عبدالوحید لاہوری ثم کراچوی ہیں۔ضابطہ سے محکمہ اطلاعات میں منسلک ،لیکن درحقیقت خدا معلوم کتنی اسلامی تحریکوں کے روح رواں اور انگریزی کتابی معلومات کے ایک چلتے پھرتے قاموس اور دوسرے خان بہادر ضیاء الدین احمد برنی دہلوی ہیں جو کبھی بمبئی کے تھے اور اب کراچی کے ہوچکے ہیں۔میرے قدیم کرم فرما اور بڑے فعال مستعد و کارگزار۔ان دونوں نے اپنا گویا سارا وقت اس نیازمندی کے لیے وقف کررکھا تھا، ہر وقت موجود ہر جگہ ساتھ۔تنخواہ دار مقامی سیکریٹری رکھے ہوتے تو وہ بھی ان دونوں سے بڑھ کر کارگزار ثابت نہ ہوتے۔''

برنی کے نام خطوط سے اس نوع کے متعدد شواہد پیش کیے جاسکتے ہیں۔علاوہ ازیں یہ بات بھی مختلف حوالوں سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ برنی نے اپنے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر کی اولاد کی ایک عرصے تک کفالت کی۔اس کا ذکر وہ اپنی خودنوشت میں بھی ایک مقام پر کرچکے ہیں۔غالباً وہ اس کا ذکر نہ کرتے جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں تاہم ایک تلخ امر نے انھیں مجبور کیا کہ وہ اس

کا ذکر کریں۔

کتابی دنیا کے متعدد شمارے اس امر کے گواہ ہیں کہ جب کسی ادیب یا شاعر کا انتقال ہوا تو برنی نے نہ صرف تحریراً اظہار افسوس کیا بلکہ کوشش کی کہ حکومت کی جانب سے اس کے خاندان کی کفالت کا انتظام ہو جائے۔ اس سلسلے میں ان کی قلمی کاوشوں کو قلمی جہاد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کیوں کہ جب تک انھیں کامیابی نہیں ہو جاتی وہ چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ اگر از خود یا کسی اور کی کوشش سے حکومت نے مدد کا یقین دلایا تو برنی سراہائے بہ غیر بھی نہیں رہے۔

قمر القادری لکھتی ہیں:

> ان کی زندگی ''خوش باش وے کہ زندگانی ایں است'' کا پرتو تھی وہ فطرتاً صلح پسند اور وضعدار تھے جس کسی سے دوستی یا رشتہ قائم کیا مرتے دم تک نبھایا۔ صوبہ بمبئی کی مسلمان خواتین میں مشہور ''فیضی خواہران'' زہرہ بیگم، آمنہ نازلی اور مشہور عالم عطیہ بیگم تمام ادبی ثقافتی اور فنونِ لطیفہ کی فضا پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان کا ایوانِ رفعت دنیا کی نام ور ترین ہستیوں کا مہمان خانہ اور فنونِ لطیفہ کا گہوارہ تھا۔ اُس وقت بھی برنی صاحب ان کے بے تکلف دوست تھے اور جب ایوانِ رفعت کے مکینوں کا سورج گہنایا، رات کی رانی کی خوشبو سے مہکتے ہوئے صحن کے بجائے وہ ہسپتال کے جنرل وارڈ میں صورتِ موہوم بنے ہوئے تھے۔ تب بھی برنی صاحب ان کے ویسے ہی مخلص دوست تھے جتنے ان کے عروج کے وقت۔ برنی صاحب پابندی سے ان دونوں بہنوں سے ملتے تھے اور ہر طرح سے ان کی دل جوئی کرتے۔ مجھے بھی ایک بار اپنے ساتھ لے گئے۔ میں ان کی موجودہ حالت دیکھ کر تھرا گئی۔ برنی صاحب کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ ہر ایک سے تعلقات خوش گوار رہیں اور اگر بہ صد مجبوری یہ ممکن نہ ہو تو ''موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود''۔ ملنسار، پرخلوص، بلند اخلاق، وطن دوست، اسلام پرست، وقت کے پابند، دن رات تخلیقِ ادب، تعمیرِ ادب میں منہمک ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا''۔(۱۵۱)

برنی ایک منظم شخص تھے۔ چیزوں کا سلیقہ خوب آتا تھا۔ ان کے رکارڈ سے دست یاب اشیاء میں ان کو دیے گئے سرٹیفکیٹ بھی ہیں جنھیں برنی نے نہایت احتیاط سے سنبھال کر رکھا۔ انھوں نے اپنے اردو اور انگریزی مضامین اپنی زندگی ہی میں ترتیب دے لیے تھے۔ غیر مطبوعہ کتب بھی اپنی زندگی ہی میں تیار کر لی تھیں۔(۱۵۲)

برنی اپنی کتابیں اپ ڈیٹ کیا کرتے تھے۔ جہاں آرا اور جمال الدین افغانی اپ ڈیٹ ہو کر شایع ہو چکی ہیں جب کہ تذکرہ بلھے شاہ اور عظمتِ رفتہ شایع نہیں ہو سکیں۔

انتقال سے قبل انھوں نے اپنے بچوں کو جو ہدایتیں تحریر کروائی تھیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ برنی اس

بیماری کی حالت میں بھی اپنے معاملات میں کتنے احتیاط پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کی یادداشت بلا کی تھی۔ انھیں ان اخیر ایام میں بھی یاد تھا کہ کسے کیا دیا جائے گا اور کس سے کیا وصول کیا جائے گا، کس کا کیا حق اور کس پر کیا قرض ہے۔

انیس شاہ جیلا کے مضمون سے چند اقتباسات جہاں تہاں سے نقل کرتا ہوں جو برنی کے کردار عادت واطوار اور شرافتِ نفس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ''شرافت، اخلاق اور مروت کا پیکر تھے۔'' ''آخر عمر میں (نماز) پڑھ دار تو ہوگئی تھی پھر بھی صبح سویرے بیدار ہو جاتے بچوں کو جگاتے نماز پڑھتے، قرآن کی تھوڑی سی تلاوت اور انگریزی ترجمے کا مطالعہ کرتے۔'' ''ان کا مسلک رواداری تھا۔ چھوت چھات سے دور، ہندوؤں کے ہاں مہینوں قیام کرتے اور کھاتے پیتے۔'' ''غلط تلفظ ان کے سینے میں برچھی بن کر اتر جایا کرتا تھا۔'' ''قد کاٹھ کے تو برنی صاحب ذرا سے تھے مگر اس چھوٹے سے خاکی وجود میں بے خوفی اور بے باکی کا مادہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔'' ''خطوں کے جواب بڑی باقاعدگی سے دیا کرتے تھے، گھنٹوں کی دیر بھی مشکل سے ہوتی، نام اور پتا انگریزی میں لکھنا بھی عادت سی تھی، جوابی لفافہ بھیجے تو مرحوم اسے توہین تصور کرتے اور خفا ہوتے۔ انگریز کی خوبی ایک یہ بھی بیان کیا کرتے تھے کہ خطوں کے جواب جلدی اور عمدگی سے دیتے ہیں۔'' ''بیمے کو جائز سمجھتے اور تصوف سے بھی شغف تھا، صوفیائے کرام کے فیوض باطنی کے قائل تھے، البتہ رسومات توہمات اور فروعات کے وہ سختی سے مخالف تھے، ملاؤں کی تقریریں سن کر بے قابو ہو جاتے تھے۔'' ''میں حاضر ہوتا تو رخصتی مصافحہ دروازے پر ہوتا۔'' ''مرنے والے دوستوں کی پیشانیاں وفورِ محبت سے چوم لینا اور تجہیز و تکفین کے جملہ مراحل میں شرکت ان کا معمول تھا۔''

چوں کہ برنی کے دیکھنے والے اور ان پر لکھنے والے اب کم ہی رہ گئے ہیں لہٰذا ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر انیس شاہ جیلانی کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جیلانی صاحب نے جو باتیں برنی کے حوالے سے تحریر کی ہیں وہ خاصی حد تک ان کی اولاد کے بیان سے بھی مطابقت رکھتی ہیں۔

قمر القادری اپنے مضمون میں برنی کی شخصیت اور کردار کے بعض گوشوں پر اس طرح روشنی ڈالتی ہیں:

> برنی صاحب صوم وصلوٰۃ کے تو بہت پابند تھے۔ علی الصباح نماز کے لیے گھر والوں کو تو کیا پاس پڑوس کو بھی اٹھا دیتے تھے۔ رمضان شریف میں بے روزہ دار کو خوب پھٹکارتے تھے۔ مگر پردے کے قائل نہیں تھے۔ کہتے تھے موجودہ پردہ شرعی نہیں بلکہ رواجی ہے۔ ہندو راجپوتوں اور برہمنوں کی صحبت میں رہ کر سیکھا ہے اسلامی پردہ وہ ہے کہ عورت قرونِ اولیٰ کی مسلمان خاتون کی طرح زمانۂ جنگ اور امن دونوں میں مفید ثابت ہو۔ شرم وحیاء پاس وفا اور حدِ اعتدال میں رہنا عورت کا فطری جوہر ہے اس کے لیے تصنع اور خلاف عقل پابندی کی ضرورت نہیں وہ عورت کی آزادی، بے راہ روی، بے حیائی اور لاابالی پن سے سخت متنفر تھے۔ قیدِ بے زنجیر بھی ناپسند تھا۔ دراصل وہ بہت اعتدال پسند اور وضع دار انسان تھے کسی بات میں افراط وتفریط اور ملمع کاری سے نفرت کرتے تھے۔

جب کبھی بہت غصہ آتا تو بے ساختہ لفظ ''نامراد'' زبان سے نکل جاتا ہر جملے سے پہلے بعد آخر یہی ترکیب بند ہوتا۔ آواز اتنی گھمبیر تھی کہ درودیوار لرز جاتے اور مقابل کا پتہ پگھل جاتا۔ چند منٹ یہ کیفیت رہتی پھر وہی مطلع صاف۔ دوستوں، عزیزوں اور ہمسایوں کے لیے تو فرشتہ رحمت تھے۔ طبیعت میں وراثتاً قناعت پسندی اور خودداری تھی ورنہ اگر چاہتے تو اپنے قلم سے دولت کے خزانے حاصل کر لیتے۔

ان کی امن پسند اور صلح جو فطرت نے بعض مرتبہ انھیں شدید نقصانات بھی پہنچائے مجھے یاد ہے میرے بچپن میں چند افراد نے ان کا حق ترجمہ خورد برد کر لیا اور خواہ مخواہ ان سے الجھ بھی پڑے بات بہت بڑھی مگر ان کی طبیعی سلامت روی نے معاملہ رفع دفع کر دیا اور پھر وہی لوگ ان کے گہرے دوست بن گئے۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ آپس کے تعلقات خوش گوار رہیں اگر یہ ممکن نہ ہو سکتا تو موسیٰ بدین خود عیسیٰ بدین خود۔ طبیعت میں وقتی غصہ ضرور تھا مگر شر پسندی یا سازش مطلق نہیں تھی۔ دوست نوازی کنبہ پروری، وطن دوستی، اسلام پرستی، وقت کی پابندی، دن رات مصروفیت اور انہماک ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔'' (۱۵۴)

برنی کی اولاد میں اقبال برنی، اعجاز برنی، جہاں آرا اور ریاض برنی سے نہ صرف ملاقات کر چکا ہوں بلکہ انٹرویو بھی کر چکا ہوں علاوہ ازیں برنی کے ان عزیزوں سے جن کا برنی سے ایک عرصے کا تعلق تھا جن میں میمونہ اختر (منشی عبدالقدیر کی بیٹی)، قیوم صاحب اور عظمت اللہ سلیم نمایاں ہیں۔ میں نے کسی سے نہیں سنا کہ انھیں برنی سے کوئی شکایت تھی۔ ان سب نے برنی کے اچھے کردار کی حد درجہ تعریف کی۔

اوصاف علی واحدی کے یہ الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے:

برنی صاحب بڑے ملنے جلنے والے آدمی تھے، محب وطن اور جذبہ قومیت سے سرشار، انسان دوست، سب دوست تھے دشمن کسی کے نہیں تھے۔ اختلاف رائے بڑے مہذب اور پیارے انداز میں کیا کرتے تھے۔ کردار، مزاج اور جذبات کے اعتبار سے بہت اچھے آدمی تھے۔ (۱۵۵)

برنی کے جگری دوست ڈاکٹر سجاد دہلوی کے بہو اور بھانجی اور شوکت دہلوی کی بیٹی بیگم ذاکر اعجاز نے برنی کے انتقال پر ایک مضمون ان کی یاد میں سپرد قلم کیا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے برنی کے شخصی اوصاف کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے:

برنی صاحب اپنی جن باتوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہیں گے وہ ان کی صداقت پسندی، مردم شناسی اور انسان دوستی تھی۔ یوں تو وہ ادیب ہی کیا جو صداقت پسند نہ ہو لیکن ذاتی واقفیت اور صداقت کی جو لگن ان میں تھی وہ ہمارے بہت کم ادیبوں میں نظر آتی ہے۔ وہ جو کچھ قلم بند کرتے تھے اس کی

خوب چھان پھٹک کرلیا کرتے تھے اور ہر واقعہ کو اس طرح پرکھتے تھے جس طرح ایک مورخ پرکھتا ہے۔

ان کی عمر دوست بناتے اور دوستیاں کرتے گزری۔ وہ آدمی کو خالص معیار پر جانچتے تھے خواہ وہ کسی مذہب، طبقے، علاقے یا نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ ان کے حلقہء احباب میں رند اور پاک باز، مسلمان، عیسائی، ہندو اور مجوسی، ملکی غیر ملکی، کالے اور گورے، کانگریسی اور مسلم لیگی سبھی شامل تھے۔ اور یہ سب کے سب انسانی معیار کے مطابق بڑے قابل احترام لوگ تھے۔ (۱۵۶)

## برنی بہ حیثیت مترجم:

بنیادی طور پر ترجمے کی ضرورت ایک زبان کے ذریعے دوسری زبان میں موجود خیالات، تصورات اور معلومات کی تفہیم کی غرض سے پیش آتی ہے۔ رواں اور اصل کے مطابق ترجمہ اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتا جب تک مترجم ہر دو زبان پر صحیح عبور نہ رکھتا ہو۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے ترجمے کی اہمیت اس طرح واضح کی ہے:

ترجمے ہی کے ذریعے ایک مخصوص ملک، ایک جغرافیائی علاقے اور ایک خاص قوم کی تحقیقات، اس کے علوم و فنون تمام انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں۔ اس لحاظ سے ترجمے کی ذمے داری کم از کم اتنی اہم ہے جتنی کسی کیمیاوی یا معدنی قوت کو ایک روپ سے دوسرے روپ میں ڈھالنے کی ہوتی ہے۔ (۱۵۷)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے مختصر الفاظ میں اس کی افادیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

ہم اپنی زبان کو جب تک لطافت اظہار کے تنوع اور علوم کی وسعت سے مفید نہیں بنائیں گے، ہماری زبان پیچھے رہ جائے گی اور ہماری پوری تہذیب بھی موت کے آغوش میں جا سوئے گی۔ میرا خیال ہے کہ اچھے ترجموں کے ذریعے اپنی زبان اور اپنی تہذیب کی خدمت کر کے اسے مفید، کارآمد اور موثر بنا سکتے ہیں۔ (۱۵۸)

برنی نے جس عہد میں آنکھ کھولی تھی وہ عہد سر سید احمد خاں کے بعد کا عہد تھا جس میں ترجمہ نگاری نے باقاعدہ ایک فن کی صورت اختیار کر لی تھی۔ سائنٹفک سوسائٹی، فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، دار الترجمہ حیدر آباد دکن وغیرہ جیسے معروف ادارے قائم ہو چکے تھے اور ان کے ذریعے تراجم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

ضیاء الدین احمد برنی کو اسکول کے زمانے سے اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی زبانوں سے بھی واسطہ رہا۔ امتحانات میں ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کروایا جاتا تھا۔ یقیناً وہیں سے برنی کو فارسی اور انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی ترجمہ کرنے کے مواقع میسر آئے اور وہیں سے ان میں ترجمہ نگاری کا شوق پروان چڑھا۔

برنی کی اوائلِ عمر ہی میں ترجمہ کرنے کی تربیت ہوگئی تھی۔ اسکول کے زمانے (۱۹۰۷ء) میں، دہلی میں مولوی اسحاق

رامپوری سے انھوں نے فارسی پڑھی۔ وہ فارسی سے اردو اور غالباً اردو سے فارسی میں ترجمہ کروایا کرتے تھے۔(۱۵۹) چوں کہ اسکول کے امتحانات میں ترجمہ کرنا پڑتا تھا اس لیے وہ اس کی مشق کروایا کرتے تھے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک ضرورت کے تحت، سید احمد دہلوی (مولفہ ''فرہنگِ آصفیہ'') نے اپنی کتابوں پر اردو میں نوٹ لکھ کر دیے اور برنی نے ان کی بنیاد پر ان کتابوں پر سید احمد دہلوی کی خواہش کے احترام میں، انگریزی میں تبصرے لکھ دیے۔ اسے ایک طرح سے رواں یا آزاد ترجمہ شمار کیا جاسکتا ہے۔(۱۶۰)

کالج کے زمانے میں اپنے انگریزی کے استاد سی ایف اینڈریوز کے کئی مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا ان میں سے بیشتر نظام المشائخ دہلی میں شائع ہوئے۔(۱۶۱) برنی کے لیے نہ صرف یہ اعزاز کی بات ہے بلکہ ان کی ترجمہ نگاری کو اعتبار حاصل ہونے والی بات ہے کہ انھوں نے انگریزی کے مشہور استاد سی ایف اینڈریوز کے مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا۔ سی ایف اینڈریوز نے اپنی انگریزی کتاب ''ذکاء اللہ آف دہلی'' مکمل کی اور وہ کلکتہ کے مشہور رسالے ''ماڈرن ریویو'' میں قسط وار شایع ہوئی اسی زمانے (کالج کے کچھ عرصے بعد کا زمانہ) میں سی ایف اینڈریوز کی خواہش پر برنی نے اس کتاب کا اردو ترجمہ ''تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی'' کے عنوان سے کیا اور وہ کانپور کے مشہور رسالے ''زمانہ'' میں قسط وار شائع ہوا۔ برنی نے ۱۹۳۴ء میں سی ایف اینڈریوز کی ایک اور کتاب ''آئیڈیاز آف مہاتمہ گاندھی'' کا ترجمہ ''خیالات مہاتمہ گاندھی'' کے عنوان سے دو جلدوں میں کیا۔ ''تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی'' نے تو بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر سید سجاد تو یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

> ضیاء الدین احمد صاحب برنی نے یہ علمی سعی کہ انھوں نے اس بلند پایہ کتاب کا نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ زرِ کثیر خرچ کر کے وہ اس کو شایع بھی کر رہے ہیں، نا قابلِ فراموش ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ جناب برنی صاحب نے اپنے ترجمے کے ذریعے سے اینڈریوز مرحوم کی اصل تصنیف اور اس کے بیش بہا مواد کو ضائع ہونے سے بچالیا بلکہ اس کو حیاتِ مکرر بخش دی ہے اور مسٹر اینڈریوز جس شکریہ کے مستحق تھے اب وہ ایک گونہ ان کے مترجم کے نام سے منسوب ہو گیا۔(۱۶۲)

اس تربیت کا نتیجہ تھا کہ برنی میں یہ خوبی بھی پیدا ہوگئی کہ وہ ترجمے میں اصل اسلوب کو برقرار رکھ لیا کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال تو سی ایف اینڈریوز کی کتابیں ہیں۔ دوسری یہ کہ جب سی ایف اینڈریوز نے ذکاء اللہ آف دہلی لکھ لی تو اس پر مقدمہ کے لیے ڈپٹی نذیر احمد سے درخواست کی انھوں نے اردو میں مقدمہ لکھ دیا جسے مولوی ذکاء اللہ دہلوی کے بیٹے مولوی عنایت اللہ نے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کر دیا۔ ۱۹۱۱ میں علامہ راشد الخیری نے اس مقدمے کو کٹی پٹی حالت میں ''تمدن'' دہلی میں شائع کر دیا۔ جب برنی نے ۱۹۵۲ء میں جب ''تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی'' کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا تو انھیں اس اردو مقدمے کی ضرورت پڑی مگر وہ جگہ جگہ سے کٹا پٹا تھا چناں چہ انھوں نے اُس انگریزی مقدمے سے ترجمہ کر کر کے اُس اردو مقدمے کے متن کی تصحیح کر لی۔ اُس پورے مقدمے کو پڑھ کر ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ اس میں پیوند کاری کی گئی ہے بلکہ پورا مقدمہ ڈپٹی نذیر احمد ہی کے زورِ قلم کا نتیجہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ برنی کا کمال ہے کہ

انھوں نے مخمل میں "ٹاٹ کے پیوند" اس طرح لگائے ہیں کہ اصل اور ترجمے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا بلکہ مکمل تحریر کا اسلوب ڈپٹی نذیر احمد ہی کا اسلوب لگتا ہے۔

جب برنی نے عطیہ بیگم کی انگریزی کتاب "اقبال" کا اردو ترجمہ کیا جو اقبال اکیڈمی کی جانب سے پہلی مرتبہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تو اس میں گیارہ عدد خط کا اردو ترجمہ برنی نے اس انداز سے کیا کہ تمام خطوط ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ یہ برنی کا کمال ہے کہ انھوں نے ترجمے میں اقبال کا سا اسلوب پیدا کیا۔ اپنی پسندیدگی کے باعث مذکورہ کتاب اقبال اکیڈمی سے تین مرتبہ شایع ہوئی۔

ترجمہ نگاری پر برنی نے کوئی باقاعدہ مضمون یا کتاب تو نہیں لکھی تاہم اپنی مترجمہ کتاب "خیالاتِ مہاتمہ گاندھی" حصہ اول کے پیش لفظ بہ عنوان "عرضِ حال" میں بلیر بیلاک کے درج ذیل خیالات پیش کرکے ترجمہ نگاری کے حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے:

> جس دور میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں خصوصیت کے ساتھ صحیح ترجمہ کی ضرورت ہے یعنی ایک زبان میں جو کچھ شائع ہوا ہے، اُس کا پورا پورا مفہوم دوسری زبن میں ادا ہو جائے، ایسا مفہوم جو اصل روح کے عین مطابق ہو۔ (۱۶۳)

مذکورہ کتاب ہی میں برنی نے ترجمہ نگاری سے متعلق اپنے ذاتی خیالات بھی تحریر کیے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ برنی ترجمہ نگاری میں پیش آنے والی مشکلات سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ ان کے حل سے بھی آگاہ ہیں۔

انھوں نے مترجم کے لیے تین بڑی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ترجمہ کرتے وقت مترجم کو بالعموم تین قسم کی عبارتوں سے سابقہ پڑتا ہے اولاً ایسی طرزِ عبارت جس کی مثال اردو میں پہلے سے موجود ہے اس قسم کی عبارتوں کا ترجمہ کرنا مقابلتاً سہل کام ہے۔ دوسری قسم کی طرزِ عبارت وہ ہے جس کی مثال اردو لٹریچر میں موجود نہیں۔ یہ بہت مشکل کام ہے اور مترجم کو دونوں زبانوں پر قدرت رکھنے کے باوجود اس کی اصل روح کو واضح کرنے کی غرض سے محنت شاقہ اٹھانی پڑتی ہے اور اس کے بعد بھی شبہ رہتا ہے کہ آیا وہ اس میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں تیسری قسم کی عبارت وہ ہے جو بہ لحاظ تراکیب خالصتاً انگریزی ہے (بشرطیکہ اصل کتاب اُس زبان میں ہو) ایسی عبارتوں کا جوں کا توں ترجمہ کر دینا یا اس طرح سے ترجمہ کر دینا جس سے اُن کا قریب ترین مفہوم ادا ہو جائے، اگرچہ مشکل امر ہے تاہم دوسری شق سے زیادہ نہیں ایسی ہی عبارتوں کے ترجمے سے ہم زبان اردو کے دامن کو دن بہ دن زیادہ وسیع کر سکتے ہیں مقامِ مسرت ہے کہ ایسی عبارتوں کا استعمال اب روز بہ روز ترقی پر ہے۔ (۱۶۴)

برنی کو مذکورہ کتاب میں تینوں طرح کے طرزِ عبارت کا سامنا رہا چناں چہ اس مشکل کو انھوں نے اس طرح حل کیا:

> میری تمام تر کوشش یہی رہی ہے کہ ان (عبارتوں) کا ترجمہ پڑھتے وقت محض اردو داں اور

انگریزی سے کلیتاً نابلد طبقہ کوئی غرابت محسوس نہ کرے اس کے علاوہ میں نے ایک اور امر کا التزام ملحوظ رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے حتی الامکان ایک لفظ کو بھی نظر انداز نہیں کیا کیوں کہ میرا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے اصل روح کے نظر انداز ہو جانے کا خطرہ رہتا ہے۔(۱۶۵)

سینٹ اسٹفنز کالج سے فارغ ہونے کے بعد برنی کا تعلق ہمدرد سے ہو گیا تھا۔ گزشتہ اوراق میں ملا واحدی کا ایک بیان نقل کیا گیا ہے۔ جس کے مطابق:

بی اے ہو جانے کے بعد برنی صاحب نے سال دو سال مولانا محمد علی جوہر کے روزنامہ ہمدرد اور ہفتہ روزہ کامریڈ (انگریزی) میں بحیثیت سب ایڈیٹر اور مترجم کام کیا۔(۱۶۶)

برنی کی ترجمہ نگاری کی قابلیت کے باعث اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس بمبئی میں ٹرانسلیٹر کی ملازمت ملی۔ وہاں انھوں نے تقریباً ستائیس سال تک اردو فارسی ٹرانسلیٹر کی خدمات انجام دیں اور سینئر ٹرانسلیٹر کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔

برنی نے کل بیس کتابیں اردو میں ترجمہ کیں۔ اُنیس انگریزی سے اور ایک فارسی سے۔ ترجمہ کی جانے والی کتابوں کے موضوعات متنوع ہیں۔ انگریزی سے ترجمہ کی جانے والی کتابوں کو پیش نظر رکھیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے مقتضی وقت وحالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتابیں ترجمہ کیں تاہم بہ غیر شوق اور دل چسپی کے یہ کتابیں وجود میں نہیں آسکتی تھیں۔ فارسی سے ترجمہ کی جانے والی کتاب ''ملا نصر الدین'' جہاں فارسی زبان پر ان کے عبور کا اظہار ہے وہاں ان کی خوش طبعی بھی ظاہر ہوتی ہے۔

برنی کی مترجمہ ''سی۔ایف۔اینڈریوز'' ان کی مشہور کتابوں میں سے ہے۔ اس پر کیے جانے والے تبصروں سے پتا چلتا ہے کہ ان کی اس کتاب کو کئی حوالوں سے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ جہاں ترجمے کے رواں اور سلیس ہونے کی تعریف کی گئی ہے وہاں لفظی غرابت جیسے بعض کم زور پہلوؤں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ سی۔ایف۔اینڈریوز برنی کے پسندیدہ استاد تھے۔ انھیں اپنے استاد سے حد درجہ محبت تھی۔ سی۔ایف۔اینڈریوز بھی عام انگریزوں سے بہت مختلف تھے۔ وہ مشنری ہونے کے علاوہ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان کی سوشل لائف مثالی تھی۔ انھیں انسانوں سے بلا تفریق مذہب انسیت تھی۔ برنی کی مترجمہ ''سی۔ایف۔اینڈریوز'' کی اشاعت پر مولانا ماہر القادری نے ''فاران'' میں تبصرہ کرتے ہوئے برنی کی ترجمہ نگاری کو سراہانے کے علاوہ بعض نامانوس الفاظ کی نشان دہی کی ہے:

مسٹر ضیاء الدین احمد برنی ایک مشاق مترجم اور تجربہ کار اہلِ قلم ہیں، دہلی کے سینٹ اسٹیفنز کالج میں وہ اینڈریوز کے شاگرد بھی رہے ہیں، اس کتاب کا ترجمہ کر کے انھوں نے شاگردی کا حق ادا کیا ہے اور اپنی اُس محبت کا ثبوت دیا ہے جو اُن کو اینڈریوز کی ذات سے تھی۔

ترجمہ خاصہ شگفتہ ہے اور اس کام میں فاضل مترجم نے بڑی محنت اور استقلال سے کام لیا ہے پھر بھی ترجمہ میں کہیں کہیں جھول رہ گیا ہے۔(۱۶۷)

ترجمہ نگاری کے حوالے سے برنی کے رواں، سلیس اور شگفتہ اسلوب کی اکثر مبصرین نے

تعاریف کی ہے۔

## برنی کی ملازمتیں:

برنی کی پہلی ملازمت مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ''ہمدرد'' میں بہ حیثیت سب ایڈیٹر ہوئی تھی۔ وہ پندرہ ماہ تک اخبار سے وابستہ رہے۔(۱۶۸) ۱۰ جون ۱۹۱۴ کو انھیں ایک ماہ پیش تر ملازمت سے علیحدگی کے لیے آگاہ کیا گیا۔(۱۶۹) اخبار سے علیحدگی کے بعد کچھ عرصے تک کسی دوسری ملازمت کی تلاش میں سرکاری دفاتر کے چکر کاٹتے رہے۔ اس سلسلے میں سید احمد امام جامع مسجد دہلی اور سید احمد مؤلف ''فرہنگ آصفیہ'' کا تعاون بھی رہا تاہم کامیابی نہیں ہوئی۔(۱۷۰) برنی کے علم میں یہ بات خاصے عرصے بعد آئی کہ چیف کمشنر دہلی نے خفیہ حکم نامہ جاری کر دیا تھا کہ اخبار ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' سے وابستگان کو دہلی میں سرکاری ملازمت نہ دی جائے۔(۱۷۱) چناں چہ اس اثنا میں انھوں نے ٹیوشن پڑھا کر آمدن کا ذریعہ پیدا کر لیا۔

برنی کے دوست ڈاکٹر محمد حفیظ سید کے توسط سے انھیں جلد ہی کانپور کے ''تھیوسوفیکل ہائی کانپور'' میں بہ طور ٹیچر ملازمت مل گئی۔ برنی اس اسکول سے جولائی ۱۹۱۵ سے فروری ۱۹۱۸ء تک وابستہ رہے۔(۱۷۲) یہ اسکول تھیوسوفیکل ایجوکیشنل ٹرسٹ (Theosophical Educational Trust) تحت کام کرتا تھا۔(۱۷۳) اس دوران انھوں نے اسکول سے ایک ایسا رسالہ جاری کیا جو ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ یہ رسالہ اردو اور انگریزی زبانوں میں تحریر ہوتا تھا، جس میں اساتذہ اور طلبہ دونوں مضامین لکھا کرتے تھے۔(۱۷۴) اسی عرصے میں انھوں نے مدراس کے مشہور رسالے ''تھیوسوفسٹ'' (Theosophist) کے لیے دو مضمون:

(1)Beauties of the Quran,Aug.1916,P267.

(2)The Contribution of Islam to the World's thought,June 1919,P515.

یہ دونوں مضامین درج ذیل ویب سائٹ پر بھی دیکھے جا سکتے ہیں:

http://www.austheos.org.au/indices/THEOST.HTM

برنی کے دست آویزات میں تھیوسوفیکل سوسائٹی، چوہان لاج، کانپور کی جانب سے ایک اطلاع نامہ ہے۔ اس اطلاع نامہ میں سوسائٹی سے متعلق افراد کے نام اور ان کے لیکچر کے عنوان اور دیے جانے کی تاریخ اور مہینہ بھی درج ہیں۔ اس کا سرنامہ اس طرح ہے:.Programme of Sunday evening Meeting in Lodge Rooms۔ برنی کا حوالہ اس طرح ہے: Theosophy"Sept.12th. "Sufism in the Light of۔

برنی کی خود نوشت سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے زمانہ قیام کانپور میں وہاں تھیوسوفیکل سوسائٹی کے تحت ہونے والی تقریبات میں اسلام کے موضوع پر متعدد تقاریر بھی کیں۔(۱۷۵) کانپور ہی میں برنی کی دیا نرائن نگم سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اگر چہ وہ ان کے رسالے ''زمانہ'' میں زمانہ طالب علمی مضامین لکھ رہے تھے۔

اسی زمانے میں آرہ، کانپور میں خوف ناک ہندو مسلم فساد ہوا جس کے لیے ہونے والے امدادی کاموں میں برنی بھرپور حصہ لیا، تقاریر کیں اور چندہ جمع کیا۔ ۱۹۱۷ میں کانپور میں سخت بارشیں ہوئیں تو برنی نے اس سلسلے میں بھی امدادی کام

کیے۔(۱۷۶)

برنی کے مطابق ان کے دوست ڈاکٹر حفیظ سید فروری ۱۹۱۸ء میں انجمن اسلام ہائی اسکول، بمبئی (۱۷۷) میں ہیڈ ماسٹر ہوکر چلے گئے اور وہاں جا کر انھوں نے برنی کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ چناں چہ برنی نے تھیوسوفیکل ہائی اسکول سے استعفیٰ دے دیا۔ ترکِ تعلق کے بعد برنی کو اسکول انتظامیہ کی جانب سے (۱۷۸) ایک سرٹیفکیٹ جاری کیا گیا جس میں بہ طور استاد ان کی خدمات کو طلبہ سے ان کی ہم آہنگی، کھیلوں میں بہت زیادہ دل چسپی، اسکول کے رسالے کے سلسلے میں ان کی محنت اور ان رواداری کو بہت اچھے الفاظ میں سراہا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ انجمنِ اسلام ہائی اسکول میں بہ طور اسسٹنٹ ٹیچر ملازم ہوگئے۔ برنی کا تعلق انجمنِ اسلام سے زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ جون ۱۹۱۸ میں ان کا تعلق مذکورہ اسکول سے بھی ختم ہوگیا۔ انجمنِ اسلام ہائی اسکول میں برنی نے اسسٹنٹ ٹیچر کے طور پر خدمت انجام دی۔(۱۷۹)

جولائی ۱۹۸۱ء میں پروفیسر شیخ عبدالقادر کے توسط سے ان کی ملازمت اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس، بمبئی میں بہ طور اردو فارسی مترجم ہوگئی۔(۱۸۰) اگر چہ سرکاری ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے تاہم سابقہ غیر سرکاری ملازمتوں کے تجربے کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اسے قبول کیا۔

انجمن اسلام ہائی اسکول سے ترکِ تعلق اور اس نئی سرکاری ملازمت کے دوران انھوں نے دو تین جگہ ملازمتیں کیں۔(۱۸۱) ایک جگہ کا تذکرہ برنی نے عطیہ فیضی پر اپنے مضمون ''اقبال، دیگر مشاہیر اور عطیہ فیضی'' میں کیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ عطیہ فیضی نے اپنی والدہ کی یاد میں بمبئی میں بدر باغ میں لڑکیوں کا ایک اسکول ''امیر النساء اسکول'' بھی قائم کیا تھا، جہاں کچھ عرصہ برنی نے بھی اعزازی طور پر اردو پڑھائی تھی۔ اس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ برنی عورتوں کی آزادی کے ساتھ تعلیم کے حامی تھے۔ انھوں نے عطیہ کے ان اقدامات کو سراہا ہے جو آزادیٔ نسواں سے متعلق ہیں۔(۱۸۲)

برنی کا تعلق اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس میں ''پریس برانچ'' سے تھا۔(۱۸۳) اس برانچ میں برنی کو مضامین، کتابوں کے علاوہ اخبارات کا مطالعہ بھی کرنا پڑتا تھا۔(۱۸۴)

''عظمتِ رفتہ'' کے بعض خاکوں کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اہم سیاسی شخصیات کے زمانۂ قید میں ان کے نام خطوط اور کتب سنسر سے گزرا کرتی تھیں۔ اس میں برنی کا بڑا اہم کردار تھا۔ ان کی اسلام پسندی اور وطن پرستی کی شان دار مثالیں اس میں پائی جاتی ہیں۔ برنی اگر چہ حکومتِ انگلشیہ کے ملازم تھے تاہم آزادی کی تحریک کی حد سے بڑھ کر امداد کی۔ قابلِ اعتراض باتوں پر اخبار بند کرنا اور اخبارات کا سنسر کرنا بھی ان کی ذمے داری تھی۔(۱۸۵) اس کے علاوہ جب بیرون ملک سے کوئی شخصیت وردِ ہندوستان ہوتا تو بہ طور ترجمان ذمے داری ادا کرتے۔(۱۸۶) انھیں حکومت کی طرف سے گواہ کے طور پر یا ترجمان کی طور پر بھی عدالت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں جو کتابیں تصنیف کیں ان پر ان کا نام درج نہیں ہے۔(۱۸۷) بمبئی کرانیکل میں قلمی نام سے برٹش سرکار پر نکتہ چینی اور غلطیوں کی نشان دہی کی، عمدہ تجاویز پیش کیں منظور بھی ہوئیں۔ ۲۵ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا

دوستوں کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ عیبوں سے پردہ اٹھانے والا مراسلہ نگار برنی تھے۔(۱۸۸)

قیامِ بمبئی ہی کے زمانے میں ان کا تعلق ہندوستان کے مشہور انگریزی روزنامے ''بمبئی کرانیکل'' (Bombay Chronicale) سے ہو گیا جہاں برنی نے کوئی پچیس سال زائد عرصے تک اردو رسائل و کتب پر تبصرے کیے اور نامور شخصیات پر مضامین لکھے۔ یہ سلسلہ باقاعدگی سے ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ اسی اخبار میں برنی نے اردو اخبار کے اقتباسات کے ذریعے ایک ہفتہ وار سلسلہ بہ عنوان ''خوشہ چینیاں'' بھی شروع کیا۔ ان اقتباسات میں ہندوستانی زندگی کا اچھا پہلو پیش کیا جاتا تھا۔(۱۸۹)

اردو کی خدمت جس قدر اس انگریزی اخبار نے انجام دی ہندوستان کے کسی اور اخبار نے اتنی نہیں کی ہوگی۔ اردو کا زیادہ تر کام برنی ہی کے ذمے تھا۔ افسوس کے باوجود سخت تلاش کے اس اخبار کی فائل دست یاب نہیں ہو سکی لہٰذا برنی کی وہ ساری اردو خدمت جو اس اخبار کے ذریعے سامنے آئی زمانہ حال کی نظروں سے اوجھل ہے۔

اُسی زمانے میں وہ ''پنجاب مسلم ایسوسی ایشن'' بمبئی کے جائنٹ سکریٹری بنائے گئے، جس کے پلیٹ فارم سے انھوں نے، تقسیم سے قبل بمبئی میں تین مرتبہ ''اقبال ڈے'' منایا۔(۱۹۰) جس میں تقاریر کے علاوہ بڑے پیمانے پر مشاعرے بھی ہوئے جن میں ہندوستان کے معروف شعراء نے شرکت کی۔

ان کی علمی ادبی سرگرمیاں دورانِ ملازمت بھی جاری رہیں۔ چوں کہ سرکاری ملازمت منتہائے نظر نہیں تھا لہٰذا ان کا حقیقی اور فطری ذوق اس دوران اپنی جولانیوں پر رہا۔

اُسی زمانے میں ان کا تعلق بمبئی کی ادبی انجمن ''بزمِ خیال'' سے قائم ہو گیا۔ وہ بزم کے صدر مقرر کیے گئے۔ یہ بزم انھوں نے اور ان کے چند دوستوں نے قائم کی تھی۔ اس بزم کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

> پچیس تیس سال پہلے بمبئی کے چند دوستوں نے 'بزمِ خیال' کی تشکیل کی تھی۔ راقم الحروف اس بزم کا صدر تھا اور نجندی (۱۹۱) نائب صدر۔ سوائے میرے باقی سب عہدے دار شاعر تھے۔ اس کی زیرِ سرپرستی ہم نے دو تین دفعہ آل انڈیا مشاعرے منعقد کیے جو بے حد مقبول ہوئے۔ اسی بزم کی بدولت اہلِ بمبئی جوش ملیح آبادی، آزاد انصاری، سیماب اکبر آبادی، بسمل الہ آبادی، ساغر میرٹھی، احسن ماہروی جیسے شعرا سے متعارف ہوئے۔ مولوی نجندی ان مشاعروں کے انعقاد میں تن، من، دھن ایک کر دیتے تھے۔(۱۹۲)

اسی ملازمت کے دوران برنی نے کئی کتابیں بھی ترجمہ کیں۔ تقاریر، مراسلے، مضامین اور رپورٹس اس کے علاوہ ہیں۔

مدراس کے مشہور پبلی شر گنیش اینڈ کو کے اصرار پر ہندوستان میں محمد علی جوہر کی پہلی انگریزی مختصر سوانح لکھی۔ چوں کہ وہ سرکاری ملازم تھے اور سرکاری ملازم کے کسی سیاسی رہ نما اور وہ بھی انگریزی حکومت کا مخالف ہو پر لکھنا نہایت خطرناک تھا چناں چہ اس کتاب پر ان کا نام درج نہیں ہوا۔(۱۹۳)

دوسری کتاب ''جنگِ جمل'' ہے، جس میں ان کے دفتری رفیق سے تنازع پر دو مقدمات کی تفصیل درج ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ میں محبوب المطابع دہلی سے پہلی مرتبہ شایع ہوئی تھی۔ بعد میں برنی نے کسی زمانے میں اس پر جا بجا اضافے کیے ہیں اور حواشی بھی بڑھائے ہیں تاہم یہ ترمیم شدہ ایڈیشن شایع نہیں ہو سکا۔

برنی نے ایک کتاب Sources of Indian History کا ترجمہ ''ماخذِ تاریخ ہند'' کے نام سے کیا تاہم یہ کتاب مسٹر عطا حسین کے نام سے مولوی فیروز سنز نے ۱۹۲۹ء میں شائع کیا۔ اس کتاب پر رسالہ تعلیم و تربیت، لاہور اکتوبر ۱۹۲۹ء میں تبصرہ شائع ہوا تھا جس میں مسٹر عطا حسین کا تعارف بھی دیا گیا ہے اور فوٹو بھی ہے۔

مسٹر عطا حسین ان کے دفتری رفیق تھے اور ''جنگِ جمل'' انھی سے مقدمے کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ (۱۹۴)

انھوں نے اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس کی انگریزی میں تاریخ '' Romance of the Oriental Translator Office of Bombay'' کے عنوان سے تحریر کی۔ (۱۹۵)

ان کے مختصر خود نوشت سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انھوں تو ہن و کر ہن ''رنگیلا رسول'' جیسی کتاب کا ترجمہ بھی کیا۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> چونکہ میں حکومتِ بمبئی کی پریس برانچ سے تعلق رکھتا تھا اسلیے مجھے رطب و یابس قسم کے مضامین ہزار ہا کی تعداد میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے جو کچھ پڑھا عام آدمی کی دسترس سے باہر ہے۔ اسلام کے خلاف مجھے ایسی ایسی لغو کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا کہ جنکو محض پڑھنا ہی کارے دارد ہے۔ میں اس سلسلے میں کتاب ''رنگیلا رسول'' کا ذکر کرونگا۔ اس سے قبل کہ حکومتِ بمبئی جس سے میں متعلق تھا ''رنگیلا رسول'' کو ضبط کرے مجھے اسکا ترجمہ کرنا پڑا اور میں برملا کہتا ہوں کہ وہ کتاب حقیقتاً لغو ترین تھی اور اسکے مصنف نے اس سے بڑھ کر مایوس کن کتاب نہ لکھی ہوگی۔ (۱۹۶)

۳ فروری ۱۹۴۵ء کو سبک دوش ہوئے۔ ہندوستان میں برنی کی یہ آخری ملازمت تھی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ دلّی میں رہ کر وہ ۱۹۴۷ میں پاکستان آگئے تھے۔ برنی نے پاکستان آکر انفارمیشن ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کی تھی مگر وہاں پنجابی گروپ بڑا اسٹرونگ تھا۔ ان کا برتاؤ اُن کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ مگر جب انھوں نے کہا کہ وہ بھی گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے اور پنجابی میں بات کی تو وہ حیران ہو گئے کہ اتنی شستہ پنجابی۔ مگر انھوں نے ان کے رویے کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ ملازمت چند مہینے کی تھی۔ (۱۹۷)

برنی نے دوسری ملازمت پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی، کراچی میں کی تھی۔ اقبال برنی کے مطابق:

> ہمارے والد کے بمبئی کے دوست تھے [عبدالمجید] اسماعیل صاحب [مینجنگ ڈائرکٹر بہ حوالہ

کتابی دنیا دسمبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۱] انھوں نے یہاں آکر ایک کمپنی کھولی تھی پین اسلامک اسٹیم شپ۔ انھوں نے والد صاحب کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات جب خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل تھے۔ اسماعیل صاحب نے والد کو بہت نوازا تھا۔ حال آں کہ گورنر جنرل غلام محمد کو بھی جانتے تھے ان سے ملنے گئے تھے مگر اس نے ملنے سے انکار کر دیا کہ میں آپ کو جانتا نہیں۔ والد صاحب کہتے تھے کہ انھوں نے اس کی کسی کیس میں مدد بھی کی تھی۔(۱۹۸)

ریاض احمد برنی کے بہ قول وہ اس کمپنی کے اشاعت و طباعت کے معاملات دیکھا کرتے تھے۔ وہ یہ کام شام کے اوقات میں کرتے تھے۔ یہ ملازمت ان کی پارٹ ٹائم ملازمت تھی۔

## برنی کی صحافت سے وابستگی:

برنی کو زمانہ ءطالب علمی سے اردو صحافت سے دل چسپی تھی۔(۱۹۹) کیوں نہ ہوتی ان کے والد اور ان کے برادر بزرگ با قاعدہ صحافی تھے۔ جن کا ذکر امداد صابری اپنی تصنیف ''تاریخ صحافت اردو'' میں با قاعدہ صحافی کے طور پر کیا ہے۔ انھوں نے زمانہ طالب علمی ہی میں یعنی ۱۹۱۲ء میں جب وہ بی اے کا امتحان دینے لاہور گئے تو مولانا ظفر علی خاں کے اخبار ''زمیندار'' کے ادارتی عملے میں کوئی ایک ماہ بلا معاوضہ کام کیا۔(۲۰۰)

جیسا کہ گزشتہ اوراق میں ذکر ہو چکا ہے کہ برنی ۱۹۱۳ء میں بی اے کرنے کے بعد مولانا محمد علی کے اخبار ''ہمدرد'' سے وابستہ ہو گئے ملا واحدی نے تو ان کی وابستگی کامریڈ سے بھی ظاہر کی ہے تاہم برنی کے کسی بیان سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ان کی ہمدرد سے وابستگی پندرہ ماہ رہی۔

اخبار سے سبک دوش ہونے اور کانپور جانے سے قبل انھوں نے اخبار بیں حضرات کے لیے ایک کتاب ''اخباری لغات معروف بہ کلیدِ اخبار بینی'' اپریل ۱۹۱۵ میں تحریر کی۔ اس کتاب کا انتساب علامہ اقبال کے نام ہے انھوں نے اس کتاب کو مفید قرار دیا تھا۔ اس کتاب میں ساڑھے چھ سو سے زائد انگریزی اخباری اصطلاحات ہیں۔(۲۰۱) اس کتاب سے بھی برنی کی صحافت سے دل چسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ ذکر تو قبلاً ہو چکا ہے کہ انھوں نے کانپور کے تھیوسوفیکل ہائی اسکول کے لیے ایک رسالہ ہاتھ سے لکھا ہوا جاری کیا تھا، جس میں اساتذہ اور طلبہ کے مضامین شایع ہوا کرتے تھے۔ یہ ان کے اسی شوق کا نتیجہ تھا۔

ان کا ایک طویل مضمون ''صوبہ ءبمبئی کے اردو، فارسی اور عربی اخبارات (۱۸۶۷ تا ۱۹۱۴ء)'' اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس مضمون کا حوالہ بمبئی یونی ورسٹی میں لکھے جانے والے شعبہ ءاردو کے پہلے پی ایچ ڈی کے مقالے بہ عنوان ''بمبئی میں اردو'' میمونہ عبدالستار دلوی میں آیا ہے۔(۲۰۲) ان کی صحافتی زندگی کا سب سے زیادہ عرصہ ''بمبئی کرانیکل'' میں لکھتے گزرا۔ یہ عرصہ تقریباً پچیس سال کو محیط ہے۔(۲۰۳) اس کا آغاز انھوں نے مراسلوں سے کیا پھر ماہانہ اردو رسالوں پر تبصرے کرنے لگے۔ یہ تبصرے اتوار کی اشاعت میں

شائع ہوا کرتے تھے۔انھی رسالوں میں انجمن ترقی اردو کا رسالہ "اردو" بھی تھا جب کہ انجمن کی دیگر مطبوعات پر بھی تبصرے کرتے تھے۔ تبصروں کے علاوہ برنی مضامین بھی لکھا کرتے تھے۔اردو ادیبوں کی وفات کے بعد ان کی یاد میں بھی برنی مضامین لکھا کرتے تھے۔اس میں ہندو مسلمان کی قید نہیں تھی۔

بمبئی کرانیکل سے متعلق برنی اپنے فرضِ منصبی کے تحت یورپین مستشرقین کی اُن غلط بیانیوں کی تردید بھی کرتے رہے جو وہ اپنی کتابوں میں اسلام اور بانیِ اسلام کے متعلق کیا کرتے تھے۔ان میں ایچ جی ویلز (H.G.Wells) کی Outline of world History خاص طور پر نمایاں ہے۔اسی حوالے سے انھوں نے Chamber's Dictionary کی بعض اغلاط کی طرف بھی اس کے ناشر کی توجہ مبذول کی ان کے اس اقدام کے تحت ناشر نے شکریے کے ساتھ ان اغلاط کی اصلاح کی۔(۲۰۴)

یورپین مستشرقین کے علاوہ ہندوستانی مصنفین کی بعض ایسی کتابوں کو انھوں نے اپنی کوششوں سے ضبط کروایا جن میں رسول اللہ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی۔برنی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> قبل اس کے کہ حکومت بمبئی جس سے میں متعلق تھا "رنگیلا رسول" کو ضبط کرے مجھے اس کا ترجمہ کرنا پڑا اور میں برملا کہتا ہوں کہ وہ کتاب حقیقتاً لغوترین تھی اور اس کے مصنف نے اس سے بڑھ کر مایوس کن کتاب نہ لکھی ہوگی۔(۲۰۵)

اسی سلسلے کی بعض اور کتابیں بھی برنی نے نہ صرف پکڑیں بلکہ ان کے ضبط کیے جانے کے لیے یا ان کی اصلاح کے لیے عدالت سے بھی رجوع کیا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان آجانے کے بعد انھوں نے اپنا تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔اپنے اسی صحافتی اور ادبی شوق کے پیشِ نظر کراچی سے دسمبر ۱۹۵۵ء میں ماہنامہ "کتابی دنیا" جاری کیا۔(۲۰۶)

## برنی کی فارسی زبان سے دلچسپی:

یہ امر نہایت واضح ہے کہ برنی کو اردو اور انگریزی زبانوں پر عبور تھا۔الہ آباد یونی ورسٹی سے ۱۹۱۷ء میں فارسی میں ایم اے سالِ اول پاس کر لینے سے قبل انھوں نے ۱۹۰۷ میں میٹرک کے زمانے میں مولوی اسحاق سے فارسی پڑھی تھی۔علاوہ ازیں کئی اور حوالے ایسے سامنے آتے ہیں جو ان کی فارسی دانی پر دال ہیں۔

اس سلسلے میں دو سرٹیفکیٹ بھی پیشِ نظر رکھے جاسکتے ہیں ایک سر ابراہیم رحمت اللہ، جی بی ای، کے سی ایس آئی، سی آئی ای کا جو یکم جون ۱۹۳۶ء کو جاری کیا گیا تھا، جس کے آخری الفاظ اس طرح ہیں He is quite proficient in Urdu and persian and a very efficient translator.

دوسرا سرٹیفکیٹ راؤ صاحب سی بی ویلکر، بی اے، ایل ایل بی ایڈوکیٹ، او بی، پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی جانب سے ہے جو ۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو جاری ہوا تھا۔ان کے الفاظ یہ ہیں: He is considered to be an authority on these languages.He is a scholar of persian and urdu.

برنی کے نام فارسی زبان میں خطوط بھی ان کی صلاحیت کی گواہی دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برنی نے ایک کتاب "ملانصر الدین" فارسی سے ترجمہ کی (۲۰۷) اور "صنائع بدائع" کے عنوان سے ایک کتاب تالیف کی تھی جو شایع نہیں ہو سکی اس میں صنائع بدائع تحریر کی تعریفات تو اردو میں ہیں تاہم مثالیں فارسی زبان سے لی گئی ہیں کہیں کہیں اردو مثالیں بھی درج کی گئی ہیں۔(۲۰۸)

فارسی زبان سے ان کی دل چسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شمس العلماء عمر بن داؤد پوتا کی فارسی کتاب اپنے اشاعتی ادارے "تعلیمی مرکز" سے کئی بار شایع کی۔

## برنی کا بہ طور ممتحن انتخاب:

برنی نے اپنی خودنوشت میں یا کہیں اور اس امر کا تذکرہ نہیں کیا کہ ان کا کس زمانے میں ان کا انتخاب کیا گیا تاہم ان کے نام مرزا علی محمد خان کا سرٹیفکیٹ ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے بمبئی یونی ورسٹی میں ممتحنِ اردو کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا۔(۲۰۹)

## انجمنوں اور سوسائٹیوں سے وابستگی:

اس سلسلے میں برنی نے خود تو بہت کم لکھا ہے تاہم بعض جگہ ان کے کاغذات سے ظاہر ہوا اور بعض معلومات راقم کی کوششوں سے ظاہر ہوئیں کہ برنی کن کن انجمنوں، تنظیموں یا سوسائٹیوں سے وابستہ رہے۔

برنی، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، بمبئی شاخ کے رکن تھے۔ سوسائٹی کے جرنل بابت نومبر ۱۹۲۵ء کے صفحہ نمبر ۳۱۲ پر ان کے نام کا اندراج بہ حیثیت ممبر بمبئی برانچ کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۲۰ء سے اس سوسائٹی کے رکن تھے۔

پاکستان میں "پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی کے رکن رہے۔ انھوں نے خود تو اس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا تاہم بعض حوالوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ "ہم قلم" کراچی کے 'سالگرہ نمبر' ۱۹۶۱ میں گلڈ کی سالانہ رپورٹ شایع ہوئی تھی۔ دوسری نشست بابت ۳۰ جنوری ۱۹۶۰ء کی رپورٹ کے بعد صفحہ ۳۰۰ پر "اراکین جو ۳ جنوری ۱۹۶۰ کو ادارے میں شامل کیے گئے" کے عنوان سے کراچی کے اراکین کی فہرست درج کی گئی ہے۔ جس میں برنی کے علاوہ سید الطاف علی بریلوی اور آغا ناصر کے نام بھی درج ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کے نام برنی کے چند خطوط سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ باقاعدہ رکن تھے۔ ان کے نام بعض خطوط میں گلڈ کی جانب سے رکنیت کا چندہ وقت پر جمع کرانے کی درخواست کی گئی ہے۔(۲۱۰)

اسی اشاعت میں برنی کا ایک طویل مضمون "کاپی رائٹ" کے عنوان سے شایع ہوا تھا۔ جس میں انھوں جہاں دنیا میں کاپی رائٹ کی تاریخ بتائی ہے وہاں ہندوستان اور پاکستان میں اس کے اطلاق کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

انجمن ناشران و تاجرانِ کتب کراچی کی بنیاد جنوری ۱۹۵۱ء میں کراچی میں رکھی گئی اس کے بانی اراکین میں حافظ وصی اشرف، سراج الدین ظفر، ضیاء الدین احمد برنی، علاء الدین خالد، رازق الخیری ارشاد احمد اور کرمانی شامل تھے۔(۲۱۱) اسی انجمن

کے بعض ہم خیال اور ادبی ذہن رکھنے والے دوستوں نے کتابی دنیا جاری کیا۔(۲۱۲) اسی انجمن کی کوششوں سے کراچی میں اردو بازار کا قیام عمل میں آیا۔(۲۱۳) وہ "انجمن ادبی رسائل پاکستان" کے جنرل سیکریٹری اور جوائنٹ سیکریٹری رہے تھے۔(۲۱۴) انھوں نے اس انجمن کے تحت ہونے والی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔

## برنی کی ازواج اور اولاد:

ضیاءالدین احمد برنی نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی کا تعلق اکبرآباد (آگرہ) سے تھا جب کہ دوسری بیوی کا تعلق دہلی سے تھا۔ پہلی بیوی کا نام محمودہ بی بی تھا۔ ان کے والد کا نام عصمت یار خان تھا۔ عصمت یار خان کے دادا کابل سے ہجرت کر کے آگرہ میں آباد ہوئے تھے۔(۲۱۵) ان کا کاروبار ہینگ اور سلاجیت کا تھا، وہ جس محلے میں آکر آباد ہوئے تھے اسی سبب سے اس محلے کا نام 'ہینگ منڈی' پڑ گیا تھا۔(۲۱۶) آگرہ میں عصمت یار خان کی خاصی جاگیر تھی۔ تقسیم کے وقت وہ تقریباً چار سو مکانات کے مالک تھے۔(۲۱۷) بقول محمد اقبال برنی ان کا آگرے میں ایک سینما بھی تھا۔ جس میں وہ فلم دیکھنے جایا کرتے تھے۔ ان کی والدہ یعنی محمودہ بی بی کو بھی فلم دیکھنے کا شوق تھا۔(۲۱۸)

عصمت یار خان نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے اصغری بیگم اور دوسری بیوی سے محمودہ بیگم کے علاوہ حمیدہ بیگم، سعیدہ بیگم، رشیدہ بیگم ہوئی تھیں۔(۲۱۹) اصغری بیگم کے شوہر انجینئر تھے جب ان کا تبادلہ دہلی میں ہوا تو وہ برنی کے محلے چھتہ لال میاں میں آکر رہے۔ انھی کے ہاں سے برنی کی شادی کا سلسلہ آگے بڑھا تھا۔(۲۲۰)

زاہدہ خاتون بنت ظہیر الدین تحریر کرتی ہیں کہ برنی صاحب نے ان کے والد یعنی اپنے بھتیجے کی نہ صرف تعلیم و تربیت کی بلکہ ریلوے میں ملازمت بھی دلوائی۔ اپنی سالی سعیدہ بیگم سے اُن کی شادی بھی برنی ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔(۲۲۱)

محمودہ بیگم سے برنی کی شادی جنوری ۱۹۱۹ء کی کسی تاریخ میں ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کی خسر کی جانب سے بعض شرائط پر مبنی ایک حلف نامہ بھرا گیا تھا جس پر برنی کے علاوہ چار گواہوں، سید سجاد ایم اے، محمد الدین، خادم علی خان اور عبداللطیف (محمودہ بیگم کے بھانجے۔ کراچی منتقل ہو گئے تھے) کے دستخط ہیں۔

مرحومہ قمر القادری نے اپنے ایک مضمون میں محمودہ بیگم کی عادت و خصلت اور ان کے اخلاص اور محبت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ جس زمانے میں قمر القادری کی عمر تین سال تھی برنی اپنی پہلی بیوی، تین بیٹوں جمال، اقبال اور محمد احمد اور ایک سالی رشیدہ کو لے کر ان کے محلے میں جا بسے۔ قمر القادری کے مطابق ایک لڑکی کچھ ہی دن قبل فوت ہوئی تھی۔(۲۲۲)

قمر القادری لکھتی ہیں:

> انھیں (محمودہ بیگم) میرے والد صاحب سے بے انتہا محبت و عقیدت تھی اور انھوں نے بھی انھیں اپنی بیٹی بنایا ہوا تھا۔ یہ پُرخلوص اور پاکیزہ رشتہ بی آپا (محمودہ بیگم) نے بڑے حسن و خوبی کے ساتھ تمام زندگی نبھایا۔
>
> برنی صاحب بیویوں کے معاملے میں بڑے خوش نصیب ہیں۔ موجودہ بیوی بھی صورت

وسیرت کے لحاظ سے ہر طرح قابلِ تعریف اور شوہر کی خدمت و جاں نثاری میں مثالی خاتون ہیں۔ محمودہ بیگم بھی اسم با مسمّیٰ تھیں۔ ان دنوں مسلمان خواتین میں تعلیم کا اتنا چرچا نہ تھا۔ خال خال کو مسلمان خاتون اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔

جب کبھی کہیں کوئی زنانہ اجتماع ہوتا تو برنی صاحب اپنی بیوی کو تقریر لکھ دیتے جو وہ جا کر وہاں کرتیں اور بڑی واہ واہ ہوتی۔ اس طرح بمبئی ایسے دور افتادہ مقام پر اردو کا پرچار بھی ہو جاتا اور مسلمان خواتین میں تقریر کرنے کا شوق بھی پیدا ہوتا۔ محمودہ بیگم کو قدرت نے بڑی خوب صورت آواز بخشی تھی اور میلاد شریف پڑھنے کی بڑی شوقین تھیں۔ میرے والد صاحب انھیں حافظ شیراز، عبدالرحمٰن جامی، امیر خسرو، امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعتیں سکھاتے اور یاد کراتے جو وہ میلاد کی محفلوں میں سناتیں اور داد تحسین لیتیں۔ (۲۲۳)

محمودہ بیگم تعلیم یافتہ خاتون تھیں مگر ان کی تعلیم سے متعلق معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔ وہ بمبئی کی ''انجمنِ امدادِ نسواں'' کی سرگرم رکن تھیں۔ انجمن کی تقریبات میں باقاعدگی سے حصہ لیا کرتی تھیں۔ (۲۲۴)

انتقال سے قبل وہ بیمار تھیں۔ ایک عرصے سے بدہضمی اور اختلاج کے عارضہ لاحق تھا۔ طویل بیماری کی وجہ سے مزاج وہمی ہو گیا تھا اور زندگی سے بے زار تھیں۔ (۲۲۵) ان کا انتقال بہ روز جمعہ ۸/ جون ۱۹۳۴ء کی صبح ۴ بجے ہوا۔ (۲۲۶) ان کی نماز جنازہ بعد نمازِ جمعہ مدنپورہ، بمبئی کی بڑی مسجد میں ادا کی گئی اور تدفین ناریل باڑی کے قبرستان میں ہوئی۔ مذکورہ مسجد ہی میں بعد نماز عشاء کے لیے قرآن خوانی ہوئی۔ (۲۲۷)

خاتون، دہلی نے جون کی اشاعت میں ان کے انتقال کی خبر ''بیگم برنی کی حسرت ناک موت'' کے عنوان سے شائع کی:

> انجمن امداد نسواں کی سرگرم ممبر تھیں۔ مرحومہ ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ خیالات سلجھے ہوئے اور شائستہ تھے۔ خداوند کریم مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور مرحومہ کے شوہر اور رشتہ داروں کو صبر عطا فرمائے۔ سنا گیا ہے کہ مرتے وقت بھی بچوں کا لفظ زبان پر تھا۔
>
> انجمن کے جلسے کی کارروائی مختصراً خاتون، جون ہی کے شمارے میں شائع کیا گیا:
>
> انجمن کی ممبر مسز برنی صاحبہ کے وفات پر ماتمی رزولیشن پاس کیا گیا اور قرار پایا کہ مسز اسحاق صاحبہ ان کے شوہر کی خدمت میں انجمن کی طرف سے اظہار رنج و غم کریں اور روزلیوشن کی نقل روانہ کریں۔ (۲۲۸)

## برنی کی دوسری بیگم آمنہ بانو:

ان کا نام آمنہ بانو بیگم تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئی تھیں۔ تمام تعلیم گھر پر حاصل کی تھی۔ برنی کی ہم مزاج تھیں۔ ان کا انتقال ۱۲۸ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو چار بجے شام ہوا۔ عمر تقریباً ۷۵ برس پائی۔ شریف آباد والے مکان میں انتقال ہوا۔ سخی حسن کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ میونسپل رجسٹر کے سیریل نمبر ۲۹۱ اور صفحہ ۴۷ پر اندراج ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے کہ جب راقم نے محمود اختر بنت منشی عبدالقدیر سے برنی صاحب کی بیگمات کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا" آپ برنی صاحب کی انصاف پسندی دیکھیے کہ جب پہلی بیگم کا انتقال ہوا تو انھوں نے دوسری شادی سے قبل جہز کا سارا سامان فروخت کیا اور لڑکوں کو جامعہ ملیہ میں داخل کروایا اور تعلیم دلوائی۔

جب دوسری شادی کی فکر ہوئی تو خاصے وقفے کے بعد ہماری دادی، دونوں پھوپیوں اور میں نے لڑکی پسند کی۔ اور بڑے اہتمام سے شادی ہوئی۔ دوسری بیوی سے دولڑکے اعجاز برنی، ریاض برنی اور ایک لڑکی جہاں آرا ہیں۔"

برنی کی یہی انصاف پسندی ایک اور مقام پر ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل اپنی یادداشتیں اور بعض اہم باتیں قلم بند کروانی شروع کردی تھیں اُس میں انھوں ۱۹ اگست ۱۹۶۸ کو شام چار بجے اپنی بیگم سے متعلق یہ باتیں لکھوائیں:

۱۔　میں باحوش وحواس نارتھ ناظم آباد کی زمین جو بلاک۔R میں ۴۴۱ گز ہے اور جو میرے نام ہے اپنی بیوی کے نام پر منتقل کرتا ہوں بہ عوض اُن خدمات کے جو انھوں نے میری بیماری میں کیں۔ وہ اس کو لینے دینے کا پورا پورا حق رکھتی ہیں۔

۲۔　میرا روپیہ National and Grindlays Bank میں سیونگ بینک (اکاؤنٹ) میں ہے۔ پہلے میں خود روپیہ نکالا کرتا تھا لیکن اب میں نے ریاض برنی کا نام بھی شامل کردیا ہے تاکہ روپیہ نکالنے میں آسانی ہو۔ روپیہ کی رقم بارہ ہزار کے قریب ہے بیگم کو ایم مقررہ رقم کم از کم دو ہزار روپے سفر پر چلتے وقت دینے ہیں۔ انہی بارہ ہزار کی رم میں وہ ایک ہزار روپے کی رقم بھی شامل ہے جو میں نے مہر کی ادا کردی تھی اور حفاظت کے طور پر بینک میں جمع کرادی تھی۔ اسی میں دو ہزار روپے کی وہ رقم بھی شامل ہے جو میری بیوی (آمنہ بانو) کی ذاتی رقم ہے اور جو میں نے حفاظت کے طور پر اس بینک میں جمع کرادی تھی۔ اس طرح کل رقم ۳ ہزار ہے جو میری بیوی کی ذاتی رقم ہے اور جس کو وہ جب چاہے نکلوا سکتی ہیں۔ بقیہ ۷ ہزار کی مالک میری بیگم آمنہ بانو ہونگی اور وہ اس چیز کی پوری پوری حقدار ہونگی کہ وہ رقم جس کو چاہیں دین اور لیں۔ میری بیوی کی ذاتی ملکیت میں کوئی دخیل نہیں ہوسکتا یہ اس کی واحد ملک ہیں باقی رقم کی بھی یہی مالک ہیں۔

## ضیاءالدین احمد برنی کی اولاد:

پہلی بیوی سے برنی کے تین لڑکے جمال، محمد اقبال اور محمد احمد اور دو لڑکیاں خالدہ ادیب اور جہاں آرا۔(۲۲۹) محمودہ بیگم کو بیٹی کا بڑا شوق تھا۔ چوں کہ ان کی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے خالدہ ادیب اور جہاں آرا فوت ہوگئی تھیں۔ لہذا اپنے منجھلے بیٹے اقبال کو برسوں لڑکیوں کا لباس پہنا کر اپنا شوق پورا کیا۔(۲۳۰) قمر القادری کے پڑوس میں جا کر رہیں تو انھیں ہمیشہ ساتھ رکھتیں اور ماں کا سا پیار دیا۔(۲۳۱)

## خالدہ ادیب:

ان کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔(۲۳۲) چوں کہ برنی کو خالدہ ادیب خانم کی شخصیت اور خدمات سے دل چسپی تھی اسی لیے انھوں نے اپنی بیٹی کا نام خالدہ ادیب رکھا۔ خالدہ ادیب خانم کے کارناموں پر ایک کتابچہ بھی لکھا تھا جواب ناپید ہے۔(۲۳۳)

## جہاں آرا:

ان کا انتقال بھی بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔(۲۳۴) برنی شاہجہاں کی بیٹی جہاں آرا کے پاکیزہ کردار، شخصیت اور خدمات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کے یہ تاثرات ان کی کتاب ''جہاں آرا بنتِ شاہجہاں بادشاہ'' (۲۳۵) میں بھی ظاہر ہوگئے ہیں۔ برنی نے اپنی دوسری بیوی آمنہ بانو کی اکلوتی بیٹی کا نام بھی جہاں آرا رکھا۔

## جمال احمد برنی:

۱۹۲۵ء کو ولادت ہوئی اور انتقال ۱۹۷۶ء میں۔ دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی ان پڑھ تھیں۔ انھیں طلاق دے دی۔ دوسری بیوی افروز جغرافیہ میں ایم اے تھیں۔ جدید مدرسۃ البنات میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ ایک بیٹی نبیلہ (فرح) لے کر پالی تھی جو آج کل کینڈا میں مقیم ہے۔(۲۳۶)

## محمد اقبال برنی:

محمد اقبال ۲۵ اگست ۱۹۲۷ء کو ڈونگری، بمبئ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بمبئ میں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دلّی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسکول کی تعلیم حاصل کی۔ جب جامعہ قرول باغ سے اوکھلے منتقل ہوگئی تو انھیں بمبئ بلا لیا گیا۔ بمبئ میں میٹرک تک پڑھا۔ مزید تعلیم اپنے گانے کے شوق کے سبب سے جاری نہیں رکھ سکے۔ ۱۹۴۴ میں گانے کا شوق تھا اس زمانے میں ہندوستان کے مشہور زمانہ گلوکار محمد رفیع سے دوستی تھی۔ ان کے ہندو دوست بھی تھے اور ان سے میل جول بھی تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں ہندو لڑکی سے عشق نہ ہوجائے ۱۹۴۷ میں ان کی شادی آگرے میں کردی گئی۔ اقبال برنی حیات ہیں اور کراچی میں کورنگی میں مقیم ہیں۔ ان کی اولادیں۔۔۔(۲۳۷)

## محمد احمد برنی:

محمد احمد اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے تھے۔ ادب سے لگاؤ ورثے میں ملا تھا اور بھائیوں میں نسبتاً

زیادہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کا زمانہ تھا، یہ دہلی کے قصبے حصار میٹرک امتحان دینے گئے تھے کہ ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے انھیں ان کے ایک ہندو ٹیچر نے کہیں چھپا دیا۔ انھوں نے کوئی دو تین ماہ روپوشی اور گھر (دلی) پہنچنے کی سعوبتیں جھلیں جس کے باعث ان کی صحت بہت زیادہ متاثر ہوئی نتیجۃً دائمی پیچش کا شکار ہو گئے۔

محمد احمد شروع ہی سے اپنے تعلیمی اور پیشہ ورانہ مستقبل کے لیے سنجیدگی سے فکرمند اور کوشاں رہے۔ کراچی پہنچ کر بہ حیثیت کلرک ایک سرکاری ملازمت کی جس کے دوران وہ شارٹ ہینڈ سیکھتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے فرانسسی زبان کا کورس بھی پاس کیا۔ وہ سب بھائیوں میں سب سے زیادہ career conscious، پرعزم، بلند حوصلہ، سرگرم اور کامیابی کے لیے کوشاں وفعال رہے۔

پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ نوجوانی میں کئی سال تن سازی (باڈی بلڈنگ) کی۔ ورزش باقاعدہ کیا کرتے تھے۔ موسیقی کا بھی شوق تھا۔ بینجو اچھا بجاتے تھے۔ امریکی سفارت خانے کی ملازمت کے آغاز میں امریکی دوستوں سے ماؤتھ آرگن کا شوق ہوا اور بڑا اچھا بجانے لگے۔ موسیقی کا ستھرا ذوق، ان کا اور ان کی بیگم کا بعد تک رہا۔

خطاطی اور مصوری خون میں ہونے کے باعث اپنے والد کو دیکھ کر خوب صورت اور خوش خط لکھتے تھے۔ بعد میں کئی وضع کی انگریزی خطاطی شوقیہ سیکھی۔ انھوں نے امریکی سفارت خانے کے لیے رضا کارانہ کئی قابلِ تعریف کام کیے اور سفیر اور اعلیٰ حکام سے داد و تحسین پائی۔

انھوں نے امریکی سفارت خانے میں ملازمت کا آغاز USIS سے کیا پھر لائبریرین رہے۔ وہ سفارت خانے میں بہ تدریج ذمے دارانہ عہدوں پر رہے۔ جب سفارت خانہ کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا تو وہ وہاں Personal میں تھے اور وہیں انتقال تک رہے۔

محمد احمد سب بھائیوں میں سب سے وجیہ، خوب رو، خوش وضع اور خوش لباس تھے۔ گو کہ یونی ورسٹی کی تعلیم شروع میں حاصل نہیں کر سکے تھے لیکن امریکی سفارت خانے میں ملازمت کے بعد بہ تدریج تعلیمی قابلیت بڑھاتے رہے۔ ذاتی مطالعے سے اور پرائیوٹ امتحان پاس کرتے رہے۔ انھوں نے سیاسیات اور انگریزی ادب میں ایم اے کیے۔ ان میں ہمیشہ آگے بڑھنے کا شدید جذبہ رہا۔ ان میں حسنِ معیار کا احساس (Quality conscious ness) اور Excellence کی کوشش حد درجہ تھی۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل برص کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس مرض نے ان کے خوب صورت چہرے کو داغ دار کر دیا تھا جس نے ان کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر متاثر کیا اور یوں آہستہ آہستہ ان کی امنگیں اور حوصلے جواب دے گئے۔

متواتر محنت اور دفتری تناؤ (Tension) کی وجہ سے اوّلاً معدے کے السر پھر دل کی بیماری میں رہ کر کم عمری میں ۲۸ر اگست ۱۹۷۴ء کو راول پنڈی میں انتقال کیا، تدفین پاپوش نگر، کراچی میں والد کے قریب ہوئی۔

بیگم، سیدہ یاسمین بھی انتقال کر چکی ہیں۔ وہ بھی تعلیم یافتہ تھیں۔ محمد احمد برنی اپنے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ ان کی چار بیٹیاں سیمین، ساجیہ نورین، طوبیٰ اور طہٰ ہیں۔ آخری دو جڑواں ہیں۔ سب شادی شدہ ہیں۔ طوبیٰ کی شادی ایک فلسطین انجینئر اور

سائنسدان سے ہوئی ہے جس نے پاکستان میں تعلیم حاصل کی۔ آج کل مہران یونی ورسٹی جام شورو سے پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ (۲۳۸)

دوسری بیوی سے دو بیٹے اعجاز احمد برنی اور ریاض احمد برنی اور ایک بیٹی جہاں آرا ہوئے۔ تینوں بقید حیات ہیں۔

## جہاں آرا نظام:

اُن کا اصل نام جہاں آرا ہے۔ وہ ۲۰ اپریل ۱۹۴۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔ انھوں نے کراچی یونی ورسٹی سے سوشل ورک میں ایم اے کیا۔ انھوں نے اپنی پہلی ملازمت Swidish Pakistan Family Welfare project,Karachi میں ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کی۔

ایک سال امریکہ کی شکاگو یونی ورسٹی میں ایک سال تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے واپسی پر پاکستان گورنمنٹ کے ادارے Training Research & Evaluation Centre جو صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے تحت آتا تھا، میں ملازمت کی۔ ۱۹۶۸ء میں ان کی شادی میں ہوئی۔ ۱۹۷۶ء میں اُن کے شوہر نظام صاحب نے امریکہ سے پی ایچ ڈی کیا۔ یہ پروگرام چوں کہ تین سال کا تھا لہٰذا جہاں آرا بھی اپنے دونوں بچوں کو لے کر اور اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے کر ۱۹۷۷ء میں امریکا چلی گئیں۔ نظام صاحب کی ملازمت کے دوران اُردن، مصر اور نیویارک کے سفر کیے۔

نیورک میں قیام کے دوران جہاں آرا صاحبہ نے ایک اسکول میں کچھ عرصے تدریس بھی کی۔ اُسی دوران انھوں نے اپنے شوق کے باعث نیویارک کے School of Interrior Design سے ڈپلوما کیا۔

ان کے دو بچے ایک بیٹا اور ایک بیٹی، ہیں۔ بیٹے فواد احمد نے کمپیوٹر میں تعلیم حاصل کی۔ اُنھیں گٹار بجانے کا شوق ہے۔ بیٹی ربیعہ نظام نے Colambia University سے گریجویشن اور New York University سے ایم اے کیا ہے۔

جہاں آرا صاحبہ میں ادب اور بالخصوص شعر و شاعری سے دل چسپی ان کے والد ضیاالدین احمد برنی کے سبب سے آئی ہے۔ ان کے والد انھیں بچپن میں ادبی محفلوں میں ساتھ لے کر جایا کرتے تھے۔ جہاں آرا صاحبہ نے امریکا میں قیام کے دوران اپنے گھر پر شعری محفلوں کا انعقاد کیا کرتی تھیں۔ جن میں اردو ادب کی بعض معروف شخصیتوں نے شرکت کی۔ (۲۳۹)

## اعجاز احمد برنی:

اعجاز احمد برنی تینوں بہن بھائیوں میں بڑے ہیں۔ وہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۲ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ کراچی یوی ورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں بی اے کیا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان ائرلائن (PIA) میں مارکیٹنگ ڈپارٹمنٹ کے ریزورشین سیکشن سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۸۶ تا ۱۹۸۹ء تین سال صلالہ، عمان کے پی آئی اے اسٹیشن پر ڈسٹرکٹ سیل منیجر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اسی دوران تین حج بھی کیے۔ ایک سال ۱۹۹۶ تا ۱۹۹۷ء ٹکٹ آفیسر منیجر کی حیثیت سے بیجنگ، چین کے پی آئی اے آفس میں خدمات انجام دیں اور کابل، افغانستان میں ۱۹۷۷ء میں تین مہینے کے لیے ٹکٹ آفیسر منیجر کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ ۲۴ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو اسسٹنٹ

منیجر پروسیجر بیورو کی حیثیت سے اپنے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

پاکستانی ائرلائن سے ریٹائر ہونے کے بعد ۲۰۰۴ء سے وہ مقامی فضائی کمپنی ائیر وایشیا کے کراچی آفس میں منیجر پروسیجر بیورو (CRC) کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔

انھوں نے دوران ملازمت متعلقہ کاموں کی ٹریننگ بھی لیں۔انھیں پی آئی اے میں ملازمت کے دوران اچھی خدمات کے صلے میں کئی اسناد کمپنی کی جانب سے دی گئیں۔

ان کی شادی ۱۹۶۸ء میں اردو کے معروف ادیب اشرف صبوحی کی صاحب زادی طاہرہ سے لاہور میں ہوئی۔ان کی بیگم نے پنجاب یونی ورسٹی سے گریجویشن کیا ہوا ہے۔

ان کے دو بچے ہیں ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔فیصل اعجاز احمد،ایمریٹس ائر لائن، کراچی میں ائرپورٹ پر سروس ڈپارٹمنٹ میں ہے۔حال ہی میں شادی ہوئی ہے،اعجاز صاحب کی خالہ کی نواسی سے۔عظمیٰ اعجاز۔شادی شدہ ہیں اور شوہر کے ساتھ سعودی عرب میں مقیم ہیں۔(۲۴۰)

## برنی کی پاکستان آمد:

پاکستان آکر برنی اور ان کے خاندان کا قیام اُس بلڈنگ میں ہوا جس میں آج اردو اکیڈمی سندھ ہے۔بعد اسی عمارت کے ساتھ ایک فلیٹ کرائے پر لیا گیا۔رسالہ اُسی فلیٹ سے جاری ہوا تھا۔ادارہ تعلیمی مرکز کراچی بھی اسی فلیٹ میں قایم کیا گیا۔بعد میں وہ ان کے بیوی بچے شریف آباد میں مکان خرید کر رہنے لگے۔

یہاں انھوں نے کچھ عرصے کے لیے دو ایک ملازمتیں بھی کیں تاہم اُن کا بیشتر وقت تصنیف و تالیف اور اپنی کتابوں کے نئے ایڈیشن شایع کرنے میں گزرا۔بعض نئی کتابیں بھی شایع کیں۔(۲۴۱) اسی زمانے میں انھوں نے ''کتابی دنیا'' نامی ایک ماہ نامہ جاری کیا جس کا ذکر علاحدہ باب میں کیا جارہا ہے۔

## برنی کی علالت اور وفات:

برنی کو دمے کا عارضہ پرانا تھا اور اس حملے ہوا کرتے تھے۔۱۵ مئی ۱۹۶۴ء کو انیس شاہ جیلانی کے خط میں اس کا تذکرہ اس طرح کیا ہے''میں پانچ چھ دن سے دمہ میں مبتلا ہوں''۔

برنی اپنی زندگی کے اخیر زمانے میں کئی بیماریوں میں مبتلا ہوگئے تھے۔وہ زندگی کے آخری لمحے تک اُن کا مقابلہ کرتے رہے۔ہاتھ میں رعشہ آجانے اور بینائی انتہائی کم ہوجانے کے باوجود علم وادب سے رشتہ جوڑے رکھا۔

> جنوری ۱۹۶۶ء کے کتابی دنیا میں اس خوش خبری کے ساتھ یہ اندوہ ناک خبر بھی شایع ہوئی کہ:
> اس رسالے کو شروع ہوئے تقریباً گیارہ برس ہوچکے ہیں اور باقاعدگی سے ہر ماہ شائع ہوتا رہا ہے جس سہرا ہمارے بزرگ، مشہور ادیب، مورخ، مترجم، صحافی،

نقاد، سوانح نگار جناب ضیاء الدین صاحب برنی کے سر ہے جوان دنوں عارضہء دل میں صاحب فراش ہیں خدا اُن کو جلد صحت دے اور لمبی عمر عطا کرے۔ آمین

۱۹۶۶ء میں انھوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ سے اپنی بیماری سے متعلق رابطہ کیا تھا۔ ان کے نام گلڈ کے ریجنل سیکریٹری سید انور کے کئی خط ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اُن کی بیماری کے بعض اخراجات بھی گلڈ نے برداشت کیے۔

جنوری ۶۶ء میں بیمار ہوجانے کے بعد صحت کسی قدر بحال ہوئی۔ تاہم یہ بحالی عارضی ثابت ہوئی۔ کتابی دنیا اگست، ستمبر ۱۹۶۷ء میں دوبارہ ان کے علیل ہوجانے کی اطلاع دی گئی:

مشہور مدیر کتابی دنیا کی عمر اس وقت اسی برس کے اوپر ہے۔ کئی ماہ سے دل کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ پچھلے دنوں وہ روبہ صحت تھے مگر وسط ستمبر سے پھر وہ صاحب فراش ہیں۔ ان کی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں گزری ہے۔ موصوف کو منشی ذکاءاللہ، نذیر احمد اور سی ایف اینڈ ریوز جیسے استادوں سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ خدا انھیں جلد صحت یاب فرمائے۔

۱۹ دسمبر ۱۹۶۷ء کو برنی کی بڑی بہن فاطمۃ الکبریٰ کا انتقال ہوگیا جس کی بڑی تفصیلی خبر ''کتابی دنیا'' میں شایع کی گئی۔ یقیناً اس سانحہ نے برنی کی صحت نہایت برا اثر ڈالا ہوگا۔ چناں چہ برنی مسلسل بیمار رہنے لگے۔

۱۹۶۸ء میں انھوں نے جو مختصر خودنوشت تحریر کی اس میں اپنی صحت سے متعلق لکھا:

گذشتہ دوسال سے صاحبِ فراش ہوں۔ بیماریاں بڑی سخت ہیں۔ دمہ، بلڈ پریشر اور Thrombos۔ جس محبت اور خلوص سے میرے ڈاکٹروں نے میرا علاج کیا ہے اور کررہے ہیں میں اُسے زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔

برنی نے اپنی خودنوشت میں اپنے معالجین ڈاکٹر عبدالعزیز چوہدری (سابق سول سرجن، ملتان)، ڈاکٹر محمد شریف (ماہر امراضِ قلب، جناح ہسپتال)، ڈاکٹر منظور احمد قریشی۔ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر عبدالعزیز چوہدری کے متعلق لکھا ہے کہ ''رات اور دن کی کسی گھڑی میں بھی میرے علاج سے غافل نہیں رہے۔''

برنی کئی برس اپنی بیماریوں سے نبرد آزما رہنے کے بعد ۴ مئی ۱۹۶۹ء بہ مطابق ۱۶ صفر المظفر ۱۳۸۹ھ کو انتقال کرگئے۔ انتقال سے دو روز قبل انھیں ڈبل نمونیہ ہوگیا تھا جس کے باعث انھیں جناح ہسپتال میں داخل کردیا گیا تھا۔ جہاں وہ ایک دن بے ہوش رہنے کے بعد انتقال کرگئے۔ انھیں پاپوش نگر کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ان کے انتقال سے متعلق خبر ملک اور ملک اخبارات میں شایع ہوئی۔ جنگ کراچی نے ۶ مئی، ۷ مئی اور ۸ مئی ۱۹۶۹ء کو خبر شایع کی۔ حریت کراچی نے ۶ مئی ۱۹۶۹ء کو مشرق کراچی نے ۶ مئی کو خبر شایع کی۔ اسی طرح اخبار خواتین کراچی نے بھی ان کے انتقال کی خبر نمایاں طور پر ''اک چراغ اور بجھا'' کے عنوان سے دی۔

انگریزی اخباروں میں ڈیلی نیوز کراچی، ڈان کراچی اور مورننگ نیوز کراچی نے ان کے انتقال کی خبر دی۔ رئیس

امروہوی نے اُن کی یاد میں قطعہ کہا جو ۷ مئی ۱۹۶۹ء کو جنگ کراچی میں شایع ہوا۔

**قطعہ تاریخ وفات**

جناب ضیاء الدین احمد برنی مرحوم مصنف عظمتِ رفتہ

سخن وہ بے نظیر اس کا ادب وہ بے مثال اُس کا
نشانِ عظمتِ رفتہ تھا ماضی اور حال اس کا
صلاحِ عام و صلحِ عام اندازِ کمال اس کا
''ضیاء الدین احمد برنی مصلح'' ہے سال اس کا
۱۳۸۹ھ

انتقال کے بعد ان پر کئی مضامین شایع ہوئے۔ ان کے دوست ملا واحدی کا مضمون ''ملا واحدی کے قلم سے'' کے عنوان سے روزنامہ جنگ کراچی، مئی ۱۹۶۹ء میں شایع ہوا۔ ''روشنی کا مینار ضیاء الدین احمد برنی'' کے عنوان سے قمر القادری کا مضمون روزنامہ جنگ، کراچی، ۹/اگست ۱۹۶۹ء میں شایع ہوا۔ مولانا ماہر القادری نے فاران کراچی میں ایک مستقل عنوان ''یاد رفتگاں'' کے تحت ''ضیاء الدین احمد برنی'' کے عنوان سے مضمون لکھا۔

روزنامہ جنگ، کراچی، جمعہ ایڈیشن، ۱۵ مئی ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں پیر علی محمد راشدی نے اپنے کالم ''مشرق و مغرب'' میں انھیں اس طرح یاد کیا تھا:

> ہمارے یہاں سے جناب ضیاء الدین احمد برنی صاحب بھی راہگرارے عالم جاودانی ہوگئے۔ جناب رئیس احمد جعفری مرحوم کے انتقال کے بعد ہی ایک بزرگ پرانے دور کی یادگار رہ گئے تھے سو وہ بھی رخصت ہوگئے کیا کچھ انھوں نے نہیں دیکھا اور کیا کچھ انھوں نے نہیں لکھا۔ جس دور سے ان کا تعلق رہا وہ برصغیر کی تاریخ کا اہم ترین دور تھا۔ ایسی شخصیتیں انھوں نے دیکھیں جیسی شخصیتیں نئی نسل کے لوگ شاید ہی دیکھ سکیں۔ یہ لوگ انسانی پاؤں پر ایک چلتی پھرتی تاریخ تھے۔ ضیاء الدین مرحوم کی خالی کردہ جگہ اب کون بھر سکے گا۔ رئیس احمد کی جگہ کس نے بھری کہ اب ضیاء الدین کی جگہ بھریگا۔ ان بزرگوں کا اُٹھ جانا ایک عظیم قومی المیہ ہے۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک ماضی معلوم نہ ہو مستقل کے متعلق صحیح راہیں نظر نہیں آسکتیں۔ ہمارا ماضی بتانے والا اب کون رہ گیا ٹیڈیوں اور ٹوڈیوں کی طرف بلانے والے تو بہت نظر آئینگے مگر جناح، جوہر، حسرت، شوکت، ظفر علی کا راستہ بنانے والے کہاں ملیں گے۔

## برنی کا ذکر اردو کتب میں:

یہاں اُن بہت سی اردو اور انگریزی کتابوں میں سے چند کا تذکرہ کیا جارہا ہے جن میں ضیاء الدین احمد برنی کا ان کی شخصیت یا ان کی خدمات کے حوالے سے تذکرہ ہے۔


منیر احمد سلیچ (مرتب)، ''وفیاتِ ناموران پاکستان''، پبلی شر اردو سائنس بورڈ، لاہور۔

ابوسلمان شاہجہاں پوری، ڈاکٹر، ''علامہ اقبال اور مولانا محمد علی''، کراچی، مکتبہ شاہد، ۱۹۹۳ء۔

ابوسلمان شاہجہاں پوری، ڈاکٹر، ''مکتوبات رئیس الاحرار''، کراچی، موڈرن پبلیشرز، دسمبر ۱۹۷۸ء۔

ابوسلمان شاہجہاں پوری، ڈاکٹر، ''مولانا محمد علی اور ان کی صحافت''، کراچی، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، اول دسمبر ۱۹۸۳۔

امدد حسین صدیقی، دبستانوں کا دبستان کراچی، حصہ اول، کراچی، محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۰۳۔

اصغر کاظمی، محمد، سید، نشاط النساء بیگم حسرت موہانی، کراچی، حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال، فروری ۲۰۰۵ء۔

اقبال، محمد، علامہ، مرتبہ مظفر حسین برنی، کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد اوّل، دوّم، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۳۔

امداد صابری، ''تاریخ صحافتِ اردو''، جلد ۵،

انیس شاہ جیلانی، سید، آدمی غنیمت ہے، اول، صادق آباد، مبارلائبریری، محمد آباد، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۷۔

بیگم رشیدہ آفتاب، ''علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب''، کراچی، فیروزسنز، اگست ۱۹۹۹ء۔

تحسین فراقی، ڈاکٹر، ''عبدالماجد دریابادی۔ احوال و آثار''، دوم، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۶ء۔

حمزہ فاروقی، محمد، ''یادوں کے دیے''، کراچی، مکتبہ دانیال، اول ۲۰۰۱۔

حمزہ فاروقی، ''سفرنامہ اقبال''، کراچی، اسلوب، ۱۹۸۹ء۔

رابعہ طارق، ''مولانا ظفر علی خاں کی آپ بیتی''، لاہور ندوۃ المعارف، ۱۹۹۹ء (برنی کو ڈاکٹر لکھا ہے، ص ۲۲۸)

سید اوصاف علی واحدی دہلوی (مرتب)، ''ناقابل فراموش شخصیات''، مرتبہ اسلام شبنم، کراچی، نظام المشائخ، ۲۰۰۵ء۔

شاہ محی الحق فاروقی، ''بیدار دل لوگ''، کراچی، اکادمی بازیافت۔

شفیق عقیل، مشہور اہل قلم کی گمنام تحریریں، لاہور، بک ہوم، ۲۰۰۴۔

صلاح الدین، ڈاکٹر، ''دلی والے''، ۱۹۸۶، اردو اکادمی، دہلی۔

عبدالقوی دسنوی، ''اقبالیات کی تلاش''، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۸۳۔

عبداللطیف اعظمی، مشاہیر کے خطوط، دہلی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۷۵۔

عبداللطیف اعظمی، ''مولانا محمد علی ایک مطالعہ''، لاہور، ایچ۔ وائی۔ پرنٹرز، ۲۰۰۰ء۔

عبدالماجد دریابادی، مولانا، ''سیاحتِ ماجدی''، کراچی، ادارہ علم وفن، ۲۰۰۱ء۔

عبدالمجید قریشی، کتابیں ہیں چمن اپنا، کراچی، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۹۲ء۔

کامل قریشی، ڈاکٹر (مرتب)، ''داغ دہلوی حیات اور کارنامے''، دہلی، اردو اکادمی۔

ماہر القادری، مرتبہ طالب ہاشمی، یادِ رفتگاں، جلد اول، لاہور، البدر پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء۔

محمد اصغر کاظمی، سید، ''مولانا حسرت موہانی ایک ہمہ جہت شخصیت''، کراچی حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال ٹرسٹ، ۲۰۰۴ء۔

مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، ''کتابیات تراجم''، جلد دوم، نثری ادب، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء۔

ملا واحدی، خواجہ حسن نظامی، (سوانح عمری)، کراچی، گلڈ انجمن کتاب گھر، ۱۹۵۷ء۔

ملا واحدی، ''دلی جو ایک شہر تھا''، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء۔

میمونہ عبدالستار دلوی، ''بمبئی میں اردو'' (مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بمبئی یونی ورسٹی)

ولی مظہر، ''عظمتوں کے چراغ''، ملتان، مجلس کارکنان تحریک پاکستان، جلد دوم، ۱۹۸۸ء۔

## برنی کا ذکر انگریزی کتب میں:

1. LIBRARIANSHIP IN PAKISTAN FIFTEEN YEAR'S WORK.1947-62 by:Anis kurshid, irshad Ali 1965.(BanionPAGE-5)

2. NATIONALIST CONSCIENCE:M.AANSARI,THE CONGRESS,AND THE RAJ. By:Mushirul Hassan 1987.(Bani on PAGE-11)

3. PUBLICATIONS OF LEARNED BODIES AND RESEARCH ORGANIZATIONS IN PAKSTAN. By:National Book Centre of Pakistan.1973-(Bani on page-11)

4. NEW HISTORY OF INDIA 7 PAK!STAN. By:abdul qayyum,Mahmud Brelvi.1951.(Bani onPAGE-123)

5. JOURNAL OF THE PAKISTAN HISTORICAL SOCIETY. By:pakistan Historical Society.1953.(Bani onPAGE-46)

7. LETTERS 7 WRITINGS OF IQBAL.By:Bashir Ahmed Dar.1967(Bani onPAGE-11)

8. MOHAMED ALI IN INDIAN POLITICS:SELECT WRITINGS. By:Mushirul Hassn.1986.(Bani onPAGE-15)

9. SEPARATISM AMONG INDIAN MUSLIMS: THE POLITICS OF THE UNITED PROVINCES...By: Francis Robinson.2007.(Bani onPAGE-368)

10. MUSLIM WOMEN IN MEDIEVAL INDIA. By:Zinat Kausar.1992.(BanionPAGE-174)

11. SUCCESSORS OF SIR SYED AHMED KHAN:THEIR ROLE IN THE GROWTH

OF MUSLIM...By:Shan Muhamm 1981.(Bani onPAGE-84)

12. JOURNAL OF THE RESEARCH SOCIETY OF PAKISTAN. By:Research Society of Pakistan.1964.(Bani onPAGE-70)

13. THE THEOSOPHIST. By:Helena Petrovna Blavatsky.Theosophical Society(Madras India).1916.(Bani onPAGE-515)

14. LEADERSHIP IN SOUTH ASIA. By:Bishwa NathPandey,University of London.1977.(Bani onPAGE-393)

15. THE VOICE OF ISLAM. By:Jamiyat-ul-Falah.1952.(Bani onPAGE-104)

16. PAKISTAN BOOK TRADE DIRECTORY. By:Muhammad adil Usmani.1966.(Bani onPAGE-82)

17. IQBAL by ATIYA BEGAM,IQBAL by Atiyq Begum,IstEdition,Bobay,1947 & 2nd Edition,Aina-e-Adab,Lahore,1969.

18. A Concise Etymological Dictionary of Persian Language by Dr.Sheikh Ghulam Maqsud Hilali,Patna,Khuda Bakhsh Oriental Public Library,1961.

19. A Catalogue of the Persian Printed Books in the British Museum: [London] By British Museum Dept. of Oriental Printed Books and Manuscripts, Edward Edwards,Published by British Museum, 1922, 967 pages.

20. Journal of the Asiatic Society of Bombay By Asiatic Society of Bombay, Published by Asiatic Society of Bombay,Item notes: v.25,Original from the University of California, Digitized Jul 31, 2008.

21. Quarterly Journal of Indian Studies in Social Sciences, By Indian Institute of Asian Studies. Published by Indian Institute of Asian Studies, 1967
Original from the University of California. Digitized Dec 17, 2007.

22. Gazetteer of the Bombay Presidency, By Bombay (India : State), James M Campbell, R E Enthoven, Bombay (India : State Published by Govt. Central Press,1904.

23. Pakistan Book Trade Directory, By Muhammad Adil Usmani, Ghaniul Akram Sabzwari, Published by Library Promotion Bureau,1966.Original from the University of California, Digitized Dec 14, 2006 , 204 pages.

24. The Visva-bharati Quarterly, By Rabindranath Tagore, Visva-Bharati Published by Visva-bharati,1941, Item notes: ser.2 v.16-17 (May 1950-A

Original from the University of California, Digitized Jan 10,2007.

25. A CONCISE ETYMOLOGICAL DICTIONARY OF PERSIAN LANGUAG by Dr.Sheikh Ghulam Maqsud Hilali(d.1961),Khuda Baksh Oriental Public Library,Patna.

اس باب میں برنی کے حالاتِ زندگی مختلف ادوار میں اوران کی شخصیت وکردار کا جائزہ دست یاب ماٰخذ کی روشنی میں پرکھ کر کیا گیا ہے۔حتی المقدور کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام ماٰخذ تک رسائی حاصل کی جائے جولازمی اور ناگزیر ہیں تاہم حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس ضمن میں سوفیصد کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔

برنی کے بچپن کے حالات باوجود کوشش کے دست یاب نہیں ہوسکے۔اس سلسلے میں راقم نے خلیق انجم صاحب کو لکھا، دہلی یونی ورسٹی کے شعبہء اردو کو لکھا علاوہ ازیں سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی خطوط لکھے اور ای میل سے بھی رابطہ کیا، تاہم خلیق انجم صاحب خاطر خواہ مدد نہیں کر سکے، دہلی یونی ورسٹی سے وہ معلومات حاصل نہیں ہوئیں جن کی راقم کو ضرورت تھی جب کہ سنیٹ اسٹیفنز کالج سے جواب نہیں آیا۔

انفرادی طور پر بعض حضرات کو خطوط لکھے مگر مطلوبہ معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔چناں چہ دست یاب ماٰخذ ہی پر اکتفا کرنا پڑا۔اس سلسلے میں راقم اپنے تئیں بھر پور کوشش کی ہے کہ برنی کی زندگی کا کوئی پہلو رہ نہ جائے۔

## حواشی وتعلیقات:

۱۔ ضیاءالدین احمد برنیؔ "خواجہ حسن نظامی"، مشمولہ عظمت رفتہ، تعلیمی مرکز، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص۳۲۔

دائرہء معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، جلد۴، ۱۹۶۹ء اول، کے مطابق "بُرن" بلند شہر کا قدیم نام ہے۔ تاریخ میں ضیاءالدین برنی، بلند پایہ مؤرخ کے طور پر مشہور ہوا۔ وہ ۱۲۸۴ء میں بہ مقام برن (بلند شہر) پیدا ہوا۔ اس مشہور کتابیں یہ ہیں: تاریخ فروز شاہی، فتاویٰ جہاں داری، نعمتِ محمدی۔ (فیروز سنز اردو انسائیکلوپیڈیا تیسرا ایڈیشن جنوری ۱۹۸۴ء، کراچی)

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے باب اول حاشیہ نمبر ۵۱۔

۳۔ ضیاءالدین احمد برنی: "میری زندگی کے بارے میں" (غیر مطبوعہ) مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء، ص ا۔

۴۔ یہ بھی دہلی کا ایک محلہ ہے۔ جس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: واقعات دارالحکومت دہلی از بشیرالدین احمد بحولہ بالا، ص ۱۸۵۔

۵۔ بشیرالدین احمد: واقعات دارالحکومت دہلی، حصہء دوم، ص ۲۸۹۔

۶۔ برنی، ضیاءالدین احمد: "میری زندگی کے بارے میں" (غیر مطبوعہ) از برنی مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء، ص

۷۔ عظمت اللہ سلیم صاحب جو کہ گوجرانوالہ کے ایک معروف پرائیویٹ اسکول میں........ کے عہدے پر مامور ہیں، نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ M.B.Primary School سے مراد میونسپل بورڈ پرائمری اسکول مراد ہے۔

۸۔ غالباً سہواً شیخ لکھ دیا گیا یا کوئی اور معاملہ ہو۔ ورنہ ضیاءالدین احمد برنی کے بزرگوں کے حالات کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ ذات کے راجپوت کھوکھر تھے۔ آج بھی خاندان کے وہ تمام افراد جن سے میری ملاقات ہوئی ہے یا رابطہ ہوا اس پر متفق ہیں کہ ان کی ذات راجپوت کھوکھر ہے۔

۹۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، اپنی تصنیف "اقبال کی ابتدائی زندگی"، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اول، ۱۹۸۶ء میں اپر پرائمری اسکول کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

اَپر پرائمری سکول میں دو جماعتیں ہوتی تھیں یعنی چوتھی اور پانچویں جماعت۔ ان جماعتوں میں انگریزی اور ورنیکلر دونوں قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ (ص ۱۲۱)

۱۸۸۸ء میں اقبال نے پانچویں جماعت یعنی اپر پرائمری سکول کا امتحان پاس کیا۔ امتحان پاس کرنے پر پنجاب یونی ورسٹی کی جانب سے حلقہ کا انسپکٹر آف سکولز باقاعدہ ایک سند جاری کرتا تھا۔ (ص ۱۲۲)

ص ۱۷ پر "لوئر پرائمری" کے متعلق لکھتے ہیں: پرائمری میں ابتدائی چار جماعتیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ۱۸۷۵ء میں ان جماعتوں کو اس طرح پکارا جاتا تھا:

1st. Class lower School.

2nd. Class lower School.

3rd. Class 3rd Primary School vernacular.

4th. Class 4th vernacular.

۱۰۔ برنی، ضیاءالدین احمد: "میری زندگی کے بارے میں" (غیر مطبوعہ) از برنی مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء، ص۲۔

۱۱۔ منشی محمد الدین کا اپنا خاندان ایک بیوی، بیٹے: منشی عبدالقدیر، ضیاءالدین احمد برنی، منشی محمد یوسف دہلوی، بیٹیاں: فاطمۃ الکبریٰ اور آمنہ خاتون۔ ان کے علاوہ ان کے بھتیجے ان کے ساتھ تھے جن کا ذکر منشی محمد الدین کے ذیل میں آ چکا ہے۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ منشی محمد الدین کے ساتھ ان کے بھتیجے بھی دہلی سے گاؤں چلے گئے یا صرف ان کا اپنا کنبہ۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کا اپنا کنبہ گیا ہوگا۔

۱۲۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر کا مکتوب بنام راقم، محررہ ۲۷ جنوری ۲۰۰۴ء، لاہور۔

۱۳۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر: اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اول، ۱۹۸۶ء ص ۳۳۔

۱۴۔ برنی، ضیاء الدین احمد: ''میری زندگی کے بارے میں'' (غیر مطبوعہ) از برنی مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء، ص ۲۔

۱۵۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صاحب محقق اور دانشور ہیں۔ انھوں نے ۱۹۶۸ء میں ایم۔اے (اردو)، ۱۹۷۰ء، میں ایم۔اے (انگریزی) اسلامیہ کالج، سکھر سے کیے۔ ۱۹۷۶ء میں شعبہء اردو، سندھ یونی ورسٹی سے ''خطبات گارسیں دتاسی۔ ترتیب وتعلیقات'' کے موضوع پر مرحوم ڈاکٹر غنی احمد ہاشمی کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی کیا۔ گورنمنٹ کالج پسرو، سیال کوٹ اور گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں بہ حیثیت استاد خدمات انجام دینے کے بعد صدر شعبہء اردو کے عہدے سے ۲۸ راکتوبر ۱۹۹۶ء میں سبک دوش ہوئے۔ وہ سبک دوشی کے باوجود تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔

ان کی چند اہم تصانیف یہ ہیں:

۱۔ اردو کی نثری تاریخ میں سرسید کا مقام۔ فیروز سنز، لاہور ۱۹۷۱ء دہلی ۱۹۷۶ء

۲۔ یورپ میں اردو کے مراکز۔ مجلس ترقی اردو، لاہور، ۱۹۸۴ء

۳۔ علامہ اقبال کے استاد، شمس العلماء مولوی سید میر حسن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۱ء

۴۔ اقبال کی ابتدائی زندگی۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۴ء

۵۔ تعلیقات خطبات گارسیں دتاسی۔ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۷ء

۶۔ تاریخ پسرو۔ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء

۷۔ تاریخ شیخوپورہ۔ اظہار سنز، لاہور، ۱۹۹۹ء

۸۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پچاس سال (۱۸۶۴ء۔۱۹۱۳ء)۔ اظہار سنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

اقبال کے آخری ۴۴ سال (۱۸۹۵۔۱۹۸۳) زیر ترتیب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان کی تصنیف ''علامہ اقبال کے استاد، شمس العلماء مولوی سید میر حسن'' پر داؤد ادبی انعام سے نوازا جا چکا ہے۔

۱۶۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر کا مکتوب بنام راقم، محررہ ۱۸ نومبر ۲۰۰۳ء، لاہور۔

گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے رسالے مہک کے ''گوجرانوالہ نمبر'' سے پتا چلتا ہے کہ یہ اسکول ۱۸۹۷ء میں اس وقت قائم کیا گیا جب ۱۸۵۲ء میں وزیر آباد تحصیل کو گوجرانوالہ میں دیے جانے کے بعد عہدِ برطانیہ کے ابتدائی دور میں اس تحصیل میں متعدد فلاحی کام ہوئے۔ (دیکھیے: رسالہ ''مہک'' کا گوجرانوالہ نمبر، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ، ۱۹۸۲ء، ص۔)

۱۷۔ ان کارڈ کے لیے دیکھیے: ضمیمہ نمبر:.........

۱۸۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر: اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اول، ۱۹۸۶ء ص ۱۲۶۔

۱۹۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر کا مکتوب بنام راقم، محررہ ۱۱ نومبر ۲۰۰۳ء، لاہور۔

۲۰۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر: اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اول، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۵۔

۲۱۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر: اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اول، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۷۔

۲۲۔ ایضاً۔

۲۳۔ برنی، ضیاء الدین احمد: ''میری زندگی کے بارے میں'' (غیر مطبوعہ) از برنی مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء، ص ۳۔

۲۴۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر کا مکتوب بنام راقم، محررہ ۶ رمارچ ۲۰۰۴ء، لاہور۔

۲۵۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر کا مکتوب بنام راقم، محررہ ۲۷ جنوری ۲۰۰۴ء، لاہور۔

۱۱راپریل ۲۰۰۶ء کو راقم جنڈیالہ ڈھاب والا، گوجرانوالہ گیا مگر اس روز گاؤں ہی میں وقت زیادہ ہوگیا تھا۔ چوں کہ راقم کے ساتھ عظمت اللہ سلیم اور محمد قیوم صاحب کے علاوہ ضیاءالدین احمد برنی کی صاحب زادی جہاں آرا نظام بھی تھیں اور ہمیں لاہور سے نکلے ہوئے پورا دن ہوگیا تھا لہٰذا ارادے کے باوجود، وزیرآباد کے وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول نہیں جاسکے۔

۲۶۔ ''کوچہ چیلاں کی مسجد میں جسے اب کالے خاں کی مسجد کہتے ہیں حضرت شاہ رفیع الدین درس دیتے تھے۔ یہ مسجد بالکل میرے مکان کے بالمقابل ہے۔ سڑک بیچ اور نزدیک ہی مولانا محمد علی کے دفتر ہمدرد سے متصل کیکروالی مسجد میں حضرت شاہ عبدالقادر کا درس ہوتا تھا۔'' (میرے زمانے کی دلی، ملا واحدی، ص: ۵۷) تفصیل کے لیے دیکھیے: واقعات دارالحکومت دہلی از بشیر الدین احمد، حصہ دوم، اردو اکادمی دہلی

۲۷۔ قطعی طور پر یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ گوجرانوالہ سے جاتے ہی کوچہ چیلاں کی مسجد کالے خاں کے پاس جاکر آباد ہوئے، ممکن ہے گوجرانوالہ جانے سے پیشتر منشی محمد دین نے محلّہ تبدیل کرلیا ہو۔ تاہم ضیاءالدین احمد برنی کے قریبی دوست ڈاکٹر سید سجاد دہلوی کی بہو اور بھانجی بیگم ذاکرا عجاز برنی پر لکھے جانے والے ایک تعزیتی مضمون میں لکھتی ہیں: ''وہ دلی کے محلے کوچہ چیلاں میں مسجد کالے خاں کے پاس رہتے تھے، یہیں ہمارا مکان بھی تھا۔ بعد میں وہ مفتی والوں میں اُٹھ گئے، جو کوچہ چیلاں کے قریب ہی تھا۔'' (''عظمتِ رفتہ کا مصنف خود عظمتِ رفتہ بن گیا'' از بیگم ذاکرا عجاز، روزنامہ جنگ، کراچی، سنڈے ایڈیشن، ۱۴رجون ۱۹۶۹ء)

''میر بشارت علی جالب'' پر خاکے میں برنی نے خود بھی اس کی تصدیق کی ہے وہ لکھتے ہیں: جالب اور راقم الحروف ہم محلّہ تھے اور ہم دونوں کوچہ چیلاں میں مسجد کالے خاں کے قریب رہا کرتے تھے۔'' (عظمتِ رفتہ از ضیاءالدین احمد برنی، ص ۴۰)

۲۸۔ [دلّی] کے مشن ہائی اسکول کے بعد دوسرا نمبر گورنمنٹ ہائی اسکول کا تھا۔ تیسرا اینگلو عربک ہائی اسکول کا چوتھا اینگلو سنسکرت ہائی اسکول کا۔ پانچواں شاہزدہ ہائی اسکول (میرے زمانے کی دلی از ملا واحدی، ص ۴۴)

۲۹۔ برنی، ضیاءالدین احمد: ''میری زندگی کے بارے میں'' (غیر مطبوعہ) از برنی مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء، ص ۳۔

۳۰۔ ملا واحدی نے اپنے مضمون ''میرے زمانے کی دلّی'' میں بابو کرامت کے ذیل میں ضیاءالدین احمد برنی کے متعلق ایک واقعہ رقم کیا ہے جو دراصل ہے تو بابو کرامت ہی کے متعلق تاہم اس میں برنی، ملا واحدی اور ان کے مشترکہ دوست شوکت علی خاں کا تذکرہ بھی تفصیل سے آگیا ہے۔ اس واقعے میں انھوں نے ۱۹۰۵ء میں برنی کا انٹرنس کا امتحان دینا لکھا ہے۔ یہی واقعہ ان کے مضمون ''دلی کے تین پنجابی عاشق'' میں بھی آگیا ہے۔ یقیناً ملا واحدی نے سہواً ۱۹۰۵ء میں انٹرنس کا امتحان دینا لکھ دیا ہے۔ برنی کا انٹرنس کا پاس سرٹیفکیٹ اور برنی کی اپنے بیانات ۱۹۰۸ء میں مذکورہ جماعت پاس کرنے کی شہادت دیتے ہیں۔ (دیکھیے ضمیمہ) ملا واحدی کے مضامین کے لیے دیکھیے: ا۔ میرے زمانے کی دلّی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۸۲۔ ۲۔ دلی جو ایک شہر تھا، مطبوعہ اوکسفرڈ، یونی ورسٹی پریس، کراچی ۲۰۰۳ء، ص ۹۳۔۹۴۔

۳۱۔ یہ سرٹیفکیٹ ضمیمے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۳۲۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر کا مکتوب راقم کے نام، محررہ ۱۸ نومبر ۲۰۰۳ء۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ معلومات اور علاوہ ازیں رزلٹ کی نقل پنجاب یونی ورسٹی گزٹ (P.U.Call:1906-07,P:152.220) سے نقل کرکے اور فوٹو کاپی کی صورت میں بھی ارسال فرمائیں۔

۳۳۔ ایضاً۔

۳۴۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر کا مکتوب راقم کے نام، محررہ ۲۹ راکتوبر ۲۰۰۳ء۔ یہ معلومات ڈاکٹر صاحب نے پنجاب یونی ورسٹی گزٹ سے فراہم کی ہیں۔

۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ پنجاب یونی ورسٹی کیلنڈر ۹۔۱۹۰۸ء میٹرک۔۱۹۰۸ء۔P.U.Call:1908-09 یہ پرچے ضمیمے میں، دیکھے جاسکتے ہیں۔

۳۷۔ میٹریکولیشن اگزمنیشن (آرٹس فیکلٹی)، پنجاب یونی ورسٹی گزٹ، ۳رجولائی ۱۹۰۸ء،ص ۸۹۴۔ دیکھیے ضمیمہ

۳۸۔ یہ سرٹیفکیٹ ضمیمے میں، دیکھے جاسکتا ہے۔

۳۹۔ ملا واحدی نے اپنے مضمون ''میرے زمانے کی دلی'' میں بابو کرامت کا ذکر کرتے ہوئے اس واقعے کو ۱۹۰۵ء کا بتایا ہے۔ دیکھیے: حاشیہ نمبر ۱۴۸۔

۴۰۔ تفصیلی واقعے کے لیے دیکھیے:''دلی کے تین پنجابی عاشق''مشمولہ دلی جو ایک شہر تھا،مطبوعہ اوکسفرڈ، یونی ورسٹی پریس، کراچی ۲۰۰۳ء،ص ۹۳۔۹۴۔یہ واقعہ مولانا کوثر نیازی نے اپنے کالم ''مشاہدات و تاثرات'' میں بھی نقل کیا ہے۔ دیکھیے: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲رجولائی ۱۹۸۱ء۔

۴۱۔ یہ مشن کالج یکم فروری ۱۸۸۱ کو دہلی میں قائم ہوا۔سرجان الیٹ کے۔سی۔ایس۔آئی نے اس کا سنگِ بنیاد رکھا اور پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر جیمس لایل نے افتتاح کیا۔سموئیل سکاٹ آلنٹ نے اس کو قائم کیا اور وہی اس کے پہلے پرنسپل تھے۔دوسرے جون رائٹ، تیسرے جی۔ہبرٹ وئیر اور چوتھے پرنسپل سوسل کمار رودرا تھے۔برنی نے رودرا کے زمانے میں تعلیم حاصل کی۔کالج کی تاریخ کے مطالعے کے لیے دیکھیے: بشیر الدین احمد کی واقعات دارالحکومت دہلی، حصہ دوم،ص ۲۸۵۔یا سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی کی ویب سائٹ:http://www.ststephens.edu۔

۴۲۔ ضیاء الدین احمد برنی کے ہم محلّہ، کالج کے ہم جماعت۔ہندوستان کی اس وقت کی وفاقی کابینہ کے وزیر، امریکا میں ہندوستان کے پہلے سفیر، سوئٹزرلینڈ میں بھارت کے سفیر اور اسام میں گورنر رہے۔تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: عظمتِ رفتہ از ضیاء الدین احمد برنی،ص ۱۲۲۔

۴۳۔ برنی، ضیاء الدین احمد:''میری زندگی کے بارے میں''(غیر مطبوعہ) از برنی مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء،ص ۳۔

۴۴۔ برنی، ضیاء الدین احمد: مسٹر آصف علی، مشمولہ عظمتِ رفتہ، تعلیمی مرکز کراچی، ۱۹۶۱ء،ص ۱۲۲۔

۴۵۔ برنی، ضیاء الدین احمد: تمہید، سی۔ایف۔اینڈریوز، تعلیمی مرکز، کراچی،

۴۶۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر کا مکتوب بنام راقم، محررہ ۱۸ نومبر ۲۰۰۳ء، لاہور،ص ۳

۴۷۔ پنجاب یونی ورسٹی کیلنڈر: ۱۹۱۰ء انٹرمیڈیٹ۔۱۹۱۰ء۔P.U.Call:1910-11۔

۴۸۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر کا مکتوب بنام راقم، محررہ ۲۹ راکتوبر ۲۰۰۳ء، لاہور۔سلطان صاحب نے یہ معلومات پنجاب یونی ورسٹی کیلنڈر ۱۹۱۰ء دیکھ کر لکھی ہیں۔دیکھیے حاشیہ نمبر ۱۶۵۔

۴۹۔ یہ معلومات ان کے رپورٹ کارڈ سے حاصل ہوئی ہیں، جو کالج کے پرنسپل ایس۔کے۔رُدرا کے دست خط سے جاری ہوئے تھے۔

۵۰۔ پنجاب یونی ورسٹی کیلنڈر ۱۳۔۱۹۱۲ء،ص ۸۔محترم ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صاحب نے راقم ناچیز کی دل چسپی اور کام کی اہمیت کے پیشِ نظر پنجاب یونی ورسٹی جا کر امتحانی پرچے، کیلنڈر اور گزٹ نہ صرف خود مطالعہ کیے، اہم معلومات نقل کیں اور مذکورہ دست آویز کی فوٹو کاپی راقم کو ارسال کیں۔پرچے باب کے اختتام پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

۵۱۔ پنجاب یونی ورسٹی کا گزٹ اس کی تصدیق کرتا ہے۔اس کا تذکرہ برنی نے اپنے خودنوشت حالات''میری زندگی کے بارے میں''(غیر مطبوعہ) مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء،ص ۴ پر بھی کیا ہے۔

۵۲۔ ''ڈاکٹر اقبال''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا،ص ۲۷۰۔

۵۳۔ ''یادوں کا سفر'' از اخلاق احمد دہلوی،

۵۴۔ برنی، ضیاء الدین احمد:''میری زندگی کے بارے میں''(غیر مطبوعہ) از برنی مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء۔

۵۵۔ ''ڈاکٹر سید سجاد دہلوی''، عظمتِ رفتہ، محولہ بالا،ص ۱۳۴۔

۵۶۔ ''میری زندگی کے بارے میں''، ص۲۔

۵۷۔ ایضاً، ص۳۔ کالج کے اساتذہ کی ایک فہرست، پنجاب یونی ورسٹی کیلنڈر ۱۴-۱۹۱۳ء لاہور، ۱۹۱۳ء، ص ۲۸-۶۲۷ سے ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین صاحب نے فراہم کی۔ مرسلہ: ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء بہ صیغۂ مکتوب بہ نام راقم ناچیز۔

انگریزی: C.F.Andrews MA(Oxn)

C.H.C Sharp MA(Oxn)

F.F.Monk MA(Oxn)

عربی: عبدالرحمٰن مولوی منشی فاضل

فارسی: خواجہ عبدالمجید بی اے

ریاضی: N.G.Leather BA(Contab)

تاریخ: F.F.Monk

F.A.Cockin

C.F.Andrews

P.N.F.Youns MA(Contab)

فلسفہ: N.K.Sen

C.H.Sharp

۵۸۔ برنی نے سی ایف اینڈریوز پر انگریزی میں لکھی گئی سوانح عمری کا اردو میں ترجمہ کیا۔ تفصیل دیکھیے برنی کی کتابوں کے ذیل میں۔ برنی نے سی ایف اینڈریوز کے کئی مضامین کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا جو زمانہ کانپور، نظام المشائخ دہلی اور ماہِ نو کراچی وغیرہ میں شائع ہوئے۔

۵۹۔ پروفیسر غلام یزدانی، ایم اے مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہم جماعت اور دوست تھے۔ ''نذیر احمد کی کہانی'' میں ان کا تذکرہ جا بہ جا آیا ہے۔ سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ بعد میں حیدرآباد دکن میں محکمۂ آثارِ قدیمہ میں ڈائریکٹر مقرر ہو گئے تھے۔ ان کا خاندان پاکستان آ گیا تھا مگر ہو حیدرآباد دکن میں رہے۔ ان کی علمی خدمات کے عوض ''پدم بھوشن'' کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: کتابی دنیا، کراچی، دسمبر ۱۹۶۲ء اور نصیر الدین ہاشمی کا مضمون ''غلام یزدانی''، ساقی، نومبر ۶۴ء)

۶۰۔ دیکھیے: دیباچہ اول، ''جہاں آرا بیگم''، تعلیمی مرکز، کراچی دوسرا ایڈیشن، ۱۹۵۵ء۔

۶۱۔ سی ایف اینڈریوز، ۱۹۵۲ء، تعلیمی مرکز، کراچی۔ برنی کے نام آر۔ وی بوڈگر، جرنلسٹ (R.V.Bodgers, Jounaalist)، ایس۔ کے۔ رُدرا (S.K.Rudra, Principal)، سی۔ ایف اینڈریوز (C.F.Andrews, Senior Professor of English)، سی۔ بی۔ ینگ (C.B.Young.MA) کے تعریفی سرٹیفکیٹ بھی اساتذہ سے اُن کے تعلقات اور اساتذہ کی ان سے توقعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ بالترتیب یکم نومبر ۱۹۱۴ء، ۱۲ اپریل ۱۹۱۲ء، ندارد، ۱۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو دیے گئے۔ یہ سرٹیفکیٹ سادہ کاغذ پر ٹائپ کیے گئے ہیں۔ غالباً یہ اصل نہیں ہیں بلکہ برنی حفاظت کی غرض سے نقل تیار کی۔

۶۳۔ ''میری زندگی کے بارے میں''، ص۴۔

۶۴۔ ایضاً

۶۵۔ راقم نے متعدد بار کوشش کی کہ سینٹ اسٹفنز کالج سے رابطہ ہو سکے اور وہاں سے برنی کے طالب علمی کے زمانے کے کوائف اور کالج میگزین میں

ان کے مطبوعہ مضامین حاصل ہو جائیں۔اس سلسلے میں کئی بار ان کے ای میل ایڈریس پر میل بھیجی گئیں مگر ان کی جانب سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا ۔ان کا کالج میگزین کسی on line library میں بھی نہیں ہے۔

۶۶۔ ''میری زندگی کے بارے میں''،ص ۴۔

۶۷۔ غیر مطبوعہ۔

۶۸۔ ''میری زندگی کے بارے میں''،ص ۳۔بہت کوشش کی گئی کہ امرتسر کے اُس رسالے کا پتا چل سکے جس میں برنی کا مضمون شایع ہوا تھا تاہم کامیابی نہیں ہوئی۔

۶۹۔ تمہید،سی ایف اینڈریوز،تعلیمی مرکز،کراچی ۱۹۵۲ء۔

۷۰۔ ''تاثرات''از ملا واحدی،مرتبہ حکیم محمد سعید،اول کراچی،ہمدرد اکیڈمی،جلد اول،۱۹۷۰ء۔

۷۱۔ میرے زمانے کی دلی،انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی،۲۰۰۰،ص ۴۶۔

۷۲۔ ملا واحدی کے قلم سے،ملا واحدی،رونامہ جنگ کراچی،مئی ۱۹۶۹۔

۷۳۔ ایضاً،ص ۸۳۔

۷۴۔ ناقابلِ فراموش شخصیات،سید اوصاف علی واحدی دہلوی،مرتبہ اسلام شبنم،اول،کراچی،ایوان آمنہ''نظام المشائخ''،۲۰۰۵۔

۷۵۔ ملا واحدی کے قلم سے،ملا واحدی،رونامہ جنگ کراچی،مئی ۱۹۶۹۔

۷۶۔ ناقابل فراموش شخصیات،محولہ بالا،ص ۱۷۱۔

۷۷۔ سید سجاد پر مضمون عظمتِ رفتہ میں جگہ پانے سے پیشتر ساقی،کراچی میں اپریل ۱۹۵۵ء میں شایع ہوا تھا۔سب رس،کراچی کے ڈاکٹر سجاد نمبر میں یہ مضمون ساقی ہی سے لیا گیا۔اسی میں بعض ترامیم کے بعد برنی ۶۱ء میں عظمتِ رفتہ میں شامل کیا۔کتابی دنیا،کراچی دسمبر ۵۵ء میں بھی برنی ان سے متعلق اپنے خیالات محفوظ کیے ہیں۔

۷۸۔ ''میرے زمانے کی دلّی''،ص ۲۰۸۔

۷۹۔ عظمتِ رفتہ،ص ۱۳۴

۸۰۔ ایضاً،ص ۱۴۳۔

۸۱۔ ڈاکٹر سید سجاد ہلوی نمبر،سب رس،کراچی،اگست ۱۹۸۰،ص ۷

۸۲۔ بیگم ذاکر اعجاز:''عظمتِ رفتہ کا مصنف خود عظمتِ رفتہ بن گیا''،روزنامہ جنگ،کراچی،سنڈے ایڈیشن،۱۴ جون ۱۹۶۹ء۔

۸۳۔ عظمتِ رفتہ،ص ۱۴۳۔

۸۴۔ ''عظمتِ رفتہ کا مصنف خود عظمتِ رفتہ بن گیا''محولہ بالا۔

۸۵۔ تاریخ صحافتِ اردو،امداد صابری،جلد ۵،ص ۶۱۹

۸۶۔ عظمتِ رفتہ،محولہ بالا،ص ۱۳۰۔

۸۷۔ تاریخ صحافتِ اردو،امداد صابری،جلد ۵،ص ۶۲۰

۸۸۔ عظمتِ رفتہ،محولہ بالا،ص ۱۳۱۔

۸۹۔ عارف ہسوی کا یہ خط غیر مطبوعہ ہے تاہم اسے برنی نے عظمتِ رفتہ میں عارف ہسوی کے خاکے میں نقل کیا ہے۔برنی نے خط نقل کرتے ہوئے اس کے کچھ حصے حذف کر دیے تھے۔یہاں اس خط کو مکمل نقل کیا گیا ہے۔

۹۰۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۱۔ کتابی دنیا، مئی ۶۴ء ص ۱۳۔

۹۱۔ میرے زمانے کی دلی، ص ۲۰۶۔

۹۲۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۰

۹۳۔ سوانح عمری حضرت خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، کراچی، گلڈ انجمن کتاب گھر، ۱۹۵۷ء، ص ۴۷

۹۴۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۲۔ میاں سلطان احمد وجودی نے اپنے مضمون "خواجہ حسن نظامی" میں بہت سی ایسی معروف شخصیات کے نام خواجہ صاحب کے عطا کردہ القاب دیے ہیں اور وہ لوگ انھیں القابات سے مشہور ہوئے۔ اس میں برنی کا نام بھی درج ہے۔ دیکھیے: سہ ماہی صحیفہ، لاہور، مجلس ترقی ادب، شمارہ ۵۲، جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۳

۹۵۔ ضیاء الدین برنی: سترہ سال تک محمد بن تغلق کے عمائدین میں شامل رہا۔ "تاریخ فروز شاہی" (آغاز عہد بلبن ۱۲۶۶ء سے لے کر سلطان فروز شاہ کے ابتدائی دور ۱۳۸۵ء) تک کے تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ (فتاویٰ جہاں داری)

ضیاء الدین برنی کے تفصیلی حالات کے لیے: فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ از ڈاکٹر محمد ریاض، ڈاکٹر صدیق شبلی، فارسی زبان وادب مجموعہ مقالات از ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۲۳۹۔

۹۶۔ سردار پور جھنڈیر لائبریری میں جانا ہوا تو وہاں میں نے ان کے ریکارڈ میں دونوں کے نام خلط ملط پائے۔ چناں چہ سردار مسعود صاحب کی فرمائش پر راقم نے ان کا ریکارڈ درست کیا۔ اسی طرح اپنے تحقیقی کام کے دوران راقم نے بعض حضرات کی غلط فہمیوں کو دور کیا کہ یہ "تاریخ فیروز شاہی" برنی نہیں ہیں بلکہ "عظمتِ رفتہ" والے ہیں۔

۹۷۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۲۔

۹۸۔ ملا واحدی کے قلم سے، محولہ بالا۔

۹۹۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۵۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۲۶۔

۱۰۱۔ ماہ نامہ عصمت، کراچی، جولائی و اگست ۱۹۶۴ء۔

۱۰۲۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۵۔

۱۰۳۔ ایضاً، ص ۲۸۔

۱۰۴۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری، ڈاکٹر: مکتوبات رئیس الاحرار، کراچی، موڈرن پبلیشرز، دسمبر ۱۹۷۸ء، ص ۲۶۶۔

۱۰۵۔ سوانح عمری حضرت خواجہ حسن نظامی، کراچی، گلڈ انجمن کتاب گھر، ۱۹۵۷۔

۱۰۶۔ مرقومہ ۱۶ ستمبر ۱۹۱۵ء، دہلی۔ (غیر مطبوعہ)

۱۰۷۔ مرقومہ ۲۲ مارچ ۱۹۱۵ء، دہلی (غیر مطبوعہ)

۱۰۸۔ مرقومہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۷ء، دہلی (غیر مطبوعہ)

۱۰۹۔ مرقومہ ۲۸ جون ۱۹۵۰ء (غیر مطبوعہ)

۱۱۰۔ مرقومہ ۱۸ نومبر ۱۹۲۹ء (غیر مطبوعہ)

۱۱۱۔ ضیاء الدین احمد برنی، ماہ نامہ کتابی دنیا، کراچی تعلیمی مرکز، دسمبر ۱۹۵۵ء، ص ۵۔ ۳ مئی ۱۹۶۴ء کو "حلقہ ادب پاکستان، لاہور" نے یوم حسن نظامی منانے کا ارادہ کیا تو برنی عابد نظامی کی درخواست پر پیغام لکھ کر بھیجا۔ دیکھیے: کتابی دنیا مئی ۶۴ ص ۱۳۔

۱۱۲۔ حیاتِ مولانا محمد علی جوہر از ضیاءالدین احمد برنی، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۔

۱۱۳۔ ایضاً

۱۱۴۔ ضیاءالدین احمد برنی: میری زندگی کے بارے میں، غیر مطبوعہ، ص ۵۔

۱۱۵۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، مولانا محمد علی اوران کی صحافت، کراچی، ادارہ تصنیف وتحقیق پاکستان، اول دسمبر ۱۹۸۳ء، ص ۹۵۔

۱۱۶۔ ملا واحدی کے قلم سے، محولہ بالا۔

۱۱۷۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری: مولانا محمد علی اوران کی صحافت، ادارہ تصنیف وتحقیق پاکستان، کراچی، دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۹۱۔

۱۱۸۔ قاضی عبدلعزیز منصور پوری کا خط ضیاءالدین احمد برنی کے نام مرقومہ ۱۴ نومبر ۱۹۱۴ء (غیر مطبوعہ)

۱۱۹۔ یہ خط (انگریزی) کامریڈ کے لیٹر پیڈ پر تحریر ہے۔ خط ضمیمے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۱۲۰۔ قاضی عبدلعزیز منصور پوری کا خط، محولہ بالا۔

۱۲۱۔ میری زندگی کے بارے میں، محولہ بالا، ص ۶۔

۱۲۲۔ ایضاً۔

۱۲۳۔ عظمتِ رفتہ، ص ۵۴۔۵۳۔

۱۲۴۔ حیاتِ مولانا محمد علی جوہر، کراچی اردو اکیڈمی سندھ، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۱۶۔۱۵۔

۱۲۵۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۷۰، اسی اجلاس میں علامہ شبلی نعمانی نے مسلمانانِ ہند کی جانب سے اقبال کو ترجمانِ حقیقت کا خطاب دیا تھا اور خواجہ کمال الدین نے اس کی تائید نہایت پرجوش الفاظ میں کی تھی۔ (دیکھیے: ''خواجہ کمال الدین''، عظمتِ رفتہ، ص ۱۷۵)

۱۲۶۔ دہلی یونی ورسٹی کے قیام سے پیشتر دہلی کے طالب علموں کے امتحانات پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں لیا کرتی تھی۔

۱۲۷۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۷۰۔ بشیر احمد ڈار نے اپنی تالیف ''انوارِ اقبال'' (اول مارچ ۱۹۶۷ اقبال اکادمی پاکستان کراچی، ص ۱۴۰) میں اس خط کو تعارفی خط ہی لکھا ہے جب کہ سید مظفر حسین برنی نے کلیاتِ مکاتیبِ اقبال جلد اول (چہارم ۱۹۹۳ء، اردو اکادمی، دہلی) میں بلا تحقیق اسے ''سفارشی خط'' لکھ دیا ان کے اس عمل نے اس واقعے میں شک پیدا کر دیا کہ برنی غالباً امتحان میں زیادہ نمبر کے خواہاں تھے اور اس کے لیے خواجہ صاحب سے کوئی سفارشی خط لکھوا کر لائے تھے۔ اصل واقعہ برنی نے اپنے خاکے ''ڈاکٹر اقبال'' مشمولہ عظمتِ رفتہ میں تحریر کیا ہے اسی واقعے کو بشیر احمد ڈار نے بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ حال آں کہ ایسا نہیں تھا وہ تعارفی خط محض ایک خوش گوار ملاقات کے لیے تھا۔ ملاقات کے دوران برنی کو معلوم ہوا کہ اقبال فلسفے کے ممتحن بھی ہیں چناں چہ اتفاقاً اور بلا ارادہ جسے انھوں نے طفلانہ جسارت پر محمول کیا ہے، سے کام لے کر اپنا رول نمبر انھیں پیش کیا جس پر وہ بگڑ گئے۔ رعایت کی کیوں ضرورت پڑی اس سے متعلق واقعہ بھی برنی نے عظمتِ رفتہ کے انھی صفحات پر تحریر کر دیا ہے۔ جس سے معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔

۱۲۸۔ اقبال کے اردو خطوط برنی کے نام سید مظفر حسین برنی کی مرتبہ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال جلد اول، دوم میں شائع ہو گئے ہیں اور ایک انگریزی خط بشیر احمد ڈار کی کتاب Letters of Iqbal، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور میں شائع ہوا ہے۔

۱۲۹۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۷۳۔

۱۳۰۔ اگرچہ برنی ٹرانسلیٹر آفس میں ملازم تھے تاہم خلافت ہاؤس سے بھی ان کی بڑی گہری وابستگی تھی۔ قمر القادری اپنے مضمون ''روشنی کا مینار ضیاء الدین احمد برنی'' از قمر القادری، روزنامہ جنگ، کراچی، ۹ راگست ۱۹۶۹ء میں لکھتی ہیں ''ساتھ کی عمارت میں خلافت ہاؤس تھا جہاں خادم کعبہ، مولانا شوکت علی ان کے بیٹے زاہد علی اور بیگم زہرہ بنتِ محمد علی رہتے تھے۔ اخبار خلافت بھی وہیں سے نکلتا تھا۔ رئیس احمد جعفری، مولانا عرفان، مولانا قطب الدین صدیقی بھی وہیں رہتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ شام کی چائے میرے والد صاحب اور جُندی صاحب مولانا شوکت علی کے ہاں پیتے تھے جہاں

ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر موجود ہوتا تھا اور خوب گرما گرم سیاسی بحث ہوا کرتی تھی۔ دونوں بلڈنگوں کی چھتیں بہت ہوادار اور کشادہ تھیں۔ سب لوگ اکثر رات گئے تک وہیں بیٹھتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی اہم سیاسی مسئلے کو حل کرنے "باپو جی" مہتما گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈر بھی مولانا کے پاس آجاتے اور سماں بندھ جاتا۔ ایک دو مرتبہ تو قائداعظم بھی تشریف لائے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو مسلم فساد زوروں پر تھا اور خلافت کمیٹی نے ینگ مسلم اسکاؤٹ کی تحریک قائم کی تھی یہ اسکاؤٹ امدادی سامان لے کر مخدوش مقامات پر جا کر خطرے میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو نکال لاتے تھے اور مولانا اپنے معزز دوستوں اور بمبئی کے سیٹھوں کو بلا کر ان سے چندہ لے کر انھیں مسلمان محلوں میں آباد کرتے تھے۔ برنی صاحب برٹش گورنمنٹ کے وفادار ملازم ہونے کے باوجود ان کاموں میں پیش پیش رہتے اور ہر قسم کی اخلاقی مدد کرتے۔

۱۳۱۔ عظمت رفتہ، ص ۲۷۶۔

۱۳۲۔ برنی کے نام سید عبداللہ بریلوی، مدیر بمبئی کرانیکل کے غیر مطبوعہ خطوط، محررہ ۷ دسمبر ۱۹۳۳ء اور ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء۔ یہ دو خط مثالاً پیش کیے گئے ہیں۔

۱۳۳۔ برنی نے عظمتِ رفتہ، ص ۲۷۲، پر اس کے تحریر کیے جانے کا سن 1918ء لکھا ہے جب کہ اصل کتاب پر 1915 درج ہے۔

۱۳۴۔ بشیر احمد ڈار، انوارِ اقبال، طبع اول، کراچی، اقبال اکادمی پاکستان، مارچ ۱۹۶۰ء، ص ۱۴۱

۱۳۵۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۱۴۲۔۱۴۳۔

۱۳۷۔ IQBAL by Atiyq Begum,2nd Edition,Aina-e-Adab,Lahore,1969.

۱۳۸۔ اقبال، عطیہ بیگم، مترجمہ ضیاءالدین احمد برنی، دوم، کراچی، اقبال اکیڈمی، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۱۲۲۔

۱۳۹۔ یہ مضمون عظمتِ رفتہ سے نقل کیا گیا ہے۔ جام نو، کراچی کے اقبال نمبر شمارہ ۱۔۲، ۱۹۵۱ء میں پہلی مرتبہ شایع ہوا تھا عظمتِ رفتہ میں شامل کرنے سے قبل برنی نے اس پر نظر ثانی کی تھی اور عظمتِ رفتہ میں اضافے کے ساتھ شایع کیا۔

۱۴۰۔ مضمون نہایت معلومات افزا ہے۔ یہ مضمون درحقیقت عطیہ فیضی کے انتقال پر ان کی یاد میں لکھا تھا۔ اس میں ان کی سوانح بھی آگئی ہے۔ جہاں ان کے شوہر فیضی رحمین کا تذکرہ ہے وہ اقبال اور شبلی کا تذکرہ بھی برنی نے نہایت عقیدت اور احترام سے کیا ہے۔ برنی نے جس دکھ اور درد سے یہ کہانی سنائی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

۱۴۱۔ Separatism Among Indian Muslims,Cambridge University Press,

۱۴۲۔ "مجنوں جو مر گیا ہے"، آدمی غنیمت ہے از سید انیس شاہ جیلانی، اول، صادق آباد، مبارک لائبریری، محمد آباد، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۷۔

۱۴۳۔ احسن بہ نام برنی یکم ستمبر ۱۹۳۴ء، غیر مطبوعہ۔

۱۴۴۔ احسن بہ نام برنی ۶ فروری ۱۹۳۵ء، غیر مطبوعہ۔

۱۴۵۔ احسن بہ نام برنی ۲۷ مارچ ۱۹۳۵ء، غیر مطبوعہ۔

۱۴۶۔ بدرالحسن جلالی بہ نام برنی، مراد آباد جنوری ۱۹۵۴ء۔

۱۴۷۔ ایضاً، ۲۲ جنوری ۱۹۵۴ء۔

۱۴۸۔ ایضاً، ۷ جنوری ۱۹۵۴ء۔

۱۴۹۔ ماہر القادری بہ نام برنی، س ن، نوائے ادب، ممبئی، اکتوبر ۲۰۰۶ء۔

۱۵۰۔ ایضاً۔

۱۵۱۔ ''روشنی کا مینار ضیاء الدین احمد برنی'' از قمر القادری، روزنامہ جنگ، کراچی، ۹ راگست ۱۹۶۹ء۔

۱۵۲۔ اردو اور انگریزی مضامین کے مجموعے تاحال بازیافت نہیں ہو سکے ہیں۔

۱۵۳۔ ''مجنوں جو مر گیا ہے''، آدمی غنیمت ہے از سید انیس شاہ جیلانی، اول، صادق آباد، مبارلا ئبریری، محمد آباد، جنوری ۱۹۹۴ء، ص ۱۳۷۔

۱۵۴۔

۱۵۵۔ اوصاف علی واحدی دہلوی، سید، نا قابلِ فراموش شخصیات، کراچی، ایوانِ آمنہ، نظام المشائخ، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۹۔

۱۵۶۔ عظمتِ رفتہ کا مصنف خود عظمتِ رفتہ بن گیا از بیگم ذاکرا عجاز، روزنامہ جنگ، کراچی سنڈے ایڈیشن ۱۶ جون ۱۹۶۹ء۔

۱۵۷۔ خلیق انجم، ڈاکٹر: ''فنِ ترجمہ نگاری'' قمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دلی، ۱۹۹۵ء، ص ۷۸۔

۱۵۸۔ قمر رئیس، ڈاکٹر: ترجمہ کا فن اور روایت، تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۲۶

۱۵۹۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۔

۱۶۰۔ عظمتِ رفتہ، ص ۱۱۸۔

۱۶۱۔ میری زندگی کے بارے میں، ص ۱۱۸۔

۱۶۲۔ پیش لفظ، ''تذکرہ ذکاء اللہ دہلوی''۔

۱۶۳۔ برنی، ضیاء الدین احمد: خیالاتِ مہاتمہ گاندھی، حصہ اول، اجمل پریس، پرنس بلڈنگ، بمبئی، ۱۹۳۴ء۔

۱۶۴۔ برنی، ضیاء الدین احمد: خیالاتِ مہاتمہ گاندھی، حصہ اول، اجمل پریس، پرنس بلڈنگ، بمبئی، ۱۹۳۴ء۔

۱۶۵۔ برنی، ضیاء الدین احمد: خیالاتِ مہاتمہ گاندھی، حصہ اول، اجمل پریس، پرنس بلڈنگ، بمبئی، ۱۹۳۴ء۔

۱۶۶۔ دیکھیے: حوالہ نمبر ۱۱۶۔

۱۶۷۔ ماہ نامہ ''فاران'' کراچی، دسمبر ۱۹۵۲ء۔

۱۶۸۔ حیاتِ مولانا محمد علی جوہر از ضیاء الدین احمد برنی، ص ۱۳۔

۱۶۹۔ برنی کے نام دفتر ہمدرد سے جاری ہونے والا ایک غیر مطبوعہ خط۔

۱۷۰۔ خود نوشت، ص ۵

۱۷۱۔ خود نوشت، ص ۵۔

۱۷۲۔ (الف) عظمتِ رفتہ، ص ۲۰۷، ۲۸۱۔ (ب) خود نوشت، ص ۵۔

۱۷۳۔ ۱۹۱۶ء میں مدراس سے تھیوسوفیکل ایجوکیشنل ٹرسٹ کی رپورٹ شایع ہوئی تھی۔ اسی رپورٹ میں اس اسکول سے متعلق معلومات بھی دی گئیں ہیں۔ اسکول کے اسٹاف ارکان میں برنی کا نام بھی درج ہے۔

۱۷۴۔ خود نوشت، ص ۵۔

۱۷۵۔ افسوس کہ وہ تقاریر دست یاب نہیں ہوسکیں۔

۱۷۶۔ ''زمانہ''، کانپور، فروری مارچ یادگار نمبر ۱۹۲۳ء، ص ۳۸۔

۱۷۷۔ انجمن اسلام ہائی اسکول ۱۸۹۳ء میں بمبئی کے کوکنی، میمن، بوہرہ اور دیگر مسلمانوں کے تعلیمی شعور کی یادگار کے طور پر قائم ہوا اور جس نے نہ صرف شہر بمبئی بلکہ سارے مہاراشٹر کے مسلمانوں میں اردو زبان اور تعلیم کو پھیلانے میں مدد دی۔ (نئی تحریریں از زور ص ۲۳) دیکھیے: بمبئی میں اردو'' از میمونہ دلوی۔

''انجمن اسلام سوسائٹی اور اسکول کو قائم کرنے اور انھیں اعلیٰ پیمانے پر چلانے والوں میں بدرالدین طیب جی کے ساتھ ان کے بھائی قمرالدین طیب جی کا نام نامی بھی شامل ہے۔اس طرح وہ مشہور و معروف ادارہ وجود میں آیا جس نے بمبئی کے مسلمانوں کی ایک نئی تعلیم یافتہ نسل پیدا کی۔''(''اردو کے سرپرست خاندان'' مشمولہ ''بمبئی میں اردو ۱۹۱۴ تک'' از ڈاکٹر میمونہ دلوی [مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بمبئی یونی ورسٹی] مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۰ء)

''انجمن اسلام سوسائٹی اور اسکول کو قائم کرنے اور انھیں اعلیٰ پیمانے پر چلانے والوں میں بدرالدین طیب جی کے ساتھ ان کے بھائی قمرالدین طیب جی کا نام نامی بھی شامل ہے۔اس طرح وہ مشہور و معروف ادارہ وجود میں آیا جس نے بمبئی کے مسلمانوں کی ایک نئی تعلیم یافتہ نسل پیدا کی۔''(''اردو کے سرپرست خاندان'' مشمولہ بمبئی میں اردو ۱۹۱۴ تک از ڈاکٹر میمونہ دلوی [مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بمبئی یونی ورسٹی] مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۰ء)

۱۷۸۔ اس سرٹیفکیٹ پر انگریزی میں تھیوسوفیکل ہائی اسکول کانپور، کی عبارت درج ہے۔ یہ سرٹیفکیٹ ۱۵ فروری ۱۹۱۸ء کو جاری کیا گیا۔اس کے اختتام پر کسی کے دست خط ہوں گے تاہم وہ کہنگی کے باعث مٹ گئے۔خیال یہی ہے کہ یہ انتظامیہ ہی کی جانب سے دیا گیا ہوگا۔

۱۷۹۔ انجمن اسلام کے اسسٹنٹ سکریٹری کی جانب سے برنی کو ۳۱ جنوری ۱۹۱۳ء کو ان کے پتے:90,Civil Lines,Cawnpore پر ملازمت دیے جانے کا حکم نامہ جاری کیا گیا۔اس حکم نامے کے مطابق ان کی تنخواہ ۲۵ روپے مقرر ہوئی تھی۔انکریمنٹ ۱۰ روپے مقرر ہوا تھا۔یہ حکم نامہ ضمیمے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۱۸۰۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۸۲۔اس سلسلے میں کہ برنی ٹرانسلیٹر آفس میں اردو فارسی ٹرانسلیٹر تھے برنی کے دستاویز میں ایک سرٹیفکیٹ ہے جو سر ابراہیم رحمت اللہ، جی بی ای، کے سی ایس آئی، سی آئی ای کی جانب سے یکم جون ۱۹۳۶ء کو جاری کیا گیا تھا، جس کے آخری الفاظ اس طرح ہیں: He is quite proficient in Urdu and persian and a very efficient translator.۔مرزا علی محمد خان (وائس چانسلر، بمبئی یونی ورسٹی) کا برنی کے نام سرٹیفکیٹ بھی اس کی گواہی دیتا ہے۔

۱۸۱۔ ایضاً، ص ۲۸۱۔

۱۸۲۔ ماہ نامہ ''ماہِ نو''، کراچی، اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۲۱، ۲۳۔

۱۸۳۔ خودنوشت حالات، ص ۸۔

۱۸۴۔ خودنوشت حالات، ص ۸۔

۱۸۵۔ ''روشنی کا مینار ضیاء الدین احمد برنی'' از قمر القادری، روزنامہ جنگ، کراچی، ۹ راگست ۱۹۶۹ء۔

۱۸۶۔ ایضاً۔

۱۸۷۔ ایسی کتابوں کا تذکرہ آگے آئے گا۔

۱۸۸۔ ''روشنی کا مینار ضیاء الدین احمد برنی'' از قمر القادری، روزنامہ جنگ، کراچی، ۹ راگست ۱۹۶۹ء۔قمر القادری دنیا سے جا چکی ہیں ان کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا تھا۔ بیٹے فوزی حیدرآباد سندھ میں حبیب بینک کی کسی برانچ میں ملازم ہیں۔راقم نے نہایت مشکل سے انھیں کھوج نکالا تھا انھوں نے اپنے مکان لطیف آباد نمبر ۶ پر ملاقات کے لیے بلایا بھی مگر ملے نہیں۔

۱۸۹۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۹۹۔

۱۹۰۔ ایضاً، ص ۲۳۵۔۲۳۶۔

۱۹۱۔ مولوی نذیر احمد خجندی مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کے بھتیجے تھے۔تفصیلی حالات کے دیکھیے :عظمتِ رفتہ از ضیاء الدین احمد برنی۔

۱۹۲۔ عظمتِ رفتہ، ص: ۳۱۶۔
۱۹۳۔ اس کتاب کی تفصیل کتابوں کے ذیل میں دیکھیے۔
۱۹۴۔ ایضاً۔
۱۹۵۔ ایضاً۔
۱۹۶۔ خودنوشت، ص ۸۔
۱۹۷۔ اقبال برنی کا انٹرویو۔ برنی کے کاغذات میں ایک مراسلہ Department of Advertising & Films Information & Broadcasting Division Ministry of Interior,karachi. کی جانب سے ہے۔ جس میں ''اردو ٹرانسلیٹر'' کے طور پر ۱۵۰ روپے ماہانہ کے عوض ملازمت کی آفر کی گئی ہے۔ غالباً یہ وہی مراسلہ ہے جس کی بنیاد پر برنی مذکورہ ملازمت کی۔
۱۹۸۔ ایضاً۔
۱۹۹۔ عظمتِ رفتہ، ص ۴۸۔
۲۰۰۔ ایضاً، ص ۲۴۲۔
۲۰۱۔ اس کتاب کی تفصیل کتابوں کے ذیل میں دیکھیے۔
۲۰۲۔ میمونہ عبدالستار: ''بمبئی میں اردو'' طبع ثانی رسالہ اردو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۴ء۔
۲۰۳۔ خودنوشت، ص ۷۔
۲۰۴۔ ایضاً۔
۲۰۵۔ ایضاً۔
۲۰۶۔ اس کی تفصیل اگلے صفحات میں دیکھی جائے۔
۲۰۷۔ اس کتاب سے متعلق تفصیل کتابوں کے ذیل میں دیکھی جائے۔
۲۰۸۔ ایضاً۔
۲۰۹۔ عکسی نقل ضمیمے میں دیکھی جائے۔
۲۱۰۔ یہ خطوط علاحدہ باب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔
۲۱۱۔ ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' از سید یوسف بخاری (آفس سکریٹری)، کتابی دنیا، دسمبر ۱۹۵۵ء۔
۲۱۲۔ باب: کتابی دنیا ایک جائزہ میں تفصیل دیکھیے۔
۲۱۳۔ کتابی دنیا، دسمبر ۱۹۵۵ء۔
۲۱۴۔ کتابی دنیا فروری ۱۹۶۲ء ص ۷ اور اپریل ۱۹۶۵ء، ص ۷۔
۲۱۵۔ زاہدہ خاتون بنت ظہیر الدین کی غیر مطبوعہ تحریر بنام راقم۔ محمد اقبال برنی سے راقم کا انٹرویو۔
۲۱۶۔ محمد اقبال برنی سے انٹرویو۔ زاہدہ خاتون نے ان کا کاروبار ان کا کاروبار ٹھیکے داری تحریر کیا ہے، یہ درست نہیں ٹھیکے دار ان کے بیٹے یعنی عصمت یار خاں ہوں گے۔ محمد اقبال برنی نے اپنے نانا کے وسیع کاروبار کا تذکرہ کیا ہے اور زاہدہ خاتون نے بھی ان کے بیان کی تصدیق کی ہے۔
۲۱۷۔ زاہدہ خاتون بنت ظہیر الدین کی غیر مطبوعہ تحریر بنام راقم۔
۲۱۸۔ محمد اقبال برنی سے راقم کا انٹرویو۔

۲۱۹۔ برنی کی بیگم محمودہ بیگم کے نام سید سعید رضا کے ایک خط مرقومہ جولائی ۱۹۳۲ء، دیسنہ، میں ان کی بہنوں کے نام میں ''زبیدہ بیگم'' کا اضافہ ہے اس کے علاوہ بیٹوں کے نام اس طرح ہیں: رفعت، سرفراز اور زین العباد۔ (یہ خط برنی کے نام مشاہیر کے خطوط میں شامل ہے) اس خط میں محمودہ بیگم کے گھرانے کی بہت تعریف کی گئی ہے۔

۲۲۰۔ زاہدہ خاتون بنت ظہیر الدین کی غیر مطبوعہ تحریر بنام راقم۔ برنی کے سسرال کے دہلی میں آ کر رہنے کی تصدیق محمد اقبال برنی اور میمونہ اختر بنت منشی عبدالقدیر نے بھی کی ہے۔ میمونہ اختر نے اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ برنی صاحب کی بیوی کو ان کی والدہ بہن خدیجۃ الکبریٰ نے دہلی ہی میں پسند کیا تھا۔ اس زمانے میں برنی صاحب بمبئی میں رہا کرتے تھے۔

۲۲۱۔ زاہدہ خاتون بنت ظہیر الدین کی غیر مطبوعہ تحریر بنام راقم۔

۲۲۲۔ زاہدہ خاتون کے مطابق سعیدہ بیگم کا انتقال ۱۹ فروری ۱۹۸۶ء کو ہوا اور وہ ڈیفنس کے قبرستان میں دفن ہیں۔ برنی کی دیگر سالیاں حیات ہیں اور امریکا میں مقیم ہیں۔

۲۲۳۔ ''روشنی کا مینار ضیاء الدین احمد برنی'' از قمر القادری، روزنامہ جنگ، کراچی، ۹ راگست ۱۹۶۹ء۔

۲۲۴۔ خاتون، دہلی، جون (۱۹۳۴ء غالباً)۔

۲۲۵۔ ایضاً۔

۲۲۶۔ ایضاً۔

۲۲۷۔ یہ اطلاع بھی کسی رسالے یا اخبار کی ہے تاہم دست یاب تراشے پر نام، مہینہ اور سال درج نہیں۔

۲۲۸۔ خاتون، دہلی، جون (۱۹۳۴ء غالباً)۔

۲۲۹۔ ''روشنی کا مینار ضیاء الدین احمد برنی'' از قمر القادری، روزنامہ جنگ، کراچی، ۹ راگست ۱۹۶۹ء۔

۲۳۰۔ ایضاً۔

۲۳۱۔ ایضاً۔

۲۳۲۔ ایضاً۔

۲۳۳۔ ایضاً۔

۲۳۴۔ ایضاً۔

۲۳۵۔ اس کتاب کی تفصیل کتابوں کے ذیل میں دیکھی جائے۔

۲۳۶۔ یہ معلومات ریاض برنی صاحب نے انٹرنیٹ کے ذریعے فراہم کیں۔

۲۳۷۔ یہ معلومات ان کے انٹرویو سے لی گئی ہے۔

۲۳۸۔ یہ معلومات ریاض احمد برنی صاحب نے فراہم کی ہیں۔

۲۳۹۔ یہ باتیں انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہیں، جو راقم نے ان کے گھر پر لیا تھا۔

۲۴۰۔ یہ معلومات اعجاز احمد برنی سے راقم نے انٹرویو کے ذریعے حاصل کی گئی ہیں۔

۲۴۱۔ خودنوشت ص ۹۔

# باب چہارم

## مطبوعہ کتب کا تحقیقی جائزہ

☆۔مطبوعہ کتابوں کی زمانی ترتیب
☆۔مسز اینی بیسنٹ کا پہلا لکچر (۱۹۱۵ء)
☆۔اخباری لغات معروف بہ کلیدِ اخبار بینی (۱۹۱۵ء)
☆۔مسز اینی بسنٹ اور اسلام (۱۹۱۷ء)
☆۔محمد علی، ہز لائف اینڈ سروسز) (۱۹۱۸ء)
☆۔شریف ترک (۱۹۲۰ء)
☆۔جہاں آرا بیگم بنتِ شاجہاں بادشاہ (۱۹۲۱ء)
☆۔سید جمال الدین افغانی (۱۹۲۴ء)
☆۔غدر دہلی کی صبح شام (مارچ ۱۹۲۶ء)
☆۔خیالاتِ مہاتما گاندھی، حصہ اول اور دوم (۱۹۳۴ء)
☆۔اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں یعنی ڈاکٹر مسز اینی بیسنٹ آنجہانی کا لکچر (۱۹۴۵ء)
☆۔تاریخ اسلام کی سچی کہانیاں (۱۹۵۰ء)
☆۔لطائفِ ملا نصر الدین (۱۹۵۰ء)
☆۔کیوپڈ وسائیکی (۱۹۵۰ء)
☆۔رومانس آف دی اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس (۱۹۵۰)
☆۔تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی (۱۹۵۲ء)
☆۔سی۔ایف۔اینڈریوز (۱۹۵۲ء)
☆۔اقبال از عطیہ بیگم (۱۹۵۶ء)
☆۔جدید کمیونزم کا ارتقاء (فروری ۱۹۵۸ء)
☆۔عظمتِ رفتہ (۱۹۶۱ء)
☆۔ابن خلدون اور امیر تیمور (۱۹۶۷ء)
☆۔تعلیم و تربیت (۱۹۶۹ء)
☆۔حیاتِ مولانا محمد علی جوہر (۲۰۰۱ء)
☆۔ماخذِ تاریخ ہند (۱۹۲۹ء)
☆۔جدید طبی ایجادات (۱۹۵۸)
☆۔تخیلات آلمان یعنی جرمنی اور آئندہ جنگ

# باب چہارم:

## مطبوعہ کتب کا تحقیقی جائزہ

یہ ایک واضح اور روشن حقیقت ہے کہ مضمون یا کتاب، مضمون نگار یا صاحبِ کتاب کے شوق، دل چسپی اور اس موضوع سے اس کی گہری واقفیت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اولاً مضمون یا کتاب کا وجود میں آنا ممکن ہی نہیں ثانیاً وہ بے لطف اور بے مغز چیز ہوگی۔ کسی تحریر کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا تعلق بھی مذکورہ باتوں ہی سے ہے۔

برنی کی کتابوں میں بھی یہی بنیادی اور ضروری حقیقت یا روح موجود ہے۔ بالاستعاب اور عمیق مطالعے سے چند اور باتیں بھی سامنے آتی ہیں جنھیں اُس بنیادی حقیقت سے پیوستہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ کتاب کی تخلیق کو وقت کی اہم ضرورت سمجھنا۔

۲۔ موضوع سے متعلق بھرپور معلومات کا ہونا۔

۳۔ حقائق کی تلاش اور ان کو محفوظ کرنے کو فرضِ عین جاننا۔

۴۔ علم کو دوسروں تک پہچانا۔

۵۔ وقت کے تقاضوں کو محسوس کرنا اور ان سے آگاہ اور باخبر رہنا اور رکھنا۔

۶۔ موضوع سے گہری محبت اور وابستگی ہونا۔

۷۔ موضوع اگر شخصیت ہو تو اس کی خدمات کا اعتراف اور پذیرائی اور عیوب کے بہ جائے محاسن کو اجاگر

کرنا۔

۸۔ اسلام اور اہلِ اسلام کا دفاع۔

۹۔ متنوع موضوعات پر گرفت اور عبور کا اظہار۔

۱۰۔ تاریخ اور تاریخِ اسلام سے غیر معمولی دل چسپی۔

۱۱۔ اپنے مشاہدات اور تجربات کو آنے والی نسلوں کو منتقل کرنا۔

۱۲۔ نام ونمود اور وقتی شہرت کے بہ جائے خدمت الناس کو لازم جاننا۔

برنی کی کتابوں کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ اُن کی بعض کتابیں مطبوعہ ہیں اور بعض وہ ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ان دونوں طرح کی کتابوں میں سے بعض دست یاب ہیں اور بعض دست یاب نہیں ہیں۔بعض کتابیں طبع زاد ہیں اور بعض ترجمہ ہیں۔تفصیل علاحدہ علاحدہ دی جائے گی۔اس باب میں صرف مطبوعہ کتب کا جائزہ لیا جائے گا جب کہ غیر مطبوعہ کتب کا جائزہ علاحدہ باب میں لیا جائے گا۔

برنی کی دست یاب مطبوعہ اردو اور انگریزی کتب کے تفصیلی مطالعے سے قبل ان کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا جاتا ہے۔طبع زاد اور ترجمہ شدہ کتب کو علاحدہ علاحدہ رکھا گیا ہے۔

## مطبوعہ کتابوں کی زمانی ترتیب:

## طبع زاد:

۱۔اخباری لغات معروف بہ کلیدِ اخبار بینی:(۱۹۱۵ء)

۲۔جہاں آرا بیگم،بنتِ شاہجہاں بادشاہ:(۱۹۲۱ء)

۳۔سید جمال الدین افغانی:(۱۹۲۴ء)

۴۔جنگ جمل:(۱۹۳۵ء)

۵۔تاریخِ اسلام کی سچی کہانیاں:(۱۹۵۰ء)

۶۔عظمتِ رفتہ:(۱۹۶۱ء)

۷۔تعلیم وتربیت:(۱۹۶۹ء)

۸۔حیاتِ مولانا محمد علی جوہر:(۲۰۰۱ء)

## ترجمہ:

۱۔بلھے شاہ،جس میں پنجاب کے مشہور ومعروف صوفی،درویش اور شاعر کے سوانح اور تعلقات مرید وشیخ سے بحث کی گئی ہے:(۱۹۱۱ء)

۲۔مسز اینی بیسنٹ کا پہلا لکچر:(۱۹۱۵ء)

۳۔مسز اینی بسنٹ اور اسلام:(۱۹۱۷ء)

۴۔شریف ترک:(۱۹۲۰ء)

۵۔غدر کی صبح شام:(مارچ ۱۹۲۶ء)

۶۔ماخذِ تاریخ ہند:(۱۹۲۹ء)

۷۔خیالات مہاتما گاندھی، حصہ اول اور دوم:(۱۹۳۴ء)

۸۔اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں یعنی ڈاکٹر مسز اینی بیسنٹ آنجہانی کا لکچر:(۱۹۴۵ء)

۹۔لطائفِ ملا نصر الدین:(۱۹۵۰ء)

۱۰۔کیوپڈ وسائیکی:(۱۹۵۰ء)

۱۱۔تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی:(۱۹۵۲ء)

۱۲۔سی۔ایف۔اینڈ ریوز:(۱۹۵۲ء)

۱۳۔اقبال از عطیہ بیگم:(۱۹۵۶ء)

۱۴۔جدید کمیونزم کا ارتقاء:(فروری ۱۹۵۸ء)

۱۵۔ابن خلدون اور امیر تیمور:(۱۹۶۷ء)

۱۶۔تخیلات آلمان یعنی جرمنی اور آئندہ جنگ

۱۷۔جدید طبی ایجادات:(۱۹۵۸)

جیسا کہ گزشتہ اوراق میں ثابت کیا جاچکا ہے کہ برنی نے طالب علمی کے زمانے ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔اسی مناسبت سے ان کے مضامین، تبصروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ان کی کتابوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔جس کی فہرست اوپر تحریر ہو چکی ہے۔ان کے تحریر کردہ خطوط بعد بھی ان گنت ہیں۔

اب زمانی اعتبار سے اوّلاً طبع زاد ثانیاً ترجمہ شدہ کتب کی تفصیل بیان کی جاتی ہے اور ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

### ا۔"اخباری لغات معروف بہ کلیدِ اخبار بینی"(۱۹۱۵ء):

یہ کتاب ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔رجب المرجب ۱۳۳۳ھ بہ مطابق ۱۹۱۵ء میں پہلی بار دلی پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپ کر شایع ہوئی۔تعداد اشاعت ۱۰۰۰ تھی۔اس کا نام خواجہ حسن نظامی نے تجویز کیا تھا۔یہ طبع زاد ہے۔

موضوع کے اعتبار سے اس سے قبل اس نوع کی کوئی مثال نہیں ملتی۔اس کا تعلق صحافت اور اردو زبان وادب دونوں سے ہے۔جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ برنی کا تعلق ایسے عہد سے تھا جس میں، ادب، صحافت، سیاست اور کسی حد تک مذہب کے تانے بانے ملے ہوئے تھے۔صحافت اور ادب کا جدا کرنا تو بہت ہی مشکل تھا۔محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی

جوہر،شوکت علی، مولانا عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی، ملاواحدی، میر بشارت علی جالب دہلوی، مولانا ظفر علی خاں اور حسرت موہانی وہ نمایاں اور ممتاز نام ہیں جو ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ صحافی تھے اور ان کی خدمات کو جدا جدا کر کے دیکھنا آسان نہیں۔ برنی کا تعلق بھی اسی قبیل سے رہا ہے۔ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔

کتاب کا انتساب شاعر مشرق علامہ اقبال کے نام ہے۔ انتساب دینے سے قبل برنی نے اقبال کو خط لکھ کر اجازت لی تھی اول تو اقبال نے انکار کر دیا پھر برنی کے اصرار پر اور کتاب کی افادیت کی غرض سے انھوں نے اجازت دے۔

اجازت کے سلسلے میں لکھے گئے پہلے خط کا جواب اقبال نے ۲۰ اپریل ۱۹۱۵ء کو اس طرح دیا:

مکرمی بندہ　تسلیم۔

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ میں اس عزت کا نہایت مشکور ہوں جو آپ مجھے دینا چاہتے ہیں۔مگر افسوس ہے کہ میں اسے قبول کرنے سے قاصر ہوں اور اس وجہ سے کہ مجھے اس قسم کے نام نمود سے قطعی اجتناب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معاف فرماویں گے۔

آپ کا خادم　محمد اقبال　لاہور

۱۷ اپریل ۱۹۱۵ء (۱)

برنی کے اصرار پر اقبال برنی کو جواب میں لکھا:

مکرم بندہ　السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔ اگر کتاب کو میرے نام معنون کرنے سے اس کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ ہوسکتا جو آپ کی مالی منفعت یا کسی اور فائدہ کا باعث ہوتا تو ضرور اجازت دیدیتا مگر جہاں تک میں سوچتا ہوں اس کا یہ اثر نہیں ہوسکتا کیوں کہ مجھے اخباری دنیا یا اخبار نویسی سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر چوں کہ آپ مصر ہیں اس واسطے میں اپنا پہلا خط واپس کرتا ہوں اور یہ عرض کرتا ہوں کہ میں کتاب دیکھ کر اس امر کا فیصلہ کروں گا لیکن آپ مجھ سے یہ عہد کریں کہ اگر کتاب دیکھ کر میں نے اجازت نہ دی تو آپ اس سے ناراض نہ ہوں گے۔

آپ کا خادم محمد اقبال (۲)

اقبال کے مطالبے پر برنی نے یقیناً اپنی مذکورہ کتاب انھیں ارسال کی ہوگی جسے اقبال ایک خط مرقومہ ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء کے ذریعے پسند کیا۔ان کے الفاظ یہ تھے:

مکرم بندہ

آپ کی کتاب مفید ثابت ہوگی۔اردو خوانوں کے لیے بالخصوص اس قسم کی کتاب کی ضرورت تھی اگر آپ اس کتاب کے ڈیڈیکیشن سے مجھے معزز کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کی

راہ میں حائل ہونا نہیں چاہتا شوق سے ڈیڈیکٹ کیجیے۔

آپ کا خادم محمد اقبال لاہور

۲۲ مئی ۱۹۱۵ء (۳)

اندرونی سرورق پر کتاب کے نام کے زیریں حصے میں کتاب سے متعلق یہ معلومات فراہم کی ہیں:

جس میں وہ تمام الفاظ حروفِ تہجی کی ترتیب سے جمع کر دیے گئے ہیں جن کا استعمال اردو اخباروں میں ہوتا ہے اور آسان سلیس اور صاف اردو زبان میں ان کی شرح کی گئی ہے اور آخر میں دو ضمیموں کے ذریعہ ہندوستان کے طرز حکومت اور انگلستان کے طریقہ حکومت کو بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کے دیباچے میں برنی نے اس کی ضرورت اور اہمیت اس طرح واضح کی ہے:

عام اخبار بیں اصحاب میں ایسے اشخاص بہت کم ہیں جو اخبارات کے مطالب اور تلمیحات کو بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں ایسے ہی لوگوں کو فائدہ پہنچانے اور امداد دینے کے ارادہ سے یہ مختصر سی کتاب لکھی گئی ہے جو اگر چہ کسی طرح بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی مگر پھر بھی بہت ایسی ضروری باتوں پر مشتمل ہے جن کا مذکور آج کل اخبارات میں ہو رہا ہے۔

اس کتاب میں محض تلمیحات ہی نہیں بلکہ الفاظ اور اصطلاحات بھی ہیں اور انھیں تہجی وار دیا گیا ہے۔

اس کام کا آغاز انھوں نے اُس زمانے سے شروع کر دیا تھا جب ان کا تعلق اخبار ہمدرد سے ہوا تھا۔ یہ زمانہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔

یہ اس کتاب کی خوبی ہے کہ برنی نے اس میں برنی نے جن کتابوں سے مدد لی ہے ان کے نام شروع ہی میں دے دیے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ برنی تفصیل کے بعد بھی حوالہ درج کر دیتے۔ بہر حال یہ امر ان کے تحقیقی طرز کی نشان دہی کرتا تھا۔ حوالے کے ساتھ کسی بات کا اندراج تحقیقی عمل ہے۔ برنی کا اپنا مطالعہ بہت زیادہ تھا چناں چہ وہ اپنے ذاتی علم کو بھی بروے کار لائے ہیں۔

چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

**بریگیڈ (Brigade)**: ایک بریگیڈ میں چار پٹالین ہوتی ہیں، جن کی مجموعی تعداد چار ہزار آدمیوں کی ہوتی ہے۔ رسالہ کا بریگیڈ تین رجمنٹوں کے مساوی ہوتا ہے اور اس کی مجموعی طاقت ۱۶۰۰ آدمیوں کی ہوتی ہے۔ میدانی توپ خانہ کے بریگیڈ میں تین باتریاں اور ۷۸۰ آدمی ہوتے ہیں۔ رسالہ کے خانہ کا ایک بریگیڈ دو باتریوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی کل قوت ۶۷۰ سپاہیوں کی ہوتی ہے۔

**بلیک بک (Black Book)**: وہ سرکاری کتاب جس میں سزا پانے والے اشخاص کے نام درج ہوتے ہیں۔ یہ کتاب کالے سرورق میں بندھی ہوتی ہے۔

**خلیفۃ المسلمین (Caliph)**: اس خود مختار و آزاد مسلمان بادشاہ سے مراد ہے جو تختِ خلافت پر متمکن ہو اور جو حرمین شریفین کا خادم اور ان کا محافظ بھی ہو۔ سب سے پہلے خلیفہ سیدنا ابوبکر الصدیق تھے اور آج کل خلیفہ حضرت سلطان المعظم محمد شاد آفندی ہیں۔

کتاب کے آخر میں دو مضامین ضمیمے طور پر دیے گئے ہیں۔ وہ دراصل مضمون نہیں ہیں بلکہ موضوع سے متعلق اصطلاحات اور ان کی وضاحتوں پر مبنی ہیں۔ مکمل صورت میں ایک مضمون ہی کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

اس کتاب کا تعلق اسی عہد سے جس میں ادب اور صحافت نے ایک ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ برنی نے اپنے عہد کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اقبال کی پذیرائی اس امر کی دلیل ہے۔

## ۳۔ ''جہاں آرا بیگم، بنتِ شاہجہاں بادشاہ'' (۱۹۲۱ء):

یہ کتاب مغل بادشاہ شاہ جہاں (یکم اپریل ۱۶۱۴ء۔ ۶/ اپریل ۱۶۸۱ء) کی بیٹی جہاں آرا کا تذکرہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں، ایک ہزار کی تعداد میں عبدالقدیر والاخوان تاجران کتب، دہلی کی جانب سے شائع ہوا۔ (۴) دوسری مرتبہ ۱۹۵۵ء میں تعلیمی مرکز، ۱۰۵۔ گدومل لیکھراج روڈ، پاکستان، کراچی سے دو ہزار کی تعداد میں شائع ہوا۔ دوسرے ایڈیشن میں صفحات کی تعداد ۱۶۰ ہے۔

برنی کے اس تذکرے سے قبل مولوی محبوب الرحمٰن کلیم بی اے جہاں آرا کی سوانح عمری لکھ چکے تھے، تاہم اس میں زیادہ تر یورپین اہل قلم کی تنقید ہے۔ جب کہ برنی کے تذکرے میں علمی پہلو نمایاں ہے۔ (۵)

یہ کتاب برنی کی ان مقبول کتابوں میں سے ہے جس سے آج ان کا نام زندہ ہے اور اس وقت تک رہے گا جب تک ان کے پڑھنے والے اور ان کی قدر کرنے والے رہیں گے۔ اگرچہ اس کی نوعیت تذکرے کی ہے تاہم برنی نے عمیق مطالعے اور اعلا صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نہایت تحقیق کے ساتھ تحریر کیا ہے۔

برنی نے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ انھیں یہ کتاب لکھنے خیال کس طرح آیا:

> سب سے زیادہ مجھے اپنے محترم استاد مولوی غلام یزدانی صاحب، ایم۔ اے سابق ڈائرکٹر محکمہء آثار قدیمہ، حیدرآباد (دکن) کے فاضلانہ مضمون متعلق بہ جہاں آرا کا احسان مند ہونا چاہیے جسے دیکھ کر مجھے اس سے اپنے رسالہ (۶) کی تدوین اور تیاری میں بہت قیمتی امداد ملی۔

برنی کی تاریخ اور تاریخی شخصیات سے دل چسپی اُس زمانے کے اثر سے اور کچھ ان کے اجداد کے علمی ذوق کے باعث ان کی فطرت کا حصہ بن چکی تھی۔ (۷) جس کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں بھی ہو چکا ہے۔ برنی نے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں اس کتاب کی غرض وغائت اس طرح بیان کی ہے:

> اتنا لکھنا بے جا نہ ہوگا کہ جو مرقع ان اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے وہ شرافت نفس، خدمت الناس اور ذاتی ایثار و قربانی کے اعتبار سے تاریخ ہند میں عجیب وغریب ہے۔ یہی خوب

صورت خصائل ہم اپنے ملک کے طبقۂ نسواں کے ہر فرد میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ خدا کرے
کہ ان سطور کا مطالعہ مردوں سے زیادہ عورتوں کے لیے مفید ہو۔
کوشش کی گئی ہے کہ اسے ہر رطب و یابس سے پاک رکھا جائے۔ مختصر تذکروں میں یہی
عیب دیکھنے میں آیا ہے کہ عوام کے مذاق کا لحاظ رکھ کر سوقیانہ باتوں کی بھرتی کر دی جاتی
ہے۔ میں نے حتی الامکان اپنے تئیں اس عیب سے بچائے رکھا ہے اور صرف وہی امور
درج کیے ہیں جو تاریخ کی کسوٹی پر صحیح اتر سکتے ہیں۔ درحقیقت تمام تذکرہ پوری تحقیق اور
چھان بین کے بعد لکھا گیا ہے۔

دوسرے ایڈیشن میں برنی نے نئی ترتیب سے جلا پانے والے ایڈیشن کی ضرورت اور غایت بیان کر دی ہے جس سے مذکورہ کتاب کی اہمیت اور افادیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے:

یہ رسالہ (۸) ۳۴ سال قبل شایع کیا گیا تھا۔ (۹) اب اسے بہت سی ضروری ترمیموں اور
قیمتی اضافوں کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ (۱۰)

میرے پیشِ نظر ''جہاں آرا بیگم بنتِ شاہ جہاں بادشاہ'' کا دوسرا ایڈیشن ہے جس میں برنی نے جہاں آرا کے سوانح، اس سے متعلقہ لوازمے اور اپنی معروضات کو درجِ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے:

۱۔ دیباچہ (دوسرے ایڈیشن کا)
۲۔ دیباچہ (پہلے ایڈیشن کا)
۳۔ تمہید
۴۔ پیدائش
۵۔ تعلیم و تربیت
۶۔ شاہ جہاں کی تخت نشینی
۷۔ ممتاز محل کی وفات
۸۔ دارا شکوہ کا عقد
۹۔ جہاں آرا کی عزت افزائی
۱۰۔ شہزادی کے جلنے کا واقعہ
۱۱۔ جہاں آرا کی سیاست
۱۲۔ تخت نشینی کے جھگڑے
۱۳۔ جہاں آرا کا خط اورنگ زیب کے نام

۱۴۔اورنگ زیب کا خط شاہ جہاں کے نام

۱۵۔دارا کی شکست

۱۶۔جہاں آرا کی مصالحانہ کوششیں

۱۷۔جہاں آرا کا ایثار

۱۸۔اورنگ زیب کی تعزیتی خط

۱۹۔جہاں آرا کا جواب

۲۰۔جہاں آرا عہد عالم گیری میں

۲۱۔جہاں آرا کی وفات

۲۲۔جہاں آرا کا مقبرہ

۲۳۔جہاں آرا کی سیرت

۲۴۔جہاں آرا کی شاعری

۲۵۔فلاح عامہ کے کام تعمیر جامع مسجد، سرائیں، پارچہ بافی کا کارخانہ، باغات، بیگمی دالان۔

۲۶۔شہزادی کے رہنے کا مکان آگرہ میں

۲۷۔جہاں آرا کی مہر

۲۸۔تصانیف

۲۹۔خاتمہ ءکتاب

۳۰۔مونس الارواح کے اقتباسات

۳۱۔خطوط جہاں آرا بیگم بنام بدہ پرکاش

۳۲۔ہندوستان اینٹی کنی۔از سرجادو ناتھ سرکار

۳۳۔جہاں آرا کی ''خودنوشت سوانح عمری'' تصاویر

۱۔جہاں آرا کا مزار (دہلی)

۲۔مقبرہ حضرت نظام الدین اولیاو مزار جہاں آرا بیگم کا باہمی قرب

۳۔مونس الارواح کے قلمی نسخے کے پہلے صفحے کا عکس

مندرجہ بالا عنوانات اس امر کی غماضی کرتے ہیں کہ برنی نے کس ہنر و کمال سے جہاں آرا کے سوانح، باپ اور بھائیوں سے اس کے تعلقات، عوام میں اس کی مقبولیت، اس کا عقائد، اسلام سے اس کی محبت، اس کا تصوف، اس کی انتظامی

صلاحیتوں، خدمات اور اس سے متعلق چیزوں کو اس مختصر کتاب میں سمیٹ لیا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ برنی جا بہ جا حواشی کے ذریعے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے۔ برنی نے حواشی ہی کے ذریعے ان مغربی اہل قلم کے بیانات کی تردید بھی کی جن سے قصداً موصوفہ کی کردار کشی کی کوشش کی گئی ہے۔

## کتاب کے پہلے ایڈیشن پر معروف اہل قلم کی آرا:

یہ آرا جہاں آرا بیگم کے دوسرے ایڈیشن کے اختتام پر دی گئی ہیں۔ وہیں سے نقل کی جاتی ہیں۔

### شاعر مشرق علامہ محمد اقبال

۔۔۔ آپ نے جہاں آرا بیگم کے سوانح عمری بہت اچھی لکھی ہے۔ اس کی زندگی واقعی ایک نیک مسلم عورت کا نمونہ ہے۔ (۱۱)

### مولانا عبدالماجد دریابادی (مدیر: صدق)

آپ کی جہاں آرا خاصی دل چسپ ہے، لیکن امور ذیل طبع ثانی میں آپ کی توجہ کے محتاج رہیں گے: جہاں آرا بڑے پایہ کی صوفیہ تھی۔ یہ حیثیت آپ کی کتاب میں غائب ہے۔ مونس الارواح کا تفصیلی ذکر ہونا چاہیے تھا، نیز خواجگان چشت سے اس کی گہری عقیدت کا

### سید عبداللہ بریلوی (مدیر: بمبئی کرانیکل)

اس میں ہمیں بعض ایسے واقعات سے روشناس کرایا گیا جن سے جہاں آرا بیگم کی ان کوششوں کا حال معلوم ہوتا ہے جو اس نے بہن ہونے کی حیثیت سے اس نے شایستہ جنگ کو روکنے کے لیے کیں جو حصول تخت کے لیے بھائیوں میں برپا تھی۔ کتاب کی تہ میں جو کوشش کارفرما ہے وہ بہت اعلیٰ ہے۔

### ماہ نامہ ''ہمایوں''، لاہور

کتاب مستند، پر از معلومات اور سنجیدہ ہے۔ امید ہے کہ اہل ملک اس کی قدر کریں گے۔

### ماہ نامہ زمانہ، کانپور

یہ کتاب آنکھوں سے لگانے کے قابل ہے جس میں خاندانِ مغلیہ کی ایک وفا پرست اور نام ور شہزادی کے بہترین کارنامے موجود ہیں۔

### ماہنامہ ''اردو''، اورنگ آباد

ضیاء الدین احمد برنی بی اے نے نہایت تحقیق و جستجو کے ساتھ تالیف کی ہے۔ ممتاز محل کے بعد اس کی نیک سیرت بیٹی جہاں آرا کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

### ماہ نامہ ''نگار''، لکھنؤ

اس کتاب میں دولت مغلیہ کے مشہور تاج دار شاہ جہاں کی محبوب بیٹی جہاں آرا بیگم کے حالات مولفانہ کاوش کے ساتھ یک جا کیے گئے ہیں۔ اردو لٹریچر ممنون ہے کہ برنی صاحب نے اس تالیف سے مواد تاریخی میں قابل قدر اضافہ کیا۔

### ماہنامہ ''انقلاب''، بمبئی

اندازِ تحریر پسندیدہ عبارت شگفتہ اور مستند معلومات سے پر ہے۔

مندرجہ بالا آرا کے بعد جلال الدین قادری، ایجوکیشنل انسپکٹر، بمبئی ڈویژن کا ایک خط نقل کیا ہے، جس پتا چلتا ہے کہ مذکورہ کتاب کو بمبئی کے اردو مدارس کی لائبریریوں کے لیے اور انعامی کتاب کے طور پر منظور کرلیا گیا۔

**کتاب (پہلا ایڈیشن) پر تبصرہ:**

### ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جلد۹ شمارہ۳، مارچ ۱۹۲۳ء

تیموری خاندان میں جہاں آرا بیگم خوش قسمت ہے کہ اردو میں اس کی دو مستند اور سنجیدہ سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں۔ ضیاء الدین احمد صاحب برنی بی اے نے اس کی دوسری سوانح عمری لکھی ہے۔ اس میں علمی پہلو زیادہ نمایاں ہے، فارسی کی اصل تاریخوں کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں، جہاں آرا کی تصنیف مونس الارواح کی ایک مطلا صفحہ اور بیگم کی مہر کے فوٹو بھی اسمیں دیے گئے ہیں۔ آخر میں بیگم کے فرامین اور بعض نادر سیاسی مراسلات بھی درج کیے گئے ہیں۔ کتاب مستند، پر از معلومات اور سنجیدہ ہے۔

**کتاب (دوسرے ایڈیشن) پر تبصرہ:**

### ماہنامہ ''قومی زبان''، کراچی، یکم فروری ۱۹۵۶ء

جناب ملک کے مشاہیر اہلِ قلم سے ہیں انگریزی اور اردو رسائل و اخبارات میں آپ کے مؤقر مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے سوا جناب موصوف صاحب تصانیف کثیرہ بھی ہیں۔ جہاں آرا بیگم کی یہ سوانح عمری پہلے بھی شایع ہو چکی ہے جس نے قبولیت حاصل کی تھی اب بہت کچھ تاریخی معلومات کے اضافہ کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ شہزادیِ مغفورہ کی زندگی کے پر پہلو معاشرتی علمی، سیاسی پر مؤرخانہ انداز میں برنی صاحب نے ادبی طرز میں روشنی ڈالی ہے۔

اس سوانح عمری سے عصمت مآب خاتون کی سیرت اور کردار کا صحیح مرقع سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کا مطالعہ کر کے لطف اندوز ہوں گے۔ کتاب کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ برنی نے کتاب تصنیف کرنے سے پہلے ماقبل کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ اس میں اردو، فارسی اور انگریزی زبان کی تخصیص نہیں۔

جہاں آرا بیگم، اس کی شخصیت، اس کے کردار اور اس کی دیگر صلاحیتوں کے باعث برُاس سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے اپنے ہاں پیدا ہونے والی پہلی بیٹی کا نام جہاں آرا رکھا اگر چہ وہ زندہ نہ رہ سکی۔ برنی کے ہاں دوسری بیوی سے جب بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام بھی جہاں آرا رکھا۔ (۱۲)

**۴۔ ''سید جمال الدین افغانی'' (۱۹۲۴ء):**

یہ کتاب بھی برنی کی ان کتابوں میں سے ایک ہے، جس کی مقبولیت نے برنی کی خدمات کو زندہ رکھا ہوا ہے اور

جس میں برنی کی تاریخِ اسلام سے سچی اور بے لوث محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر چہ انھوں نے یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں لکھ لی تھی تاہم جامعہ ملیہ، دہلی سے اس کی طباعت واشاعت پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ دوسری مرتبہ جدید اضافوں کے ساتھ ۱۹۵۴ء میں نیوٹائڈ پرنٹنگ پریس مکلوڈ روڈ، کراچی سے طبع ہوکر تعلیمی مرکز، کراچی سے ۹۸۰ کی تعداد میں شایع ہوئی۔ دوسری اشاعت میں صفحات کی تعداد ۲۰۲ ہے۔

یہ کتاب طبع زاد ہے۔ اس کا انتساب برنی نے صدر جمہوریہ مصر جنرل محمد نجیب کے نام کیا ہے۔ انتساب سے قبل جنرل محمد نجیب کی تصویر دی گئی ہے۔

انتساب کی عبارت ہے:

## انتساب

میں ادب واحترام کے جذبات کے ساتھ اپنی اس کتاب کو صدر جمہوریہ مصر

**ہز ایکسیلنسی جنرل محمد نجیب**

کی ذات گرامی سے نسبت دے رہا ہوں جن میں پورے طور پر سید جمال الدین افغانی کی تعلیمات کی روح کارفرما ہے۔ میرے لیے

یہ امر باعث فخر ومباہات ہے کہ جنرل موصوف نے میری درخواست انتساب کو شرف قبولیت بخشا

ضیاء الدین احمد برنی

پہلے ایڈیشن پر برنی کا نام شایع نہیں ہوا تھا۔ ''عرض'' کے عنوان سے خواجہ عبدالحی، پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ، کی تحریر شاملِ کتاب ہے، غالباً یہ تحریر پہلے ایڈیشن سے لی گئی ہے، جس میں انھوں نے سید جمال الدین افغانی جیسے مجاہد اسلام کی قدر ومنزلت بیان کی ہے وہاں برنی کی اس خدمت کی قدر وقیمت بھی واضح کی ہے۔ اسی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے پہلی اشاعت پر برنی کا نام درج نہیں تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ہمارے ایک دوست نے دنیائے اسلام کے بہترین فرزند، دورحاضر میں عالم گیر اتحاد اسلامی کے اولین داعی اور مشرق کے عظیم ترین مصلح سید جمال الدین افغانی کے حالات ترتیب دیے ہیں۔
>
> اس وقت تک اس فقید الشرق کے حالات میں کئی رسائل شایع ہو چکے ہیں، مگر ہماری رائے یہ ہے کہ یہ کتاب سب پر فوقیت رکھتی ہے، اور اس میں بہت سے ایسے مسائل نظر آئیں گے جو دوسری کتابوں میں نہیں ہیں۔ مصنف علام اپنا نام شایع کرنا نہیں چاہتے اور انہیں یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پس پردہ ملک وملت کی خدمت انجام دیں۔ اس لیے میں اس کتاب کو اپنی زیرادارت شائع کرتا ہوں۔ عبدالحی (۱۳)

سید جمال الدین افغانی کی سیرت وکردار، نظریات، خدمات اور اپنی معروضات کو برنی نے درج ذیل عنوانات

میں منقسم کیا ہے:

۱۔ تمہید دوسرے ایڈیشن کی
۲۔ عرض (از خواجہ عبدالحی)
۳۔ تمہید پہلے ایڈیشن کی
۴۔ پیش لفظ (از عبدالرحمٰن صدیقی، مرحوم)
۵۔ سید جمال الدین افغانی۔ نسب
۶۔ خاندانی حالات
۷۔ ابتدائی واقعات
۸۔ حکومت ہند کا استبداد
۹۔ کفر کا تقویٰ
۱۰۔ شورش مصر اور سید
۱۱۔ اخراج کا سبب
۱۲۔ قیام ہندوستان
۱۳۔ سید اور بلنٹ
۱۴۔ معرکہء سید ورینان
۱۵۔ اتحاد اسلام اور انگلستان
۱۶۔ بعض مخصوص حالات
۱۷۔ ایران میں نفاذ اصلاحات کی کوشش
۱۸۔ قرآن مجید چھاپنے کی اجازت
۱۹۔ سید کا اخراج ایران سے
۲۰۔ ایران کی اقتصادی غلامی
۲۱۔ اجرائے ''ضیاء الخافقین''
۲۲۔ قیام قسطنطنیہ
۲۳۔ سید کا انتقال
۲۴۔ عام اخلاق اور کارنامے
۲۵۔ سید کی تعلیمات

۲۶۔سید اہل یورپ کی نظر میں

۲۷۔حلیہ و عادات

۲۸۔اعتذار

ضمیمہ درج ذیل عنوانات پر مبنی ہے:

ا۔ناصر الدین شاہ کے قاتلین کے حالات

ب۔خط و کتابت

ج۔''العروۃ الوثقیٰ'' کے اقتباسات

د۔سید و رینان کے مباحثہ کی مزید تفصیلات

ہ۔سیلاب حوادث

و۔روح جمال الدین سے گفتگو

آخر میں جن تصاویر سے کتاب ہذا کو مزین کیا گیا ہے ان کے نام دیے گئے ہیں۔

برنی نے اس کتاب میں مجاہد اسلام سید جمال الدین افغانی کی سیرت کو نہایت جامع طریق سے پیش کیا ہے۔ان کی بے باکی ،صداقت شعاری، مقاصد کے حصول کے لیے ان کی جستجو اور جدو جہد اور کردار کی پاکیزگی کی ایسی مثالیں ایسے شان دار طریق سے پیش کی ہیں کہ رہتی دنیا تک مسلمان نہ صرف ان پر فخر اور رشک کریں گے بلکہ اپنے عمل کا حصہ بنانے کی آرزو اور کوشش کریں گے۔

دائرہ معارفِ اسلامیہ ان کے بارے میں لکھتا ہے:

> جمال الدین افغانی: السید محمد بن صفدر، تیرھیوی صدی ہجری/ انیسویں صدی عیسوی کے عالم اسلام کی ممتاز ترین شخصیتوں میں سے ہیں۔وہ مفکر و حکیم بھی تھے اور عالم و رہنما بھی ۔ان کی بصیرت کا فیصلہ یہ تھا کہ مسلم اقوام کی نشاۃ ثانیہ کا راز ان دو باتوں میں مضمر ہے: اولاً اغیار کی غلامی سے نجات اور ثانیاً اتحادِ عالم اسلامی۔چناں چہ اس کے حصول کے لیے انھوں نے اپنی تمام زندگی اور صلاحیتوں کو وقت کر دیا۔بے مثل دماغی اوصاف اور اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت اور الفاظ میں اس قدر اثر و نفوذ تھا کہ وہ جس ملک میں جاتے وہاں کثرت سے لوگ ان کی تحریک اتحاد عالم اسلامی کے حامی مددگار بن جاتے۔(۱۴)

برنی نے جمال الدین افغانی سے اپنی دل چسپی اور اس کتاب کی اشاعتِ غرج و غایت کا اظہار دوسرے ایڈیشن کی تمہید میں اس طرح کیا ہے:

مجھے سید جمال الدین افغانی سے ہمیشہ دل چسپی رہی۔ جو علاج انھوں نے ملت اسلامیہ کے انتشار کو دور کرنے کے لیے سوچا تھا اس سے بہتر علاج ممکن نہیں تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ سید کی تعلیمات آج بارور ہو رہی ہیں۔ سب اسلامی سلطنتیں جن میں ٹرکی بھی شامل ہے، اتحاد اسلامی کی دل سے حامی ہیں اور چاہتی ہیں کہ وقت کی ضرورت ایک دوسرے کی ہر ممکن مدد کریں۔ (۱۵)

سید جمال الدین افغانی کی باقاعدہ سوانح شروع کرنے سے پیشتر برنی نے اپنے دوست عبدالرحمٰن صدیقی کے ایک انگریزی مضمون کو اردو ترجمہ کرکے، پیش لفظ کے طور پر شاملِ کتاب کیا ہے جو قبلاً ''جمال الدین الحسینی الافغانی'' کے عنوان سے ان کے اخبار ''مارننگ نیوز'' کے عید نمبر میں شائع ہو چکا تھا۔

برنی نے سوانحی اصولوں کے مطابق سید جمال الدین افغانی کے حالات اور اس کی فکر اور خدمات کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب کسی لحاظ بھی نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں۔ اسے تاریخ اسلام اور فن سوانح نگاری اور تاریخ سوانح نگاری میں بھی مناسب مقام ملنا چاہیے۔

برنی اس کتاب پہلے ایڈیشن اور دوسرے ایڈیشن کے تصنیف کرنے سے قبل جن کتابوں اور مضامین کا مطالعہ کیا تھا ان کا اظہار کر دیا ہے اور جن جن حضرات سے کسی طرح کی بھی مدد حاصل ہوئی حسب روایت ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ بعض معاملات میں برنی نے جو تحقیق کی اس کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ ان کے مبسوط اور جامع حوالوں نے اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔

## ۵۔ ''جنگ جمل'' (۱۹۳۵ء):

برنی کی یہ مختصر کتاب اُس زمانے سے تعلق رکھتی ہے جس زمانے میں وہ بمبئی سکریٹریٹ کے دفتر ٹرانسلیٹر آفس میں سینیر ٹرانسلیٹر آفیسر کے طور پر ملازم تھے۔ یہ کتاب اُسی زمانے کی چند مقدمہ بازیوں کی روداد ہے۔ کتاب کے نام ''جنگِ جمل'' کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کرتے ہیں ''آں حضرت کی وفات۔۔۔ مسٹر عطا حسین کی طویل القامتی کو دیکھ کر رسالے کا نام اختیار کیا گیا ہے۔'' (۱۶)

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۵ء میں محبوب المطابع برقی پریس، دہلی سے شائع ہوئی۔ میرے پیش نظر برنی کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ہے جس میں برنی بعض ضروری ترمیمات کر رکھی ہیں۔ انھیں اس کتاب کو بھی دوبارہ شائع کرنے کا موقع نہیں ملا۔

سرورق کی پیشانی پر دو انگریزی سے ترجمہ مقولے درج ہیں۔ ''زندگی نام ہے مسلسل جنگ کا''۔ نہ معلوم ''ہم بہت دنیادار ہو گئے ہیں''۔ ورڈز ورتھ۔ کتاب کے نام کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔ ''بمبئی کی دو افسوس نام مقدمہ بازیوں کی تفصیل درج ہے۔''

درج بالا مقولوں اور موخرالذکر عبارت سے برنی کے مزاج کے سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ پہلے مقولے کو انھوں نے اپنی زندگی سے ثابت کر دیا کہ آخری دم تک ایک مجاہد کی طرح جد و جہدِ پیہم کرتے اور وقت و حالات سے جنگ کرتے رہے۔ ان کی

زندگی سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بالکل دنیا دار نہیں ہوئے۔ تقاضے ضرور پورے مگر دنیا کے نہیں ہوئے۔ نہ کبھی اللہ کو بھولے، نہ گھر بھولے، نہ دوست احباب و اقارب کو اور نہ اپنی ذمے داریوں کو۔ ان کی زندگی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بہت شفیق اور محبت کرنے والا باپ، چچا، اور دوستوں پر جان دینے والا دوست، بازوے برادر، اور بہت اچھے شوہر تھے۔

وہ کسی کو جھگڑتا نہیں دیکھ سکتے تھے فوراً صلح کی کوششیں کرتے۔ نہ انھوں نے کبھی ان تنازعات سے فائدہ اٹھایا اور نہ کبھی لطف ہی لیا۔

یہ کتاب اس زمانے کے چند مقدموں کی روداد پر مشتمل ہے۔ ایک مقدمہ مسٹر عطا حسین پر برنی نے قایم کیا تھا جس میں برنی کا دعویٰ تھا کہ عطا حسین نے اپنی انگریزی کتاب ''Sources fo Indian History'' کا اردو ترجمہ ''ماخذِ تاریخِ ہند'' برنی سے کروایا تھا تاہم مسٹر عطا حسین نے برنی کو نہ صرف اس کا معاوضہ دیا بلکہ اسے اپنے نام سے شایع کر دیا۔

دوسرا مقدمہ مسٹر عطا حسین نے برنی پر قایم کیا جسے برنی نے ''ٹلی لِلی والا مقدمہ'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ مسٹر برنی اُنھیں تنگ کرتے تھے اور ٹلی لِلی کر کے انگلیاں چبھوتے تھے اور تنگ کرتے تھے۔ جب کہ ایک مقدمہ وہ ہے جو ابراہیم دلوی اور عبدالرحیم ڈمنکر نے عطا حسین پر قایم کیا کہ انھوں نے کورٹ میں اقرار کیا کہ وہ انھیں ترجمے کا معاوضہ دیں گے۔ بعد میں انکار کیا تو ان حضرات نے ان پر مقدمہ کر دیا۔

برنی نے تمام شواہد، دلائل اور حوالوں کے ساتھ ان دونوں مقدموں کی تفصیل اور نتائج تحریر کیے ہیں اور ایک وکیل ہی کی طرح اپنی پیروی کی ہے۔

برنی دونوں مقدموں سے بری ہوئے۔ عطا حسین سے عدالت نے وعدہ لیا تھا کہ وہ برنی ابراہیم دلوی اور عبدالرحیم ڈمنکر کو ترجمے عوض رقم ادا کریں گے اور درمیان میں بمبئی کی دو معتبر شخصیات کو ڈالا گیا۔ عطا حسین کے انکار پر اُن صاحبان نے عطا حسین کے خلاف مقدمہ کر دیا۔ عدالت کا فیصلہ عطا حسین کے خلاف ہوا نتیجے کے طور پر وہ نوکری سے برخواست کر دیے گئے۔ بعد میں سر شاہ نواز بھٹو کی مداخلت پر اُن کے لیے ایک سوُ روپے ماہ وار پنشن مقرر کر دی گئی۔ سر شاہ نواز اُس زمانے میں گورنر بمبئی کی ایگزیکیوٹیو کونسل کے رکن تھے۔

پہلے والے مقدمے کی جو تفصیل اس کتاب میں دی گئی ہے۔ اُس سے یہ بآسانی ثابت ہو گیا کہ ''ماخذ تاریخ ہند'' کے عنوان سے ترجمہ برنی ہی کا کیا ہوا تھا جو ستمبر ۱۹۲۹ء میں فیروز سنز، لاہور نے اسے شایع کیا۔

اس کتاب کی اہمیت کئی حوالوں سے ہے ایک تو یہ کہ اس میں برنی کے اور برنی کے نام چند خطوط بھی بالواسطہ آ گئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ زندگی میں برنی کی سخت جدوجہد کا اظہار ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ برنی نے روداد با دلِ نخواستہ مگر عبرت کی غرض سے پیش کی اور شایع کی ہے اس سے اُن کی صاف گوئی، صداقت شعاری کا بھی پتا چلتا ہے۔

### ۶۔ ''تاریخِ اسلام کی سچی کہانیاں'' (۱۹۵۰ء):

یہ کتاب نہایت کرم خردہ حالت میں دست یاب ہوئی ہے۔ سرورق ناپید ہے۔ صفحہ ۱۲۶ کے بعد کے صفحات غائب

ہیں۔اس کا کوئی اور نسخہ بھی کسی لائبریری میں میری نظر سے نہیں گزرا۔کتاب پر ضیاء الدین احمد برنی کا نام درج نہیں ہے جب کہ مصنف کا نام سرورق کے بعد والے صفحے پر اس طرح لکھا ہوا ہے۔''ڈاکٹر محمد ناظم،ایم۔اے،پی۔ایچ۔ڈی (کینٹب)،سابق ڈائرکٹر محکمہ ءآثارِ قدیمہ پاکستان،مصنف''سلطان محمود غزنوی''۔یہ کتاب برنی کے ادارے''تعلیمی مرکز،کراچی سے شائع کی گئی ہے۔برنی نے اپنی تصنیف''عظمتِ رفتہ''میں اس کتاب سے متعلق لکھا ہے کہ''۱۹۵۰ء میں ہم دونوں[ڈاکٹر محمد ناظم] نے مل کر ایک کتاب ''تاریخ اسلام کی سچی کہانیاں''لکھی تھی جو مدت تک پرائمری مدارس کے نصاب میں شامل رہی۔''(۱۷)

کتاب ہی سے پتا چلتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۵۰ء میں۔دوسرا ایڈیشن اپریل ۱۹۵۰ء اور تیسرا ایڈیشن جولائی ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا۔سول ایجنٹ کے طور پر اردو اکیڈمی سندھ،مشن روڈ کراچی کا پتا درج ہے۔

پہلے ایڈیشن کی''تمہید''میں ڈاکٹر محمد ناظم کتاب کی غرض وغایت سے متعلق لکھتے ہیں:

مسلمان بچوں کے پڑھنے کے لیے اب تک ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی جس میں تاریخ اسلام کے بڑے بڑے واقعات کو کہانی کی شکل،سلیس زبان میں میں پیش کیا گیا ہو۔جو کتابیں اس موضوع پر ملتی ہیں وہ ہمارے منشا کو پورا نہیں کرتیں۔اس کتاب کا مقصد زیادہ تر اسی کمی کو پورا کرنا ہے۔امید ہے کہ یہ کوشش بارور ہوگی۔

اس کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،خلفائے راشدین اور ان کے قریب کے زمانے کے واقعات کو ارادۃً زیادہ جگہ دی گئی ہے کیوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جو ہمارے لیے بہترین مشعل راہ ہے۔ابتدائی دور کے مسلمان جو کچھ کرتے تھے وہ اسلام کی عظمت کے لیے کرتے تھے اور ان کے کسی کام میں خود غرضی اور نفسانیت کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔اس کتاب کے ذریعے وہی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ ہمارے بچے بڑے ہو کر اسلام اور پاکستان کا نام روشن کریں۔

واقعات تاریخی ترتیب سے پیش کیے گئے ہیں مگر سن کہیں کہیں دیے گئے ہیں تا کہ بچوں کے دماغ پر غیر ضروری بوجھ نہ پڑے۔یہ سب واقعات تاریخ کی معتبر کتابوں سے لیے گئے ہیں اور حتی الامکان کوئی ایسی بات درج نہیں کی گئی ہے جس کا مقصد مسلمان بچوں میں محض مشیخت پیدا کرنا ہو۔البتہ ایسے واقعات ضرور دے دیے گئے ہیں جو تاریخ اسلام کا بہترین سرمایہ ہیں اور جن پر مسلمانوں کو بجا طور پر فخر رہے گا۔

کتاب میں جن موضوعات کو بیان کیا گیا ہے ان کے عنوانات اس طرح ہیں:

فہرستِ مضامین:

۱۔دائی حلیمہ کا احترام

۲۔اعلانِ حق

۳۔حضرت عمرؓ کا اسلام لانا

۴۔رسول اللہؐ کی ہجرت

۵۔مسجدِ نبوی کی تعمیر

۶۔جنگِ بدر

۷۔فتح خیبر

۸۔صحابہ کا ایثار

۹۔مہاجروں سے محبت

۱۰۔فتح مکہ

۱۱۔غریبوں کی خدمت

۱۲۔اطاعتِ امیر

۱۳۔فتح بیت المقدس

۱۴۔وعدہ کا پاس

۱۵۔ایفائے وعدہ

۱۶۔اسلامی مساوات کے نمونے

۱۷۔حضرت عمرؓ کی ہمدردی

۱۸۔قرآن مجید کیسے جمع ہوا

۱۹۔خاتونِ جنت کی زندگی

۲۰۔شہادتِ امام حسینؓ

۲۱۔فتح سندھ

۲۲۔فتح اسپین

۲۳۔تبلیغ کا جوش

۲۴۔عمر بن عبدالعزیز کی اصلاحات

۲۵۔عمر بن عبدالعزیز کی سادگی

۲۶ فرانس کا حملہ

۲۷۔ظلم کا نتیجہ

۲۸۔ سبکتگین اور ہرنی

۲۹۔ بڑھیا کی صاف گوئی

۳۰۔ فتح سومنات

۳۱۔ صلیبی لڑائیاں

۳۲۔ تباہی بغداد

۳۳۔ عزت کی موت

۳۴۔ فتح قسطنطنیہ

۳۵۔ بابر اور رانا سنگا کا معرکہ

۳۶۔ بے مثل بہادری

۳۷۔ خدا پر اعتماد

۳۸۔ مرہٹوں کا خاتمہ

۳۹۔ سپاہیانہ موت

۴۰۔ علی گڑھ کالج

۴۱۔ سید جمال الدین افغانی

۴۲۔ غازی انور پاشا کی جراءت

۴۳۔ قط العمارہ کا محاصرہ

۴۴۔ افغانستان کی آزادی

۴۵۔ مولانا محمد علی جوہر کا اعلان

۴۶۔ فتح سقاریہ

۴۷۔ ہمارا پاکستان

۴۸۔ انڈونیسیا کی آزادی

چھوٹے چھوٹے عنوانات، اور تھوڑی تھوڑی مگر مکمل اور جامع معلومات، کے ذریعے بچوں کی عمر اور ذہنی سطح کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی تعلیم کی گئی ہے۔ اسلوب بیان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ ہر مضمون کے بعد چند سوالات دیے گئے ہیں۔

**۷۔ ”عظمتِ رفتہ“ (۱۹۶۱ء):**

”عظمتِ رفتہ“ برصغیر پاک و ہند کی تیرانوے نامور شخصیات کے سوانحی خاکو پر مبنی اہم اور دل چسپ کتاب

ہے۔ اگر چہ یہ کتاب اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے تاہم اس میں برنی نے کسی کو فرشتہ بنانے کوشش نہیں کی۔ یہ ضرور ہے کہ اس شخص کی خامیوں اور کمزوریوں کو بشری کمزوریاں سمجھ کر اتنا نمایاں نہیں کیا کہ اس کی خوبیاں اور نیکیاں دب جائیں یا ابھر نہ سکیں۔

یہ کتاب برنی کی مقبول ترین کتاب ہے۔ جس کی مقبولیت پر برنی کو فخر رہا ہے۔(۱۸) اسے برنی کی خودنوشت بھی کہا جا سکتا ہے کہ برنی اس میں سانس لیتے، چلتے پھرتے، سوچتے، غور کرتے، میل ملاقات کرتے، خوش، بہت خوش، افسردہ اور بہت زیادہ افسردہ ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ انداز کہیں مکالماتی ہے اور کہیں بیانیہ۔

اس کے بہت سے خاکے ہندو پاک کے رسائل میں شایع ہو چکے ہیں تاہم ایک بڑی تعداد رئیس احمد جعفری کے رسالے ''ریاض''، کراچی میں شایع ہوئے۔ جب برنی نے انھیں کتابی صورت میں مرتب کیا تو ان میں بعض ضروری ترمیمات بھی کیں۔

کتاب ۱۹۶۱ء میں دیدہ زیب گرد پوش، اعلیٰ کاغذ، عمدہ طباعت اور نہایت اہتمام سے شایع کی گئی۔ سرورق پر برنی کا اسکیچ ان کے بیٹے جمال احمد برنی کا بنایا ہوا جو ہنر مند آرٹسٹ تھے۔ فہرست کے بعد مصنف کی جانب سے ''تمہید'' ہے اور اس کے بعد ''اظہار تشکر''۔ ''پیش لفظ'' مولانا عبدالماجد دریابادی کا تحریر کردہ ہے۔

جب کتاب شایع ہو کر منصۂ شہود پر آئی تو برنی کے دوست عبدالمجید قرشی صاحب کتاب کی سج دھج سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''عظمتِ رفتہ'' اپریل ۱۹۶۱ء میں چھپنا شروع ہوئی تو برنی صاحب نے اُس کے کچھ ابتدائی صفحات جو نیوز پرنٹ پر تھے۔ میرے اشتیاق کے پیشِ نظر مجھے بھیج دیے۔ میں نے انھیں دیکھا تو میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ میں نے اُسی روز برنی صاحب کو لکھا کہ اگر آپ کی یہ عظیم کتاب نیوز پرنٹ پر چھپی تو میرے لیے اس سے بڑا المیہ اور کوئی نہ ہوگا۔ اُن کا جواب آیا کہ خاطر جمع رکھیے۔ یہ اوراق محض پروف ہیں۔ اصل کتاب آپ کے تخیل سے کہیں زیادہ خوب صورت ہوگی۔ جولائی ۱۹۶۱ء میں آخر کار کتاب شایع ہوگئی۔ کیا گرد پوش، کیا جلد، کیا کاغذ، کیا ٹائپ، کیا نفسِ مضمون، ہر چیز اعلا و ارفع۔(۱۹)

اس میں جن شخصیات کے خاکے تحریر کیے گئے ہیں ان کے نام یہ ہیں:

۱۔مولوی محمد اسحاق رامپوری ۔۲۔علامہ راشد الخیری ۔۳۔خواجہ حسن نظامی ۔۴۔میر باقر علی داستان گو ۔۵۔میر بشارت علی جالب ۔۶۔مولانا محمد علی جوہر ۔۷۔راجہ غلام حسین ۔۸۔مولانا شوکت علی ۔۹۔نواب سراج الدین احمد خاں سائل ۔۱۰۔لالہ بلاقی داس ۔۱۱۔سشل کمار ردرا ۔۱۲۔مولانا احمد سعید ۔۱۳۔محمد الدین خلیقی ۔۱۴۔مولوی ذکاء اللہ ۔۱۵۔خواجہ الطاف حسین حالی ۔۱۶۔ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۔۱۷۔مولوی نذیر احمد ۔۱۸۔مولانا عبیداللہ سندھی ۔۱۹۔منشی سید احمد دہلوی ۔۲۰۔مسٹر آصف علی ۔۲۱۔عارف ہسوی ۔۲۲۔ڈاکٹر سید سجاد دہلوی ۔۲۳۔خلیل خالد بک ۔۲۴۔وحید الدین بیخود دہلوی ۔۲۵۔حکیم جمل

خاں۔۲۶۔سی۔ایف۔اینڈریوز۔۲۷۔نواب وقار الملک۔۲۸۔عبدالرحمٰن صدیقی۔۲۹۔خواجہ کمال الدین۔۳۰۔مسز اینی بیسنٹ۔۳۱۔سید فضل الحسن حسرت موہانی۔۳۲۔بیگم حسرت۔۳۳۔منشی پریم چند۔۳۴۔سیماب اکبر آبادی۔۳۵۔لالہ دیا نرائن نگم۔۳۶۔مسز سروجنی نائیڈو۔۳۷۔مجید لاہوری۔۳۸۔سید فضل شاہ۔۳۹۔جگر مراد آبادی۔۴۰۔جمشید جی نسروانجی مہتا۔۴۱۔مولانا ظفر علی خاں۔۴۲۔عبدالمجید سالک۔۴۳۔محمد رفیع کاشمیری۔۴۴۔رستم زماں گاما پہلوان۔۴۵۔حکیم عبدالوہاب انصاری۔۴۶۔علامہ شبلی نعمانی۔۴۷۔ڈاکٹر اقبال۔۴۸۔ولایت علی بمبوق۔۴۹۔پروفیسر شیخ عبدلقادر۔۵۰۔سید عبداللہ بریلوی۔۵۱۔مولوی نذیر احمد خجندی۔۵۳۔شیخ حسن علی۔۵۴۔عبدالرحیم ڈمسکر۔۵۵۔لارڈ لائڈ۔۵۶۔پروفیسر عبدالصمد مولوی۔۵۷۔عمر سوبانی۔۵۸۔غلام حسین خیراز۔۵۹۔مولوی عبداللہ چکڑالوی۔۶۰۔علی محمد مولوی۔۶۱۔سر جے۔ای۔بی۔ہاٹسن۔۶۲۔شیخ فیض اللہ بھائی۔۶۳۔سید سلیمان ندوی۔۶۴۔مولوی وحید احمد مدنی۔۶۵۔جگن ناتھ کھنہ۔۶۶۔بی۔جی۔کھیر۔۶۷۔سر غلام حسین ہدایت اللہ۔۶۸۔دادا بھائی واچ میکر۔۶۹۔مولانا محمد عرفان۔۷۰۔قاضی کبیر الدین۔۷۱۔سر آغا خاں۔۷۲۔ایم۔این۔رائے۔۷۳۔مرزا علی محمد خاں۔۷۴۔محمد مارماڈیوک پکتھال۔۷۵۔محی الدین آزاد۔۷۶۔ڈاکٹر اے۔ایل۔نایر۔۷۷۔شوکت علی خاں فانی۔۷۸۔پروفیسر معین الدین احمد۔۷۹۔شریف دیوجی کانجی۔۸۰۔کیقباد فرامجی نریمان۔۸۱۔ڈاکٹر محمد ناظم۔۸۲۔سر ابراہیم رحمت اللہ۔۸۳۔آغا شاعر قزلباش۔۸۴۔کرشن لال جھریری۔۸۵۔بی۔جی۔ہارنیمین۔۸۶۔ڈاکٹر سید حسین۔۸۷۔ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتا۔۸۸۔سر ابراہیم ہارون جعفر۔۸۹۔منشی محمد الدین۔۹۰۔مفتی محمد کفایت اللہ۔۹۱۔مولانا ابوالکلام آزاد۔۹۲۔موہن داس کرم چند گاندھی۔۹۳۔محمد علی جناح۔

خاکوں کے اختتام پر دو ضمیمے بھی شامل کتاب ہیں۔ایک عنوان ہے ''مولانا ظفر علی خاں کا شذرہ مولوی محمد حسین (۲۰) کے بارے میں۔'' دوسرا ''مولانا حسرت موہانی کا وہ مضمون جس پر انھیں پہلی مرتبہ سزائے قید ہوئی تھی۔

بہ قول برنی مذکورہ کتاب جولائی ۱۹۶۱ء تک چھپ کر تیار ہوگئی جلد ساز کی وجہ سے دیر ہوئی۔(۲۱) اس دوران ۱۶راگست کو مولوی عبدالحق خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ایسا کیسے ممکن تھا کہ برنی ان کی یاد میں کچھ نہ لکھتے چناں چہ کتاب کے آخر میں ''ڈاکٹر مولوی عبدالحق'' کے عنوان سے برنی نے اپنی یادداشتوں کو پیش کردیا۔برنی نے اس کتاب کو ''یارانِ کہن''، ''گنج ہائے گراں مایہ''، ''یادِ رفتگاں''، ''کیا خوب آدمی تھا'' اور ''چند ہم عصر'' وغیرہ نہج کی کتابوں میں شمار کیا ہے۔(۲۲)

> خواجہ جمیل احمد نے اپنی تصنیف ''چند یادیں'' میں بھی اسی امر کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:
> اردو میں سوانحی خاکوں کا جب بھی ذکر آئے گا تو بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ''چند ہم عصر'' علامہ سید سلیمان ندوی کی ''یادِ رفتگاں'' عم بزرگوار ضیاءالدین احمد برنی کی ''عظمتِ رفتہ'' اور استاد المکرم رشید احمد صدیقی کی ''گنج ہائے گراں مایہ'' کے نام ذہن میں ابھریں گے۔(۲۳)

بشیر سیفی کی خاکہ نگاری کی وضع کردہ تعریف کے مطابق کہ ''خاکہ ایسا تخلیقی مضمون ہے جس میں کسی فرد کی شخصیت

کے اہم پہلوؤں کو ذاتی حوالے سے اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہو۔''(۴۴)

فن خاکہ نگاری میں جہاں شگفتہ اسلوب کی اہمیت ہے وہاں ،اختصار، حلیہ نگاری اور اختتام پر افسانے کا سا تاثر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ برنی کے یہ خاکے خاکہ نگاری کی جدید تعاریف پر تو پورا نہیں اترتے۔ اس کا انداز بیان سوانحی نوعیت کا ہے تاہم اس کا اسلوب سلیس، سادہ اور شگفتہ ہے۔ برنی کے اسلوبِ تحریر پر دہلوی اثرات کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خاں، حالی اور مولوی عبدالحق کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ یہ اثر محض اسلوب ہی تک محدود نہیں بلکہ وہ سرسید احمد خاں کے مکتب فکر کے حامل ''افادی ادب'' کے قایل اور عامل رہے ہیں۔

برنی فکری اعتبار سے رشید احمد صدیقی کے اس نظریے کے بھی حامل رہے ہیں کہ ''کسی فن کی خاطر اپنی روایات کا خون نہیں کیا جاسکتا۔'' چناں چہ انھوں نے مشرقی اور اسلامی روایات کی پاس داری بھی کی اور مرحومین کی عیب جوئی نہیں کی۔ بلکہ ان کی نیکیوں اور خوبیوں کو خوب ابھارا ہے تاہم بعض مقامات پر برنی فنی تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔

اس کتاب میں جن شخصیات کی مرقع نگاری کی گئی ہے وہ سب معروف یا غیر معروف ہوتے ہوئے بھی اعلا کردار اور غیر معمولی کارناموں کے حامل رہے ہیں۔ برنی نے اپنی پسند کو ہر امتیاز سے بالاتر رکھا ہے۔ان شخصیات میں مسلمان بھی ہیں، عیسائی، مجوسی اور ہندو بھی تاہم ان کی خوبیوں کے بیان کرنے میں کشادہ دلی اور وسعتِ ذہنی اور اعلاظرفی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

جوجیتی جاگتی تصاویر پیش کی گئی ہیں سب کی سب ماہ تاب وآفتاب اور نادر و نایاب ہیں۔ مصنف کی آنکھ نے رنگ والفاظ کے جو نقش نگار بہ صورت تصویر قرطاس پر ابھارے ہیں وہ قاری کے ذہن کو منور اور دل کو یک گونا راحت فراہم کرتے ہیں۔

اگر چہ یہ شخصیات متنوع قسم کی ہیں یعنی بعض کا تعلق سیاست سے بعض کا مذہب سے بعض کا شعروادب سے بعض کا سماجیات سے اور بعض کا صحافت سے تاہم برنی کی فنی مشاقی نے ان کے جوہر اس طرح ابھارے کہ سبھی اپنے اپنے دائرہ عمل میں ایک سے بڑھ کر ایک نظر آتا ہے۔

درحقیقت یہ کتاب محض ان شخصیات کی زندگیوں ہی تک محدود نہیں بلکہ برصغیر کی تاریخ، باہمی تعلقاتِ انسانی کی تصویر وتفسیر، سماجی مسائل، شعروادب کے بدلتے تناظرات، رندی و پاک بازی اور سیاسی نشیب وفراز کی رنگا رنگیوں اور بوالعجبیوں سے معمور ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی ''عظمتِ رفتہ'' کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں:

> آپ کے پیش نظر و مجموعہ اوراق ہے، وہ کچھ اس قسم کا جادو گھر یا کاغذی سینما ہے۔ جس میں ۹۰-۹۱ شخصیتیں، کوئی رند اور کوئی پاک باز، لیکن سب کی سب معزز و ممتاز، چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ اوراق کے مرتب کوئی چابک دست نقاش نہیں، جو اپنے 'آرٹ' کے زور سے بے جان کو جان دار بنادیں، اور اپنے موقلم کی رنگ آمیزیوں سے دیو کو پری جمال کر دکھائیں۔ وہ ایک سیدھے سادے اہل قلم ہیں، جو وہی لکھتے ہیں جو کچھ کہ وہ دیکھتے ہیں، اور

جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اُس کو قلم سے دھرا دیتے ہیں۔ وہ ''تخلیق'' کا کاروبار نہیں کرتے۔ ۵۰، ۵۵ سال کے عرصہ میں ان کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور ان کے قلب نے جو کچھ محسوس کیا، بس اُسی کا نقشہ نقش و نگار کی صناعیوں کے بہ غیر، انھوں نے کاغذ پر اُتار دیا۔۔۔ یہ ایک سادگی ہر پرکاری پر بھاری۔ ع

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا (۲۵)

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے بڑی ہوشیاری سے برنی کی تعریف بھی کی اور ان پر طنز بھی کیا۔ غالباً انھوں نے کتاب کے تمام خاکوں کا مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ وہ یہ نہیں کہتے کہ ''جو کچھ کہ وہ دیکھتے ہیں، اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اُس کو قلم سے دھرا دیتے ہیں۔'' یعنی انھوں نے بہ طور ایک خاکہ نگار کسی فنی ماہرت کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ کسی صحافی کی طرح جو دیکھا بہ غیر کسی تاثر کے نقل کر دیا۔ حال آں کہ ایسا نہیں ہے اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں برنی نے نہ صرف خاکہ نگاری کے اصولوں کی پابندی کی بلکہ تخلیقی صلاحیت کا مظاہر بھی کیا۔

وہ اپنے ڈیل ڈول اور قد و قامت کے اعتبار سے پیکر مزاح تھے۔ ان کی گفتگو بھی بے حد دل چسپ ہوتی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کرنے کے عادی تھے۔ ان کی باتوں میں اخلاص تھا۔ (۲۶)

ان کی گفتگو انتہائی درجہ دل چسپ اور شگفتہ ہوتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اور اطمینان کے ساتھ باتیں کرنے کے عادی تھے۔ عجلت پسندی ان کے مزاج میں مطلق نہ تھی۔ ان کا طرز تکلم اس قدر شریں تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ (۲۷)

میر صاحب کے مزاج میں بے حد سادگی تھی۔ باوجود غربت کے وہ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ داستان سناتے وقت وہ شیر کی طرح گرجتے تھے، ویسے وہ دبلے منحنی آدمی تھے، متوسط قد کے یا اس سے بھی چھوٹے۔

باقر علی اپنے فن میں امام کا درجہ رکھتے تھے اور اسی میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ تھا۔ خدا جانے غالب کی طرح وہ خود بھی اپنی اس عظمت سے آگاہ تھے یا نہیں، مگر اہل دل ضرور واقف تھے۔ (۲۸)

یہ سچ ہے کہ آیندہ بڑے بڑے اہل قلم، ادیب اور انشاپرداز دنیا میں آئیں گے، بڑے بڑے بلبل شیراز اس چمن میں نغمہ سرائی کریں گے مگر مجھے یقین نہیں کہ کبھی کوئی دوسرا حسن نظامی پیدا ہوگا جو ان کی طرح گوناں گوں اوصاف کا حامل ہو۔ (۲۹)

برنی نے یہ سوچ کر خاکہ نہیں لکھا کہ جس پر لکھ رہے ہیں وہ بڑا آدمی ہے بلکہ یہ پیش نظر رکھا کہ وہ بڑا کیسا بنا اور بڑا

بھی سیرت و کردار کا بڑا۔ برنی کو زندگی میں جدو جہد کرنے والے اشخاص پسند تھے۔ یا وہ جنھوں نے اپنے ہنر و کمال سے ایک زمانے کو متاثر کیا ہو۔ برنی اسی سے متاثر نظر آتے ہیں۔

''راجہ غلام حسین'' اور ''علی محمد مولوی'' جیسے خاکے پڑھ کر امر کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں وہ شخصیات ہیں جو پستی سے بلندی کی جانب انھیں صرف اپنی محنت اور شوق کے باعث۔

ان شخصیات میں دولت مند بھی ہیں، غریب و نادار بھی، مجاہدین آزادی بھی، اسلام کے شیدائی اور دیوانے بھی، میدانِ علم و ادب کے شہسوار بھی، ملک و قوم کے بہی خواہ اور وطن و قوم پرست بھی۔ ان سب میں جو چیز قدر مشترک ہے اور جس نے برنی خامہ فرسائی پر اکسایا وہ اُن کی پُر اخلاص جدو جہد ہے۔ ان خاکوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ سب بڑے اور عظیم لوگ تھے۔ یہی سبب ہے کہ برنی نے انھیں ''عظمتِ رفتہ'' کے عنوان سے یاد کیا۔

کتنی ہی ایسی شخصیات ہیں کہ اگر ان پر برنی قلم نہ اٹھاتے اور ان کے کاموں اور کارناموں کو پیش نہ کرتے تو شاید وہ جی نہ اُٹھتے۔ تاریخ کے اوراق ہی میں دفن رہ جاتے مگر برنی نے اپنے اُسلوب بیان اور طرز تحریر سے ان زندہ و جاوید کر دیا اور تاریخ سے نکال کر ہمارے دلوں میں لا بٹھایا۔

مذکورہ کتاب کی پذیرائی کے سلسلے میں برنی کے نام خطوط میں چند سے اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں۔ ان اقتباسات سے بھی اس کتاب کی عظمت اور برنی کی محنت عیاں ہوتی ہے:

**ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں**

**شعبہء اردو، سندھ یونی ورسٹی**

**۱۲ دسمبر**

آپ کی کتاب عظمتِ رفتہ تو یوں بھی ''خاکہ نگاری'' کے ضمن میں پڑھائی جا رہی ہے۔ اب انشاءاللہ اس کے لیے نصاب میں بھی گنجائش نکالوں گا۔ اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے۔ (۳۰)

**خواجہ غلام السیدین**

کہ نہیں سکتا کہ کس قدر شوق اور دل چسپی سے اُن تمام لوگوں کے ''قلمی خاکے'' پڑھے جن کو آپ نے اس میں جمع کیا ہے۔ آپ نے اچھے لوگوں کا انتخاب کیا اور اُن کی خوبیوں ہی پر نظر ڈالی۔ مجھے اس نقطہء نظر سے اتفاق ہے۔ دنیا کو انسانوں کا روشن رخ دکھانے کی ضرورت ہے۔ برائیاں تو ہر طرف نظر آتی ہیں اور برائی پسند لوگ اس کو ہمیشہ تلاش کر لیتے ہیں۔ ان خاکوں میں ان قدروں کا جلوہ نظر آتا ہے جو ہماری پرانی تہذیب کے بہترین نمونوں میں تھیں (عام تو نہیں تھیں) اور افسوس ہے کہ ان کا چلن کم ہوتا جاتا ہے، جس کی وجہ سے آپ اس عظمت کو ''رفتہ'' کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ (۳۱)

**رشید احمد صدیقی**

ذکاء اللہ روڈ، علی گڑھ

۱۱؍اپریل ۱۹۶۳ء

۔۔۔اس سے پہلے آپ کی کتاب ''عظمتِ رفتہ'' موصول ہو چکی تھی۔اس کرم کا شکر گزار ہوں۔رسائل میں آپ کی اس کتاب پر بڑے اچھے ریویو نظر سے گزر چکے تھے اس لیے کتاب پڑھنے کو نہ ملتی تو کوئی مزائقہ نہ تھا۔خوشی بہر حال تھی کہ اردو میں ایک ایسی کتاب شایع ہوئی ہے جسے منفقہ طور پر قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔اس پر جہاں تہاں صرف سرسری نظر ڈال سکا ہوں لیکن یہ صاف طور پر محسوس ہوا کہ کتاب کی شہرت بے وجہ نہیں ہے۔پوری کتاب پڑھنے کو توفیق ہوئی تو کچھ اور عرض کر سکوں گا۔(۳۲)

طالب جے پوری

الہ آباد

۶؍دسمبر ۱۹۶۲ء

منشی پریم چند صاحب کے صاحب زادے امرت رائے صاحب کی مہربانی سے ''عظمتِ رفتہ'' کی زیارت کی۔کتاب کیا ہے ادبی شہزادوں کا دربار ہے اور زبان کیا ہے آبِ حیات کی موجیں ہیں۔آپ نے ان بزرگوں کی جس محبت وعقیدت سے ذکر فرمایا ہے وہ آپ کی دوست نوازی اور مردم شناسی کی دلیل ہے۔ان بزرگوں میں چند ایسے ہیں جن کی زیارت کا شرف مجھے بھی حاصل ہوا ہے واقعی اس عزت وعظمت کے مستحق تھے جو آپ نے انھیں بخشی۔عظمتِ رفتہ کے مطالعے سے پہلی مرتبہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اگر یہ بزرگ نہ ہوتے تو فاضل مصنف کی یہ کتاب ظہور میں نہیں آتی۔اسی طرح دو مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ اگر ''عظمتِ رفتہ'' ظہور میں نہیں آتی تو ان بزرگوں کی یہ کی عزت وعظمت کچھ اس طرح اجاگر نہ ہوتی۔خدا آپ کو سلامت رکھے اور عظمتِ رفتہ کو بقائے دوام بخشے۔(۳۳)

محمد اعظم خان (لفٹنٹ جنرل)

گورنر مشرقی پاکستان، ڈھاکہ

۳۱ جنوری ۱۹۶۲ء

آپ کی کتاب کا شکریہ! یہ میری لائبریری میں مفید اضافہ ہے اس لیے کہ بڑی شخصیتوں کی زندگی سے ہماری موجودہ نسل اور آنے والی نسل کو واقف رہنا چاہیے، اب جب خدائے برتر نے ہمیں پاکستان عطا فرمایا ہے جس کا پس منظر مثالی ہے اور جس کی گزشتہ روایات شان دار ہیں۔

ان بہادروں کی خدمات جنھوں نے اسلامی طرزِ زندگی کو قائم رکھا اور جنھوں نے اس آزادی کو حاصل کرنے کے لیے قربانیاں دیں، ہماری تاریخ کا اہم جزو ہیں۔(۳۴)

برنی اس دوسرے ایڈیشن کے لیے پہلے ایڈیشن پر نظر ثانی کر چکے تھے۔دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے مزید

شخصیات کے اضافے سے انھیں سو(۱۰۰) کی تعداد تک پہنچادیا تھا۔اس کا تذکرہ انھوں نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔"اس میں(عظمتِ رفتہ)۹۴مرحوم اشخاص کے مرقعے درج ہیں۔مجھے خوشی ہے کہ میری سب سے مقبول ترین کتاب یہی ہے۔علامہ نیاز فتح پوری نے اس پر ریویو کرتے ہوئے لکھا تھا کہ'اس کتاب نے مسٹر برنی کو امر بنادیا ہے۔'دوسرے ایڈیشن کے لیے میں نے چند اور شخصیتوں کا اضافہ کردیا ہے۔اس طرح کل ۱۰۰شخصیتوں پر خاکے ہوجائیں گے۔' برنی دوسرے ایڈیشن کے لیے پہلے ایڈیشن میں جا بہ جا حک واضافہ کیا اور اسے "اَپ ڈیٹ" کی مگر قابل افسوس بات یہ ہے کہ برنی کو ان اضافی شخصیات کے اظہار کا موقع بھی نہیں مل سکا اور ان کا بارگاہِ الٰہی سے بلاوا آگیا۔مذکورہ کتاب غیر مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔

## ۸۔"تعلیم وتربیت"(۱۹۶۹ء):

یہ کتاب برنی کے ان خیالات اور افکار کا منظم اور دل کش اظہار ہے جو ان کے زمانہ طالب علمی اور زمانہ ءتدریسی میں تجربات،مشاہدات اور معلومات سے پیدا ہوئے۔کتاب کا نام "تعلیم وتربیت" ہے۔اس کا مقدمہ پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے کا تحریر کردہ ہے۔اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ،آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس،کراچی کی جانب سے ۱۹۶۹ء میں شایع کی گئی۔یہ کتاب اگرچہ انھوں نے اپنے زمانہء کانپور یعنی جولائی ۱۹۱۵ سے فروری ۱۹۱۸ءتک کی زمانی مدت میں لکھ لی تھی تاہم اس کی طباعت و اشاعت پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس،کراچی نے کی۔

اس بات سے قطع نظر کہ یہ کتاب اس زمانے میں کیوں شایع نہیں ہوئی اور کیا موانعات درپیش تھیں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی وہ زمانہ تھا کہ جب برنی نہایت مستعد اور ان کا قلم نہایت رواں تھا۔جیسا کہ ذکر ہوچکا ہے کہ برنی نے زمانہ طالب علمی ہی سے لکھنا شروع کردیا تھا۔"ہمدرد" سے قطع تعلق کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کانپور کے تھیوسوفیکل ہائی اسکول میں انھیں بہ طور ٹیچر ملازمت مل گئی اور وہ وہاں چلے گئے۔اسکول سے وابستگی کے زمانے میں بھی اپنی تدریسی ذمے داریوں کی ادائی کے علاوہ تحریر وتقریر سے علم وادب اور کسی قدر اسلام کی خدمت بھی کرتے رہے جیسا کہ ذکر ہوچکا ہے کہ وہاں رہ کر انھوں نے کئی مضامین لکھے اور اسکول ایک رسالے کو ایڈٹ بھی کیا۔اس سے ان کے شوق کا پرکھا جاسکتا ہے۔

کانپور کے اسکول سے تعلق منقطع ہوا تو وہ بمبئی کے ایک اسکول "انجمن اسلام ہائی اسکول" سے وابستہ ہوگئے۔گزشتہ اوراق میں عرض کیا جاچکا ہے کہ برنی نے اپنا طالب علمی کا زمانہ نہایت کامیابی سے گزارا اور وہ ایک اچھے طالب علم ثابت ہوئے۔

اگرچہ برنی کی تدریسی زندگی تمام تر جزئیات کے تو ہمارے سامنے نہیں ہے جس سے اندازا کیا جاسکے کہ انھوں نے وہ زندگی کیسی گزاری تاہم بعض دست آویز سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ بہت اچھے ٹیچر رہے تھے۔

انھوں نے اپنے اور اپنے خاندان کے بچوں کی تعلیم اور خاص کر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے جو کچھ کیا ان کا تذکرہ بھی گزشتہ اوراق میں آچکا ہے،جن سے یہ بات یہ سامنے آچکی ہے کہ برنی بچوں کی تعلیم اور اچھی تربیت کے سلسلے میں ہمیشہ متفکر رہے اور اچھی تعلیم سے ثروت مند کرنے کی جدوجہد کرتے رہے اگرچہ انھیں قریہ قریہ اور شہر شہر کی خاک چھاننی پڑی اور ملازمتوں کے مسائل اور بعض خانگی مسائل نے خاطر خواہ سکون فراہم نہیں کیا تاہم انھوں نے حتی المقدور کوشش کی اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے کہ بچوں کو اچھی تعلیم اور

بہترین تربیت سے آراستہ کریں۔

آج ان کے اوران کے خاندان کے بچے جس جس مقام پر ہیں وہ سب برنی ہی کی محنت اور جدو جہد کا نتیجہ ہے۔اس پس منظر کو سامنے رکھا جائے تو برنی کی اس قابل قدر کوشش کا مطالعہ نہایت اہم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب برنی کے خیالات اور افکار اور ان کے وسیع مطالعے کا بامعنی اور قابل عمل مظاہرہ ہے۔ چوں کہ یہ کتاب برنی کے اخیر زمانے میں منصۂ شہود پر آئی لہذا برنی کو اس پر پیش لفظ وغیرہ کی صورت میں اظہار خیال کو موقع نہیں مل سکا تاہم انھوں نے اپنی خود نوشت میں مختصراس کتاب سے متعلق اظہار خیال کیا ہے ”قیام کانپور کے زمانے میں ،میں نے ایک کتاب تعلیم وتربیت کے نام سے لکھی تھی۔اور پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی نے اس کی سرپرستی کی ہے اور مجھے امید ہے کہ چالیس پینتالیس سال کے عرصے کے بعد یہ محنت بارور ثابت ہوگی۔خدا کرے کہ یہ اپنا مقصد حاصل کرے۔“

برنی نے کتاب کے موضوع کو درج ذیل عنوانات میں منقسم کیا ہے:

باب۔۱
تعلیم وتربیت

باب۔۲
گھر کا ماحول

باب۔۳
جسمانی رکھ رکھاو

باب۔۴
بچوں کے منازل ارتقاء
پیدائش سے ڈھائی سال تک عادتیں بنانے کا زمانہ

باب۔۵
ذہنی نشوونما (ابتدائی منزل)
دوسری منزل ڈھائی برس سے لے کر ۷ برس تک نشوونما کا استمرار

باب۔۶
تیسری منزل (سات سال سے لے کر تقریباً ۱۲ سال تک)

باب۔۷
مسئلہ سزا

باب۔۸
جنسی تعلیم

باب۔۹

اخلاقی (مذہبی) تعلیم

باب۔۱۰

جسمانی تعلیم

باب۔۱۱

بصارت کی حفاظت

باب۔۱۲

نیند

کتاب کے مقدمے میں پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے نے جامع اور پر مغز خیالات کا اظہار کیا ہے اور متذکرہ کتابوں کی ہر زمانے میں ضرورت اور افادیت کو اجاگر کیا ہے۔ اور مذکورہ کتاب کو فلسفۂ تعلیم یا فن تعلیم پر مبسوط اور جامع کتاب قرار دیا ہے اور پاکستان میں ایک بڑی کمی کو پورا کیے جانے کا اعتراف ہے۔

> کتاب زیر مطالعہ ''تعلیم و تربیت'' کے فاضل مصنف جناب ضیاء الدین احمد صاحب برنی نے بڑے سادہ اور دل کش انداز میں [جو] ان کے مخصوص طرز نگارش ہے، تعلیم کے ایسے پہلوؤں سے بحث کی ہے جن پر افراد کی کردار سازی اور قوموں کی تعمیر کا انحصار ہے۔ برنی صاحب پرانے اور پختہ کار ادیب اور اردو کے ہر دل عزیز مصنف کی حیثیت سے بہ خوبی جانے پہچانے ہوئے ہیں۔۔۔ انھوں نے ملک کے شہرت یافتہ ماہرین علم، قومی لیڈروں، قدیم جدید روشنی کے فیض یافتہ حضرات یہاں تک کہ ان زعماء سے بھی ذاتی تعلقات قائم کیے جن کا نام لینا بھی حکومت۔۔۔ ملازمین کو دار و رسن کا سزاوار قرار دیتا تھا۔۔۔ یہ کتاب ''تعلیم و تربیت'' برسوں کی محنت اور دماغی کاوش کا نتیجہ ہے اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب میں یہ ایک بیش بہا اضافہ ہے۔
>
> کتاب زیر نظر بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے اور ہر حیثیت سے اردو ادب میں ایک مفید اضافہ ہے۔ کتاب میں تعلیم اطفال کے مدارج کی تقسیم اور ان میں باہمی ربط کی ترتیب بڑے ماہرانہ انداز سے کی گئی ہے۔ ایسے خشک موضوع اور تکنیکی بحث میں دل کشی پیدا کرنا اور اس کو دل چسپ بنانا یہ برنی صاحب کی ادبی فطانت کا شاہ کار ہے۔ لہٰذا تمام صاحب اولاد اور فرض شناس افراد قوم کے لیے اس کتاب کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ (۳۵)

برنی نے اس کتاب میں اپنے خیالات کی تشریح اور وضاحت کے لیے حواشی کا اہتمام بھی کیا ہے اپنے خیالات او رمعلومات کے علاوہ مغربی مفکرین کے اقوال بھی رقم کیے ہیں۔ان کے اس اقدام سے کتاب کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی اور کتاب کی افادیت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

برنی نے بچوں کی تعلیم و تربیت میں والدین اور اساتذہ کو یکساں ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ایک مقام پر لکھتے ہیں:

۔۔۔سات برس کی عمر کے بعد والدین اور استاد ہی بچہ کی نشو و نما کے ذمے دار ہوتے ہیں اور دونوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بچہ ہر بات میں بڑھ چڑھ کر ہو۔اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک استاد ہی بچہ کے متعلق وہ تمام باتیں نہ جان لے گا جو والدین کو معلوم ہیں اس وقت تک وہ کما حقہ بچے کے مفاد کا خیال نہیں رکھ سکتا۔

لہذا ان (والدین) کا فرض ہے کہ خواہ ان کے ذاتی مشاغل بہت ہی زیادہ کیوں نہ ہوں وہ اپنے بچہ کی ترتیب اور نگرانی میں پوری پوری دل چسپی لیں۔

اگر بچے میں کسی خاص مضمون سے زیادہ دل چسپی ہو یا اس کا رجحان طبیعت علم موسیقی، فن نقاشی، یا دیگر فنون لطیفہ کی جانب ہو تو اس کے رجحان کو کم کرنا یا دبانا نہیں چاہیے بلکہ اس کے ابھرنے کے پورے مواقع بہم پہنچانے چاہیں۔افسوس ہے کہ ہمارے ملک کی یونی ورسٹیاں امتحان لیتے وقت طلبا کے رجحانات کا مطلق خیال نہیں کرتیں اور اسی کے باعث طلبا کی کثیر تعداد متواتر کئی کئی سال تک فیل ہوا کرتی ہے۔

گھر میں مطالعہ کا پورا سامان ہونا ضروریات میں سے ہے ان کے پڑھنے کے لیے ان کی عمر کے موافق کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہونا ضروری ہے۔(۳۶)

برنی بچوں کی جسمانی سزا کے خلاف ہیں۔وہ اصلاح کے حق میں ہیں اور اس سلسلے میں ایسی سزا کو جائز سمجھتے ہیں جو انھیں برائی سے روک سکے۔اس کے مختلف طریقوں کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب میں کیا اور متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔

برنی نے بچوں کے جنسی معاملات کو نہایت نازک قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی اور روایتی حدود کو پیش نظر رکھتے ہوئے، والدین کو ذمے دار ٹھہرایا ہے کہ وہ اس ضمن میں بچوں کی تربیت کریں تاوقتیکہ وہ بگڑ کر خراب ہو جائیں اور والدین کے لیے بدنامی کا باعث ہوں۔

برنی نے ذہنی اور اخلاقی تعلیم کے ساتھ ساتھ جسمانی تعلیم کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے متعدد مثالوں کے ذریعے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ اوراق میں ذکر ہو چکا ہے کہ برنی خود بھی کھلاڑی رہے ہیں اور اسکول اور کالج کے زمانے میں خوب کھیلا کرتے تھے۔مذکورہ کتاب ہر لحاظ سے قابل مطالعہ ہے اور نیک، شریف، اور ہر لحاظ سے صحت مند اور فعال شہری پیدا کرنے میں

معاون ۔ بچوں کی تعلیم و تربیت پر ایسی مبسوط اور جامع کتاب کم ہی منظر عام پر آئی ہیں ۔ برنی کے بعض دست آویز سے ان کی اسی موضوع پر ایک اور کتاب 'تعلیم کے چار پہلو' کا نام ملتا ہے مگر یہ کتاب نہ مطبوعہ اور نہ ان کی غیر مطبوعہ کتب میں مل سکی ۔ ممکن ہے اس حوالے سے کوئی خاکہ ان کے ذہن میں ہو یا اسی کتاب کو وہ یہ نام دینا چاہتے ہوں ۔

## ۹۔ ''حیاتِ مولانا محمد علی جوہر'' (۲۰۰۱ء):

مذکورہ کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب برنی نے ۵۵ یا ۱۹۵۷ء کی دہائی میں لکھنا شروع کی تھی ۔ درمیان میں برنی شدید بیماریوں کی لپیٹ میں رہے صحت بہتر ہوئی تو ۱۹۶۷ء میں اسے مکمل کیا ۔ (۳۷)

قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ مذکورہ کتاب جو خاص برنی کی دل چسپی کی تھی ان کی زندگی میں شایع نہیں ہو سکی ۔ مئی ۱۹۶۷ء میں اشتہار کے ذریعے اطلاع تو دی گئی کہ اردو اکیڈمی سندھ سے شایع ہونے والی ہے (۳۸) مگر کتاب ان کی زندگی میں شایع نہیں ہوئی ۔ اس میں کئی معاملات ایسے ہیں جن کی نوعیت خاندانی ہے، جو رکاوٹ بنے (۳۹)، بہر حال ۳۴ سال کے بعد کتاب شایع کی گئی ۔ سرورق دیدہ زیب ہے جس پر پاکستانی پرچم اور مولانا کی تصویر دی گئی ہے ۔ کتاب کا انتساب برنی کے والد منشی محمد الدین کے نام ہے ۔ برنی نے ان کی یاد میں اقبال کا یہ مصرع انتساب میں دیا ہے ۔ ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ۔

فہرست کے بعد محمد اعظم چوہدری، شعبہء سیاسیات، اردو کالج، کراچی کا جانب سے ''پیش لفظ'' دیا گیا ہے جو برنی کے بڑے بیٹے اعجاز احمد برنی کی جانب سے فراہم کردہ معلومات پر مبنی ہے ۔ سوانح شروع ہونے سے پیشتر برنی نے 'دیباچہ'' کے ذریعے مولانا محمد علی جوہر سے اپنے دیرینہ تعلقات پر مفصل اظہار خیال کیا ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ برنی نے جب سے ان کا تعلق مولانا سے قایم ہوا ان کے انتقال کے بعد تک اس تعلق کو تحریر و تقریر کے ذریعے نہ صرف برقرار رکھا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ان کی زندگی کے ایسے گوشے روشن کر دیے جن پر پوری مسلمان قوم نہ صرف فخر کرے گی بلکہ اس عجیب اور حیرت انگیز زندگی کو اختیار کرنا چاہے گی ۔

برنی نے مولانا محمد علی جوہر کی سوانح حیات کو درجِ ذیل عنوانات میں منقسم کیا ہے:

آبا و اجداد
ایم ۔ اے ۔ او کالج علی گڑھ
آکسفورڈ میں
بڑودہ کی ملازمت
شملہ وفد اور جداگانہ انتخاب
مسلم لیگ کی تاسیس
علی گڑھ کی اسٹرائک (۱۹۰۷ء)
موجودہ بے چینی پر خیالات

کامریڈ کا اجراء
مہاراجہ بڑودہ اور توہین ملک معظم
مقدونیہ میں آؤ اور ہماری مدد کرو
ہمدرد کا اجراء
آل انڈیا میڈیکل مشن
حادثہ کانپور
مسلم یونیورسٹی
ترکوں کی پسند
چھندواڑہ کے شب و روز
مسز این بیسنٹ اور رہائی کی کوشش
وفد خلافت۔۱
وفد خلافت۔۲
وفد خلافت۔۳
وفد خلافت۔۴
وفد خلافت۔۵
تحریکِ خلافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ
کراچی کا مقدمہ
کوکناڈا کا خطبہ صدارت
خواجہ حسن نظامی سے جنگ
پہلی موتمر اسلام
شاردا ایکٹ (۱۹۲۹ء)
سفر یورپ بہ غرض علاج
نہرو رپورٹ
فسادات بمبئی (۱۹۲۹ء)
انقلاب افغانستان

گول میز کانفرنس

آخری علالت ووفات

ماتم

۲۹۴ صفحات کی اس کتاب میں برنی نے حواشی کے ذریعے اس کی زود فہم اور معلومات افزا بنادیا ہے۔اس کتاب کی تکمیل سے متعلق برنی لکھتے ہیں:

''مولانا محمد علی جوہر'' میں نے اپنی زندگی کے اس حصے میں مکمل کی ہے جہاں سے عالم بالا اب کچھ زیادہ دور نہیں رہا۔میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کسی مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لیا گیا۔واقعات جوں کے توں بیان کردیے گئے ہیں اور حتی الامکان محمد علی کے اپنے الفاظ ہیں۔وہ جیسے کچھ بھی تھے میں نے ان اوراق میں انھی کو پیش کردیا ہے۔مگر اس کے باوجود یہ کتاب ان کی زندگی کے ہر واقعہ پر حاوی نہیں ہے۔

میں نے ان بے شمار مضامین سے بھی فائدہ اٹھایا ہے جو ملک کے مختلف جرائد میں وقتاً فوقتاً نکلتے رہے ہیں۔۔۔''مولانا محمد علی جوہر'' محبت وعقیدت کا ایک حقیر گلدستہ ہے جسے میں رفیق کار، دوست اور عقیدت مند کی حیثیت سے محمد علی کی روح پر فتوح کے حضور میں اور ملک وملت کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔خدا سے دعا ہے کہ اسے عظمتِ رفتہ کی سی قبولیت حاصل ہو اگرچہ مجھے احساس ہے کہ یہ کتاب ویسی نہیں ہے جیسی میں پیش کرنی چاہتا تھا۔(۴۰)

برنی کی یہ کتاب گیارہ بارہ سال کی کدوکاوش اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔اس کے تصنیف کرنے میں انھوں نے اپنی معلومات ہی پر انحصار نہیں کیا بلکہ ہر اُس مصدر تک رسائی حاصل کی جہاں سے انھیں زیادہ سے زیادہ صحیح اور مکمل معلومات حاصل ہوسکتی تھی۔انھوں نے اس سلسلے میں ان لوگوں سے بھی رابطہ کیا جنھوں نے یا تو محمد علی جوہر کو دیکھا تھا اور بعض واقعات میں گواہ تھے یا ان کے بارے میں بہتر معلومات رکھتے تھے۔

جب انیس شاہ جیلانی نے برنی کو ۲۹ رجنوری ۱۹۶۴ء کو ایک خط کے ذریعے اطلاع دی کہ رئیس احمد جعفری کی کتاب ''علی برادران'' (۴۱) شائع ہوگئی ہے، جس کے جواب میں برنی نے انھیں خط لکھا کہ ''اس کتاب کے بعد میری کتاب کو بڑھ کر رہنا چاہیے، ورنہ اس کا شائع کرنا بیکار ہے۔۔۔بہر حال میں اس کا غور سے مطالعہ کرونگا تاکہ جو کمیاں رہ گئی ہیں وہ میری کتاب سے پوری ہوجائیں۔'' (۴۲)

جب رئیس احمد جعفری کی کتاب برنی تک تبصرے کے لیے پہنچی یا انھوں نے حاصل کی، تو انھوں نے جون ۱۹۶۴ء کے کتابی دنیا میں اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔تبصرے میں جہاں انھوں نے رئیس احمد جعفری کی خدمات کو سراہا ہے وہاں ان کی مذکورہ

کتاب میں پائی جانے والی تسامحات کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ایک مقام پر مولانا شوکت علی سے متعلق ان کے ''ذاتی تاثرات'' پر اعتراض کیا ہے چوں کہ وہ ان واقعات کے شاہد تھے لہٰذا صحیح صورت پیش کی ہے۔ انھوں نے لکھا ''واقعہ کے بیان کرنے میں ان سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں جس کی وجہ سے تفصیلات مبالغہ آمیز بن گئی ہیں۔'' (۴۳) ''اسی طرح محمد احسن کے متعلق یہ لکھنا کہ انھیں مع عملہ کے علیحدہ کر دیا گیا تھا، صداقت سے دور ہے۔'' (۴۴)

یہ جوابی خط سے ان کے حوصلے اور ان کے ارادے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً برنی نے ۶۴ء سے ۶۷ء تک اس سلسلے میں خاصی محنت کی ہوگی تاہم جس طرح کی کتاب وہ تصنیف کرنا چاہتے تھے ویسی نہیں لکھا جا سکی اس کی سب بڑی وجہ ان کی طویل اور خطرناک بیماریاں تھیں۔ مذکورہ کتاب کے دیباچے میں بھی برنی محمد علی سے اپنے دیرینہ تعلقات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جو خطوط لکھے ان میں سے بعض خطوط سے اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں تاکہ ان کے شوق، محنت اور ان کی جستجو اور جدوجہد کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔

علامہ نیاز فتح پوری

لاہور

۲۰ ستمبر ۱۹۶۴ء

میرے پاس مولانا محمد علی مرحوم کی کوئی خاص تصویر نہیں۔ چند خطوط ضرور ہیں جو غالباً اب تک شائع نہیں ہوئے۔ اور جو کچھ آپ مرتب کر رہے ہیں جب تک اس کا صحیح اندازہ نہ ہو میں خود کیوں کہ کچھ لکھ سکتا ہوں۔ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ سیاسی قائدوں میں مولانا جیسا شخص مشکل ہی سے ملے گا۔ اور ایسا مخلص نیز صاحب نظر انسان بہت کم دیکھنے میں آیا۔ (۴۵)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ

۱۹۔۔۔۱۹۶۷ء

آپ شوق سے محمو علی کی ڈائری سے اقتباسات لے سکتے ہیں لیکن یہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی ذاتی کتابیں ہیں ان سے بھی آپ خط کتابت کرلیں۔ (۴۶)

۳/اپریل ۱۹۶۷ء

آپ 'کلیات' مولانا شبلی اور 'حیات محمد علی' سے اشعار شوق سے نقل فرما سکتے ہیں۔ دارالمصنفین کی طرف سے اجازت ہے۔ (۴۷)

ابوالاثر حفیظ جالندھری

۲۹/اگست ۱۹۵۸ء

جناب ضیاءالدین احمد برنی کو اگرچہ مجھ ایسے خادم سے اجازت کی ضرورت نہ تھی تاہم اس ذریعے ملاقات یا تجدید ملاقات ہوئی۔ میری طرف [سے] محترم ممدوح کو اجازت ہے کہ میری نظم ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح، اپنی کتاب حیات محمد علی میں درج فرمالیں۔ میں اسے اپنی

عزت اور قدر دانی سمجھوں گا۔(۴۸)

**R.S.Chhatari,pfs**

**Ministry of External affairs,Karachi**

**10,Jan 1964**

I am in recept of your letter dated Dec,20th 1963 ,concerning material and (۴۹)photographs for the Biography of the late Maulana Mohammad Ali.

اس سلسلے میں برنی نے ذوالفقار علی بھٹو کو بھی خط لکھا تھا جب کہ وہ اس زمانے میں وزیر خارجہ تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ مولانا محمد علی جوہر نے انتقال سے چند دن پیشتر لندن میں سندھ کے معاملات پر ڈیڑھ گھنٹے تک سر شاہنواز بھٹو سے گفتگو کی تھی۔(۵۰) اس ضمن میں انھوں نے خط لکھ کر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو سے دریافت کیا تھا کہ "کیا اس گفتگو کی یادداشتیں ان کے والد کے کاغذات میں محفوظ ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ گول میز کانفرنس کے متعلقہ کاغذات بمبئی کی آتش زدگی میں جل گئے تھے۔"(۵۱)

کتاب کے اختتام پر برنی نے کتابوں اور خطوط سے جو معلومات حاصل کیں انھیں اصل یا ترجمہ کی صورت میں کتاب میں شامل کیا ہے تا کہ محمد علی جوہر کو دوسروں کی نظروں سے بھی دیکھا جا سکے۔ برنی نے اپنے زمانے میں یہ بالکل نئی اور اچھوتی کوشش کی تھی۔ اس سے قبل اس طرح کی معلومات ان ذرائع سے حاصل کر کے نہیں دی گئی تھیں۔

گرد پوش کی اندرونی جانب مرحوم ڈاکٹر ابو الخیر کشفی کی رائے کتاب کے بارے میں اہمیت کی حامل ہے۔"حیات مولانا محمد علی جوہر برنی صاحب کی ایسی کتاب ہے جو اُس وقت شائع ہو رہی ہے جب ہمیں محمد علی جوہر کی یادوں کے سہارے اپنی بازیافت کی ضرورت ہے۔

محمد علی خوش نصیب ہیں کہ ان کی حیات اور کارناموں پر خود ان کے علاوہ مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور کئی اکابر نے لکھا ہے۔ ان کتابوں اور تحریروں کی افادیت مسلم لیکن برنی صاحب نے ایک مرتب اور باضابطہ سوانح حیات لکھی ہے جس میں اُن کا مشاہدہ بھی شامل ہے اور تجزیہ بھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ مولانا محمد علی اور اس کتاب کی تصنیف کے درمیان ایک طویل زمانہ حائل ہے۔ تصویر کو دیکھنے کے لیے مناسب فاصلہ ضروری ہے ورنہ خدوخال گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ برنی صاحب کی حیاتِ محمد علی جوہر میں تناظر کا یہی نکتہ موجود ہے۔ مولانا محمد علی سے قرب اور محبت کے باوجود برنی صاحب نے فنِ سوانح نگاری کے آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔"

**طبع زاد انگریزی کتب:**

۱۰۔ **"Office Romance of the Oriental Translators"** (رومانس آف

## دی اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس)(۱۹۵۰):

یہ برنی کی انگریزی کی دوسری کتاب ہے۔ پہلی کتاب مولانا محمد علی جوہر کی حیات اور خدمات سے متعلق تھی جس کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ مذکورہ کتاب برنی کی اُس زمانے کی یادداشتوں پر مبنی ہے جس زمانے میں وہ بمبئی سیکریٹریٹ کے اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس میں سینئر ٹرانسلیٹر آفیسر تھے۔ اُس ملازمت میں انھوں نے ۲۷ سال کا طویل عرصہ (جولائی ۱۹۸۱ء تا ۳ فروری ۱۹۴۵ء) گزارا۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ برنی کے اپنے اشاعتی ادارے تعلیمی مرکز کراچی سے ۱۹۵۰ء میں شایع ہوئی۔ اس کا انتساب بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو کے نام اس طرح ہے:

### انتساب

### محترمہ سروجنی نائیڈو کی متبرک یاد کے نام

**جنھوں نے اپنی مادرانہ محبت وشفقت سے دومرتبہ ایک بے ایمان افسر کے بے رحم پنجوں سے بچایا**

''پیش لفظ'' چوں کہ کتاب کا اہم حصہ ہوتا ہے لہٰذا مذکورہ کتاب سے پیش لفظ آسان اردو میں ترجمہ کر کے نقل کیا جا رہا ہے (۵۲) تا کہ کتاب کی اہمیت سے آگاہ ہوا جائے:

میں اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس میں جولائی ۱۹۱۸ء میں ملازم ہوا اور ملازمت سے فروری ۱۹۴۵ء میں سبک دوش ہوا۔ ڈی سی واچ میکر کی طرح مجھے بھی سات او۔ ٹیوں (Oriental Translators) کے ماتحت کام کرنے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ ان میں سے صرف تین نام کے او۔ ٹی تھے۔ اپنے سبک دوش ہونے کے بعد سے میں معلومات جمع کرنے میں مصروف رہا ہوں تا کہ ایک کتابچہ شایع کر سکوں ان حضرات کے بارے میں جو کسی نہ کسی طرح سے او۔ ٹی آفس سے متعلق رہے۔ میری محنت ان صفحات کی شکل میں بارآور ہوئی ہے جنھیں وہ سب دل چسپی سے پڑھیں گے جنھیں او۔ ٹی آفس کی اہمیت کا اندازہ ہے۔ ان تمام دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس سلسلے میں اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور مفید معلومات فراہم کیں خصوصاً جے۔ ای۔ سنجانا جن کی ماتحتی میں مجھے بیس سال کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ ستارا کے ڈی۔ این۔ نبر نے شنکر پندورنج پنڈت کے بارے میں لوازمہ فراہم کیا۔ محترم لیڈی عباس علی بیگ، پی۔ ایس ستار، سید پیارے صاحب قادری، فتح الاسلام (برنی کے برادرِ نسبتی)، کشما دیوی راؤ، اور بہت سے حضرات کا شکر گزار ہوں ان کی امداد کے لیے۔

مجھے بس ایک بات کا افسوس ہے کہ یہ کتاب سر چیمن لال سیتل واد کی زندگی میں شایع نہ ہو سکی۔

زیڈ۔ اے۔ برنی، کراچی

۳۰ جون ۱۹۵۰ء

پہلے باب کو بھی اسی اہمیت کے پیشِ نظر کے اس کے ذریعے ہی برنی کے کام کی اہمیت کا انداز ہو جائے گا۔ بہ طور نمونہ پہلا باب بھی ترجمہ کر کے نقل کیا جاتا ہے:

## باب اول

۱۔ یورپین اورینٹل ٹرانسلیٹرز

۲۔ پہلے ہندوستانی او۔ ٹی کا تقرر

بمبئی کا جزیرہ پرتگال نے ۱۶۶۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ Humphrey Cooke کے الفاظ میں وہاں نہ کوئی حکومت تھی اور نہ ہی انصاف اور جب بمبئی میں کچھ پیدا نہیں ہوتا تھا سوائے ناریل اور چاول کے۔

اس بے سروسامانی کی حالت سے نکل کر بمبئی نے ترقی کی اور برطانوی سلطنت میں دوسرا بڑا شہر بن کر ابھرا۔ آہستہ آہستہ نمائندہ ادارے قائم ہوتے گئے اور ہفتہ وار اور روزانہ اخبار بھی شایع ہونے لگے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے انیسویں صدی کے شروع میں اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ ایک افسر عرضیوں اور درخواستوں کے کام کے لیے مقرر کیا جائے کیوں کہ برطانوی تسلط کے آغاز میں گجراتی، مراٹھی، فارسی، ہندوستانی اور دوسری زبانوں میں گورنر کے نام درخواستیں دی جاتی تھیں۔ فارسی اس وقت کی سرکاری اور عدالتوں کی زبان تھی اس لیے سرکاری امور کے محکمے کے اندر ایک فارسی کا محکمہ شروع کیا گیا۔ اس شعبے کا افسر ڈپٹی سیکریٹری اور مترجم (ٹرانسلیٹر) کہ لیا جسے بعد میں او۔ ٹی کا نام دیا گیا اور بالآخر گورنمنٹ کا او۔ ٹی۔

ونیاک وسوڈی (Vinayak Wassoodey) کے تقرر سے پہلے یورپین دانش وروں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ ایک اور افسر بھی مقامی صحافت کے بارے میں رپورٹ تیار کرنے اور بمبئی پریذیڈنسی میں شایع شدہ مقامی مطبوعات کو رجسٹر کرنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس افسر کو مقامی مطبوعات کا رپورٹر کہا گیا اور اس کا آفس پونا میں عوامی ہدایت کے ڈائریکٹر کے آفس میں قایم کیا گیا۔

مرزا عباس علی بیگ کے دور میں یہ دونوں عہدے ایک عہدے میں ضم کر دیے گئے اور او۔ ٹی کے ماتحت دیے گئے۔ ونایاک واسو

دیو (Vinayak Wassoodev) پہلے ہندوستانی او۔ ٹی تھا جس نے ۱۸۷۹ء سے پورے پانچ سال اس حیثیت میں کام کیا۔

واسودیو سے پہلے جنرل کینیڈی او۔ ٹی تھا اور فارسی کے محکمے کا سربراہ بھی۔ جی۔ کے کی لسانی قابلیت کے اعتراف میں اس کی ماہانہ تنخواہ دو ہزار روپے مقرر کی گئی بشمول ضروری الاؤنسوں کے۔ جنرل کی وفات کے بعد تنخواہ گھٹا کر سولہ سو کر دی گئی اور ۱۸۶۴ء میں مزید کم کر کے سات سو پچاس کر دی گئی۔ جنرل کی ذمے داریوں میں حکومتِ ہند کے

احکامات کا مراٹھی اور گجراتی میں ترجمہ کرنا تھااور عوامی اور عسکری امتحانات کی کمیٹی کی صدارت بھی۔ جرنل کے بعد ایک آئی۔سی۔ایس افسر جو کہ حکومت کا ڈپٹی سیکریٹری تھااو۔ٹی کی جگہ مقرر کیا گیا۔

ونس کینیڈی کے مندرجہ ذیل نوٹ سے جو اس نے نوطرزِ مرصع کے سرورق کی پشت پر تحریر کیا، جرنل کی زبان دانی اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے:

میں تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ہندوستانی زبانوں کے اس کام بہ عنوان نوطرزِ مرصع (جس میں فرخندہ سیَر، شاہِ روم، کی کہانیاں ہیں) کو بہ غور دیکھا مجھے لگتا ہے کہ یہ تخلیقی کام خالص اور صحیح طرز اور اسلوب میں لکھا گیا ہے اور اسی لیے اگر یہ شائع ہو تو ہندوستانی کتابوں کی مانگ کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس زبان میں سیکھنے اور اس کے بارے میں معلومات میں معاون ہوگا۔

دست خط

ونس کینیڈی، بمبئی ۳ فروری ۱۸۴۶ء

۱۸۶۱ء میں او۔ٹی کا عملہ بہت قلیل تھا اور مشتمل تھا ایک معاون تنخواہ سو روپے ماہ وار، ایک مراٹھی پنڈت (چالیس روپے)، ایک گجراتی پنڈت چالیس روپے، ایک مقامی منشی پچیس روپے، اور چھے چپراسی ہر ایک چھے روپے ماہ وار پر کیوں کہ او۔ٹی کا عملہ محدود تھا اس لیے حکومتِ ہند کے قوانین وضوابط بیرونی ایجنسیوں کے ذریعے ترجمہ کرائے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر گجرات ترجمے ہائی کورٹ کا ایک ملازم کرتا تھا، جب کہ مراٹھی ترجمے میجر کینیڈی خود کرتا تھا۔ بعض اوقات مختلف اشخاص ک ترجمے کے کام کے لیے عارضی طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی زبان میں تراجم صوبہء سرحد سے کرائے جاتے تھے اور بمبئی میں نہیں کیے جاتے تھے۔

**او۔ٹی کے فرائض اور ذمے داریاں:**

ا۔ صوبائی بلوں اور قوانین کا ترجمہ کرنا۔

۲۔ انڈیا بلوں اور ضوابط کے ترجمہ کرنا۔

۳۔ حکومتی اعلانات اور قوائد وضوابط کا ترجمہ کرنا۔

۴۔ متفرق سرکاری کاغذات اور دست آویز کا ترجمہ بہ شمول عرضیوں درخواستوں کے جو کہ سیکریٹریٹ کے مختلف محکموں سے بھیجے جاتے تھے۔

۵۔ دسٹرکٹ افسروں کو ان کے علاقے کی زبانوں میں بلوں اور قوانین کی فراہمی۔

۶۔ فارسی کے محکمے کا چارج یا کنٹرول جو کہ مقامی زبانوں میں لکھی گئی درخواستوں اور جو کہ مقامی اعلیٰ افسر سے مقامی زبان میں خط وکتابت کرتا تھا۔

۷۔ عزت مآب گورنر کے سامنے ترجمانی کے فرائض۔

۸۔بطور سکریٹری، انتظامات دیکھنا محکمے اور زبان کے امتحان۔
۹۔مقامی اعلیٰ افسر کی دیکھ بھال جب کہ وہ گورنمنٹ کی سیٹ بمبئی کا دورہ کر رہے ہوں۔
۱۰۔سرکاری توشے خانے کا انتظام۔
۱۱۔سیاسی محکمے کی مدد دربار اور دیگر ریاست کی تقریبات میں۔
۱۲۔متفرق کاموں کی انجام دہی جو شرقی زبانوں اور رسم و رواج سے متعلق ہوں۔
۱۳۔حکومت کے نمائندوں اور ان مقامی اعلیٰ افسروں کے درمیان رابطہ کا کام انجام دینا جو کہ انگریزی سے ناواقف ہوں۔
۱۴۔مقامی زبانوں کے تمام اخبارات و رسائل اور مطبوعات کے بارے میں رپورٹ پیش کرنا اور حکومت کی پالیسیوں اور اقدامات پر صحافتی تنقید، اور کسانوں اور رعیت کی شکایتوں کی دادرسی اور سدباب۔
۱۵۔متعلقہ افسران کو مشورہ دینا، اعلیٰ طبقے کے ان ہندوستانیوں اور امراء کے منصب وحیثیت کے بارے میں جو کہ گورنمنٹ ہاؤس کی تقریبات اور پارٹیوں وغیرہ میں شرکت کے خواہ ہوں۔

**ROMANCE**

OF THE

ORIENTAL TRANSLATOR'S OFFICE

(BOMBAY)

A PEEP INTO THE DIM PAST

CONTAINING

BRIEF BIOGRAPHICAL SKETCHES, ETC.

(With Illustrations)

ترجمہ

قصہ بمبئی کے دفتر مشرقی مترجم کا یعنی

ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے کی کوشش، بہ تصویر مختصر سوانحی خاکوں کے ساتھ

۷۶ صفحات کی یہ کتاب اسی نوع کی معلومات اور یاداشتوں سے بھری ہوئی ہے۔ تاریخ کے طالب اور خاص کر عہد حکومتِ برطانیہ سے دل چسپی رکھنے والے شخص کے لیے یہ کتاب نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اسے اس دور کی تاریخ کا ایک باب یا پہلو کہنا چاہیے۔ اس دور کی مکمل تاریخ لکھنے والے مؤرخ کے لیے مذکورہ کتاب سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ یہ کتاب نظرانداز کرنے والی نہیں۔ اس کے ذریعے جہاں برنی کی بہ حیثیت او۔ٹی ذمے داریوں اور کا پتا چلتا ہے وہاں ان کی پوری زندگی پر پڑنے والے

اثرات کا پتا لگانا بھی آسان ہو جاتا ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ اس دفتر میں گزارا تھا۔
ایک مقام پر تعلیمی مرکز، کراچی کی جانب سے اس کتاب کے بارے میں انگریزی زبان میں آرا کے اقتباسات "Press Opinions" کے عنوان سے دیے گئے ہیں۔ کتاب کی افادیت اجاگر کرنے کی غرض سے انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

**SUNDAY NEWS OF INDIA(Bombay)**

"...Biographical sketches of many eminent scholars who in the first few years graced the office,are provided with interesting stories..."

**THE HINDUSTAN TIMES(Delhi)**

"...This is a fascinating story of the years intervening the appointment of the first Indian Oriental Translator in 1857 and the closure of the British chapter of Indian history. The concluding portions abound in most amusing anecdotes relating to Oriental Translator's Office..."

**KESARI(Pona)**

"...Those historians who are fond of Oriental Languages,will apprenciate this work..."

**The P.E.N**

**A.world Association of Writers**

**(Bombay)**

"...Mr.Barni gives us short pen.pictures of the eminent men to letters that came to occupy the official chair and some interesting inside stories about them. How we wish tha the peep were of a longer duration..."

**THE HINDUS(Madras)**

"...In a way this book has its own value as a social record of its times..."

**HIS EXCELLENCY A.A.A.FYZEE**

**(Former Indian Ambassador in Egypt)**

"...I congratulate you on packing so much information in such a small book..."

۴- "Muhammad Ali, His life and services" (محمد علی، ہز لائف اینڈ سروسز) (۱۹۱۸ء):

برنی کی یہ کتاب انگریزی میں ہے، جولائی ۱۹۱۸ء میں گنیش اینڈ کو، مدراس نے شایع کی۔ مولانا محمد علی جوہر پر انگریزی میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔(۵۳) یہ کتاب اب ناپید ہے۔

برنی نے اس کتاب سے متعلق تفصیل اس طرح لکھی ہے:

> ۱۹۱۷ء میں ''نیو ایرا[لکھنؤ] میں میرا ایک مراسلہ شائع ہوا(۵۴) جس میں میں نے لکھا تھا کہ ''میں مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی سے خوب واقف ہوں اور اس لیے وثوق سے کہ سکتا ہوں کہ انھوں نے کبھی کوئی کام ایسا نہیں کیا جس کی پاداش میں انھیں نظر بند رکھا جائے۔'' اس کے بعد میں نے مطالبہ کیا تھا کہ ''اگر مولانا قصوروار ہیں تو ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے اور انھیں صفائی کا پورا موقع دیا جائے۔'' میرے اس مراسلہ کو پڑھ کر مدراس کے ایک مشہور پبلیشر (گنیش اینڈ کو) نے مجھے لکھا کہ انگریزی میں مولانا محمد علی کی مختصر سی سوانح عمری تیار کر دو۔ باوجود بے بضاعتی کے میں نے ہامی بھر لی۔ اس کے بعد میں نے مولانا کے متعدد دوستوں کی خدمت میں اس مضمون کے خطوط بھیجے کہ اس لائف کی تیاری میں وہ میرا ہاتھ بٹائیں۔ مگر سوائے ایک شخص کے کسی نے بھی مجھے جواب سے سرفراز نہیں فرمایا اور وہ صاحب تھے ولایت علی بمبوق۔
>
> یہ کتاب بالآخر چھدواڑہ میں مولانا محمد علی کی نظر ثانی کے بعد ۱۹۱۸ء میں شایع ہوگی۔ اس پر میرا نام درج نہیں ہے۔ اس لیے کہ کتاب کی اشاعت کے وقت میں مدخولہء حکومت ہو چکا تھا۔(۵۵) اس کتاب کا دیباچہ سر سی۔ پی۔ راما سوامی آئیر کا تحریر کردہ ہے جو پبلیشر کی دوخواست پر لکھا گیا تھا۔ یہ انگریزی میں مولانا کی پہلی مختصر لائف ہے۔(۵۶)

اس امر کی تصدیق برنی کی مختصر خودنوشت سے بھی ہو جاتی ہے۔ مزید معلومات کے لیے برنی کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' کے خاکے ''راجہ غلام حسین''، ''مولانا محمد علی جوہر''، ''ولایت علی بمبوق'' دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ برنی کی ایک اور تصنیف ''حیاتِ مولانا محمد علی جوہر'' بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے علاہ کہیں اور سے معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔

کیا وجہ ہوئی کہ برنی نے اس کا نیا ایڈیشن شایع نہیں کیا؟ غالباً برنی ہندوستان سے جو کتابیں تقسیم کے لائے تھے ان میں یہ کتاب نہیں آسکی ممکن ہے اسٹاک ہی ختم ہو چکا ہو۔

مولانا عبدالماجد ۲۲ اگست ۱۹۶۱ء کو مذکورہ کتاب کو یاد کرتے ہوئے برنی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ببموق کا حال پڑھ کر آپ کی انگریزی کتاب محمد علی کی یاد تازہ ہوگئی۔ میں نے اس زمانے میں کسی صاحب سے لے کر اُسے پڑھا تھا پھر جب سے اس کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ مدراس کے ایک صاحب کو لکھ رہا ہوں کہ اگر اس پبلیشر کا وجود باقی ہے تو کتاب خرید کر مجھے بھیج دیں۔

اور آپ سے عرض ہے کہ خدا کے لیے اور کام چھوڑ کر اس کا نیا ایڈیشن مکمل کر کے پاکستان سے نکالیے۔ ظاہرہ محمد علی کے اصل کارنامے خصوصاً سلسلہء خلافت تو ۱۸ء کے بعد ہی کے ہیں۔

## ترجمہ:

۱۔ بلھے شاہ، جس میں پنجاب کے مشہور و معروف صوفی، درویش اور شاعر کے سوانح اور تعلقات مرید و شیخ سے بحث کی گئی ہے: (۱۹۱۱ء)

۲۔ مسز اینی بیسنٹ کا پہلا لکچر: (۱۹۱۵ء)

۳۔ مسز اینی بسنت اور اسلام: (۱۹۱۷ء)

۴۔ شریف ترک: (۱۹۲۰ء)

۵۔ غدر کی صبح شام: (مارچ ۱۹۲۶ء)

۷۔ ماخذِ تاریخ ہند: (۱۹۲۹ء)

۷۔ خیالاتِ مہاتما گاندھی، حصہء اول اور دوم: (۱۹۳۴ء)

۸۔ اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں یعنی ڈاکٹر مسز اینی بیسنٹ آنجہانی کا لکچر: (۱۹۴۵ء)

۹۔ لطائفِ ملا نصر الدین: (۱۹۵۰ء)

۱۰۔ کیوپڈ و سائیکی: (۱۹۵۰ء)

۱۱۔ تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی: (۱۹۵۲ء)

۱۲۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز: (۱۹۵۲ء)

۱۳۔ اقبال از عطیہ بیگم: (۱۹۵۶ء)

۱۴۔ جدید کمیونزم کا ارتقاء: (فروری ۱۹۵۸ء)

۱۵۔ ابن خلدون اور امیر تیمور: (۱۹۶۷ء)

۱۶۔ تخیلات آلمان یعنی جرمنی اور آئندہ جنگ

ا۔　''بلھے شاہ''، جس میں پنجاب کے مشہور و معروف صوفی، درویش اور شاعر کے سوانح اور تعلقات مرید و شیخ سے بحث کی گئی ہے (۱۹۱۱ء):

برنی کی یہ تصنیف مسٹر ی۔ ایف۔ ازبورن کے ایک طویل مضمون کا انگریزی سے اردو ترجمہ ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۴۴ ہے۔ یہ کتاب پہلے پہل ''تذکرہ حضرت بلھے شاہ'' کے عنوان سے برنی کے بھائی منشی عبدالقدیر نے ''محبوب المطابع دہلی میں میرزا محبوب سید صاحب، چھپوا کر''، اپنے اشاعتی ادارے عبدالقدیر والاخوان تاجرانِ کتب دہلی سے ۱۳۳۸ھ میں ایک ہزار کی تعداد میں شائع کیا۔

میرے پیشِ نظر برنی کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن جس میں برنی نے بہت سی ترمیمات کی ہیں۔ مثلاً کتاب کا عنوان اس طرح سے ہے ''تذکرہ حضرت بلھے شاہ، جس میں پنجاب کے مشہور و معروف صوفی، درویش اور شاعر کے حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری سے بحث کی گئی ہے۔''

دسمبر ۱۹۱۱ء کے نظام المشائخ، دہلی میں یہ ترجمہ مضمون کے طور پر ''انگریزی تذکرہ حضرت بلھے شاہ کا ترجمہ'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ (۵۷) اس مضمون کے آغاز میں خواجہ حسن نظامی نے تعارف کرواتے ہوئے لکھا ہے:

> یہ مسٹر ازبورن کے انگریزی تذکرہ حضرت بلھے شاہ کا وہی ترجمہ ہے جس کا ذکر گزشتہ نمبر میں آچکا ہے۔ مسٹر ازبورن نے مسئلہ ہمہ اوست کے رنگ میں اس مضمون کی تمہید لکھی ہے اور تعلقات مرید و شیخ پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے حضرت بلھے شاہ کے کلام پر رائے زنی کی ہے جو اس قابل ہے یہ خوب غور و توجہ سے پڑھی جائے۔ (۵۸)

برنی نے بھی اسی مضمون کے آغاز میں انگریزی مضمون اور اردو ترجمے کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> اس مضمون کو تذکرہ حضرت بلھے شاہ کہنا تو کسی طرح موزوں نہیں ہے لائق مصنف کے ذہن میں بھی ضرور اس بات کا خیال آیا ہوگا اور اس وجہ سے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے غالباً انھوں نے تصوف۔ شیخ اور مرید کے تعلقات اور ان کے کلام پر مفصل ریویو لکھا ہے جس سے مضمون کی شان اور دل چسپی اور دل چسپی بہت بڑھ گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ مضمون اردو داں اصحاب میں مقبول نظروں سے دیکھا جائے گا۔ (۵۹)

کتاب کے شروع میں برنی کا تحریر کردہ ''دیباچہ'' اس دیباچے میں برنی نے بلھے شاہ کے سوانح اور ان کے کلام سے متعلق مختصر اظہار خیال کیا ہے۔

جا بہ جا حواشی دے گئے ہیں جو مصنف اور مترجم کے ہیں برنی نے اپنے حواشی سے کتاب کو زیادہ سہل اور زیادہ قابل فہم بنایا ہے۔ نظر ثانی شدہ ایڈیشن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ برنی نے نہایت توجہ سے اس کو بہتر اور زیادہ معلومات افزا

بنانے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً برنی اس ایڈیشن کو شایع کرنا چاہتے ہوں گے تاہم دیگر بعض اور کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکی۔

## ۲۔ ''مسز اینی بیسنٹ کا پہلا لکچر'' (۱۹۱۵ء):

برنی کے نام خطوط۱، میں میر بشارت علی جالبؔ دہلوی کا ایک خط موجود ہے، جس کا وہ حصہ جہاں تاریخ درج ہوتی ہے ضائع ہو چکا ہے اُس میں انھوں نے برنی کی ایک کتاب کا تذکرہ اس طرح کیا ہے'' ۔۔۔اس سے کہیں زیادہ ندامت مجھے اس پر ہے کہ تمہاری کتاب پر میرا ریویو ہمدرد میں نہیں نکل سکا۔'' اسی خط میں ایک جگہ لکھتے ہیں'' ۔۔۔میں نے مسٹر محمد علی کو یہ بات لکھ دی ہے اور اختتام ۱۵ء تک جس طرح اپنے مطبع کو چلانے میں کوشش کرنے کا وعدہ کیا ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۹۱۵ء سے قبل یا اسی سال کے اختتامی مہینوں سے قبل کا ہے۔ چناں چہ کہا جا سکتا ہے کہ برنی کی کوئی کتاب ۱۹۱۵ میں بھی شایع ہوئی تھی۔

یقیناً یہ وہی لکچر ہے جس کے لیے برنی نے ''اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں'' کے دیباچہ میں لکھا تھا'' ۔۔۔سب سے بڑی خدمت ان کے دو لکچر ہیں جو اسلام پر دیے گئے تھے۔ دونوں لکچر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ مسلمان انھیں غور سے پڑھیں اور سوچیں کہ دنیا ان کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ پہلا لکچر مدت ہوئی شایع ہو چکا ہے۔''

مذکورہ دیباچہ ہی میں برنی نے اس پہلے لکچر کا اقتباس بھی نقل کیا ہے اور اینی بیسنٹ کے حوالے سے لکھا ہے'' اس لکچر میں متعدد مقامات پر وہ انھیں (مسلمانوں کو) اُن کے ماضی کا واسطہ دے کر طرح طرح سے اُبھارتی ہیں اور ان سے درخواست کرتی ہیں کہ وہ مسلمان بنیں، جہالت کے داغ اپنی پیشانی سے دھو ڈالیں اور اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں کو دوبارہ زندہ کریں۔ پہلے لکچر میں ایک مقام پر وہ مسلمانوں کی غیر معمولی شجاعت کا اعتراف اپنے مخصوص مگر نہایت دل کش انداز میں فرماتی ہیں۔''

اس کتاب سے قبل برنی کی کسی اور کتاب کا پتا نہیں چلتا لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ یہ برنی کی پہلی تصنیف ہے۔

## ۳۔ ''مسز اینی بسنٹ اور اسلام'' (۱۹۱۷ء):

۱۹۱۷ء میں برنی نے مسز اینی بیسنٹ کے حالاتِ زندگی اور ان کی خدمات کا تفصیل جائزہ ایک ۲۰ صفحات کے ایک رسالے میں پیش کیا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ رسالہ کہاں سے اور کتنی تعداد میں شایع ہوا۔ رسالہ اب ناپید ہے۔

برنی اپنی دوسری تصنیف ''اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں'' کے دیباچہ میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ۱۹۱۷ء میں میں نے ''مسز اینی بیسنٹ اور اسلام'' کے عنوان سے ۲۰ صفحات کا ایک رسالہ شایع کی تھا جس میں اُن کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی تمام خدمات کا بھی بالتصریح ذکر کر دیا تھا جو انھوں نے اپنی طویل زندگی میں اسلام کے لیے انجام دی تھیں۔ اِن خدمات میں سب سے بڑی خدمت ان کے دو لکچر ہیں جو اسلام پر دیے گئے تھے۔

دونوں کے دونوں لکچر اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ مسلمان انھیں غور سے پڑھیں اور سوچیں کہ دنیا ان کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ پہلا لکچر مدت ہوئی شایع ہو چکا ہے۔ اُن کے دوسرے لکچر کا ترجمہ میں نے ۱۹۱۷ء میں لکھنؤ کے مشہور اخبار ''ہمدم'' میں ایسے زمانہ میں چھپوایا تھا جب کہ مسز بیسنٹ اپنی طویل نظر بندی سے رہا ہو کر باہر آئی تھیں اور میرے بزرگ اور محترم دوست سید بشارت علی صاحب جالب مرحوم نے اسے صفحہء اول پر نمایاں سرخیوں کے ساتھ کچھ اس طرح شایع کیا تھا گویا کہ وہ کوئی تحفہ ہے جسے مسلمان اُن کی رہائی کی خوشی میں تقسیم کر رہے ہیں۔ اب اسی لکچر کو از سر نو ترتیب دے کر پہلی مرتبہ رسالہ کی صورت میں شایع کیا جا رہا ہے تا کہ اہلِ بصیرت اس سے پوری طرح مستفید ہوں۔

برنی کے مذکورہ بیان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۷ء میں ''مسز اینی بیسنٹ اور اسلام'' کے عنوان سے ۲۰ صفحات کی ایک کتاب جسے کم ضخامت کے باعث رسالہ کہا جاتا ہے، شایع کی۔ وہ رسالہ طبع زاد تھا یعنی برنی کی معلومات اور فکر کا نتیجہ تھا کیوں کہ برنی نے دیباچے میں اسے ترجمہ نہیں لکھا۔ افسوس کہ وہ دونوں رسالے تا حال دست یاب نہیں۔ لہٰذا علاحدہ سے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

## ۴۔ ''شریف ترک'' (۱۹۲۰ء):

عبدالقدیر والاخوان تاجران کتب چھتہ لال میاں دہلی (۶۰) نے اپریل ۱۹۲۰ء میں اسے شایع کیا۔ اس پر برنی کا نام درج نہیں ہے۔ وجہ وہ ہی تھی جس کا تذکرہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ برنی سرکاری ملازمت یعنی ٹرنسلیٹر آفس، بمبئی سیکریٹریٹ، میں آ چکے تھے چناں چہ کسی ایسے موضوع پر قلم اٹھانا یا ترجمہ کرنا، ان کے خلاف جاتا ہوا سے جرم شمار کیا جاتا تھا۔ برنی کی تصنیف ''حیاتِ مولانا محمد علی جوہر'' میں اس کتاب کو برنی کی فہرستِ کتب شامل کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں جس قسم کے خیالات پیش کیے گئے ہیں وہ یقیناً حکومتِ وقت کے لیے کسی بڑے جرم سے کم نہیں تھے۔ تاہم برنی نے اپنی دوستی اور اس پیدا ہونے والی شجاعت و بہادری کو اپنے قلم کی قوت سے اور اپنے کام سے ظاہر کر دیا ہے۔ درحقیقت برنی اپنا اسلامی اور قومی فریضہ انجام دے دیا۔ اس وقت کتنے ایسے لکھنے والے ہوں گے جنھوں نے اس بہادری اور مظاہرہ کیا ہوگا اور اگر کسی نے کیا بھی تو اس کا حشر تاریخ میں درج ہے۔ یہ برنی کی دانش مندی ہے کہ انھوں نے کام کو فوقیت دی پسِ پردہ رہ کر وہ کام کیا جو میدانِ جنگ میں ایک جری سپاہی کرتا ہے۔

ایک اقتباس ابن حزم کے دیباچے سے دیکھیے:

ترکی سلطنت نے زوال کی جو حسرت ناک تصویر حال کی دنیا کے سامنے پیش کی ہے وہ ممکن ہے کہ مغربی لوگوں کے نزدیک قابل ہمدردی تصور نہ ہو لیکن مسلمان اس پر ماتم کیے بغیر نہیں

رہ سکتے۔

> بہ حیثیت مذہب کے اسلام کے خلاف جس قدر ستم توڑے گئے ہیں وہ دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اسلام کی تلوار مفت میں بدنام ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عیسائیت کی خاموش مگر تیز تر تلوار اپنے مظالم کی نوعیت میں تیغ اسلام سے بازی لے جاچکی ہے۔ عیسائیت نے مسلمانوں کے خلاف جہاد کیا۔(۶۱)

۴۸ صفحات کی یہ کتاب درحقیقت ابن حزم کا ایک طویل مضمون ہے، جو چند ترکوں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ جس میں ''اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ انگلستان کو کن کن طریقوں سے ترکوں کا مخالف بنایا گیا ہے نیز انگریزوں کو فرانس یا اٹلی کی بجائے دنیائے اسلام سے اتحاد کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور ان سے سلطنت عثمانیہ کو تباہی و بربادی سے بچانے کی آخری پرزور اپیل کی گئی ہے۔''(۶۲)

اس کتاب کو برنی نے اپنے حواشی سے اور بھی زیادہ قابل قدر اور قیمتی بنا دیا ہے۔ برنی کی اس کتاب کا تذکرہ برنی پر تحریریں نہیں ملتا وجہ اس کی ایک تو یہ کہ اس پر برنی کا نام نہیں دوسرے یہ کہ برنی نے بھی اس کا ذکر اپنی کتابوں میں کم کیا۔

## ۵۔ ''غدر کی صبح شام'' (مارچ ۱۹۲۶ء):

یہ کتاب پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۲۶ء میں ہمدرد پریس دہلی سے شایع ہوئی تھی۔ یہ ترجمہ ہے انگریزی کتاب '' Two Native Narratives of the Mutiny in Delhi '' کا، جس کا مرتب چارلس تھیوفلس منکاف C.T.Metcalfe(CHARLES THEOPHILUS METCALFE,C.S.I. of the Bengal Civil service) ہے۔(۶۳) یہ انگریزی کتاب منکاف کی زندگی میں شایع نہیں ہوسکی اس کے انتقال کے بعد اس کی بیوی ایستھر۔ جی۔ منکاف نے پہلی مرتبہ ۱۸۹۸ء میں A. Constable, London, Harvard University. کی جانب سے شایع کیا۔ شایع ہوئی جب کہ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں Seema Publications, University of Michigan سے شایع ہوا۔(۶۴) ۱۹۷۵ء میں اس انگریزی کتاب کا پہلا پاکستانی ایڈیشن البیرونی، لاہور سے شایع ہوا۔

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ برنی کے ترجمے کی پہلی اشاعت خواجہ حسن نظامی کے طباعتی ادارے کارکن حلقہء مشائخ دہلی کی جانب سے ہوئی۔ پاکستان میں اس کا دوسرا ایڈیشن ''جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، دو خفیہ روزنامچے'' کے عنوان سے ادارہء تخلیقات، لاہور نے بہ غیر کسی اجازات کے ستمبر ۱۹۹۹ء میں شایع کیا تھا۔ سرورق پر مصنف کے طور پر معین الدین حسن خان اور جیون لال کے نام درج ہیں۔ مترجم کے طور پر برنی کا نام سرورق پر نہیں ہے بلکہ اندرونی صفحے پر دیا گیا ہے۔ نام ''ضیاء الدین برنی'' لکھا گیا ہے۔ ناشر کی جانب سے کہیں کوئی وضاحت نہیں ہے کہ قبلاً یہ کتاب کب شائع ہوئی اور کس انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔

پاکستان آنے کے بعد اپنی اکثر کتابوں کی دوبارہ اشاعت اپنے ادارے ''تعلیمی مرکز، کراچی سے کی۔ مذکورہ

کتاب کے شائع نہ کرنے میں برنی کی اعلاظرفی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بات یقیناً ان کے علم میں تھی کہ خواجہ حسن نظامی اس کتاب کو اپنی ''غدر دہلی'' کی سیریز میں شامل کر چکے تھے اور اس کے ہر صفحے پر ''غدر کی صبح شام از خواجہ حسن نظامی'' لکھ چکے تھے لہذا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسے علاحدہ سے شائع کریں۔ برنی اور خواجہ حسن نظامی جن دیرینہ تعلقات کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے ان کا تقاضا بھی یہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ملا واحدی نے اپنی تصنیف ''سوانح خواجہ حسن نظامی'' میں ''غدر دہلی'' کی سیریز میں شامل سبھی کتابوں کو خواجہ صاحب کا قرار دیا تب بھی برنی نے ''کتابی دنیا'' میں تبصرہ کرتے ہوئے بھی اس امر پر کوئی تنقید نہیں کی اور کسی کتاب پر اپنا حق نہیں جتایا۔

اپنی تصنیف ''عظمت رفتہ'' میں برنی اس جانب بڑا واضح اشارہ کر چکے ہیں کہ ''غدر دہلی کے افسانوں کے سلسلہ میں دو کتابیں میری ترجمہ کردہ ہیں اور ان پر میرا نام درج ہے۔''(۶۵)

میرے پیش نظر اس کا پہلا ایڈیشن ہے جس کے سرورق کی عبارت اس طرح ہے:

۷۸۶　　ھوالکل　　یامعین

غدر دہلی کے افسانوں کا

**دسواں حصہ**

**غدر کی صبح شام**

**غدر دہلی ۱۸۵۷ء کی نسبت ایک ہندو اور ایک مسلمان کے لکھے ہوئے**

**دو خفیہ روزنامچے**

**حضرت خواجہ حسن نظامی نے انگریزی سے ترجمہ کرا کر شائع کیے**

مسٹر مولوی ضیاءالدین احمد برنی بی۔اے دہلوی

**کارکن حلقہء مشائخ بک ڈپو دہلی س منگایئے**

مارچ ۱۹۲۶ء

**مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی**

دراصل یہ کتابوں دو ہندوستانیوں ایک مسلمان معین الدین حسن خاں اور ایک ہندو جیون لال کے روزنامچے ہیں جنھیں چارلس تھیوفلس مٹکاف نے دریافت کیے اور اس کی بیوی اسٹھر۔جی۔مٹکاف نے شائع کیے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اس کا تعلق ۱۸۵۷ء کے غدر دہلی کے سنگین ترین حالات سے ہے۔ معین الدین حسن خاں انگریزوں کے مکمل قبضے کے بعد پولیس آفیسر کے طور پر سرکاری ملازم ہو گئے تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے

حالات کا نہایت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ انھیں روزنامچہ لکھنے کی عادت تھی۔ انھوں نے خراب ترین حالات میں بھی اس عادت کو ترک نہیں کیا۔ چناں چہ جب چارلس مٹکاف نے وہ کاغذات طلب کیے تو انھوں نے نہایت خوف کی حالت میں انھیں دیے اور اس وعدے کے ساتھ کہ وہ ان کی زندگی میں اسے شایع نہیں کریں گے۔

معین الدین حسن خاں کے انتقال ۳۱ جنوری ۱۸۸۵ء کے بعد مٹکاف نے تمہید میں لکھا:

> اس واقعہ (معین الدین حسن خاں کے انتقال) کی وجہ سے میں اپنے وعدے سے آزاد ہو جاتا ہوں جو میں نے ۱۸۷۸ء میں کیا تھا یعنی یہ کہ میں معین الدین حسن خاں کی حین حیات اس مسودات کی اشاعت نہ کروں گا جو انھوں نے مجھے ایسے حالات کے ماتحت دیے تھے جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔ میں اب ان مسودات کا انگریزی میں ترجمہ پیش کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ۱۸۵۷ء کی تاریخ غدر میں اس نمایاں اضافہ ہوگا۔ (٦٦)

خواجہ حسن نظامی نے اپنے دیباچ میں خدشہ ظاہر کیا ہے کہ معین الدین حسن خاں کے لکھے ہوئے حالات میں سے وہ حصے جن میں انگریزی سرکار یا انگریزوں کے خلاف لکھا ہوا تھا مٹکاف نے حذف کر دیا۔

امداد صابری اپنی ایک تصنیف میں منشی جیون لال کے مختصر حالات لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

> جیون لال نوعمری کے زمانے میں بھرت پور اور جے پور کے محاصرے کے وقت موجود تھے، جب کہ جون ۱۸۳۵ء میں مسٹر بلیک اسسٹنٹ ریذیڈینٹ مارے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ ان بے شمار پنشنوں کے محاسب مقرر ہو گئے جنھیں انگریزی گورنمنٹ بادشاہ کے خاندانوں کو دیا کرتی تھی اور اس طرح ان کی حیثیت ایلچی کی سی ہو گئی تھی جو گورنر جنرل کے ایجنٹ کے پاس سے مغلیہ بادشاہ کے دربار میں خفیہ پیغامات پہنچاتے تھے برسوں تک بادشاہ کا ان کے خاندان کا براہ راست تعلق رہا اور اس طرح سے وہ بادشاہ کے گرد و پیش کے مختلف افراد اور قلعے کی سازشوں سے واقف تھے۔ دہلی میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران یہ شہر میں مقیم تھے اور انگریزوں کو جنگی خبریں بھیجتے تھے۔ انھوں نے خبریں حاصل کرنے کے لیے اپنے علاوہ اور بھی مخبر مقرر کیے تھے۔ چناں چہ منشی جیون لال کو بھی مجاہدین سمجھتے تھے کہ یہ انگریزوں کے جاسوس و مخبر ہیں۔ (٦٧)

خواجہ حسن نظامی نے جیون لال کے متعلق لکھا ہے کہ اُس نے بادشاہ اور اس کے خاندان سے متعلق غلط بیانی کی ہے۔ چوں کہ وہ بھی سرکاری ملازم تھا ممکن ہے کہ اُس نازک زمانے میں اس نے یہ کام مجبوری میں کیا ہو۔ (٦٨)

اردو ترجمے میں، ابتداء میں خواجہ حسن نظامی کا دیباچہ ہے جس میں انھوں نے نہایت گہری تنقیدی اور تحقیقی نظر سے کتاب کا مطالعہ پیش کیا ہے اور معین الدین حسن خاں اور جیون لال کے بیانات کی روشنی میں بہادر شاہ، جنرل بخت خاں اور حکیم احسن

خاں کی پوزشنوں کو صاف کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے سلسلے میں اس کی حیثیت تاریخ کی ہے جس میں انگریزوں کی سازشیں اور مغل حکمرانوں کی گرتی ہوئی ساکھ کو دکھایا گیا ہے۔ ترجمے پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔ سلیس اور رواں ہے۔ ایک کمی محسوس ہوتی ہے انگریزی کتاب کے اختتام میں شخصیات کا اشاریہ دیا ہے جو بہت اہم ہے، جب کہ اردو ترجمے میں اس حصے کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ اردو ترجمے میں حواشی لکھ کر بعض معاملات کی وضاحت کی گئی ہے جس سے کتاب کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔

اس امر کو برنی کی اسلامی تاریخ سے دل چسپی اور بے خوفی سے حقائق کو سامنے لانے کے نہایت جرائت مندانہ جذبے سے محمول کرنا چاہیے کہ انھوں نے جن حالات میں اس کتاب کا ترجمہ کیا اور سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے، نہایت مشکل اور جان جوکھوں کا کام تھا۔

## ۶۔ ''ماخذِ تاریخِ ہند'' (۱۹۲۹ء):

یہ برنی وہ کتاب ہے جو شایع تو ہوئی مگر دست یاب نہیں۔ اس کتاب کا تذکرہ برنی کی کتاب ''جنگِ جمل'' میں آچکا ہے کہ ان کے دفتر اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس بمبئی میں ان کے ایک افسر عطا حسین نے اپنی کتاب '' Sources fo Indian History'' کے لیے پیش کی۔ برنی نے ترجمہ کیا تاہم عطا حسین کی عدم توجہی کے باعث ایک عرصے تک برنی کے پاس رہا پھر انھوں نے اس کا مسودہ برنی سے حاصل کر لیا اور اسے شایع کر دیا۔ یہ ترجمہ ستمبر ۱۹۲۹ء میں فیروز سنز، لاہور کی جانب سے شایع ہوا۔ جب کہ مترجم کے طور پر اپنا نام دیا۔ ان کے اس اقدام پر برنی نے باس پرس کی تو انھوں نے انکار میں کہا کہ یہ ترجمہ ان کا خود کا کیا ہوا ہے۔

چناں چہ برنی نے تمام تر مصالحتی کوششوں کے بعد با حالتِ مجبوری مسٹر عطا حسین پر بمبئی کی عدالت میں مقدمہ قایم کر دیا۔ برنی کا دعویٰ تھا کہ عطا حسین نے اپنی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ''ماخذِ تاریخِ ہند'' برنی سے کروایا تھا تاہم مسٹر عطا حسین نے برنی کو نہ اس ترجمے کے کام کا معاوضہ دیا بلکہ اسے اپنے نام سے شایع کر دیا۔

''جنگِ جمل'' میں تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ برنی مقدمہ جیت گئے۔ عدالت کے حکم کے باوجود عطا حسین کو ترجمے کا معاوضہ نہ دینے پر ملازمت سے برخواست کر دیا گیا۔

بہر حال مذکورہ کتاب کو برنی کی مطبوعہ کتاب میں شمار کیا جاتا ہے اگر چہ کتاب دست یاب نہیں ہے۔ دو کتابیں اور ایسی ہیں جن میں ایک کتاب ایسی ہے جس میں برنی کا نام مترجمین میں ہے اور دوسری کتاب وہ ہے جس پر برنی نے نظرِ ثانی کی ہے۔

## ۷۔ ''خیالاتِ مہاتما گاندھی''، حصہ اول اور دوم (۱۹۳۴ء):

یہ کتاب برنی کی ان کتابوں میں شمار ہوتی ہے جن سے ان کے نظریۂ صلح کل کا اظہار ہوتا ہے اور اس سلسلے میں ان کی کوششوں کا پتا چلتا ہے۔ ان کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں وہ خاکے جو غیر مسلم شخصیات پر لکھے گئے ہیں، ان میں برنی کے اس نظریے کا زیادہ واضح اظہار ہوا ہے۔ گزشتہ اوراق میں برنی کے نظریات اور تعلقات کے حوالے سے ایسی بہت سے مثالیں دی گئی ہیں

جن سے ان کے مساویانہ رویے اور مل جل کر امن وآشتی سے زندگی گزارنے کی پالیسی کا پتا چلتا ہے۔ باوجود ان امور کے برنی نے کبھی افتراع اور بہتان کو پسند نہیں کیا اور جہاں جس طرح موقع ملا حق گوئی اور صاف گوئی کا مظاہرہ کیا اور خاموش نہیں رہے اور اگر کسی موقع پر خاموش رہے بھی تو یقیناً اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ رہی ہوگی۔ گزشتہ اوراق کے مطالعے کے بعد برنی کی نیت پر شک کرنا بہت بڑی غلطی ہوگی۔ انھوں نے جو کام بھی کیے نہایت اخلاص، دیانت داری اور سچائی سے کیے۔

یہ کتاب برنی کے استاد، سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی انگریزی کتاب ''Mahatma Gandhi's Ideas includin Selections from his writings''(۶۹) کا اردو ترجمہ ہے۔ اس انگریزی کتاب کو THE MACMILLAN COMPANY,NEW YORK، نے شایع کیا۔ اینڈریوز کی تمہید سے پتا چلتا ہے کہ انگریزی کتاب بھی دو جلدوں میں تھی۔

برنی کا اردو ترجمہ معین الدین حارث، اجمل پریس، پرنس بلڈنگ، بمبئی۔ ۹ سے رفعت یار خان (۷۰) Chawl No.42,Worli,Bambay-18، نے شایع کیا۔

یہ ترجمہ دو جلدوں میں ہے اور دونوں جلدوں کی تعداد ایک ایک ہزار ہے۔ دونوں جلدوں میں ۵۱۲ صفحات ہیں۔ اس کتاب پر بھی بہ طور مترجم برنی کا نام نہیں ہے۔ یہ اسی زمانے کی کتاب ہے جب برنی مدخولہ بمبئی سیکریٹریٹ تھے یعنی حکومتِ برطانیہ کے ملازم تھے۔ ''عرض حال'' کے طور پر دیباچہ برنی ہی کا لکھا ہوا ہے۔ برنی اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں اس بابت لکھتے ہیں:

> ۱۹۳۴ء میں، میں نے ازراہ محبت اینڈریوز صاحب کی کتاب Ideas of Mahatma Gandhi (۷۱) کو اردو میں ''خیالات مہاتما گاندھی'' کے نام سے دو جلدوں میں شایع کیا۔ اسی طرح میں نے ان کے بہت سے دوسرے مضامین کا ترجمہ بھی شایع کیا تا کہ اہل ہند کو ان کی خدمات کا پورا پورا علم رہے۔ ''خیالاتِ مہاتما گاندھی'' کو میں نے بلبل ہند مسز نائیڈو کے نام ڈیڈیکیٹ کیا تھا جو اینڈریوز کی گہری دوست تھیں۔ (۷۲)

برنی نے اپنی اس مترجمہ کتاب کا تذکرہ اپنی تصنیف ''سی ایف اینڈریوز'' اور اپنی مختصر خود نوشت میں بھی کیا ہے۔

حصہ اول اور حصہ دوم دونوں کا سرورق بہت سادہ ہے اور اس پر عنوان ''خیالاتِ مہاتما گاندھی'' اور سی۔ ایف۔ اینڈریوز کا نام درج ہے۔ جب کہ اندرونی صفحے پر عنوان اس طرح ہے ''خیالاتِ مہاتما گاندھی، جس میں ان کی تحریرات کے منتخبات بھی شامل ہیں'' تحریر ہے اور مصنف کے طور پر سی ایف اینڈریوز کا نام درج ہے۔

میرے علم کے مطابق اس کا اردو ترجمے کا پہلا ایڈیشن ہی شایع ہوا ہے اس کے بعد شایع نہیں ہوئی۔ پیش نظر دونوں اولین اشاعت کے مندرجات اس طرح ہیں:

**حصہ اول:**

۱۔عرضِ حال من جانب مترجم

۲۔تمہید

۳۔عام ہندوستانی الفاظ کی مختصر فہرست

۴۔دیباچہ

## حصہء اول

## مذہبی ماحول

### ابواب

۱۔ہندو مذہب کا پس منظر

۲۔ہندو مسلمانوں کا مسئلہ

۳۔عیسائیت سے تعلق

۴۔''حضرت عیسیٰ کا مرتبہ''

۵۔روحی قوت کا آشرم

۶۔سودیشی کا مذہبی مفہوم

۷۔اہسا کی تعلیم

۸۔کھدر کا اخلاقی پہلو

۹۔ہماری اور اُن کی ذات

## حصہء دوم:

### ابواب

۱۰۔''اعلان معتقدات، ۱۹۰۹ء''

۱۱۔جنوبی افریقہ میں مقاومتِ مجہول

۱۲۔''ٹالسٹائی فارم''

۱۳۔ہندوستان میں ستیاگرہ

۱۴۔''ہر انگریز کے نام''

۱۵۔''سنتری اعظم''

۱۶۔فسادات بمبئی

۱۷۔مقدمہ اور قید

۱۸۔دہلی کا برت

۱۹۔ہندوستان کی تحریک نسواں

۲۰۔گاندھی کے ساتھ ایک صبح

۲۱۔خاتمہ

ضمیمہ جات

انگریزی کتاب کے عنوانات فہرست اس طرح ہے:

PART 1

THE RELIGIOUS OF HINDUISM

I.The Background of Hinduism

II.TheHindu-MuslimProblem

III.TheChristiancontact

IV."The place of Jesus

V.The Ashram of Soul-Force

VI.The Religious Meaning of Swadeshi

VII.The Teaching of Ahimsa

VIII.The Ethics of Khaddar

IX."Our shame and theirs"

PART II

THE HISTORICAL SETTING

X.AconfessfessionFaith, 19909

XI.Passive Resistance in south Africa

XII.Tolstoy Farm

XIII.Satyadraha in India

"عرض حال" کے عنوان سے برنی نے مترجم کی حیثیت سے مذکورہ کتاب پر اظہار خیال کرنے کے بجائے ترجمہ نگاری اور اس کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے جن امور کا خیال رکھا گیا ہے ان کا تفصیلی تذکرہ ہے۔علاوہ ازیں جن اصحاب سے انھیں

تعاون حاصل ہوا ان کا شکریہ حسب سابق کیا ہے۔ مسٹر گاندھی کی خودنوشت ''تلاشِ حق'' سے استفادے کا اعتراف ہے کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں مہاتما گاندھی زمانہ طالبِ علمی کی تصویر دی ہے جب وہ تعلیم حاصل کرنے لندن گئے تھے۔ برنی کی جانب سے اضافہ ہے انگریزی کتاب میں یہ تصویر نہیں ہے۔

اینڈریوز کی جانب سے تمہید میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہے کہ انھوں نے پندرہ سال سے زائد عرصے کو محیط ذاتی تعلقات کی بنیاد پر موہن داس کرم چند گاندھی کی سوانح کے وہ واقعات، جو ان کے طرہء امتیاز رہے ہیں اور ان کے خیالات کو انگریزی میں تحریر کریں۔

انھوں نے گاندھی کی تقاریر اور تحریرات سے اقتباسات بھی نقل کیے ہیں تا کہ لوگ گاندھی سا صحیح طور پر واقف ہوسکیں۔ حضرت عیسیٰؑ سے متعلق گاندھی کے خیالات اور بعض دیگر نظریات بھی خاصی حد تک اینڈریوز سے مطابقت رکھتے تھے چناں ان کا اظہار اور ان سے اپنی پسندیدگی کا اعلان و اظہار بھی اس کی اشاعت کا باعث بنا ہوگا۔ خیالات و نظریات سے مطابقت کا اظہار تو اینڈریوز اپنی تمہید میں کر چکے ہیں۔

برنی کے ''عرضِ حال'' اور عظمتِ رفتہ میں گاندھی پر خاکے سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ انھوں نے یہ کتاب کیوں ترجمہ کی۔ برنی کے خیالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے چند باتیں اس سلسلے میں غور طلب ہیں۔

ا۔ان کی وہی پالیسی جس کے تحت وہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلم مل جل کر رہیں جسے ''صلح کل'' سے تعبیر کیا جا چکا ہے۔ گاندھی ایک زمانے تک اسی پالیسی کے تمنائی اور دعائی رہے۔

۲۔ برنی کے استاد سی۔ ایف۔ اینڈریوز بھی اس کے آرزومند تھے کہ ہندو، مسلم اور عیسائی میں مذہبی اختلاف نہ رہے۔ برنی انھیں ایک تو اچھا استاد ہونے کی وجہ سے اور دوسرے ان کے انھی خیالات کی وجہ سے پسند کیا کرتے تھے۔ برنی نے ان کے بہت سے مضامین اور ان کی کتابیں ترجمہ کیں ممکن ہے یہ کتاب ترجمہ کرنے کے پیچھے بھی یہی امور ہوں۔

۳۔گاندھی کے وہ خیالات جو اسلام کے بارے میں تھے اور وہ کوششیں جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اتحاد و یگانگت اور بھائی چارے سے متعلق تھیں، خیال ہے کہ برنی نے انھی خیالات کی وجہ سے کہ اردو داں طبقہ اور خاص کر مسلمان ان کے ان خیالات سے بہ خوبی آگاہ ہو جائیں اور یہ بھی کہ ان کی جفاکش سخت جدوجہد سے عبارت زندگی کا مطالعہ کر لیں۔

اس کتاب کے حصہء اول سے ایک اقتباس مثالاً نقل کیا جاتا ہے، جس میں گاندھی کے اس نوع کے خیالات پائے جاتے ہیں:

> میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یہ امر قطعاً ناممکن ہے کہ وہ آپس میں شادی کریں اور ایک دوسرے کے مذہب پر قائم رہ سکیں، اور ہندو مسلم اتحاد کی حقیقی خوب صورتی اسی بات میں مضمر ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مذہب پر قائم رہے اور ساتھ ہی ایک دوسرے کا دوست اور بہی خواہ بھی رہے کیوں کہ ہمارے سامنے جو تخیل ہے وہ یہ ہے کہ

ہندو اور مسلمان حتیٰ کہ راسخ العقیدہ قسم کے اشخاص بھی ایک دوسرے کو اپنا قدرتی دشمن نہ سمجھیں جیسا کہ وہ اب تک سمجھتے آئے ہیں۔ (۷۳)

حصہ دوم سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

گاندھی جی نے اپنے جواب کو دہراتے ہوئے کہا: سچائی ہی وہ اولین شے ہے جس کی تلاش کرنی چاہیے اور خوب صورتی اور نیکی پھر خود بہ خود تم کو حاصل ہو جائیں گی۔ اسی چیز کی تعلیم درحقیقت مسیح نے پہاڑی والے وعظ میں دی ہے۔ عیسیٰؑ میرے خیال میں بہت زبردست آرٹسٹ تھے، اس لیے کہ انھوں نے سچائی کو دیکھا تھا اور اسی کی تلقین کی تھی۔ یہی کیفیت آں حضرتؐ کی تھی۔ فضلاء کا قول ہے کہ تمام عربی زبان میں قرآن انشا پردازی کے اعتبار سے نہایت جامع کتاب ہے چوں کہ دونوں نے پہلے سچائی کے لیے سعی کی اس لیے قدرتی طور پر عبارت کی خوب صورتی جلوہ گر ہوگئی۔ (۷۴) باوجود اس کے نہ حضرت عیسیٰؑ نے اور نہ حضرت محمدؐ ہی نے آرٹ پر کچھ تحریر کیا ہے یہی وہ سچائی اور خوب صورتی ہے جس کا میں متمنی ہوں، اسی کی خاطر میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اور اسی کی خاطر میں مرنا پسند کروں گا۔ (۷۵)

## ۸۔ ''اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں یعنی ڈاکٹر مسز اینی بیسنٹ آنجہانی کا لکچر'' (۱۹۴۵ء):

یہ ۳۲ صفحات کی ضخامت کا رسالہ ہے۔ جس کا سرورق بہت سادہ ہے۔ پیشانی پر ۷۸۶ کے بعد ایک ستارہ بہ غرض خوب صورتی بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد کتاب کا نام واوین میں اس طرح درج ہے:

۷۸۶

☆

''اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں''

یعنی

ڈاکٹر مسز اینی بیسنٹ آنجہانی کا لکچر

جسے

مرحومہ نے تھیوسوفیکل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۲ء میں دیا تھا

مترجمہ

ضیاء الدین احمد برنی۔ بی اے

۱۹۴۵ء

یہ رسالہ سلطان حسین نے اپنے فائن آرٹ اینڈ لیتھو پرنٹنگ پریس سے چھاپا اور مکتبہ سلطانی، بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳، سے ایک ہزار کی تعداد میں شایع کیا گیا۔ دیباچہ برنی کا تحریر کردہ ہے جس پر فروری ۱۹۴۵ درج ہے۔ یہ مسز اینی بیسنٹ کا وہ ہی دوسرا لکچر ہے جس کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے اور جس کا ترجمہ انھوں نے جالبؔ دہلوی کے اخبار ''ہمدم''، لکھنؤ، میں ۱۹۱۷ء میں شایع کروایا

تھا۔

یہ اُسی دوسرے لکچر کی نئی ترتیب کے ساتھ کتابی صورت ہے۔ برنی نے دیباچے میں لکھا ہے "اب اُسی لکچر کو از سرِ نو ترتیب دے کر پہلی مرتبہ رسالہ کی صورت میں شایع کیا جارہا ہے تاکہ اہلِ بصیرت اس سے پوری طرح مستفید ہوں۔"

برنی نے میر بشارت علی جالبؔ دہلوی کے خاکے مشمولہ "عظمتِ رفتہ" میں اس کتاب سے متعلق لکھا ہے:

> اس لکچر میں مسز بیسنٹ نے اسلامی تعلیمات پر نئے انداز سے بحث کی ہے اور آخر میں مسلمانوں کو علمی دنیا میں اپنا سابقہ وقار حاصل کرنے کے لیے پر زور الفاظ میں اکسایا ہے۔ (۷۶)

مذکورہ کتاب پر مزید کچھ لکھنے سے پیشتر مناسب ہوگا کہ "سچ" لکھنؤ اور "زمانہ" کانپور سے محترمہ اینی بیسنٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں۔

دیانرائن نگم کے زمانہ، کانپور، نومبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں سید محمد حفیظ (۷۷) "تھیوسوفیکل سوسائٹی کی تاریخ اور اس کے مقاصد" کے عنوان اس سوسائٹی کے مقاصد اس کا نظریہء زندگی اور فلسفے پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

> بیسوی صدی کے ربع آخر میں ہندوستان میں متعدد مذہبی انجمنیں قائم ہوئیں جن میں سے تھیوسوفیکل سوسائٹی نے مثل آریہ سماج کے ہندوستان کی معاشرتی، تعلیمی اور مذہبی بیداری میں بہت کافی حصہ لیا۔ پچاس برس کے عرصے میں اس نے انواع و اقسام کی خدمات انجام دی ہیں جن کا سرسری اعادہ کرنا بھی اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے صرف تین مقاصد ہیں جو ۱۸۹۶ء میں مزید ترمیم و تنسیخ کے بعد مندرجہ ذیل الفاظ میں منضبط کیے گئے۔
>
> ۱۔ ایک ایسا مرکز قائم کرنا جس کے ذریعہ جملہ بنی نوع انسان بلالحاظ قوم، فرقہ مذہب، ذات پات، رنگ و روپ اور جنس کے ایک دوسرے کے شریک حال ہوکر عالم گیر اخوت انسانی کے اصول پر عمل پیرا ہوں۔
>
> ۲۔ دنیا کے مذہب فلسفہ اور سائنس کا باہمی موازنہ کرنا اور ان کے مطالعہ کی ترغیب دینا۔
>
> ۳۔ انسان کے باطنی قواء اور قدرت کے مخفی قوانین کی تحقیقات کرنا۔
>
> یہی مقاصد اب تک سوسائٹی کے لیے شمع ہدایت بے ہوئے ہیں ان مقاصد میں سے اخوت انسانی پر عمل پیرائی اور بنی نوع انسان کے ساتھ محبت و ہمدردی، خلق اللہ کی بے غرضانہ خدمت پر زور دیا گیا ہے۔

> الختصر یہ سوسائٹی ان طالب علموں کی جماعت ہے جو مذہب و سائنس اور فلسفہ کا موازنہ کر کے مطالعہ کرتے ہیں اور ان کو اس امر کا یقین کلی ہوتا ہے کہ انسان کا علم محدود و نامکمل ہے اس لیے اسے چاہیے کہ بہ حیثیت حقیقت کے سچے طالب ہونے کے جہاں کہیں کوئی سچائی ملے اس کو حاصل کرے اور اس طرح سے روحانی اور علمی تشنگی کو رفع کرے۔(۷۸)

مولانا عبدالماجد دریابادی کے اخبار ''سچ''، لکھنؤ میں مولانا نے اینی بیسنٹ کے انتقال پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا:

> ملک کی مشہور و معروف خادمہ اور مخدومہ، مسز اینی بسنٹ رحلت کر گئیں اور ملک ان کے ماتم میں مصروف ہے۔ ولایتی ہو کر دیسیوں میں ایسی ملیں کہ اب کسی کو ان کے ولایتی ہونے کا یقین دلانا دشوار تھا۔لباس ،غذا،طرز معاشرت ہر شے میں ہندوستانی ہوگئی تھیں اور ہندوستان کی محبت میں تو کروڑوں ہندوستانی مردوں اور عورتوں سے بڑھی ہوئی۔
>
> یہاں ذکر اس حیثیت سے نہیں کرنا ہے، ایک روشن تر گو عام نظروں سے مخفی حیثیت سے کرنا ہے۔ یورپ کی ٹھیٹھ مادیت اور مادہ پرستی کے مقابلے میں مذہب و روحانیت کی ایک زبردست علم بردار تھیں۔(۷۹)

برنی اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں مسز اینی بیسنٹ پر خاکے اختتام میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> جب وہ اپنے رب سے ملی ہوں گی تو وہ اس خیال سے یقیناً مسرور ہوں گی کہ ان کی ساری ارضی زندگی ذات پات کی قیود سے بالاتر ہو کر خالصۃً بنی نوع انسان کی خدمت میں صرف ہوئی۔ان کی زندگی درحقیقت ''افضل الاشغال خدمت الناس'' کی تفسیر تھی۔(۸۰)

مذکورہ بالا بیانات سے اور برنی کے بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ برنی نے انھیں مصلح کُل کی حیثیت سے دیکھا اور جانا۔ برنی ایک پڑھے لکھے مسلمان تھے اور چاہتے تھے کہ دوسری اقوام کے سامنے مسلمان باعزت شخص کے طور پر گزاریں اور ان کا وہ وقار جو وہ کھو چکے ہیں وہ انھیں دوبارہ حاصل ہوجائے۔

انھی خیالات کے باعث برنی نے اینی بیسنٹ کے خیالات سے اتفاق کیا اور ان کے خیالات کو عام کرنے کی غرض سے کہ وقت کی ضرورت تھے، ان کو شایع کیا۔ برنی اپنے مقاصد میں نہایت سچے اور کھرے تھے ان کے مقاصد اخلاقی اور مذہبی تھے نہ کہ سیاسی۔ انھوں نے اگر کسی حمایت کی تو اس کے پیچھے بھی نیک نیتی اور اخلاص ہی کو دخل تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے برنی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے''تھیاسوفی سے تو آپ کا بھی تعلق رہا لیکن بحمداللہ آپ میں عمر کے کسی دور میں بھی اسلامیت یورپ یا غیر اسلامیت سے مغلوب نہیں ہونے پائی۔''(۸۱)

اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت اور قرآن اور حدیث اور سیرۃ رسول اللہ سے اسلام سچے اور برحق ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کی روح کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''تھیوسوفی کی حقیقت'' کے عنوان کے تحت اینی بیسنٹ لکھتی ہیں:

جس چیز کو ہم ''تھیوسوفی'' کہتے ہیں، اس کا تعلق دنیا کے بڑے بڑے مذاہب سے کیا ہے۔ جیسا کہ آپ نام ہی سے فی الفور معلوم کر سکتے ہیں، اگر ہم اردو میں اس کا ترجمہ کریں تو اُس کے سیدھے سادے معنی ہوں گے'' خدائی حکمت'' اس نام سے وہ حکمت مراد ہے جو دنیا کے تمام مذاہب سے علاقہ رکھتی ہے۔۔۔تھیوسوفی کسی خاص مذہب کی نہیں بلکہ ہر مذہب کی دوست اور محافظ ہے۔(۸۲)

دیگر عنوانات اس طرح ہیں:

اسلام پر اعتراضات

ایک اہم فرق

الامین

آپ کی سادہ زندگی

ابتدائی مسلمانوں کی محبت اپنے رسول سے

بیعت عقبہ

نیکی کا مفہوم

علم کی فضیلت

مسلمانوں کے علمی کارنامے

عورت کا درجہ اسلام میں

تعدد ازدواج

تلوار کا مذہب

آخر میں مسز اینی بیسنٹ نے ''ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپیل'' مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کی بات کی ہے۔ جس کے لیے وہ کوشش کرتی رہی تھیں۔

آخر میں چند اخبارات اور رسائل سے ان کے تبصرے کے اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جس اس کتاب پر اور بہتر صورت میں روشنی پڑے گی۔

**''بیدار''، ۲۴ جون ۱۹۴۵ء:**

برنی صاحب کا شمار ہندوستان کے ممتاز ترین اہل قلم کی صف اول میں ہوتا ہے مترجم نے اپنی علمیت اور خداداد قابلیت کی مدد سے ترجمہ کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ تھیوسوفی یعنی خدائی حکمت کی روشنی میں محترمہ نے حکیمانہ نگاہ اسلام پر ڈالی ہے اور ان کی طبعی ذہانت کا مکمل ثبوت ہے تقریر نہایت دل چسپ اور پر از معلومات ہے۔ مسلمانوں کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

## ''تصویر''، رام پور، خاص نمبر ۱۹۴۷ء:

ان کی نظر میں اسلام ہی دنیا کا سب سے زیادہ مصلح مذہب ہے اور حقیقتاً واقعہ بھی یہی ہے۔ مسلمانوں کے لیے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

## ''ڈان'' (اردو) کراچی، ۱۸ فروری ۱۹۵۱ء:

مترجم ضیاء الدین احمد برنی ہے اسے ملنے کا پتا تعلیمی مرکز ۵۰۱ گیدومل لیکھراج روڈ کراچی ۔مسز اینی بیسنٹ نے اسلام کا جو عمیق مطالعہ کیا تھا وہ آج بھی ہمارے لیے موجب بصیرت ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ ہمارے مقابلہ میں دوسرے ہم سے کس درجہ واقف اور باخبر ہیں ہمارے نوجوانوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ازبس مفید اور پر از معلومات ہوگا۔

برنی صاحب مشاق ترجمہ کرنے والوں میں آج ممتاز حیثیت رکھتے ہیں چناں چہ یہ ترجمہ حسب دستور اصل کا رنگ رکھتا ہے۔

## ''قومی زبان'' کراچی ۱۶ مارچ ۱۹۵۱ء:

یہ بھی ضیاء الدین صاحب کا ترجمہ رسالہ تعلیمی مرکز کی طرف سے شایع ہوا ہے۔ یہ مسز اینی بیسنٹ کے ایک لکچر کا اردو ترجمہ ہے جس میں مقررہ نے دین اسلام کی حمایت و وکالت کی تھی۔ اس میں تھیوسوفی نے کیا روشنی ڈالی اس کی کوئی خاص تشریح نہیں کی گئی۔ بارے لکچر خاصا مدلل اور ترجمہ خوبی سے کیا گیا ہے۔

## ماہنامہ ''فاران''، کراچی، مئی ۱۹۵۱ء:

مسز اینی بیسنٹ نے اپنی تھیوسوفیکل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۲ء میں ایک لکچر دیا تھا جس کا شگفتہ اور سلیس ترجمہ جناب ضیاء الدین برنی (بی اے) نے پیش فرمایا ہے اس کتاب میں مسز اینی بیسنٹ نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے حضور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ تحریر میں خلوص اور سادگی پائی جاتی ہے۔ مترجم نے جہاں جہاں ضرورت محسوس کی ہے

،اختلافی نوٹ بھی دے دیے ہیں۔

**ہفتہ وار ''منصف''، کراچی ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء:**

ضیاء الدین احمد برنی متحدہ ہندوستان کے مشہور ادیب اور بالغ نظر اہل علم تصور کیے جاتے ہیں۔ موصوف کی طویل ادبی کاوشیں محتاج بیان نہیں اور علم ادب کی جو گراں بہا خدمات موصوف نے انجام دیں وہ حقیقتاً لائقِ ستائش ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو پر آپ کو اعلیٰ عبور حاصل ہے۔ لیکچر اپنے موضوع کی بلندی و رفعت کے لحاظ سے بڑی عظیم الشان افادیت کا حامل ہے۔ جس میں مسلمانوں کی پستی کے اسباب نہایت مخلصانہ انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ سرورق خوش نما کاغذ چکنا ہے۔

**''ریاست'' دہلی، ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء:**

اس میں موجودہ دور کے مسلمانوں کے علمی انحطاط پر موثر انداز میں تنقید بھی کی گئی ہے۔

**''تہذیب'' پٹنہ، فروری ۱۹۵۳ء**

یہ چھوٹا سا رسالہ اصل میں مشہور تھیوسوفسٹ خاتون مسز اینی بیسنٹ کا ایک لکچر ہے۔ جو انھوں نے تھیوسوفیکل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں دیا تھا۔ اس خطبے میں موصوفہ نے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور بعض اُن اعتراضات کا جواب ہے جو اکثر دشمنان اسلام کرتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں کو بھی مخاطب کیا ہے۔

**''صبح امید'' بمبئی:**

اس لکچر سے مسز بیسنٹ کا اسلامی مطالعہ اور تجربہ کا علم ہوتا ہے کہ موصوفہ نے اسلام اور اسلامی تعلیمات سے گہرا تجربہ حاصل کیا تھا۔ اس لکچر میں اسلام کی خوبیوں کی شرح دلائل اور ثبوت کے ساتھ پیش کی ہیں۔ مسٹر برنی کی یہ خدمت لائق تحسین ہے۔

بعض تبصروں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ برنی نے ۱۹۵۱ء یا ۱۹۵۲ء میں اس لکچر کا تعلیمی مرکز، کراچی سے دل کش کاغذ اور عمدہ سرورق کے ساتھ نیا یعنی دوسرا ایڈیشن شایع کیا تھا۔

اس لکچر میں جہاں برنی کی ترجمہ نگاری کی خوبیاں نمایاں ہوکر سامنے آئی ہیں وہاں ان کا تحقیقی رویہ بھی قابل ستائش ہے۔ طرزِ تحقیق سے بہ خوبی واقف تھے چناں چہ انھوں نے مترجم کے طور پر کتاب میں جا بہ جا حواشی سے جہاں اس کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت کو بڑھایا ہے وہاں حقائق واضح بھی کیا ہے۔

کتابی دنیا میں برنی کی مطبوعہ دست یاب کتابوں کے اشتہار شایع ہوا کرتے تھے یا مصنف کی کتابوں کے ذیل

میں مطبوعہ دست یاب اور غیر دست یاب کی فہرست مختصر تعارف کے ساتھی دی جاتی تھی۔ ایک شمارے میں ''اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں کا اشتہار دیا تھا۔

## اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں

یہ مسز اینی بیسنٹ کے ایک لکچر کا ترجمہ ہے جس میں اسلام کی اعلیٰ اقدار کو سراہا گیا ہے اور مسلمانوں کو اکسایا گیا ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں کو اجاگر کریں اور علمی دنیا میں اپنا پہلا ساوقار پھر سے حاصل کریں۔

صفحات:۳۲　　قیمت:۲۵ پیسے　　20x30/16

### ۹۔ ''لطائفِ ملا نصر الدین'' (۱۹۵۰ء):

ملا نصر الدین کا تعلق ترکی سے تھا۔ ترکی والوں نے تو ایک قصبے ''ایسکی شہر'' میں اس کی قبر بھی دریافت کر لی ہے جہاں ہر سال میلہ ہوتا ہے جس میں ملاّ کے قصے سنائے جاتے ہیں اور اس کے سوانگ بھرے جاتے ہیں۔ (۸۳)

ملا نصر الدین کے لطیفے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ برنی نے ان کی اسی شہرت کو محسوس کرتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ان میں حکمت و دانائی کی باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ ان کا ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کے پیشِ نظر ایران کے ایک اہلِ قلم آقا محمد رمضانی کا فارسی زبان کا نسخہ تھا۔ (۸۴)

انھوں نے اُس نسخے کے تمام لطیفے ترجمہ نہیں کیے بلکہ ان کا انتخاب ترجمہ کیا ہے اور ان میں سے جو ''مذاقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں'' ان کا ترجمہ نہیں کیا بلکہ شستہ اور دل چسپ لطیفوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ان میں بعض مقامات پر اختصار سے کام بھی لیا ہے۔

انھوں نے یہ ترجمہ بمبئی میں جون ۱۹۴۲ء میں کر لیا تھا جب کہ اس کی اشاعت جون ۱۹۵۰ء میں کراچی میں عمل میں آئی۔ برنی نے ''کتابی دنیا'' میں اس کا اشتہار دیا اور اس سے متعلق یہ معلومات فراہم کیں:

## لطائف ملا نصر الدین

ترکی کے اس عظیم دانش ور کے لطیفے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ ان میں عقل کی باتیں بھی ہیں اور مذاق کی بھی۔ انھیں پڑھیے اور اپنے غموں کو بھول جائیے۔ غم کے لمحات کو خوشی میں تبدیل کرنے کا یہ آسان ترین نسخہ ہے۔

صفحات:۱۲۸۔　　قیمت:۲۵ء۱ روپے　20x30/16

مذکورہ اشتہار میں برنی کا نقطۂ نظر نہایت واضح ہے۔ ان میں تین باتیں ہیں ایک یہ کہ خوش ہونے اور لطف لینے کے لیے، دوسرے عقل بڑھانے کے لیے اور تیسرے یہ کہ غموں کو بھلانے یعنی رنج کو دور کرنے کے لیے ترجمہ کی گئی۔

میرے پیشِ نظر کتاب کا پہلا ایڈیشن ہے جو دو ہزار کی تعداد میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کا انتساب انھوں نے جواں

مرگ دوست اور ایرانی فاضل آقا خلیل دہدشتی۔ ایم۔اے (اسسٹنٹ پروفیسر، سینٹ زیویرز کالج، بمبئی) کے اسم گرامی کے نام کیا ہے جنھوں نے کتاب ''ملا نصر الدین'' انھیں اس غرض سے دیا کہ وہ اس کا ترجمہ کریں تا کہ ''ایران اور ہندوستان میں باہمی روابط میں اور زیادہ قرب اور استواری پیدا ہو جائے۔''

برنی نے اپنی ایک کتاب کے پس سرورق پر ''لطائف ملا نصر الدین'' پر رسائل اور اخبارات سے مختصر تبصرے نقل کیے ہیں۔ جن میں پی۔ای۔این (بمبئی)، ملاپ (دہلی)، فایر (کانپور)، نظام المشائخ (کراچی)، فاران (کراچی)، راہی (دہلی)، قومی زبان (کرچی) اور ڈان (اردو، کراچی) ہیں۔ فاران کراچی کا تبصرہ نقل کیا جاتا ہے۔

ترجمہ شستہ اور رواں ہے عبارت اس قدر سلیس ہے کہ ترجمہ کا گمان تک نہیں ہوتا اور سہل اتنا کہ چھوٹی عمر کے بچے بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ فاضل مترجم نے صحت زبان کا بہت خیال رکھا ہے۔۔۔۔ اس قدر اہتمام کے ساتھ اردو میں کتابیں کم چھپی ہیں۔۔۔ اس چھوٹی سی کتاب سے متعلق جتنی خوبیاں مذکورہ بالا تحریر میں بیان کی جا چکی ہیں ان پر مزید کچھ کہنا غیر اضافی اور غیر مفید ہوگا۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن، پاکستان نے ۱۹۷۵ء میں محمود شام کے قلم سے مصور رنگین نسخہ شایع کیا تھا جس میں ہر واقعہ سے متعلق ملا اور دیگر لوگوں کی تصاویر کارٹونوں کی صورت میں دی ہیں جس سے یہ نسخہ بچوں ہی کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ بہر حال دل چسپی سے خالی نہیں ہے۔

## ۱۰۔ ''کیوپڈ و سائیکی'' (۱۹۵۰ء):

۸۰ صفحات کی یہ کتاب بھی ''لطائف ملا نصر الدین'' کی طرح 20x30/16 کے سائز میں اور تعلیمی مرکز، کراچی سے پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۵۰ء میں شایع کی گئی۔ اس کا سرورق اور اندورنی صفحات کو ''ڈوروتھی ملک'' کی بنائی ہوئی یونانی طرز کی تصاویر سے مزین کیا گیا۔

برنی نے قصے کے اختتام پر لکھا ہے:

> اب کیوپڈ اور سائیکی کی کہانی ختم ہوتی ہے جسے ولیم ایڈ لنگٹن نے اپولی اُس کی لاطینی سے انگریزی میں منتقل کی۔ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۵۶۶ میں شائع ہوا اور میسرز چیٹو اور ونڈس نے تصاویر سے مزین کر کے اُسے ۱۹۱۴ء میں دوبارہ شایع کیا اور اب اردو میں یہ کتاب ترجمہ پہلی مرتبہ شایع کیا جا رہا ہے۔ (۸۵)

اس کے انگریزی میں کئی نسخے اسی نام سے مختلف مصنفین کے تحریر کردہ اور بعض دوسرے نام سے تحریر کردہ مختلف زبانوں میں تحریر کردہ، انٹرنیٹ ویب سائٹ www.books.google.com پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ برنی نے جس انگریزی نسخے سے ترجمہ کیا ہے اس کے مصنف بلکہ مترجم کا اس نے لاطینی زبان سے ترجمہ کر کے انگریزی زبان میں منتقل کیا، کا نام بھی دے دیا ہے اور اشاعت سے متعلق دیگر تفصیلات بھی دے دی ہیں۔

یہ کہانی در حقیقت محبت کے دیوتا کیوپڈ کی ارضی مخلوق سائیکی سے بیاہ کی دل چسپ کہانی ہے۔ برنی نے دیباچہ میں اس کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں اور اس کی اہمیت بھی اجاگر کی ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ برنی نے ترجمے کی ضرورت کیوں محسوس کی۔ وہ لکھتے ہیں:

> اہلِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ کیوپڈ اور سائیکی کی کہانی اپنی دل آویزی اور خوب صورتی کے اعتبار سے ایسی دل چسپ ہے جسے بچپن میں ایک مرتبہ سن لینے یا پڑھ لینے کے بعد بھی مدت العمر بھلایا نہیں جاسکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پاکیزہ کہانی ہر لغویت سے مبرا ہے قدیم زمانہ کی اسی کی متعدد کہانیاں اچھی اور سبق آموز ہونے کے باوجود اپنے اندر بہت کچھ فواحشات رکھتی ہیں۔ مگر کیوپڈ اور سائیکی کی کہانی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ان سب میں آپ اپنی نظیر ہے۔
>
> ترجمہ کرتے وقت میں نے اصل طرزِ تحریر کو قائم رکھا ہے اس میں مجھے ایک خاص لطافت نظر آئی اور اسی لیے میں نے جوں کا توں کا اُسے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔

مذکورہ کتاب میں فہرستِ عنوانات تو نہیں ہیں کیوں کہ عنوان ایک ہی ہے اور وہ ہے ''کیوپڈ و سائیکی کے بیاہ کی کہانی''، جب فہرستِ تصاویر دی گئی ہے۔ جو اس طرح ہے:

۱۔ سائیکی آسمان کی طرف لے جائی جا رہی ہے۔

۲۔ سائیکی چٹان پر

۳۔ زیفی رس دونوں کو اپنے شانوں پر اٹھائے لا رہا ہے

۴۔ کیوپڈ سرو کے درخت پر

۵۔ جنگلوں کا دیوتا اور کیوپڈ

۶۔ سائیکی بیدار ہو رہی ہے

۷۔ کیوپڈ معرضِ عتاب میں

۸۔ بیاہ کی تقریب

یہ کہانی در حقیقت نہایت دل چسپ اور ایک ہی نشست میں ختم کر لینے کی ہے۔ رنگین تصویریں پڑھنے والے کی دل چسپی اور شوق کو اور زیادہ ہوا دیتی ہیں اور کتاب ایک مرتبہ ہاتھ میں آنے کے بعد چھٹتی نہیں۔

اس کہانی کے مطالعے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ برنی میں تخلیقی جوہر بھی اعلیٰ درجے کا تھا۔ انھوں نے دنیا کی بہترین تخلیق کو ترجمہ کیا تو اسے نئی زندگی عطا کر دی اور طبع زاد اور ترجمے میں فرق کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ ترجمے پر تخلیق کا گمان ہوتا ہے۔ برنی کی بعض کتابیں جو طبع زاد ہیں ان سے تو برنی کی تخلیقی نثر سے لطف اندوز ہوا ہی جاتا ہے بعض ترجمہ کی جانے

والی کتابیں بھی وہی لطف فراہم کردی ہیں۔ یہ برنی کی ترجمہ نگاری کی مہارت تامہ ہے کہ انھوں نے ترجمہ کو طبع زاد بنا دیا ہے۔

نیاز فتح پوری کی کتاب ''نگارستان'' (۸۶) میں شامل ایک مضمون ''کیوپڈ و سائیکی'' میری نظر سے گزرا ہے۔ جس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ یہ قصہ انھوں نے کس انگریزی کتاب سے ترجمہ کیا ہے تاہم مضمون کا اسلوب نہایت رواں اور ان کی اچھوتی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مذکورہ کتاب سے برنی کی نثر کا ایک اقتباس بہ طور نمونہ نقل کیا جاتا ہے:

> اس طرح حسین سائیکی نرم اور نازک پودوں پر لٹا دی گئی گویا کہ وہ نرم اور خوشبودار پھولوں کا بستر ہیں اور جب اس کے بے چین دماغ کو بھینی بھینی خوشبو والے پھولوں کی سیج میں سکون ملا تو وہ گہری نیند سو گئی اور جب وہ کافی نیند سو کر تازہ دم ہو گئی تو وہ پہلے سے زیادہ دماغی سکون کے ساتھ اٹھی اور اسے خوش قسمتی سے ایک پر فضا جنگل نظر آیا جو بلند اور تناور درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ اسی طرح اس نے بہتا ہوا دریا بھی دیکھا جس کا پانی بلور کی طرح شفاف تھا۔

یہ وہ شاندار اور موضوع سے مطابقت رکھتی ہوئی چشمے کے پانی کی طرح رواں دواں نثر ہے، جس سے پوری کتاب مرصع ہے اور حسن و لطف کی فراہمی کا باعث ہے۔

## ۱۱۔ ''تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی'' (۱۹۵۲ء):

''پیش لفظ'' کے اختتام پر ۲۰ راپریل ۱۹۵۲ء تحریر ہے۔ یہی زمانہ اس کی اشاعت کا ہے۔ یہ کتاب برنی ان بہترین اور یادگار کتابوں میں سے ہے جسے بہت زیادہ پزیرائی حاصل ہوئی۔

برنی ترجمہ کرنے سے قبل ذاتی طور پر مولوی ذکاء اللہ سے واقف تھے۔ وہ ان کے والد منشی محمد الدین کے دوست تھے۔ (۸۷) ان کے بیٹے عنایت اللہ برنی کے دوست تھے۔ مولوی ذکاء اللہ برنی کے ہم محلّہ تھے۔ مولوی ذکاء اللہ کی بیماری کے زمانے تو وہ روز اپنے استاد سی ایف اینڈ ریوز کی ہدایت کے مطابق مولوی ذکاء اللہ خیر خیریت سے انھیں آگاہ کرتے تھے۔ (۸۸) یہ کتاب برنی کے استاد سی۔ ایف۔ اینڈ ریوز کی انگریزی کتاب Zakaullah of Delhi کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۵۲ء میں تعلیمی مرکز، کراچی سے پہلی مرتبہ شایع ہوا۔ اس کا انتساب اس طرح ہے:

### انتساب

**میں اس ترجمہ کو اُن تمام اشخاص کے نام سے نسبت دینا چاہتا ہوں جو اردو کے درخشاں مستقبل پر ایمان رکھتے ہیں اور اردو کی خدمت کو اپنا فرضِ عین سمجھتے ہیں۔**

اینڈ ریوز نے ذکاء اللہ دہلوی سے متعلق تمام لوازمے کو درجِ ذیل عنوانات میں منقسم کیا تھا:

پیش لفظ

دیباچہ

مقدمہ

تمہید

۱۔ پرانی دہلی

۲۔ مغلیہ دربار

۳۔ انگریزی امن وامان

۴۔ علوم جدیدہ

۵۔ ذکاء اللہ کا خاندان

۶۔ ذکاء اللہ کی ابتدائی زندگی

۷۔ غدرِ دہلی

۸۔ عہدِ وکٹوریہ

۹۔ تحریک علی گڑھ

۱۰۔ سیاسی حالات

۱۱۔ بڑھاپا

۱۲۔ ذکاء اللہ کی سیرت

پیش لفظ سے پہلے برنی نے کارڈینل نیومین کا یہ قول اردو ترجمے کے ساتھ نقل کیا ہے "اسی باعث یہ کہا گیا ہے کہ شریف آدمی کی یہ تعریف سی ہوگئی ہے کہ وہ ایسا شخص ہے جو کبھی دوسروں کو آزار نہیں پہنچاتا۔" کتاب کا پیش لفظ برنی کے دوست ڈاکٹر سید سجاد دہلوی ایم۔اے، پی ایچ ڈی (سابق صدر شعبہء اردو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن) (۸۹) کا تحریر کردہ ہے۔

سید سجاد دہلوی کے یہ الفاظ پیش لفظ کا ماحصل ہیں:

> یہ کتاب دنیا کی اُن چند کتابوں میں سے ہے جو انتہائی لٹریری دیانت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں جس کا موضوع ایک مسلمان ہے، انسان کی طبیعت کے اس عالی اور فطری سانچے کو برقرار رکھا ہے جس کو صانعِ حقیقی نے پیدا کیا ہے۔

برنی کی کاوش سے متعلق ڈاکٹر سید سجاد لکھتے ہیں:

> ضیاء الدین احمد صاحب برنی نے یہ علمی سعی کہ انھوں نے اس بلند پایہ کتاب کا نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ زرِ کثیر خرچ کر کے وہ اس کو شایع بھی کر رہے ہیں، نا قابلِ فراموش ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ جناب برنی صاحب نے اپنے ترجمے کے ذریعے سے اینڈریوز

مرحوم کی اصل تصنیف اور اس کے بیش بہا مواد کو ضائع ہونے سے بچالیا بلکہ اس کو حیاتِ مکرر بخش دی ہے اور مسٹر اینڈریوز جس شکریہ کے مستحق تھے اب وہ ایک گونہ ان کے مترجم کے نام سے منسوب ہوگیا۔

بہ قول برنی سی ایف اینڈریوز نے "Zakaullah of Delhi" پہلی جنگِ عظمیٰ سے پہلے تصنیف کر لی تھی۔(۹۰) اسی زمانے میں انھوں نے انھیں ترجمے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ حالات کی سختی کے باعث جنگ کے بہت عرصے بعد کلکتہ کے مشہور رسالے" ماڈرن ریویو" میں قسط وار شایع ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں ضروری ترمیمات کے ساتھ بہ صورتِ کتاب کیمبرج سے شایع ہوئی۔(۹۱) جس زمانے میں سی ایف اینڈریوز کی کتاب ماڈرن ریویو میں شایع ہوئی اسی زمانے میں برنی کا ترجمہ "تذکرہ مولوی ذکاءاللہ دہلوی" بھی زمانہ، کانپور میں شایع ہوا۔ جون ۱۹۴۷ء میں برنی نے کتاب کا مسودہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کے سپرد کیا تقسیم کے ہنگاموں میں جہاں اور بہت کچھ برباد ہوا وہاں برنی کا ترجمہ بھی نذرِ آتش کر دیا گیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد برنی نے از سرِ نو ترجمہ درست کیا اور ۱۹۵۲ میں اپنے ہی ادارے "تعلیمی مرکز"، کراچی سے مجلد ایک ہزار کی تعداد میں شایع کیا۔

اس کتاب کی اہمیت اس بات سے اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے کہ اس کا مقدمہ "ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم دہلوی" (۹۲) کا کردہ ہے۔ برنی کی معلومات کے مطابق یہ تحریر ڈپٹی صاحب کی آخری تحریر تھی۔(۹۳)

ڈپٹی نذیر احمد نے اردو میں مقدمہ تحریر کیا جسے ذکاءاللہ کے بیٹے عنایت اللہ نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس انگریزی ترجمے کو سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے اپنی انگریزی کتاب میں شامل کیا۔ وہ اردو مقدمہ ایک عرصے بعد علامہ راشد الخیری کے ہاتھ لگ گیا تاہم اس حالت میں کہ الفاظ اور سطریں اڑی ہوئی تھیں، انھوں نے اسی کو اپنے رسالے "تمدن، دہلی" میں اگست ۱۹۱۱ء میں شایع کر دیا۔ برنی نے اس اردو مقدمے کو تبرکاً اپنی کتاب میں شامل کر لیا اور انگریزی ترجمے کی مدد سے ان حصوں کا جوڑے ہوئے تھے ترجمہ کر کے اردو مقدمے میں قوسین میں شامل کر کے اسے مکمل کر دیا۔(۹۴)

یہ حقیقت ہے کتاب شوق اور محنت سے لکھی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ دل چسپ اور پر از معلومات ہے۔ مکمل سوانح عمری کا لطف دیتی ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ کتاب محض ذکاءاللہ کی سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے جس کا تعلق ذکاءاللہ سے اور نہیں بھی ہے۔ بعض معاملات کو سی ایف اینڈریوز اپنے نقطۂ نظر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ایسے ہی مولوی ذکاءاللہ کے بعض خیالات کو مصنفِ کتاب نے اپنے خیالات کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے مقدمے میں ذکاءاللہ سے متعلق یہ ضرور لکھا ہے کہ "ان کا دامنِ عقیدت لوثِ تعصب سے بالکل پاک تھا وہ سیدھے سادے آدمی تھے، وہ باہمی میل جول میں مذہب کو دخل ہی نہیں دیتے تھے، وہ سب سے خواہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا عیسائی، خلوص کے ساتھ ملتے تھے اور حاضر و غائب سب کے ساتھ ایک طرح کا سلوک کرتے تھے۔"(۹۵)

انگریزوں اور انگریز حکومت کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ انگریزی شاعر ٹینی سن کے بارے میں لکھتے ہیں "وہ غیر فانی شعراء میں تقریباً سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔"(۹۶) اس وجہ یہ ہے کہ ٹینی سن چوں کہ ملکہ وکٹوریہ کی بہت تعریف کرتا تھا۔(۹۷)

سی ایف اینڈر یوز کی تحریر کے اس اقتباس سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے:

ان کی [ذکاء اللہ] کی فطرت اس امر کی مقتضی تھی کہ ان کے روبرو ہمیشہ کوئی شخصیت رہے جس کی وہ تقلید کیا کریں اور جس چیز کی انھیں ضرورت تھی وہ انھیں انگریزی سیاسی زندگی کے لبرطبقہ میں نیز نیک نہاد ملکہ وکٹوریہ کے اعلیٰ اخلاقی کیرکٹر میں تمام وکمال مل گئی۔(۹۸)

ایسی سے بھی مثالیں اس کتاب میں ملتی ہیں کہ کوئی بات سی ایف اینڈریوز نے لکھی اور برنی نے اپنے استاد ہونے کے باوجود ان کی بات سے یا سوچ یا نظریے سے اختلاف کیا۔ جب اینڈریوز نے لکھا کہ ''جو اثر اور رسوخ مسٹر گلیڈ اسٹون کے نام نے اُن انگریزی دان ہندوستانیوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا جنھوں نے کھلم کھلا نئے علوم کو قبول کر لیا تھا۔''(۹۹)

برنی نے مذکورہ کتاب کے حاشیے میں اس بات سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا:

ممکن ہے اس دور کے ہندو مسلمان گلیڈ اسٹون کے بے حد مداح ہوں لیکن جب سے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا ہوا انھوں نے اُس کی پالیسی دربارہ ٹرکی کی ہمیشہ مذمت کی ''سامان سمیت ترکوں کو یورپ سے باہر نکال پھینکنے'' کا محاورہ بھی اسی کی اختراع تھی۔ اسے قرآن کریم سے بھی سخت پرخاش تھی۔ مترجم(۱۰۰)

برنی نے اس قسم کی حق گوئی کا مظاہرہ کتاب میں ہر اس جگہ کیا ہے جہاں انھوں نے جانا کہ حقیقت اس بیان کے برخلاف ہے۔

باوجود ایک سوانح عمری کے اس کتاب کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ ایک انگریز پادری کے خیالات اور نقطہ نظر سے کتاب کا مطالعہ کرنے سے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

مولانا ذکاء اللہ دہلوی کی تصنیف ''عرب قبل اسلام'' کے مرتب ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، کتاب کا انتساب برنی کے نام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''۔۔۔اینڈریوز کی یہ دولتِ بیدار آپ ہی کی بدولت ہمیں نصیب ہوئی ہے۔ تذکرہ ذکاء اللہ نے اس مرحوم کو بھی میری نظروں میں بلند تر کر دیا اور آپ بھی عزیز تر ہو گئے۔ اسی تذکرہ نے مجھے مقدمہ(۱۰۱) کے لیے بڑی حد تک مواد جسے میں نے اپنے طور پر مرتب کیا ہے تا کہ ایک خاص زاویے سے ذکاء اللہ کی عظمت اور اہمیت ابھار سکوں اور اب یہ کتابچہ آپ کی نذر ہے۔ کشفی''

مذکورہ کتاب میں جابہ جا برنی کے ترجمے سے بہ حوالہ استفادہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی مرحوم نے برنی کے تذکرہ ذکاء اللہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس پر کیے جانے والے تبصروں سے بھی ہوتا ہے۔ میرے پیشِ نظر وہ رسائل و جرائد ہیں جن میں مذکورہ کتاب پر تبصرے شائع ہوئے حوالے دیے جاتے ہیں:

''شیراز'' (کراچی) ۳۰ جنوری ۱۹۵۵ء۔ ''انجام'' ۱۶ مئی ۱۹۵۵ء۔ ''آفاق'' جون ۱۹۵۵ء۔ ''ریاض'' (کراچی) مئی ۱۹۵۳ء۔ ''صدق'' (لکھنؤ) ۲۷ فروری ۱۹۵۳ء۔ ''العلم'' (کراچی) جنوری ۱۹۵۳ء۔ ''تہذیب'' (پٹنہ) فروری

۱۹۵۳ء۔ ''ساغر'' (سالنامہ) (کراچی) ۱۹۵۶ء۔ ''قومی زبان'' (کراچی) یکم اپریل ۱۹۵۳ء۔ ''ڈان'' (انگریزی) (کراچی) مارچ ۱۹۵۳ء۔ ''ریاست'' (دہلی) ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء۔ ایوننگ ٹائمز (انگریزی) ۱۴ اپریل ۱۹۵۳ء۔ ''نظام المشائخ'' (دہلی) اگست ۱۹۵۳ء۔ ''جنگ'' (کراچی) ۲۲ جنوری ۱۹۵۳ء۔ ''منصف'' (کراچی) ۳۱ جنوری ۱۹۵۳ء۔ ''ماہ نو'' (کراچی) مئی ۱۹۵۳ء۔ ''فاران'' (کراچی) مارچ ۱۹۵۳ء۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا ''رفتارادب۔ اردو کی نئی مطبوعات پر تبصرہ'' کے عنوان سے مذکورہ کتاب پر تبصرہ ہے غالباً یہ غیر مطبوعہ ہے۔ عبدالمجید سالک کا برنی کے نام یکم جنوری ۱۹۵۴ء کا خط ہے جس میں مذکورہ کتاب پر مفصل تبصرہ ہے۔ یہ خط بھی غیر مطبوعہ ہے۔

چند تبصروں سے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

### شیراز (کراچی) ۳۰ جنوری ۱۹۵۵ء

''یہ تذکرہ سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے مولوی ذکاء اللہ دہلوی مرحوم کے حالات میں لکھا تھا۔ اسی۔ ایف۔ اینڈریوز کی انگریزی انشاء بڑی لطیف، دل نواز، شیریں اور مؤثر ہوتی ہے۔ اردو تحریر میں برنی صاحب کو بھی یہی ملکہ حاصل ہے۔ وہ ترجمہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ اصل کا تمام حسن ترجمے میں منتقل ہوجاتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر اُس دتی کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے جواب نقش ونگار طاقِ نسیاں ہوگئی ہے۔ وہی غدر کے بعد کی دتی۔ جواب ویران ہوجانے کے باوجود بھی آباد تھی۔''

### العلم (کراچی) جنوری ۱۹۵۳ء

''ضیاءالدین احمد برنی نے بڑی خوب صورتی سے اس کا ترجمہ پبلک کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب بہت برمحل ہے اس لیے کہ اس میں بعض ایسے تعلیمی مسائل کا حل موجود ہے جن سے آج پاکستان دوچار ہورہا ہے ان میں ایک مسئلہ ذریعہ تعلیم کا ہے۔ مولوی ذکاءاللہ چاہتے تھے کہ ذریعہ تعلیم طالب علم کی مادری زبان ہو۔ کتاب کا ترجمہ اس قدر اچھا ہے کہ ہم اسے ایک مستقل اردو تصنیف کا درجہ دے سکتے ہیں۔''

### ۱۲۔ ''سی۔ ایف۔ اینڈریوز'' (۱۹۵۲ء):

برنی کو سی۔ ایف۔ اینڈریوز (Charles Freer Andrews) سے غیر معمولی محبت اور انسیت تھی۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ جن میں اولین تو یہ کہ وہ برنی کے استاد تھے اور ایک بزرگ دوست بھی۔ برنی کو بزرگوں اور اساتذہ سے جو محبت اور عقیدت رہی ہے اس کی کئی مثالیں گزشتہ اوراق میں بیان ہوچکی ہیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ اینڈریوز بعض پادریوں سے مختلف تھے۔ وہ مسلمانوں سے اُس طرح کا بغض وکینہ نہیں رکھتے تھے جیسا کہ دوسرے رکھا کرتے تھے۔ برنی ان کی انتھک اور سبق آموز زندگی سے بھی متاثر تھے۔ برنی کو ان کی اور مولوی ذکاءاللہ کی دوستی عزیز تھی۔ ذکاءاللہ اینڈریوز کو بیٹا کہا کرتے تھے۔

برنی نے انھی تعلقات کے باعث اینڈریوز کی کتابیں ''مولوی ذکاء اللہ'' اور ''خیالاتِ مہاتما گاندھی'' اور مذکورہ کتاب کا ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ برنی نے اینڈریوز کے کئی مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے۔

برنی خود اپنے استاد کی سوانح لکھنا چاہتے تھے مگر مکمل مواد کی عدم دست یابی کے باعث ایسا نہیں کر سکے۔(۱۰۲) برنی کے دو دوست اور کالج کے ساتھی بنارسی داس چترویدی اور مس مارجوری سائکس (۱۰۳) نے سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی سوانح انگریزی میں لکھی۔ برنی نے اپنی خواہش کی تکمیل اس کا اردو ترجمہ کر کے کی۔ ان کی یہ کتاب ان کے ادارے تعلیمی مرکز، کراچی سے ۱۹۵۲ء میں شایع ہوئی۔ ۴۶۴ صفحات کی یہ ضخیم کتاب بھی برنی کی مقبول کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ کتاب پر سن اشاعت درج نہیں۔ برنی کی تمہید کے اختتام پر ۳۰ جون ۱۹۵۲ء تحریر ہے اس سے اس کی اشاعت کا پتا چلتا ہے۔ کتاب گرد پوش کے ساتھ شایع کی گئی تھی۔ گرد پوش پر اینڈریوز کی خوب صورت تصویر دی گئی ہے۔

گرد پوش کی اندرونی جانب برنی نے مختصر تحریر کے ذریعے سی۔ ایف۔ اینڈریوز سے متعلق وہ معلومات دے دی ہے جس سے اینڈریوز کی زندگی اور خدمات آئینہ ہو جاتی ہیں:

> اینڈریوز گنتی کے ان چند انگریزوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی خدمت خلق میں گذار دی۔ ہندوستان (بھارت و پاکستان) کی کوئی تحریک ایسی نہ تھی جس میں وہ شریک نہ رہے ہوں۔ ان کی بھرپور زندگی کا مقصد وحید خدمت الناس تھا اور یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے جس دل سوزی، خلوص اور محبت سے سمندر پار کے ہندوستانیوں کی خدمت کی اور ان کے معیار زندگی کو بلند کیا، وہ انھی کا حصہ تھا۔ ہندوستان کو آزادی دلانے میں بھی جو ٹھوس کام انھوں نے انجام دیا وہ امٹ ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے حاکموں اور محکموں (غالباً محکوموں) کے تعلقات کو ہر نازک موقع پر خوش گوار بنانے میں مدد دی۔ ان اوراق میں آپ کو ایک بے غرض اور شریف النفس انسان کی زندگی کے حالات بے کم و کاست ملیں گے جنھیں انگریزی میں بنارسی داس چترویدی اور مس مارجوری سائیکس نے ترتیب دیا ہے۔ کتاب میسرز جارج ایلن اینڈ اُن ون لمیٹڈ، لندن کی جانب سے شایع کی گئی ہے اور انھی کی اجازت سے اب اسے اردو کا لباس پہنایا گیا ہے۔ اینڈریوز کی حسین وجمیل زندگی میں آپ کو بہت سے سبق آموز واقعات ایسے ملیں گے کہ انھیں پڑھ کر آپ کا قلب متاثر ہوئے نہ رہے گا۔ اینڈریوز پادری تھے اور ساری عمر عیسائی رہے لیکن سب سے بڑھ کر وہ انسان دوست تھے، ان کی ساری زندگی تلاشِ حق میں گذری۔ وہ مذہبِ اسلام کا بہت احترام کرتے تھے۔

اصل کتاب میں دیباچہ ایم۔۔۔ کے گاندھی کا انگریزی زبان میں ہے۔ اس مختصر دیباچے کو برنی نے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ ضیاء الدین احمد برنی نیک عمل کرنے اور اس کے فروغ میں سرسید احمد خاں کی فکر کے قائل رہے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مذکورہ کتاب کا ترجمہ بھی اسی غرض سے کیا ہے۔

کتاب ہی کے مطالعے سے اس کے ترجمہ کرنے اور شایع کرنے کے مقاصد سامنے آجاتے ہیں جو یہ ہیں:

ا۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز برنی کے پسندیدہ استاد تھے۔ پسندیدہ اس لحاظ سے کہ وہ پاکیزہ زندگی گزارنے والے اور خدمت

الناس کے نظریے کے حامل اور عامل شخص تھے۔

۲۔اینڈریوز کی زندگی سوشل لایف تھی۔ وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کو پسند کرتے تھے۔ برنی نے ان کی سوشل زندگی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے اور دکھایا ہے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تمہید کے اختتام پر اپنی اس کو اہش کا اظہار کیا ہے کہ ''مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ جہاں کہیں اچھائی دیکھیں اسے اپنالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس کتاب کو اسی نقطہء نظر سے پڑھیں گے۔''

تمہید ہی میں ایک مقام پر برنی لکھتے ہیں کہ ''اس شاندار زندگی میں جو قیام پاکستان سے بہت پہلے ختم ہوگئی، بہت سی دل چسپ اور سبق آموز باتیں پڑھنے والوں کو ملیں گی اور میں چاہتا ہوں کہ قارئین کرام غور سے ان کے حالاتِ زندگی پڑھیں۔اس لیے کہ صرف اسی صورت میں وہ ان کی پاکیزہ زندگی سے متمتع ہوسکیں گی۔

ہمارے یہاں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو معاشرتی اور تعلیمی میدانوں میں مشنریوں کے طریقوں پر کام کرے۔ حال آں کہ ہمارے رسولؐ مقبول کا ارشاد گرامی ہے۔افضل الاشغال خدمت الناس مگر اس کے باوجود ہم میں ایسے قومی اداروں کی افسوس ناک کمی ہے جن کا مطمح نظر سوشل خدمت ہو۔اگر میری اس کتاب کے مطالعے سے قدرے قلیل مسلمانوں میں سوشل خدمت کا جذبہ ابھر آئے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی۔''

۳۔اینڈریوز بعض مسلمان رہ نماؤں مثلاً محمد علی جوہر، ذکاءاللہ دہلوی کے بہت اچھے دوست تھے۔

۴۔برنی کو برصغیر کی تاریخ اور خاص برطانوی عہد سے ناصرف دل چسپی رہی ہے بلکہ وہ اس عہد سے متعلق بہت کچھ جانتے تھے۔چناں چہ یہ کتاب ایک اچھی سوانح نے ہی نہیں بلکہ ہندوستان اور ہندوستان میں ابھرنے والی سیاسی، مذہبی تحریکات کی تاریخ بھی ہے۔

برنی کی مذکورہ کتاب پر جو تبصرے پاک و ہند کے رسائل و جرائد میں ہوئے شایع ہوئے ان میں ''فاران'' (کراچی) دسمبر ۱۹۵۲ء۔''شیراز'' (کراچی) ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء۔''ایوننگ ٹائمز'' (کراچی) ۳۰ دسمبر ۱۹۵۲ء۔''منصف'' (کراچی) ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء۔''ریاست'' (دہلی) ۱۵ دسمبر ۱۹۵۲ء۔''مدینہ'' (بجنور) ۱۵ اگست ۱۹۵۲ء۔''ریاض'' (کراچی)''جدید'' (لکھنؤ) ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۲ء۔''تہذیب'' (پٹنہ) فروری ۱۹۵۳ء۔''ریاست'' (دہلی) ۱۶ فروری ۱۹۵۳ء، ''قومی زبان'' (کراچی) ۱۲ مارچ ۱۹۵۳ء۔''العلم'' (کراچی) جنوری ۱۹۵۳ء ''ماہ نو'' (کراچی) مئی ۱۹۵۳ء۔''Dawn'' (انگریزی) (کراچی) ۱۵ دسمبر ۱۹۵۳ء۔''The Indian P.E.N'' جولائی ۱۹۵۳ء۔

ان تبصروں میں سے دو تبصروں سے اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

**''تہذیب''، پٹنہ، فروری ۱۹۵۳ء**

سی۔ایف۔اینڈریوز، مسز اینی بیسنٹ اور مسٹر بی جی ہارنی مین کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ روشن حرفوں میں لکھے جانے کا مستحق ہے۔ان تینوں قابل احترام شخصیتوں نے ترک وطن کر کے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا اور ساری زندگی نئے وطن کی خدمت میں صرف

کردی۔ بڑی ضرورت تھی، کہ اردو زبان میں ان قابل احترام بزرگوں کے سوانح حیات شایع ہوں تا کہ اُن کی پاکیزہ زندگی سے اردوداں طبقہ بھی روشنی حاصل کر سکے۔

**''قومی زبان''، کراچی، ۱۲؍مارچ ۱۹۵۳ء**

اینڈ ریوز ان انگریزوں میں سے، تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی خلق خدا کی خدمت کے لیے وقف کردی اور اس ملک کی ہر تحریک میں وہ جان و دل سے شریک رہے۔ پاکستان میں خدمتِ خلق کی طرف بھی لوگوں کو توجہ نہیں ہوئی ہے۔ اگر اینڈ ریوز کے سوانح حیات کے مطالعے سے یہ جذبہ بیدار ہو گیا تو مترجم کی محنت ٹھکانے لگے گی۔ مترجم اینڈ ریوز صاحب کے عزیز شاگردوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے شفیق استاد کی لائف کا ترجمہ بڑی محنت اور ذوق وشوق سے کیا ہے۔

## ۱۳۔ ''اقبال از عطیہ بیگم'' (۱۹۵۶ء):

کتاب ہٰذا عطیہ بیگم (عطیہ فیضی) کی انگریزی کتاب ''Iqbal'' (۱۰۴) کا اردو ترجمہ ہے۔ انگریزی مجموعے میں خطوط کی تعداد ۱۰ ہے جب کہ اردو ترجمے میں ۱۱ عدد خط ہیں۔ (۱۰۵) یہ اردو ترجمہ اقبال اکیڈمی، کراچی نے پہلی بار ستمبر ۱۹۵۶ء میں شایع کیا۔ دوسری بار ۱۹۶۹ء اور تیسری بار ۱۹۸۱ء میں شایع ہوا۔ (۱۰۶)

اردو ترجمے کی یہ اضافی خوبی ہے کہ اس میں عطیہ بیگم کی ذاتی ڈائری کے صفحات بھی شامل اشاعت کیے گئے ہیں جو یکم اپریل ۱۹۰۷ء سے ۴ ستمبر ۱۹۰۷ء کے زمانے کو محیط ہے۔ اس کے علاوہ ایک مضمون ''ایک بھولی ہوئی صحبت'' جو ۲۷؍اپریل ۱۹۴۶ء کو انجمن ہائی اسکول بمبئی کے ہال میں نواب حسن یار جنگ بہادر، کی زیر صدارت ہونے والے ''اقبال ڈے'' میں پڑھا گیا۔ اس جلسے میں عطیہ بیگم بھی شریک تھیں۔ انھوں نے ہی اس جلسے کو ترتیب دیا تھا۔ (۱۰۷)

برنی عطیہ بیگم اور اقبال کا کس قدر احترام کیا کرتے تھے اور انھوں نے کس طرح عطیہ بیگم آخیر زمانے تک کہ جب وہ نہایت پریشان کن حالات میں رہیں، برنی نے ان سے تعلق قایم رکھا اور ہر طرح ان کے کام آتے رہے۔ اقبال سے بھی برنی کا ایک خاص تعلق رہا ہے جس اظہار ان کے نام اقبال کے خطوط سے اور اقبال کے لیے برنی کے کاموں سے ہو جاتا ہے۔ ان سب باتوں کا تفصیلی ذکر گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔

برنی نے اقبال سے اپنے دیرینہ تعلق کو مذکورہ کتاب میں بھی اس طرح واضح کیا ہے ''میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ گزشتہ تیس پینتیس سال میں مجھے وقتاً فوقتاً علامہ موصوف کی خدمت میں حاضری دینے کا شرف حاصل رہا ہے۔'' (۱۰۸)

برنی پر عطیہ بیگم کے اعتماد کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی ڈائری کے وہ صفحات جن میں اقبال کا تذکرہ ہے برنی کو دے دیے کہ وہ شایع کر دیں۔ غالباً یہ صفحات بآسانی تو دست یاب نہیں ہوئے گے جب کہ عطیہ بیگم کو کسی طرح بھی شہرت عزیز نہیں تھی۔ یقیناً اس سلسلے میں برنی کو تگ ودو کرنی پڑی ہوگی۔

اس ڈائری سے متعلق برنی مذکورہ ترجمے کی تمہید میں لکھتے ہیں:

اس مجموعے کے ساتھ میں عطیہ بیگم صاحبہ کی ڈائری کے وہ حصے بھی شائع کر رہا ہوں جن کا تعلق اقبال کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ ڈائری قریب قریب انھی کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ میرا اپنا تصرف تو صرف اتنا ہے کہ میں نے کہیں کہیں ہجوں کو ٹھیک کر دیا ہے اور بعض جگہ لفظی ترمیمات کر کے گویا اس کے انگریزی پن کو دور کر دیا ہے اور بس۔ (١٠٩)

برنی نے انگریزی مجموعے میں عطیہ بیگم کی علمی مدد کی تھی جسے عطیہ بیگم نے اپنے پیش لفظ میں ان الفاظ میں سراہا ہے۔ "My thanks to Miss Hilla Vakeel and Ziauddin Burney for reading the Manuscript."(١١٠)

مذکورہ کتاب میں فہرست مضامین اس طرح ہے:

١۔ تمہید (از مترجم)
٢۔ سبب اشاعت (از عطیہ بیگم)
٣۔ اقبال (از عطیہ بیگم)
٤۔ ڈائری (از عطیہ بیگم)
٥۔ ایک بھولی ہوئی صحبت (از مترجم)
٦۔ خطوط اقبال کے بلاک (عکس)
٧۔ نظموں کے بلاک

تمہید میں برنی نے اقبال کے خطوط کی اہمیت اور قدر و قیمت نمایاں کی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

یہ خطوط جہاں تک اقبال کی زندگی کا تعلق ہے، گہری دل چسپی سے پڑھے جانے کی چیز ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں انھوں نے یورپ میں کس قسم کی زندگی بسر کی تھی۔ ہندوستان آنے پر ان پر کیا کیا افتادیں پڑیں اور وہ کیسی کیسی ذہنی تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ ایک خط سے ان کی گھریلو زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ وہ پہلو ہے جو آج تک پبلک کی نظروں کے سامنے نہیں آیا۔

بعض خطوط سے اقبال کے ذاتی خصائص اور اوصاف پر بھی روشنی پڑتی ہے۔۔۔ کچھ خطوط ایسے بھی ہیں جن سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال دنیاوی وجاہت کی کبھی پروا نہیں کی اور اگرچہ اُن پر برے وقت بھی آئے لیکن وہ بہ دستور سابق فلسفی، شاعر اور خواب دیکھنے والے ہی رہے۔

برنی نے اپنے ایک مضمون ''اقبال، دیگر مشاہیر اور عطیہ فیضی'' میں بھی عطیہ بیگم اور اقبال کے تعلقات اور پر اظہار خیال کیا ہے۔(۱۱۱)

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح اقبال کی زندگی میں یہ کتاب اہم رہی ہے اسی طرح ''اقبالیات'' کے ذیل میں لکھی جانے والی کتابوں میں بھی اس کا ذکر آتا ہے۔ یہ امر بھی اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے کہ یہ کتاب تین مرتبہ شائع ہوئی۔

ماہنامہ ''کتاب''، لاہور کی ایک اشاعت میں مذکورہ کتاب پر تبصرہ شائع ہوا تھا۔ جس سے ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

> اقبال، عطیہ فیضی کا مشہور انگریزی مقالہ ہے جو نواب حسن یا جنگ کی تحریک پر تقسیم ہند سے پہلے کتابی صورت میں شائع کیا گیا تھا۔ اس مایہ ناز تصنیف کا بیشتر مواد ان انگریزی مکتوبات میں سے بعض پر مشتمل ہے جو شاعر مشرق نے وقتاً فوقتاً مس فیضی کو لکھے تھے۔ اگر چہ ان مکتوبات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر عطیہ بیگم کے تجزیہ و تشریح کو حذف کر دیا جائے تو مذکورہ تصنیف کی اہمیت آدھی رہ جاتی ہے۔

### ۱۴۔ ''جدید کمیونزم کا ارتقاء'' (فروری ۱۹۵۸ء):

برنی کی بیشتر کتابیں وہ ہیں جو مقتضیِ وقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہوئے ترجمہ یا تصنیف کی گئیں۔ اس میں مالی منفعت کو دخل نہیں بلکہ علم و فکر اور آگہی میں اضافے کو دخل ہے۔

انھی کتب میں ''جدید کمیونزم کا ارتقاء'' بھی ہے۔ یہ کتاب Massimo Salvadori کی انگریزی تصنیف ''The Rise of Modern Communism'' کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۹۵۲ء میں Henry Holt and Company New York کی جانب سے شائع ہوئی۔

برنی نے ۱۹۵۸ء میں ترجمہ کر کے جاوید پریس، کراچی سے چھپوایا اور کتاب ایجنسی، تلک چاڑی، حیدرآباد، سندھ سے شائع کیا۔ بنیادی طور پر یہ کمیونزم کی تاریخ ہے جسے مصنف نے تین بڑے عنوانات کے تحت تحریر کیا ہے۔ وہ عنوانات یہ ہیں:

۱۔ کمیونزم، ابتداء سے ترقی کی پہلی منزل تک

۲۔ کمیونزم، ۱۹۲۳ء سے دوسری عالم گیر جنگ کے آخر تک

۳۔ کمیونزم، ۱۹۴۵ء کے بعد

برنی نے ''دیباچہ'' میں اصل کتاب کی قدر و قیمت اور ترجمے کی اہمیت اور ضرورت پر مختصر مگر جامع الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔ انھی کے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں:

> یہ کتاب ایک ایسے شخص نے لکھی ہے، جس نے قریب سے کمیونزم کی تحریک کا مطالعہ کیا ہے۔

اس چھوٹی سی کتاب میں جسے کمیونزم کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔ مصنف نے وہ سب کچھ بیان کردیا ہے جس کا جاننا ضروری ہے۔ مصنف نے بالکل غیر جانب داری کے ساتھ ان صفحات کو قلم بند کیا ہے اور اس میں وہ تمام باتیں آ گئی ہیں جو دنیا کی اس زبردست تحریک کے بارے میں ہر تعلیم یافتہ شخص کو جاننا لازمی ہیں۔ اسے موجودہ کمیونزم کی تاریخ بھی کہا جاسکتا ہے۔

مصنف نے جن سوالات کا جواب دیا ہے ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ کیا یہ تحریک کم زور پڑ جائے گی یا جوں کی توں رہے گی؟

۲۔ کیا اس کی اندرونی ہیئت میں کسی تبدیلی کا امکان ہے؟

۳۔ کیا کبھی چین اور سوویٹ کے کمیونسٹ لیڈروں میں اَن بن ہوسکتی ہے؟

۴۔ کیا اس تحریک کے علم برداروں میں جمہوری ملکوں جیسی آزاد خیالی یا حریت پسندی پیدا ہوسکتی ہے؟

یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات کا تجزیہ اس کتاب میں کیا گیا ہے اور ان کے جوابات دیے گئے ہیں۔ بہر حال ضرورت اس امر کی ہے کہ جمہوری ممالک کے لوگ اس تحریک کو پوری طرح سمجھیں اور یہ جان سکیں کہ اس تحریک کی طاقت کا سرچشمہ کیا ہے اور اس کی کم زوریاں کیا ہیں۔

اس کتاب نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کردیا ہے اور یہ کتاب پوری طرح کمیونزم کی تمام تحریک پر حاوی ہے۔ مصنف نے اختصار ہی اختصار میں وہ باتیں بیان کردی ہیں جو دوسرے مصنفین نے ضخیم کتابوں میں بھی بیان نہیں کی ہیں۔ اس کا طرز بیان منفرد ہے۔ ترجمہ کرتے وقت کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کے مفہوم کو عام فہم زبان میں ادا کردیا جائے۔

اس تاریخ میں بہت سی سبق آموز باتیں ہیں، جن کا جاننا اور غور کرنا اس دور کے ہر ذی روح کے لیے ضروری تھا۔ سرمایہ داری، کمیونزم اور جمہوریت اس زمانے میں کہ جب کتاب تصنیف کی گئی اور جب ترجمہ کی گئی اہم موضوعات تھے۔ برنی کی یہ کوشش سراہے جانے کے قابل ہے کہ انھوں نے وقت کے تقاضے کو نہ صرف محسوس کی بلکہ اس کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

### ۱۵۔ ”ابن خلدون اور امیر تیمور“ (۱۹۶۷ء):

اس کتاب کا انگریزی نام ”Ibn Khaldu-n and Tamerlane“ اور مفصل نام ”Ibn Khaldu-n and Tamerlane: their historic meeting in Damascus, 1401“ اس کا مصنف Walter Joseph Fischel ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں پہلی مرتبہ University of California Press, Berkeley and Los Angeles, California سے شائع ہوئی۔

برنی نے اس کا اردو ترجمہ ”ابن خلدون اور امیر تیمور“ کے نام سے ۱۹۶۷ء میں کیا۔ پاکستان میں شائع ہونے والا یہ پہلا ایڈیشن ہے۔ اسے اردو اکیڈمی سندھ نے بہ اشتراک، فرینکلن لاہور۔۔۔ نیویارک، نشاط پریس، کراچی سے چھپوا کر دو ہزار کی

تعداد میں شایع کیا۔ یہ ضخیم کتاب ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

برنی کی ترجمہ کردہ کتابوں میں سے یہ کتاب بہت اہم کتاب ہے۔ اس میں برنی کی محنت کا اندازہ کتاب کے مطالعے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ برنی نے ''عرضِ حال من جانب مترجم'' کے عنوان سے اس کتاب کی اہمیت اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی سے امر پر قیاس کرنا مشکل نہیں رہتا کہ برنی نے اس کا ترجمہ کیوں کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> یہ کتاب جس کا اردو ترجمہ اب قوم کے سامنے پیش کیا جارہا ہے، تاریخ کے ایک اہم دور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں تیمور اور ابن خلدون کی باہمی ملاقات کا تفصیلی بیان درج ہے اور یہ دونوں اپنے دور کی زبردست شخصیتیں تھیں۔ انگریزی مترجم پروفیسر والٹر جے۔ فشل نے اس اہم تاریخی واقعہ پر تفصیل کے ساتھ ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جسے تشنہ کہا جاسکے۔ ان کے حواشی بالخصوص ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

کتاب کے مصنف والٹر جے۔ فشل نے ''تمہید'' میں زیادہ وضاحت سے اس کتاب کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> جو مقالہ اب پیش کیا جارہا ہے وہ اُس لکچر کی توسیع شدہ صورت ہے جو پیرس میں مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کے ۱۲ ویں اجلاس (منعقدہ جولائی ۱۹۴۸ء) میں دیا گیا تھا اور جس میں ابن خلدون اور تیمور لنگ کے باہمی تعلق کا ابتدائی احوال مختصراً بیان کیا گیا تھا۔
>
> فی الحال موجودہ مقالہ میں عربی مخطوطات کے صرف اُس حصہ کا ترجمہ (مع حواشی کے) پیش کیا جارہا ہے، جس کا تعلق ابن خلدون اور امیر تیمور کی باہمی ملاقات سے ہے جو دمشق میں ۱۴۰۱ء میں ہوئی تھی اور جو تاریخی لحاظ سے بڑی اہم ہے۔
>
> اس اہم اور دلچسپ موضوع کو درج ذیل عنوانات میں منقسم کیا گیا ہے:

## تعارف

۱۔ تیمور اور ابن خلدون کے بارے میں ابن عرب شاہ کا بیان

۲۔ تیمور کے بارے میں دوسرے قدیم ماخذ

۳۔ ابن خلدون کی کتاب العبر

۴۔ مخطوطات کا باہمی تعلق

۵۔ ''خودنوشت سوانح عمری'' کا عنوان

۶۔ ''خودنوشت سوانح عمری'' ایک جداگانہ تصنیف کی حیثیت سے

۷۔ مکمل 'خودنوشت سوانح عمری'' کے مضامین

۸۔ موجودہ مقالہ کی حدود

## تعارف پر نوٹ

### اردو ترجمہ

۱۔ منگولوں اور تاتاریوں کے سلطان امیر تیمور سے ملاقات

۲۔ امیر تیمور سے ملاقات کے بعد ابن خلدون کی قاہرہ کو واپسی

۳۔ قاہرہ میں (ابن خلدون کا) قاضی کے عہدے پر تیسری چوتھی اور پانچویں مرتبہ تقرر

شرح

اہم واقعات کی تاریخ وار جدوَل

تفصیل کتب

اعلام کا اشاریہ

مقامات کا اشاریہ

تصاویر

والٹر جے۔ فشل نے یہ کتاب عمیق تحقیق کے بعد تصنیف کی ہے۔ ابن خلدون اور امیر تیمور پر اس وقت تک جو کچھ لکھا جا چکا تھا اس نے اس سب سرمایے کا مطالعہ کر لیا تھا۔ اس کے حواشی اور شخصیات اور واقعات کی شرح اس پر دال ہے۔

درحقیقت برنی نے بھی اُسی باریک بینی اور احتیاط سے اُس کا ترجمہ کیا ہے۔ والٹر ہی کی طرح برنی کا بھی شوق، محنت اور ترجمہ نگاری کی صلاحیت کتاب کے لفظ لفظ سے چھلکتی ہے۔ برنی نے اس اہم کتاب کا ترجمہ کر کے نہ صرف تاریخ اسلام کی خدمت کی ہے بلکہ اردو داں طبقات کی بھی خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے والٹر کی اس کتاب کو زندہ و جاوید کر دیا ہے۔

### ۱۶۔ ''تخیلات آلمان یعنی جرمنی اور آئندہ جنگ'':

برنی نے اپنی خودنوشت میں اس کتاب کا تذکرہ اس طرح کیا ہے''۔۔۔ مؤخر الذکر کتابوں میں فان برن ہارڈی کی کتاب Germany and the Next war قابلِ ذکر ہے۔ میں نے اس کتاب کا ترجمہ کر لیا تھا۔ مگر اُس کے انگریز ناشر نے مجھے اردو میں شائع کرنے کی اجازت نہ دی اگر چہ ڈپٹی کمشنر دہلی نے مجھے ایک خاص ملاقات میں اس کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے دہلی کی ایک مشہور ہستی حکیم غلام سبریا خان عرف بھورے خان صاحب کو اس کتاب کا مسودہ پیش کر دیا جو شاید اب بھی ان کی لائبریری میں موجود ہو۔'' (۱۱۲)

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ برنی نے کتاب کا مسودہ بھورے خان کو کیوں دے دیا۔ اپنے پاس کیوں نہیں رکھا تا کہ اسے خود چھپواتے؟ ممکن ہے بھورے خان نے چھپوانے کا وعدہ کیا ہو تاہم یہ امر بھی غور طلب اور تحقیق طلب ہے کہ برنی ''تاریخ

ہند کے مآخذ" کے مصنف عطا حسین کی طرح بھورے خان کے پیچھے کیوں نہیں پڑے؟

جو کتاب میرے پیش نظر ہے اس پر کتاب کا نام "تخیلات آلمان یعنی جرمنی اور آئندہ جنگ" ہے، مصنف کا نام جنرل ایف۔فون برن ہارڈی (Friedrich von Bernhardi) ہے۔عنوان کے نیچے یہ عبارت درج ہے "جس میں جرمنی کے وہ خیالات جو اس جنگ کی بنا ہیں درج ہیں اور جس کو قاری عبدالولی نے دفتر البیان سے شائع کیا صرف ٹائٹل اصح المطابع آسی پریس محمود نگر لکھنؤ میں چھپا، حقِ ترجمہ بنام طبع محفوظ ہے۔"

دیباچے میں "محمد عبدالولی" لکھتے ہیں: "....ہمیں بھی اس کے ترجمہ کا خیال پیدا ہوا اور ہم نے بہ صرف زرِ کثیر ایک نہایت لائق اور تجربہ کار گریجوئٹ کی بیش قیمت امداد سے اس کتاب کو اردو زبان کا جامہ پہنانے کی کوشش کی اور ایک خاص حد تک اس کا لحاظ رکھا کہ مصنف کی عبارت کا اصل مفہوم اور مطلب بدستور قائم رہے۔(۱۱۳)

کتاب پر کہیں سن اشاعت یا ترجمہ کیے جانے کا سن درج نہیں اور نہ اندر ہی کہیں کسی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مترجمہ کتاب کب شایع ہوئی۔

محمد عبدالولی کے "دیباچہ" میں دو باتیں ایسی ہیں جن سے اس کا سن اشاعت اور مترجم کا نام کا کافی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> موجودہ جنگ عظیم (جس کے جاں سوز شعلے اس وقت براعظم یورپ مین بھڑک رہے ہین اور جس نے اس وقت خطہء یورپ کے گلزار پرُ بہار کا جہنم کا طبقہ بنا رکھا ہے) تاریخ عالم مین اپنا نظیر نہین رکھتی۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہے کہ یہ کتاب پہلی جنگِ اعظیم کی درمیانی مدت (۱۹۱۸ء-۱۹۱۴ء) میں شایع ہوئی ۔دوسرے ان کا یہ لکھنا کہ "ہم نے بہ صرف زرِ کثیر ایک نہایت لائق اور تجربہ کار گریجوئٹ کی بیش قیمت امداد سے اس کتاب کو اردو زبان کا جامہ پہنانے کی کوشش کی۔"

اس دوسرے بیان سے خیال ضیاءالدین احمد برنی کی جانب بھی جاتا ہے تاہم یہ امر تحقیق طلب ہی ہے کہ برنی نے تو مسودہ بھورے خان کو دیا تھا عبدالولی تک کیسے پہنچا اور انھوں نے برنی کو "زرِ کثیر" کس طرح دی؟

جب کتاب میں دیے گئے حواشی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ برنی کی فکر سے مطابقت نہیں رکھتے حواشی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مترجم حکومتِ برطانیہ کا نمک خوار ہے اور کسی قدر چاپلوس بھی۔برنی کی مترجمہ جتنی کتابوں کا تجزیہ اس باب میں پیش کیا گیا ہے ان میں یہ بات واضح ہوگئی کہ برنی نے کبھی انگریزوں کی حکومت کو پسند نہیں کیا اور کسی حد تک مسلمانوں کا خیر خواہ سمجھتے اور ہمیشہ مسلمانوں کی حمایت کی۔جہاں کوئی غلط بات درج ہوئی اور انھوں نے اصل حقائق کو پیش کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھا۔

جولائی ۱۹۱۷ء کے ماہ نامہ "معارف" میں ایک کتاب "تخیلاتِ المان" پر تبصرہ شامل رسالہ ہے۔اس تبصرے سے بعض الفاظ کرم خوردگی کے باعث نہیں پڑھے جا سکے۔کتاب کے مصنف کا نام فان برن ہارڈی لکھا گیا ہے اور مترجم مسٹر عبدالقوی

بی اے کا نام درج ہے۔ تبصرے سے پتا چلتا ہے کہ زیر تبصرہ نسخہ، نسخۂ ثانی ہے۔ مبصر کے الفاظ اس طرح ہیں:

جرمن زبان کی وہ انقلاب انگیز کتاب جو موجودہ جنگ سے چند برس پہلے ۱۹۱۱ء میں جنرل ایف فان برن ہارڈی کے قلم سے "جرمنی اور آیندہ جنگ" کے عنوان سے نکلی تھی، تخیلات المان کے نام سے ہمارے دوست مسٹر عبدالقوی بی اے نے اس کو اردو میں منتقل کیا ہے، زیر نظر نسخہ طبع ثانی ہے، ایک سال کے اندر اردو میں کسی کتاب کا دوبارہ شایع ہونا اس کی مقبولیت کی کافی ضمانت ہے۔

جنرل فان برن ہارڈی کی وہ عجیب وغریب پیش گوئیاں جو اُس جنگ میں حرف بہ حرف پوری ہوئیں۔۔۔ حیرت ناک ہیں۔ جنگ کے فلسفے پر اور دنیا کے لیے اس کی ضرورت پر جو باب ہے وہ ہر مسلمان کے پڑھنے کے لائق ہے کہ اُس غزوات اسلامیہ کی حقیقت ظاہر ہوگی۔

ترجمہ نہایت کامیابی کے ساتھ انجام پایا ہے، کہیں کہیں عبارت میں پیچیدگی یا بیان میں ژولیدگی ہے وہ ترجمہ کا فطری حق ہے، تاہم طبع اول سے زبان اور طرز ادا نہایت صاف اور سہل الفہم ہے۔ پتہ آسی پریس محمود نگر لکھنؤ۔ (۱۱۴)

میرے پیش نظر جو نسخہ اور جس پر تبصرہ کیا گیا ہے دونوں پر پتا ایک ہی ہے اس سے یہ بات تو واضح ہے کہ یہ وہی کتاب ہے تاہم یہ ہوسکتا ہے کہ میرے پیش نظر نسخہ پہلا ایڈیشن ہو اور زیر تبصرہ ایڈیشن دوسرا ہو۔ ممکن ہے دوسرے ایڈیشن پر مترجم کا نام بھی درج ہو ورنہ مبصر کو کیسے معلوم یہ کہ فلاں کا ترجمہ ہے۔ جب کہ میرے پیش نظر ایڈیشن پر مترجم کا نام درج نہیں۔
بہر حال یہ مسئلہ ابھی مزید تحقیق کا متقاضی ہے تب ہی واضح ہو سکے گا کہ مذکورہ کتاب برنی کی مترجمہ ہے یا مسٹر عبدالقوی بی اے کی۔

حاصل کلام یہ کہ برنی نے بھی فان ڈی ہارڈی کی کتاب Germany and the nex war کا اردو ترجمہ کیا ضرور ہے۔ شایع ہوا یا نہیں یہ دوسری بات ہے۔

## ۱۷۔ "جدید طبی ایجادات" (۱۹۵۸):

یہ کتاب ترجمہ ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں ہے۔ کتاب کا نام ہے Modern Medical Deiscoveries مصنف ہے Irmengarde Eberle پبلی شر ہے Thomas Y.Growell Company, New York۔

اردو میں یہ ترجمہ اگست ۱۹۵۸ء میں اردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے دو ہزار کی تعداد میں شایع ہوئی۔ کتاب کے

مترجمین و مرتبین کے نام یہ ہیں:

ڈاکٹر ایس۔اے۔شکور

حکیم عطا الرحمٰن

سید ابوالخیر کشفی

ضیاء الدین احمد برنی

خواجہ آشکار حسین

کتاب کے آغاز میں مختصر تحریر کے ذریعے مترجمین و مرتبین نے کتاب کے مقصد کو اس طرح بیان کیا ہے ''ہم یہ کتاب بڑے اعتماد اور [اعتقاد اور جذبہء] خدمت کے احساس کے ساتھ آپ [حضرات کی خدمت] میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ کتاب [جدید طبی ایجادوں] (۱۱۵) کو انسانی تجربوں کے طویل۔۔۔(۱۱۶) پر آپ کی خدمت میں پیش کرے گی۔

'حقیقت افسانے سے دل چسپ ہوتی ہے' یہ کتاب آپ نے بارہا سنی ہے اور یہ کتاب اسی دعوے کی دلیل ہے۔ آج انسانی جدوجہد کی داستان الف لیلیٰ کی خواب آگیں فضا سے کہیں بڑی اور دلچسپ ہے۔''

اس کتاب کی حقیقت اور اہمیت و افادیت کو اس کے عنوانات سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ عنوانات کو چند بڑے اور چند ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بڑے عنوانات یہ ہیں:

۱۔　پنسلین۔محافظِ حیات

۲۔　سلفا دوائیں ساری دنیا کے لیے

۳۔　حال اور مستقبل کی نئی جراثیم کش دوائیں

۴۔　وریدوں میں تازہ حیات کی گردش

۵۔　زندگی کے دھارے کے بارے میں مزید راز

۶۔　جراثیم سے حفاظت

۷۔　حیاتین کی تلاش

۸۔　مستقبل کے راستے

کتاب میں کوئی پیش لفظ یا دیباچہ نہیں ہے۔ کتاب اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے ترجمے کو وقت کی ضرورت اور انسانیت کی خدمت کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ اس کا اسلوبِ بیان سادہ اور رواں ہے تمام معلومات کو کہانی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ کتاب اپنے خاص موضوع کے اعتبار سے شعبہء طب سے تعلق رکھنے والوں کے لیے زیادہ مفید و کار آمد ہے تاہم عام آدمی بھی اپنی صحت اور زندگی سے متعلق فکر مند رکھتا ہے اس کتاب سے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

کتاب کے تمام مترجمین کے کام کو علاحدہ علاحدہ کر کے دیکھنا اور نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے۔ اس سلسلے میں کتاب ہذا

کوئی مدد نہیں کرتی۔ کتاب ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب کا سرورق تین رنگوں میں جاذب نظر ہے۔

تصنیف اور ترجمہ کے علاوہ ایک ایسی کتاب بھی سامنے آئی ہے جو ان کی نظر ثانی شدہ ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل میں دی جاتی ہے۔

برنی کی کل مطبوعہ کتابوں کو واضح طور پر دو طرح سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ ایک ترتیب طبع زاد اور ترجمہ نگاری کے لحاظ ہو سکتی ہے۔ دوسری ترتیب سوانحی اور غیر سوانحی کے لحاظ سے ہو سکتی ہے۔

فنِ سوانح نگاری اور فن ترجمہ نگاری کے اعتبار سے برنی نے سارے فنی تقاضوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ ایک آزمودہ کار اور منجھے ہوئے سوانح نگار اور ترجمہ نگار ہیں۔ کسی زمانے میں بھی ان کی دونوں فنی مہارتوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا بلکہ سراہا ہی گیا ہے۔ چناں چہ یہ مطبوعات تاریخی، صحافتی اور ادبی حوالے سے نہ صرف اہم کتب ہیں بلکہ ہمیشہ ان کی ضرورت رہے گی۔ جیسا کہ کہا گیا ہے کہ یہ مطبوعات علاحدہ علاحدہ اپنے موضوعات کے حوالے سے ہی اہمیت کی حامل نہیں ہیں بلکہ یہ ایک دور کی تاریخ بھی ہیں۔ ان کی ایک بالواسطہ خوبی اور بھی اور وہ یہ کہ ان میں اسلامی روح بھی پیوست ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ برنی علم و ادب اور تاریخ ہی کی خدمت نہیں کہ بلکہ اسلام کی خدمت بھی کہ ہے۔

ان کتابوں سے جو مجموعی تاثر جنم لیتا ہے وہ یہ ہے کہ برنی نے حق بات کے اظہار میں یا صاحب حق کی حمایت میں نہایت جراءت و بے باکی اور بے خوفی کا مظاہر کیا۔ انھوں نے ہمیشہ وقت کی ضرورت کو پیش نظر رکھا۔ افادی ادب کی تخلیق میں سر سید احمد خاں کے نظریے کا حامل تھے۔ ان کی ساری تخلیقات میں یہ نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔

## حواشی وتعلیقات:

۱۔ کلیاتِ مکاتیب اقبال، سید مظفر حسین برنی، جلد اول، دہلی، اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء۔
۲۔ ایضاً۔
۳۔ ایضاً۔
۴۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن سے تو یہ پتا نہیں چلتا کہ پہلا ایڈیشن کس نے شایع کیا، تاہم ''معارف'' اعظم گڑھ، جلد ۹ نمبر ۳ مارچ ۱۹۲۳ء ص ۲۴۰ میں مذکورہ ایڈیشن پر تبصرے سے پتا چلتا ہے کہ برنی کے بڑے بھائی کے ادارے نے اسے شایع کیا۔
۵۔ ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ، ادارہ دارالمصنفین، مارچ ۱۹۲۳ء، ص ۲۴۰۔
۶۔ رسالہ سے مراد یہ تذکرہ جہاں آرا بیگم ہے۔ غالباً صفحات کی تعداد موجودہ تذکرے سے کم ہوگی لہذا برنی نے اسے رسالہ لکھا ہے۔
۷۔ اس سلسلے میں برنی کی تحریر کردہ اور مترجمہ کتابیں دیکھی جاسکتی ہیں۔
۸۔ یہ برنی کا انکسار ہے کہ وہ ۱۶۰ صفحات کی کتاب کو رسالہ لکھ رہے ہیں۔
۹۔ یہ اشارہ پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۲۱ء، دہلی، کی جانب ہے۔
۱۰۔ دیباچہ، دوسرا ایڈیشن، ص ا۔
۱۱۔ اقبال کا خط مرقومہ ۲۱ اپریل ۱۹۲۲ء، مشمولہ ''کلیات مکاتیب اقبال، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، جلد دوم، ۱۹۹۳ء۔
۱۲۔ اس کا ذکر گزشتہ اوراق میں برنی کے سوانح کے ذیل میں آچکا ہے۔
۱۳۔ سید جمال الدین افغانی از ضیاء الدین احمد برنی، دوسرا ایڈیشن۔
۱۴۔ دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۷، لاہور، پنجاب یونی ورسٹی، ص ۳۷۲۔
۱۵۔ تمہید، ''سید جمال الدین افغانی''، دوسرا ایڈیشن۔
۱۶۔ جنگِ جمل از برنی، محبوب المطابع برقی پریس دہلی، ۱۹۳۵ء، ص ۳۔
۱۷۔ عظمتِ رفتہ، ص ۴۲۱۔ ''کتابی دنیا'' مئی جون ۱۹۶۱ء، ص ۱۶ پر بھی مذکورہ کتاب کو برنی کا لکھا گیا ہے۔
۱۸۔ ''خدا سے دعا ہے کہ اسے 'عظمتِ رفتہ' کی سی قبولیت حاصل ہو'' (حیاتِ مولانا محمد علی جوہر از برنی، ص ۱۶)۔
۱۹۔ ''کتابیں ہیں چمن اپنا'' از عبدالمجید قریشی، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۲ء۔
۲۰۔ برنی کے تایازاد بھائی۔
۲۱۔ عظمتِ رفتہ، ص ۴۹۸۔
۲۲۔ تمہید، عظمتِ رفتہ۔
۲۳۔ ''گرد پوش''، ''چند یادیں'' از خواجہ جمیل احمد، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۷ء۔
۲۴۔ ڈاکٹر بشیر سیفی: ''خاکہ نگاری۔ فن وتنقید''، لاہور، نذیر سنز پبلی شرز، ۱۹۹۳ء، ص ۱۷۔
۲۵۔ پیش لفظ، عظمتِ رفتہ، ص ۵۔۴۔
۲۶۔ ''مجید لاہوری''، عظمتِ رفتہ، ص ۲۲۸۔
۲۷۔ ''علامہ شبلی نعمانی''، عظمتِ رفتہ، ص ۲۶۹۔

۲۸۔　''میر باقر علی داستان گو''، عظمتِ رفتہ، ص ۳۹۔

۲۹۔　''خواجہ حسن نظامی''، عظمتِ رفتہ، ص ۳۵۔

۳۰۔　خط پر ۱۲ دسمبر درج ہے۔ متن سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ ۱۹۶۱ء کے بعد کا ہے۔ ۶۱ء میں کتاب طبع ہوئی۔ ''عظمتِ رفتہ تو یوں بھی ''خاکہ نگاری'' کے ضمن میں پڑھائی جارہی ہے۔'' کا جملہ اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ یہ خط ۶۱ء کے بعد کا ہے۔ یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔

۳۱۔　خواجہ غلام السیدین کا خط برنی کے نام ہے جو امریکا کی یونی ورسٹی آف ہوائی سے لکھا گیا ہے۔ یونی ورسٹی کے ایسٹ ویسٹ سینٹر نے انھیں چند ماہ کے لیے مدعو کیا تھا۔ یہ کتاب انھوں نے وہیں دیکھی تھی۔ خط پر تاریخ درج نہیں۔ روانگی کی مہر ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی ہے جب کہ برنی کی جانب سے وصولیابی کی تاریخ ۱۶/۱۰/۶۳ درج ہے۔ یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔

۳۲۔　''رشید احمد صدیقی کا خط برنی کے نام۔ یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔

۳۳۔　یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔

۳۴۔　مطبوعہ، کتابی دنیا، فروری ۱۹۶۲ء۔

۳۵۔　مقدمہ، تعلیم و تربیت، یکم جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۱۴۔

۳۶۔　تعلیم و تربیت، ص ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵۔

۳۷۔　''دیباچہ'' حیاتِ مولانا محمد علی جوہر'' کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء۔

۳۸۔　اشتہار کی عبارت یہ تھی'' جناب ضیاء الدین احمد برنی اُن چند برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں جن کے مولانا محمد علی مرحوم سے ذاتی اور گہرے روابط تھے۔ موصوف سالہا سال سے مولانا کی سوانح لکھ رہے تھے جواب مکمل ہوگئی ہے اور جلد اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوگی۔

۳۹۔　برنی نے اپنی خودنوشت میں اس سے متعلق لکھا ہے تفصیل میں جائے بہ غیر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اخیر زمانے میں ایک سبب سے برنی کے بھتیجوں یعنی علاء الدین خالد وغیرہ نے جو مالک تھے اردو اکیڈمی سندھ، کراچی کے برنی سے قطع تعلق کرلیا تھا جس کا برنی کو بڑا قلق تھا اور اس کا اظہار انھوں نے نہایت رنجیدگی اور افسردگی سے کیا ہے۔ چناں چہ کتاب کا مسودہ اکیڈمی ہی کے پاس رہ گیا اور برنی اپنی بیماری کے سبب اس کے لیے مطالبہ نہیں کرسکے ہوں۔ ان کے انتقال کے بعد علاء الدین خالد کے بیٹے عبدالعزیز خالد جو اس وقت اکیڈمی کے مالک و مختار ہیں، خدا معلوم کیا نیکی ان کے دل میں آئی کہ کتاب کو ۲۰۰۱ء میں کوئی چونتیس سال کے بعد شائع کیا۔

۴۰۔　''دیباچہ'' حیاتِ مولانا محمد علی جوہر'' کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء۔

۴۱۔　رئیس احمد جعفری: علی برادران، لاہور، محمد علی اکیڈمی، ۱۹۶۴ء۔

۴۲۔　یہ خط یکم فروری ۱۹۶۴ء کو لکھا گیا۔ غیر مطبوعہ ہے۔

۴۳۔　کتابی دنیا، جون ۱۹۶۴ء، ص ۲۶۔

۴۴۔　ایضاً۔

۴۵۔　یہ ایک پوسٹ کارڈ ہے اس میں اور بھی باتیں ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ ہے۔

۴۶۔　یہ خط بھی غیر مطبوعہ ہے۔

۴۷۔　ایضاً۔

۴۸۔　یہ خط بھی غیر مطبوعہ ہے۔

۴۹۔　اس خط میں اور بھی باتیں آگئی ہیں۔ یہ خط بھی غیر مطبوعہ ہے۔

۵۰۔ حیاتِ مولانا محمد علی جوہر، ص ۲۷۲۔

۵۱۔ حاشیہ، ایضاً۔

۵۲۔ اس ترجمے میں ضیاءالدین احمد برنی کے بیٹے جناب ریاض احمد برنی کی مدد شامل ہے۔

۵۳۔ حیاتِ مولانا محمد علی جوہر از ضیاءالدین احمد برنی، کراچی اردو اکیڈمی سندھ، مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۔

۵۴۔ دیکھیے ''محمد غلام حسین''، مشمولہ عظمتِ رفتہ۔

۵۵۔ جولائی ۱۹۱۸ء میں برنی کی ملازمت اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس بمبئی میں ہوگئی تھی یہ اشارہ اسی جانب ہے۔ اس زمانے میں سرکاری ملازم ہوتے ہوئے کسی سیاسی شخصیت سے تعلق یا اس کی حمایت میں مضمون لکھنا یا کتاب لکھنا جرم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانے کی برنی کی کئی کتابیں ہیں جن پر ان کا نام نہیں بلکہ اپنے خودنوشت حالات میں تو انھوں نے یہ تک لکھا ان کی کتابیں کچھ ان کے نام سے کچھ دوسروں کے نام شائع ہوئیں۔

۵۶۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۷۸۔۲۷۷۔

۵۷۔ ''انگریزی تذکرہ حضرت بلھے شاہ کا ترجمہ'' نظام المشائخ، دسمبر ۱۹۱۱ء، ص: ۲۵ تا ۳۶۔

۵۸۔ ایضاً، ص ۵۵۔

۵۹۔ ایضاً۔

۶۰۔ برنی کے بڑے بھائی کا اشاعتی ادارہ۔

۶۱۔ شریف ترک، مولفہ ابن حزم، دیباچہ۔

۶۲۔ مذکورہ کتاب کے سرورق کی عبارت۔

۶۳۔ چارلس تھیوفلس مٹکاف، سر طامس مٹکاف (دہلی کے دربار میں کمشنر اور ایجنٹ) کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ کلکتہ میں کمشنر تھا (غدر کی صبح شام، ص ۴۰، ۴۲)

۶۴۔ یہ معلومات انگریزی کتاب پر بھی موجود ہیں بعض اضافی معلومات کے لیے ویب سائٹ: www.books.google.com سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۶۵۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۸۔

۶۶۔ تمہید، ''غدر کی صبح شام''، دہلی کارکن حلقہ مشائخ، ۱۹۲۶ء۔

۶۷۔ ضمیمہ، ''دہلی کی یادگار ہستیاں''، دہلی، کامل صدیقی و ریاض صدیقی، چوڑیوالان، ص ۴۴۰۔

۶۸۔ دیباچہ از خواجہ حسن نظامی، ''غدر کی صبح شام''۔

۶۹۔ یہ انگریزی کتاب نیٹ پر موجود ہے۔ ویب سائٹ: www.questia.com پر دیکھا جاسکتا ہے۔

۷۰۔ برنی کے برادر نسبتی (برنی کی خودنوشت، ص ۶)

۷۱۔ برنی نے سہواً کتاب کا یہ نام لکھ دیا اصل اور مکمل نام "Mahatma Gandhi's Ideas includin Selections from his writings" ہے۔

۷۲۔ عظمتِ رفتہ، ص ۱۶۷۔۱۶۶۔

۷۳۔ خیالاتِ مہاتما گاندھی، حصہ اول، ص ۲۷۔

۷۴۔ برنی حاشیے میں اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں: گاندھی جی کے ان الفاظ سے یہ مطلب اخذ نہ کرنا چاہیے کہ وہ قرآن کو الہامی کتاب

نہیں سمجھتے۔ مترجم

۷۵۔ خیالاتِ مہاتما گاندھی، حصہ دوم، ص ۴۶۹۔

۷۶۔ عظمتِ رفتہ، ۱۹۶۱ء، ص ۴۷۔

۷۷۔ سید محمد حفیظ کانپور تھیوسوفیکل ہائی اسکول میں استاد تھے۔ برنی کے دوست تھے انھوں نے ہی برنی کو مذکورہ اسکول میں ملازمت دلوائی تھی۔

۷۸۔ زمانہ، کانپور، شمارہ ۵، جلد ۴۹، نومبر ۱۹۷۲ء، ص ۲۲۵۔

۷۹۔ سچ، لکھنؤ، ۲۹ ستمبر ۱۹۳۳ء، ص ۶۔

۸۰۔ عظمتِ رفتہ، ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۶۔

۸۱۔ مکتوباتِ ماجدی، مرتبہ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، جلد سوم، کلکتہ، ادارہ انشائے ماجدی، خط نمبر ۸، ص ۱۸۵۔

۸۲۔ اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں، ۱۹۱۷ء، ص ۴۔

۸۳۔ ''پیش لفظ''، ملانصر الدین کے پرانے قصے نئے روپ میں از محمود شام، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۵ء۔

۸۴۔ ''دیباچہ'' لطائف ملانصر الدین از ضیاء الدین احمد برنی، اول، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۵۰ء۔

۸۵۔ کیوپڈ اور سائیکی از ضیاء الدین احمد برنی، کراچی تعلیمی مرکز، ۱۹۵۰ء ص ۷۵۔

۸۶۔ نگارستان از نیاز فتح پوری، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، اول ۱۹۵۸ء۔

۸۷۔ تمہید، مولوی ذکاء اللہ دہلوی۔

۸۸۔ برنی کی کتاب ''عظمتِ رفتہ'' میں منشی ذکاء اللہ دہلوی پر خاکہ بھی اس تعلق پر واضح روشنی ڈالتا ہے۔

۸۹۔ تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے: عظمتِ رفتہ از ضیاء الدین احمد برنی، ۱۹۶۱ء اور ماہنامہ ''سب رس'' کراچی کا ڈاکٹر سید سجاد نمبر، اگست ۱۹۸۰ء۔

۹۰۔ ''یہ کتاب ابتداءً انگریزی میں لکھی گئی تھی ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں لیکن کتابی صورت میں اس کے چھپنے کی نوبت آئی ۱۹۲۹ء۔'' (دیکھیے: حاشیہ، مولوی ذکاء اللہ دہلوی از برنی، ص ۱۶۳۔)

۹۱۔ Encyclopaedia of Indian literature vol. 5 - Page 4645,by various - 1996

۹۲۔ نذیر احمد دہلوی ''ڈپٹی نذیر احمد دہلوی'' کے نام سے مشہور ہیں۔

۹۳۔ تمہید، مولوی ذکاء اللہ دہلوی۔

۹۴۔ ایضاً۔

۹۵۔ مقدمہ از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مشمولہ مولوی ذکاء اللہ دہلی، ص ۹۔

۹۶۔ مولوی ذکاء اللہ دہلی، ص ۱۲۶۔

۹۷۔ ایضاً، ص ۱۲۲۔

۹۸۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۹۹۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۱۰۰۔ ایضاً۔

۱۰۱۔ عربِ قبل اسلام از مولوی ذکاء اللہ کا مقدمہ ابوالخیر کشفی مرحوم کا لکھا ہوا ہے۔

۱۰۲۔ عظمتِ رفتہ، ص۱۶۴۔

۱۰۳۔ یہ دونوں برنی کے سینٹ اسٹیفنز کالج کے ساتھی تھے۔

۱۰۴۔ یہ کتاب ۱۹۴۹ء میں پہلی بار وکٹری پرنٹنگ پریس بمبئی (Victory printing press,Bombay) سے شایع ۸۸ صفحات کی تعداد میں شایع ہوئی۔ اس کتاب میں اقبال کے ۱۰ خطوط مع عکس شامل ہیں۔ یہ خطوط جولائی ۱۹۵۰ء میں ''نگار'' لکھنؤ میں سب سے پہلے اردو ترجمے کے ساتھ شایع ہوئے تھے۔ (دیکھیے: کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد اول، ۱۹۹۳ء، ص۳۳۔ اصل کتاب پر اول اشاعت کا سن ۱۹۴۷ء درج ہے) اور دوسری بار ۱۹۶۹ء میں آئینہ ادب، لاہور سے شایع ہوئی۔

۱۰۵۔ صابر کلوروی نے اپنی کتاب ''مکاتیب اقبال کے مآخذ'' میں اس جانب توجہ دلائی ہے کہ اصل کتاب یعنی انگریزی مجموعے میں ۱۰ عدد خط ہیں جب کہ اردو ترجمہ میں گیارہویں خط کا انگریزی عکس دیا گیا ہے جب کہ اردو ترجمہ موجود نہیں۔ یوں برنی کی کتاب میں گیارہ عدد خط ہو گئے ہیں۔ (دیکھیے: کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد اول، ص۳۴۔) برنی نے ترجمے میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔

۱۰۶۔ اس انگریزی مجموعے کا دوسرا اردو ترجمہ منظر عباس نقوی نے کیا جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی جانب سے ۱۹۷۴ء میں شایع ہوا۔ تیسرا ترجمہ عبدالعزیز خالد نے کیا جو ۱۹۷۵ء میں آئینہ ادب، لاہور کی جانب سے ۱۹۷۵ء میں شایع ہوا۔ (دیکھیے: کلیاتِ مکاتیب اقبال، جلد اول، ۱۹۹۳ء، ص۳۴۔)

۱۰۷۔ اقبال از عطیہ بیگم، مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی، لاہور، اقبال اکیڈمی، ۱۹۸۱ء، ص۱۳۲۔

۱۰۸۔ ایضاً۔

۱۰۹۔ برنی کے اس بیان سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ڈائری اردو زبان ہی میں تھی۔ برنی نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ زبان کی صحت کی تھی۔

۱۱۰۔ ''Raison D'etre'' اقبال از عطیہ بیگم، وکٹری پرنٹنگ پریس بمبئی، ۱۹۴۷ء۔

۱۱۱۔ مطبوعہ، ماہ نو، کراچی، اپریل ۱۹۶۷ء۔

۱۱۲۔ ''میری ادبی زندگی کے بارے میں''، ص۶۔

۱۱۳۔ ایضاً، ص۲۔۳۔

۱۱۴۔ ماہ نامہ معارف، اعظم گڑھ، شمارہ نمبر ۱، جلد ۲، جولائی ۱۹۱۷ء، ص۵۵۔

۱۱۵۔ بریکٹ میں دیے جانے والے الفاظ وہ ہیں جو اصل عبارت میں کاغذ شکستہ ہونے کی وجہ سے نہیں پڑھے جا سکے چناں چہ اندازے سے الفاظ لکھ کر عبارت کو قابلِ فہم بنایا گیا ہے۔

۱۱۶۔ یہ لفظ نہیں پڑھا جا سکا۔

# باب پنجم

## برنی کے خطوط کا تجزیاتی مطالعہ

☆۔ برنی کی مکتوب نگاری
☆۔ برنی کے دست یاب اردو خطوط
☆۔ انیس شاہ جیلانی کے نام
☆۔ احسن مارہروی کے نام
☆۔ عبداللطیف اعظمی کے نام: (مدیر، ماہنامہ "جامعہ"، دہلی)
☆۔ محمد طفیل: (مدیر، نقوش، لاہور)
☆۔ مدیرانِ رسائل کے نام خطوط
☆۔ نجی خطوط
☆۔ خطوط کا مجموعی جائزہ

# باب پنجم:

# برنی کے خطوط کا تجزیاتی مطالعہ

## برنی کی مکتوب نگاری:

خط کا تعلق چوں کہ براہ راست انسان کے باطن سے ہوتا ہے اور اس میں جس طرح کی بے تکلفی اور بے ساختگی در آتی ہے ویسی کسی اور صنف میں نہیں پائی جاتی، اس لیے کسی شخص کی شخصیت کو پرکھنے اور اس کی نفسیات کو سمجھنے میں خطوط نہایت اہم دست آویز کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ بہ قول عبدالعزیز ساحر:

> خط۔۔۔ دلی جذبات اور باطنی کیفیات کا اظہاریہ ہوتے ہیں۔ ایک پرخلوص مکتوب نگار اپنے خطوں میں سانس لیتا ہے اور خط اس کے باطن کی سرزمین سے پھوٹتے ہیں۔ ان میں دو اور دو چار کے عمل کی کارفرمائی ممکن نہیں ہوتی، بلکہ ہو سکتی ہی نہیں، کیوں کہ یہ تو مومن خان مومن کے اس شعر کی کیفیاتی سچائی کا منظرنامہ ہوتے ہیں کہ:
>
> تم مرے پاس ہوتے ہو، گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا(۱)

خطوط ذاتی نوعیت کی تحریر ہونے کے باعث خط نگار سے متعلق غیر معمولی معلومات بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض خطوط میں ایسی نادر اور اہم معلومات آجاتی ہیں جو کسی سوانح نگار کی نظر میں بھی نہیں ہوتیں۔ کبھی کبھی وہ شخص خطوط میں اتنا مختلف ہوتا ہے کہ ویسا وہ عام آدمی کی نظر میں نہیں ہوتا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خط اور باہر کی زندگی میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ خطوط اُس شخص کی زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

مظفر حسین برنی نے خطوط کو ایک طرح کا آئینہ قرار دیا ہے جس میں اُسے اچھی طرح دیکھا جاسکتا ہو:

اُسلوب یا اسٹائل کے بارے میں ڈاکٹر بوفان (۱۷۰۷۔۱۷۸۸) نے کہا تھا کہ ''اسلوب خود انسان ہے''یعنی اس میں انسان کی چھپی ہوئی شخصیت اور اس کے ذہن کو پڑھا جاسکتا ہے، اس پر ناقدوں نے بہت کچھ بحث کی ہے، یہ بات اسلوب کے لیے درست ہو یا نہ ہو، البتہ خطوط پر ضرور صادق آتی ہے، یہاں لکھنے والا بے تکلف ہوتا ہے اور خطوط میں اُس کا جذباتی مدوجزر بھی پوری طرح ظاہر ہوجاتا ہے۔(۲)

## برنی کے دست یاب اردو خطوط:

برنی نے ہزاروں خطوط اپنے احباب کو لکھے تاہم اتنے خطوط دست یاب نہیں ہوسکے چناں چہ جتنے ہوسکے ہیں انھی کو پیش نظر رکھ کر ان کی شخصیت اور نفسیات کی تفہیم کی جائے گی۔

برنی کے جو خطوط دست یاب ہوسکے ہیں ان میں اردو خطوط کی تعداد کچھ اس طرح ہے:

۱۔ بہ نام انیس شاہ جیلانی ۸۵عدد (غیر مطبوعہ)

۲۔ بہ نام احسن مارہروی ۸عدد (غیر مطبوعہ)

۳۔ بہ نام عبداللطیف اعظمی ۸عدد (مطبوعہ)

۴۔ بہ محمد طفیل ۴عدد (غیر مطبوعہ)

۵۔ بہ نام ملا واحدی ۱عدد (مطبوعہ)

۶۔ بہ نام سید اوصاف علی واحدی دہلوی ۱عدد (مطبوعہ)

۷۔ بہ نام منشی رحیم اللہ خان (چچازاد بھائی) ۱عدد (غیر مطبوعہ)

۸۔ بہ نام ایڈیٹر وسانٹ (؟) ویکلی، (انگریزی) ۱عدد (غیر مطبوعہ)

۹۔ بہ نام مدیر ''کارواں''، کراچی ۱عدد (مطبوعہ)

۱۰۔ بہ نام مدیر رسالہ ''کتاب'' ۱۲/اکتوبر ۱۹۵۶ء (مطبوعہ)، کتابی دنیا، دسمبر ۱۹۵۶ء، ص:۱۲۔

ضیاء الدین احمد برنی کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے خطوط میں جو باتیں آگئی ہیں وہ مبنی بر حقیقت ہیں۔ جس طرح ان کی زندگی میں ظاہر و باطن میں اختلاف نہیں تھا اسی طرح ان کے خطوط بھی ان کی زندگی کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں۔

ان کے خطوط میں حسب مراتب کا اہتمام پایا جاتا ہے۔ سنجیدگی اور متانت بھی خطوط کا خاص عنصر ہیں۔ عموماً طوالت سے گریز کرتے ہیں تاہم جواب طلب باتوں کا جواب دینے میں از خود طوالت آجاتی ہے۔

برنی کے نام خطوط سے اندازہ ہوتا کہ برنی خط کا جواب دینے میں تاخیر نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تاخیر ہونے

کی صورت میں مکتوب الیہ فکر مند نظر آتا ہے۔

ضیاء الدین احمد برنی نے یقیناً اپنی عملی زندگی ہی سے خط کتابت کا سلسلہ شروع کر دیا ہوگا۔ ان کے نام خطوط سے بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے تعلقات کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔ ان کے نام دست یاب خطوط کی تعداد ہزار سے زیادہ ہے۔ یہ تعداد بھی مکمل نہیں ہے۔ چناں چہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنے ہی یا اس سے زائد خطوط انھوں نے بھی لکھے ہوں گے اس لیے کہ وہ باقاعدگی سے جواب دیا کرتے تھے۔ اُن کے خطوط کی نوعیت علمی وادبی ہے۔ بعض خطوط میں نجی معاملات بھی آ گئے ہیں۔

چوں کہ اس باب میں برنی کے خطوط کا تجزیہ مقصود ہے اس سبب سے برنی کے تمام خطوط نقل نہیں کیے جا رہے ہیں بلکہ وہ خط پیشِ نظر رکھے جائیں گے جن سے برنی کی شخصیت، نفسیات اور ان کے کردار پر واضح روشنی پڑتی ہے۔

## انیس شاہ جیلانی کے نام:

دریافت شدہ خطوط میں محترم انیس شاہ جیلانی صاحب کے نام برنی کے خطوط کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ (۳) ان خطوط کا زمانہ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۹ء ہے۔ یہ تمام کے تمام خطوط علمی نوعیت کے ہیں اور بیشتر میں جیلانی صاحب کی باتوں کے محض جوابات ہیں۔ انیس شاہ جیلانی صاحب کوئی رسالہ (غالباً ''لالہ ءصحرا'') نکالنا چاہتے تھے اس کا تذکرہ ہے۔ ان کی جانب سے کتابوں اور رسالوں کے مطالبات کے جوابات ہیں۔ انھوں نے ایک زمانے میں مرحوم حیرتؔ شملوی کے خطوط جمع کرنے اور شایع کرنے کا ارادہ کیا تھا اس سلسلے میں برنی نے ان کے ساتھ بہت تعاون کیا تھا۔ بیشتر خطوط اس سلسلے کے جوابی خطوط ہیں۔ رسالہ کتابی دنیا سے متعلق بھی باتیں ان خطوط میں پائی جاتی ہیں۔ بعض خطوط محض طلبِ خیر کا جواب ہیں۔ اکثر خطوط میں انیس شاہ جیلانی کے محض جوابات دیتے نظر آتے ہیں۔ ایک بہ طور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

۲۹ رجنوری ۱۹۶۴ء کو برنی کو انیس شاہ جیلانی صاحب کا خط موصول ہوا (۴) جس میں نے انھوں نے محمد علی جوہر پر برنی کی کتاب (۵) سے متعلق دریافت کیا کہ کس مرحلے میں ہے اور برنی کو اطلاع دی کہ رئیس احمد جعفری کی کتاب (۶) شایع ہو گئی ہے اور وہ برنی کو تبصرے کے لیے بھیجیں گے۔

یکم فروری ۱۹۶۴ء کو جواباً برنی لکھتے ہیں:

> محبی۔ تسلیم۔ میں نے ''انجام'' [ماہنامہ کراچی] میں جعفری صاحب کی کتاب کا ریویو دیکھا ہے۔ کتاب ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری۔ میں نہیں کہ سکتا کہ کتاب میرے پاس ریویو کے لیے آئیگی۔ آئے آئے نہ آئے نہ آئے۔ (۷) یہاں میں نے چند کتاب فروشوں سے اس کا ذکر کیا تھا لیکن ابھی تک کسی کے پاس نہیں آئی۔ شاید روزانہ اخبارات کو بھیجی گئی ہو۔ کل یا پرسوں ''جنگ'' میں جا کر دریافت کرونگا۔ میری کتاب میں ابھی دیر ہے۔ اس کتاب کے بعد میری کتاب کو بڑھ کر رہنا چاہیے، ورنہ اس کا شائع کرنا بیکار ہے۔
>
> بہر حال میں اس کا غور سے مطالعہ کرونگا تا کہ جو کمیاں رہ گئی ہیں وہ میری کتاب

سے پوری ہو جائیں۔

اب آپ کا کوئی خط ایسا نہیں جس کا جواب میں نے نہ دیا ہو۔ والتسلم

مخلص

ضیاءالدین احمد برنی (۸)

اس خط کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ برنی محمد علی جوہر کی حیات پر جو کتاب تحریر کر رہے تھے۔ رئیس احمد جعفری کی کتاب کے منصۂ شہود پر آجانے کے بعد اس فکر میں پڑ گئے کہ کسی طرح وہ کتاب حاصل کریں اور دیکھیں کہ اُس میں کیا کمیاں رہ گئی تا کہ ان کی کتاب میں کوئی کمی واقع نہ ہو ورنہ اس کتاب کا شایع کرنا بے معنی ہو جاتا ہے۔

برنی نے اپنے تبصرے میں ظاہر کیا کہ رئیس احمد جعفری کی کتاب میں بعض مقامات پر کم زوریاں پائی جاتی ہیں۔ باوجود اس کے برنی نے رئیس احمد جعفری کے کام کو سراہا ہے۔

نہایت افسوس کا امر ہے کہ برنی کی کتاب تیار ہو جانے کے باوجود سرد خانے میں پڑی رہی اور اردو اکیڈمی نے اُسے شایع کیا تو برنی کو اِس دنیا سے رخصت ہوئے بتیس سال ہو چکے تھے۔

بعض خطوط میں انیس شاہ جیلانی برنی سے جواب نہ دینے کی شکایت کرتے نظر آتے ہیں۔ یا یہ کہ فلاں بات کا جواب نہیں دیا۔ برنی اپنے خطوط میں تاخیر کی وجوہات بیان کرتے رہے ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک خط مرقومہ ۳ جولائی ۱۹۶۴ء (۹)، برنی کی جانب سے انھیں لکھا گیا اس میں برنی کا لہجہ کسی قدر ترش مگر شوخی لیے نظر آتا ہے:

مجی۔ تسلیم

ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا۔ آپ کی خدمت میں چند رسالے اور ایک کتاب بھیجی گئی تھی۔ بذریعہ رجسٹرڈ۔ مگر آپ نے آج تک رسید نہیں بھیجی۔ آپ نے یہ کس چیز کا بدلہ لیا ہے؟ میری تاخیر کا؟ والتسلیم

برنی (۱۰)

انیس شاہ جیلانی صاحب نے ۲۲ اپریل ۱۹۶۴ء (۱۱) کو برنی کو ایک خط میں لکھا کہ وہ مولانا محمد علی جوہر پر جو کتاب لکھ رہے ہیں اس میں محمد علی کی زندگی کے دونوں رخ پیش کریں۔ اُنھیں شبلی کے خطوط کی اشاعت اسی لیے پسند تھی کہ اس میں ان کے دونوں رخ سامنے آگئے تھے۔ انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ برنی اگر نہیں چاہتے کہ محمد علی کی وہ کم زوریاں جواُن کے علم میں ہیں، اُن کی زندگی میں شایع ہوں تو وہ ان کے بعد شایع کر دیں گے۔ یا برنی بنک لاکر میں رکھوا دیں پھر انھیں بعد میں شایع کر دیا جائے۔ ان سب باتوں کا حاصل یہ تھا کہ جیلانی صاحب یہ چاہتے تھے کہ انسان فرشتہ نہیں ہوتا لہٰذا اُس کی زندگی کے دونوں رخ سامنے ہونے چاہیں۔

برنی نے ۲۴ راپریل کوانیس شاہ جیلانی صاحب کو جو جواب دیا اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عموماً برنی کی نظر انسانی خوبیوں پر رہتی تھی کم زوریوں پر نہیں۔ انھوں نے ''عظمتِ رفتہ'' میں جو خاکے لکھے ہیں ان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ کم زوری بھی پائی گئی ہے کہ اُس میں شخصیات کا اچھا پہلو نمایاں ہے اور برا یا کم زور پہلو سامنے نہیں ہے۔ بعض مقامات پر برنی اس کا اظہار بھی کر چکے ہیں کہ انسان کی خوبیوں کا تذکرہ کرنا چاہیے۔

جیسا کہ گزشتہ اوراق میں ایک مقام پر یہ بات آ چکی ہے کہ ''ہمدرد'' سے برنی کی رخصتی مولانا محمد علی جوہر کی خفگی تھی، باوجود اس واقعے کے برنی نے مولانا کی شرافت نفس کی کیسی تصویر کشی کی اور شبلی کا دفاع بھی کیسا کیا۔

برنی اور حیرت شملوی کے تعلقات اچھے تھے۔ برنی اُن سے ملاقات کے لیے اکثر و بیشتر ان کے مکان واقع غازی عبداللہ کلفٹن جایا کرتے تھے۔

محترم انیس شاہ جیلانی صاحب برنی کے چھوٹے بھائی محمد یوسف دہلوی (خطاط پاکستان) سے کچھ لکھوانا چاہتے تھے اور اس کا کئی بار برنی سے تقاضا کر چکے تھے اور چاہتے تھے کہ برنی انھیں لکھوا کر دیں۔ برنی نے ایک طویل خط کے ذریعے انھیں مطمین کیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ جیلانی صاحب لالہ صحرا نکالنا چاہتے تھے مگر وہ نکال نہیں سکے تھے، اس سلسلے میں برنی سے ان کی بہت خط کتابت ہوئی تھی برنی نے ہر طرح ان کی مدد کی۔ وہ حیرت شملوی کے خطوط مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن تا حال خطوط کا مجموعہ شایع نہیں ہو سکا۔ برنی نے اس سلسلے میں ان کی جس قدر مدد کی ہوگی شاید ہی کسی اور نے کی ہو۔ اس سلسلے میں برنی اور انیس شاہ جیلانی کے درمیان طویل خط کتابت رہی۔

آخری زمانے یعنی ۱۹۶۸ میں برنی بہت زیادہ بیمار رہنے لگے تھے۔ اسی زمانے کے دو خط جن میں برنی نے نہایت مختصراً اپنی اس وقت کی کیفیت لکھوائی ہے۔

۱۱۲ کتوبر ۶۸ء

آپ کا خط ملا۔ خدا کے فضل سے آہستہ آہستہ طاقت آ رہی ہے۔ آپ نے کام کہاں تک کیا۔ کتاب کب تک تیار ہو جائے گی۔

مخلص

ضیاء الدین احمد برنی (۱۲)

اس کے بعد انیس شاہ جیلانی خط لکھتے اور برنی سے جواب طلب کرتے رہے مگر برنی اپنی بیماری اور بینائی کی خرابی کے باعث جواب نہیں دے سکے اُسی زمانے کا ایک خط جو ۲۵ اپریل ۱۹۶۹ء کو لکھا گیا یہ خط برنی کے بہ جائے ان کی کسی بیٹے کی جانب سے تھا۔

آپ کے خط اکثر ملتے رہتے ہیں۔ کل بھی آپ کا نوازش نامہ ملا۔ یاد آوری کا

بہت بہت شکریہ!

ابا جی (برنی صاحب) کی طبیعت آج کل زیادہ اچھی نہیں ہے کم زوری بے انتہا ہوگئی ہے۔ چل پھر بالکل نہیں سکتے۔ سانس کا دورہ اکثر و بیشتر پڑتا رہتا ہے۔ علاج برابر جاری ہے لیکن اب زیادہ تر دوائیں بے اثر ہوگئی ہیں۔ انجکشن روزانہ لگتا ہے لیکن بعض اوقات اس کا بھی اثر جلدی زائل ہو جاتا ہے۔ ضعیف بہت ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کہ وہ ابا جی [کو] جلد از جلد اچھا کرے آپ بھی دعا فرمائیں۔

اب دعاوں کا اثر ہی بہ نسبت دواؤں کے زیادہ اچھا ہوسکتا ہے۔ لہذا اللہ پر بھروسہ ہے کہ وہ ان کی تکلیف کو دور کرے گا۔ آمین

کبھی آپکا کراچی آنا ہو تو ضرور ملکر جائیے گا۔ مصروفیت کے باعث آپکے پچھلے خطوط کا جواب نہیں دیا جاسکا۔ امید ہے کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں گے اور آئندہ بھی یاد کرتے رہینگے۔ اچھا خدا حافظ۔ فقط

اعجاز احمد برنی (۱۳)

برائے

ضیاء الدین احمد برنی

## احسن مارہروی کے نام:

دست یاب خطوط میں انیس شاہ جیلانی کے بعد ان کے خطوط کی ایک بڑی تعداد احسن مارہروی کے نام ہے۔ برنی نے مارچ ۱۹۶۷ء میں اپنے نام سیکڑوں خطوط میں سے اسّی معروف شخصیات کے تین سو اردو انگریزی خطوط پر مشتمل انتخاب "خطوطِ مشاہیر" کے نام سے مرتب کیا تھا، ضروری حواشی بھی لکھے تھے، تاہم زیورِ طباعت سے آراستگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا اور ۴ مئی ۱۹۶۹ء کو باوجود بلند حوصلگی اور اعلا ہمتی کے زندگی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

میں مسلسل برنی کے نام مشاہیر کے خطوط کی تلاش میں تھا کہ میری تگ و تاز رنگ لائی اور برنی کے نام مشاہیر کے کوئی ڈیڑھ ہزار سے زائد خطوط کا وہ ذخیرہ جس سے برنی نے مذکورہ انتخاب مرتب کیا تھا لاعلمی کے اندھیرے سے علم کی روشنی میں لایا گیا۔

اسی ذخیرے میں احسن مارہروی کے چودہ خط شامل ہیں۔ برنی نے اپنے انتخاب میں احسن کے بارہ خط منتخب کیے تھے۔

شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور کے رسالے "تحقیق نامہ" کے شمارہ مشترکہ ۲۰۰۵ء۔۲۰۰۶ء میں ادارۂ نقوش کے ذخیرۂ مکاتیب سے محمد طفیل مدیر "نقوش" کے نام مشاہیر کے خطوط کی فہرست شایع ہوئی تھی، جس سے پتا چلا کہ ضیاء الدین احمد برنی کے ۸ عدد خط بھی مذکورہ ذخیرے میں شامل ہیں۔

میں نے یونی ورسٹی کے چیف لائبریرین عبدالوحید صاحب کو برنی کے خطوط کی فراہمی کے لیے لکھا۔ انھوں نے ۳۰ر مارچ ۲۰۰۷ء کو مطلوبہ خطوط کی عکسی نقل مرحمت فرمائی۔ یہ ۸ عدد خط محمد طفیل کے نام نہیں بلکہ مولانا احسنؔ مارہروی کے نام ہیں۔

ان خطوط کے ذریعے برنی اور احسن کے تعلقات کا علم ہوتا ہے جو تا حال اہلِ علم کی نظروں سے اوجھل تھے۔ برنی کے خطوط کے مطالعے سے جہاں برنی کی زندگی کے بعض گوشے روشن ہوتے ہیں وہاں احسنؔ مارہروی کی زندگی کے آخری چند سال سے متعلق معلومات بھی ہمارے علم میں آجاتی ہیں، جن میں وہ نہایت پریشان کن بلکہ تکلیف دہ مسائل کا شکار رہے۔ ان خطوط میں انھوں نے برنی سے کھل کر اپنے خانگی تر ددات کا اظہار کیا ہے۔

برنی کے نام احسن خطوط اس لحاظ سے اہم ہیں کہ پہلی مرتبہ منظر عام پر آرہے ہیں اور احسنؔ مارہروی نے ان خطوط میں بلا تامل جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے ان کا ذکر بھی کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ علاوہ ازیں برنی کے خطوط بھی غیر مطبوعہ ہیں اور دونوں حضرات کے تعلقات کی تفہیم میں خاصی معاونت کرتے ہیں۔

ان خطوط سے پتا چلتا ہے کہ برنی اور احسنؔ کی ملاقات کا آغاز ۱۹۳۴ء سے بمبئی میں ''بزمِ خیال'' کے تحت ہونے والے مشاعرے کے توسط سے ہوا جو ۱۹۳۶ء تک جاری رہا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب برنی بمبئی سیکریٹریٹ میں اردو فارسی ٹرانسلیٹر کے طور پر خدمات انجام دے رہے تھے۔ باوجود سرکاری ملازمت کے علمی ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ ایک عرصے تک ادبی انجمن ''بزمِ خیال'' کے صدر رہے۔

ممکن ہے برنی اور احسنؔ کی خط کتابت ۱۹۳۶ء کے بعد تک جاری رہی ہو چوں کہ اس سلسلے میں مذکورہ خطوط کے سوا کوئی اور شہادت ایسی نہیں جس سے دونوں فضلاء کے تعلقات کی زمانی مدت کا درست تعین کیا جاسکے چناں چہ انھی خطوط کو پیشِ نظر رکھ کر اندازہ قایم کیا جاسکتا ہے۔

خطوط اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ دونوں کے تعلقات احترام، اخلاص اور محبت کی بنیاد پر قایم تھے۔ احسنؔ کو برنی پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے اپنے ذاتی اور خانگی حالات کا تذکرہ اُن سے کھل کر کیا ہے یہی وجہ تھی کہ برنی نے احترام و اعتماد کی پاس داری کرتے ہوئے خطوط میں سے وہ حصے حذف کر دیے جن سے اُن کے خیال میں احسنؔ کی شخصیت یا ان کی شہرت پر کوئی حرف آتا۔ احسنؔ کے جذبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں برنی نے اپنے حسنِ سلوک سے احسنؔ کے دل میں ایک سچے اور حقیقی دوست کی جگہ پیدا کرلی تھی جس کے باعث احسن یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ ''اپنے چندروزہ سرسری تجربے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ جناب اپنے اخلاق خصوصی سے نمایاں امتیاز کے حامل ہیں۔''؛ ''آپ کے خلوص اور بے لاگ شفقتوں نے گرویدہ کرلیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آپ کو نہ بھولوں۔''

احسنؔ مارہروی کے نام برنی کے مذکورہ خطوط کے مطالعہ سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں جو ان کی شخصی زندگی اور ان کے اخلاق و کردار پر روشنی ڈالتی ہیں۔

۱۔ برنی جذبہ انسانی ہمدردی سے سرشار تھے۔

۲۔ بلا خوف اور بے غرض تعاون کرنے کو فرض عین سمجھتے تھے۔

۳۔ بعض باتوں کے بے وجہ اصرار اور تکرار سے چڑ نہیں جاتے تھے بلکہ نہایت تحمل اور برداشت کا مظاہر کرتے تھے۔

۴۔ کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنے بلکہ بہ خوشی دوسروں کے بوجھ سہارے۔

۵۔ اگر کوئی وجہ نہ ہو تو بہ عجلت خط کا جواب دیا کرتے تھے۔

## عبداللطیف اعظمی کے نام: (مدیر، ماہنامہ "جامعہ"، دہلی)

عبداللطیف اعظمی کے نام برنی کے آٹھ عدد خط ہیں جو اُن کی کتاب "مشاہیر کے خطوط" مکتبہء جامعہ نئی دہلی، دسمبر ۱۹۷۵ء میں شایع ہو چکے ہیں۔ جب کہ برنی کے نام عبداللطیف اعظمی کے چھے عدد خط ہیں جو غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کا احوال برنی کے نام مشاہیر کے خطوط والے باب میں بیان کیا جائے گا۔

عبداللطیف اعظمی اور برنی کے تعلقات دو علمی و ادبی شخصیات کے علاوہ دو مدیروں کے تعلقات بھی تھے۔ عبداللطیف اعظمی نے برنی سے اپنے تعلقات کے آغاز سے متعلق اس طرح لکھا ہے "ضیاءالدین احمد برنی صاحب سے میری خط و کتابت اس وقت شروع ہوئی جب ماہنامہ جامعہ دوبارہ جاری ہوا۔ اس سے پہلے میں ذاتی طور پر ان سے واقف نہیں تھا۔" (۱۴)

برنی ان تعلقات کا احترام کرتے ہوئے بہ خوشی اور باقاعدگی سے اپنے رسالے "کتابی دنیا" میں "جامعہ" دہلی، پر ،جس کے عبداللطیف اعظمی مدیر تھے، تبصرہ کیا کرتے تھے۔

برنی کا ایک خط ملاحظہ فرمایئے۔ اس خط میں کتنی کام کی باتیں آگئی ہیں۔ کسی صاحب علم اور باعمل شخص کے اُٹھ جانے کا دکھ برنی کو ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ وہ بیمار کی تیمارداری اور مرنے پر تعزیت ضرور کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ رسمانہیں ہوتے بلکہ اُن میں حقیقی اثر ہوتا ہے۔ حامد علی خاں اور خالدہ ادیب خانم کی موت کا دکھ انھیں کس قدر تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ وہ دونوں شخصیات سے اچھی طرح واقف تھے، انھیں دیکھے ہوئے تھے۔

ہم اس خط میں یہ بھی ملاحظہ کریں گے کہ انھیں انسانوں ہی کا نہیں بلکہ قومی و ملی اداروں کا بھی کتنا خیال تھا۔ علاوہ ازیں معاملات میں کتنے صاف تھے۔ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بار کسی اور پر پڑے۔

۱۳ر جنوری ۱۹۶۴ء

محترمی۔ تسلیم

حامد علی خاں صاحب (م ۵ر دسمبر ۱۹۶۳ء) کے انتقال (۱۵) پر میری دلی ہمدردی قبول فرمائیں۔ مرحوم پر فروری میں ایک نوٹ لکھوں گا۔ (۱۶)،

نوٹ خالد لکھیں گے، اس لیے کہ وہ ان سے بہت مانوس (۱۷) تھے۔ بہر حال یہ صدمہ مدتوں بھلایا نہ جا سکے گا۔

میں جو رسالوں پر طائرانہ تبصرہ کرتا ہوں، وہ آپ کی نظر سے گزرتا ہوگا۔ کیا آپ اسے پسند کرتے ہیں؟ اس سلسلے میں مجھے دسمبر کا پرچہ چاہیے وہ مجھے نہیں ملا۔ فروری میں نومبر، دسمبر اور جنوری کے پرچے طائرانہ نظر میں شامل کیے جائیں گے۔

یقیناً خالدہ ادیب خانم (م ۹ جنوری ۱۹۶۴ء) پر بھی آپ مضمون لکھیں گے، لکھیے اور ضرور لکھیے (۱۸) میری بھی ان سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی، عجیب وغریب عورت تھی، اس کی تقریر اس قدر روح پرور تھی کہ آج تک یاد ہے۔ کیا جامعہ ملیہ کے لکچروں کو جامعہ نے چھاپا ہے؟ (۱۹) اگر چھاپا ہو تو اس کی ایک جلد میرے نام بھیج دیجیے اور قیمت سے بھی مطلع فرمایئے، تاکہ میں اس کی روانگی کا انتظام کروں۔

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ جامعہ کو دو موتوں (۲۰) سے سابقہ پڑا، خدا دونوں کو بخشے۔

آج کل یہاں شدید سردی پڑ رہی ہے، یہ کہیں سے آئی ہوئی سردی کی لہر ہے، دیکھیے کب ختم ہو۔

والتسلیم

مخلص

ضیاءالدین احمد برنی

مکرر: اگر آپ کے یہاں خالدہ ادیب خانم کا کوئی فوٹو ہو تو اسے بذریعہ رجسٹری ارسال فرما دیجیے، میں پھر اسے واپس کر دوں گا، محصول ڈاک کا بار جامعہ پر نہ پڑے۔

**محمد طفیل: (مدیر، نقوش، لاہور)**

برنی کے نام محمد طفیل کے چار عدد خط ہیں۔ دونوں جانب خطوط کے تبادلے سے دونوں کے باہمی تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ یہ تعلقات دو ادیبوں کے تعلقات تھے۔ جن میں کسی قدر بے تکلفی بھی تھی۔ ان تعلقات کا ان خطوط کے علاوہ کہیں اور سے پتا نہیں چلتا۔ خطوط ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی ملاقات بھی رہی تھی۔ محمد طفیل برنی کی عظمت اور ان کی خدمات سے واقف بھی تھے۔ اگر یہ خطوط سامنے نہیں آتے تو یہ تعلقات اندھیرے ہی میں رہتے۔

برنی کے خطوط ''انجمن ادبی رسائل پاکستان'' کے سلسلے میں ہیں جس کے وہ جنرل سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری رہے تھے۔ ان کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس ادبی انجمن کو متحرک اور فعال رکھنے میں کس قدر کوشاں تھے۔

سید الطاف علی بریلوی اپنی تصنیف ''تحلیقات و نگارشات'' میں علامہ راز ق الخیری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

انجمن ادبی رسائل کی بھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا بنیاد ڈالی اور دس سال سے زائد

میں جو رسالوں پر طائرانہ تبصرہ کرتا ہوں، وہ آپ کی نظر سے گزرتا ہوگا۔ کیا آپ اسے پسند کرتے ہیں؟ اس سلسلے میں مجھے دسمبر کا پرچہ چاہیے وہ مجھے نہیں ملا۔ فروری میں نومبر، دسمبر اور جنوری کے پرچے طائرانہ نظر میں شامل کیے جائیں گے۔

یقیناً خالدہ ادیب خانم (م ۹ جنوری ۱۹۶۴ء) پر بھی آپ مضمون لکھیں گے، لکھیے اور ضرور لکھیے (۱۸) میری بھی ان سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تھی، عجیب وغریب عورت تھی، اس کی تقریر اس قدر روح پرور تھی کہ آج تک یاد ہے۔ کیا جامعہ ملیہ کے لکچروں کو جامعہ نے چھاپا ہے؟ (۱۹) اگر چھاپا ہو تو اس کی ایک جلد میرے نام بھیجد یجیے اور قیمت سے بھی مطلع فرمائیے، تاکہ میں اس کی روانگی کا انتظام کروں۔

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ جامعہ کو دو موتوں (۲۰) سے سابقہ پڑا، خدا دونوں کو بخشے۔

آج کل یہاں شدید سردی پڑ رہی ہے، یہ کہیں سے آئی ہوئی سردی کی لہر ہے، دیکھیے کب ختم ہو۔

والتسلیم

مخلص

ضیاءالدین احمد برنی

مکرر: اگر آپ کے یہاں خالدہ ادیب خانم کا کوئی فوٹو ہو تو اسے بذریعہ رجسٹری ارسال فرمادیجیے، میں پھر اسے واپس کردوں گا، محصول ڈاک کا بار جامعہ پر نہ پڑے۔

**محمد طفیل: (مدیر، نقوش، لاہور)**

برنی کے نام محمد طفیل کے چار عدد خط ہیں۔ دونوں جانب خطوط کے تبادلے سے دونوں کے باہمی تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ یہ تعلقات دو ادیبوں کے تعلقات تھے۔ جن میں کسی قدر بے تکلفی بھی تھی۔ ان تعلقات کا ان خطوط کے علاوہ کہیں اور سے پتا نہیں چلتا۔ خطوط ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی ملاقات بھی رہی تھی۔ محمد طفیل برنی کی عظمت اور ان کی خدمات سے واقف بھی تھے۔ اگر یہ خطوط سامنے نہیں آتے تو یہ تعلقات اندھیرے ہی میں رہتے۔

برنی کے خطوط ''انجمن ادبی رسائل پاکستان'' کے سلسلے میں ہیں جس کے وہ جنرل سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری رہے تھے۔ ان کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس ادبی انجمن کو متحرک اور فعال رکھنے میں کس قدر کوشاں تھے۔

سید الطاف علی بریلوی اپنی تصنیف ''تخلیقات ونگارشات'' میں علامہ رازق الخیری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

انجمن ادبی رسائل کی بھی جس کا اوپر ذکر کیا گیا بنیاد ڈالی اور دس سال سے زائد

عرصے تک اس کے فعال صدر رہے۔ اس کی مجلس عاملہ میں انھوں نے شاہد احمد دہلوی، ضیاء الدین احمد برنی اور صہبا لکھنوی وغیرہ کی طرح مجھے بھی رکھا۔ مجلس کے جلسے مولانا اپنے مکان پر کرتے اور کافی تواضع فرماتے تھے، انجمن کے شاندار سالانہ اجلاس بھی ۱۹۵۳ء میں لاہور، ۱۹۵۵ء میں کراچی، ۱۹۶۲ء میں پھر لاہور اور ۱۹۶۵ء میں ڈھاکہ میں منعقد ہوئے۔(۲۱)

رسالہ سویرا، لاہور کے خاص نمبر ۱۳، ۱۴ میں انجمن کے پہلے تاریخی اجلاس کی رپورٹ شایع ہوئی تھی۔ جس میں اُس کے عہدے داروں اور مجلس عاملہ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کیا گیا تھا۔ فروری ۱۹۶۲ء کے ''کتابی دنیا'' سے پتا چلتا ہے کہ برنی اس کے جنرل سیکریٹری تھے۔ انھوں نے لاہور میں ۱۹۶۲ء میں ہونے والے اس کے چوتھے جلسے میں نہ صرف شرکت کی بلکہ ایک دن قبل صحافیوں کے مختلف سوالوں کے جوابات بھی دیے۔ انھوں نے مذکورہ جلسے میں رپورٹ بھی پڑھی۔

مارچ ۱۹۶۵ء میں ڈھاکا میں ہونے والے اجلاس میں جن عہدے داروں کا اعلان ہوا اس کے مطابق برنی اور محمد طفیل انجمن کے جائنٹ سیکریٹری بنائے گئے۔(۲۲)

محمد طفیل نے نقوش کے شخصیات نمبر کے لیے برنی سے مولانا محمد علی جوہر کی سوانح کا مطالبہ کیا تھا۔ جس سلسلے میں برنی نے محمد طفیل کو ایک خط لکھا۔

کراچی، یکم جون ۱۹۵۶ء

مکرمی تسلیم

میں نے مولانا (۲۳) کی سیرت و کردار پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اپنے (مقررہ) وقت کے اندر وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔ آپ کا نمبر مجھے ابھی تک نہیں ملا جس کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا تھا۔

میرے پاس مولانا کی دو تصویریں ہیں: ایک میں دونوں بھائی کھڑے ہیں اور دوسرے میں دونوں بھائی بی اماں کے پاس بیٹھے ہیں۔(۲۴) فرمائیے آپ کو کونسے فوٹو کی ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ متعدد فوٹو ہیں جو groups کی شکل میں ہیں۔

میرے پاس خطوط بہت سے اشخاص کے ہیں: حالی، سیماب، مولوی عبدالحق، نیاز، عبدالماجد، حسن نظامی، عنایت اللہ، اقبال، محمد علی، مسز نائیڈو، پکتھال وغیرہ وغیرہ۔ خطوط بہت سے ہیں اور میرا ارادہ یہ ہو رہا ہے کہ میں خود انھیں کتابی صورت میں شائع کروں۔(۲۵)

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے پرچہ کے کب تک شائع ہو جانے کی امید

ہے۔

مخلص

ضیاءالدین احمد برنی

محمد طفیل کے خطوط دل چسپ ہیں۔ایک خط میں انھوں نے انجمن ادبی رسائل سے متعلق لکھا ہے ''مرحوم انجمن کا چہلم کرڈالیے۔'' (۲۶)

## ''کارواں''، کراچی اور ''ہماری زبان''، دہلی کے مدیران کے نام:

یہ خط برنی کی صلاح جوئی کوظاہر کرتا ہے۔ برنی کسی بھی قسم کے لڑائی جھگڑے کو پسند نہیں کرتے اور ادبا ءشعراء کے درمیان تو قطعی نہیں۔ان کی اسی خوبی کا تذکرہ شاہد احمد دہلوی نے اپنے ایک خط میں کیا ہے۔اس خط سے یہ امر عیاں ہے کہ برنی اپنے عہد کی سرگرمیوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان میں حتی المقدور اور جہاں مناسب خیال کرتے تھے حصہ بھی لیتے تھے۔

اس عہد کے اس اہم موضوع پر بھی برنی خاموش تماشائی نہیں بنے رہے بلکہ تنازع کو ختم کرنے کے لیے فراق اور عسکری سے اپیل کی ہے۔

> اثر اور فراق کے مابین جو قلمی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔میں نے اس سلسلے میں دو مضمون دیکھے ہیں جو ساقی کراچی کی گذشتہ دو اشاعتوں میں شایع ہوئے ہیں۔ایک فراق کا مضمون ہے دوسرا عسکری کا۔اول الذکر نہایت طویل ہے اور باوجود طوالت کے میں اسے غور سے پڑھا۔پڑھنے کے بعد مجھے افسوس ہوا کہ فراق کا قلم ایسے میدان میں دوڑ رہا ہے جو ان کے شایانِ شان نہیں۔عسکری نے اپنے مضمون میں فراق کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ ان مخالفانہ مضامین کی وجہ سے اثر کو بقائے دوام حاصل ہوگیا ہے۔یہ ایک طنز ہے جس سے عسکری ہی لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ایسے مضامین کبھی بقائے دوام حاصل نہیں کرسکتے۔بہر حال یہ سلسلہ ایسا ہے کہ اسے بند ہوجانا چاہیے۔فراق اپنے آپ کو جواب کہتے ہیں۔میں ان سے درخواست کروں گا کہ سفید بال احترام کے مستحق ہیں نہ کہ سب وشتم کے۔مجھے ان تینوں حضرات کی خدمت میں نیاز حاصل نہیں ہے اور اس لیے میں کسی سے ذاتی اپیل نہیں کرسکتا۔یہ اپیل صرف اخلاقی ہے اور بس۔
>
> ضیاءالدین احمد برنی (۲۷)

کارواں نے برنی کے خط کو مکمل شایع نہیں کیا تھا جب کہ ''ہماری زبان'' دہلی نے برنی کے اس خط کو ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو مکمل شایع کیا۔یہ امر پیش نظر رہے کہ برنی اس معاملے میں متحرک تھے کہ انھوں ایک خط پاکستان کے مدیر رسالہ کو اور وہ خط ہندوستان کے ایک مدیر رسالہ کو ارسال کیا تا کہ جلد از جلد یہ مسئلہ حل ہو۔

اس خط سے پتا چلتا ہے کہ برنی ہی کی طرح رشید احمد صدیقی بھی اس تنازع کو ختم کرنے میں متحرک تھے اور برنی سے قبل اس سلسلے میں آواز بلند کر چکے تھے۔ ہماری زبان کو لکھا گیا خط برنی پاکستان کے قارئین کے لیے ''کتابی دنیا'' میں بھی شایع کر دیا تھا۔(۲۸)

مذکورہ خطوط میں برنی کا ایک ایسا خط بھی ہے جس کا تعلق ہمارے قومی المیے سے ہے تاہم جو بات دیکھنے اور نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ برنی اس قومی المیے پر کس قدر رنجیدہ اور تشویش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ حق گوئی میں برنی نہایت جری اور پرجوش واقع ہوئے تھے۔ اس معاملے میں انھوں نے کبھی کسی زمانے میں بھی لیت ولال یا مصلحت سے کام نہیں لیا بلکہ بروقت اس کا اظہار کیا۔ خطوط کے علاوہ اس کے مظاہرے ان کے تبصروں میں بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ جس سے ان کے قومی درد کی عکاسی ہوتی ہے۔

انجمن ترقی اردو، پاکستان کے تنازع پر برنی کیوں خاموش رہتے ایک تو انھیں قوم و ملک سے، قومی اداروں سے قومی زعماء سے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق سے حد درجہ محبت تھی چناں چہ ان پر کسی طرح کی بھی آنچ وہ کیوں برداشت کرتے لہٰذا انھوں نے اس سلسلے میں ایک مراسلہ روزنامہ جنگ کراچی کو لکھا تا کہ ان کے ہم مزاج اور ان کا سا دل رکھنے والے اس معاملے کی طرف متوجہ ہوں اور اپنا قومی فرض انھی کی طرح ادا کریں۔

برنی نے اپنے اُس خط کو ''کتابی دنیا'' جون ۱۹۵۸ء، کے حلقے کی واقفیت کے لیے شایع کیا۔ یقیناً اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوگا کہ اس معاملے کے حل کے لیے جلد از جلد کارروائی ہو۔ کتابی دنیا میں برنی نے اداریے میں جگہ دی اور ''انجمن ترقی اردو پاکستان'' کے عنوان سے شایع کیا۔ خط ملاحظہ فرمایئے:

> گذشتہ چند مہینوں سے انجمن ترقی اردو کے بارے میں اخبارات میں مسلسل مضامین نکل رہے ہیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی تحریریں بھی شایع ہوئی ہیں جن میں بے حد مایوسی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں رائے عامہ بیدار ہوتی تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی بلکہ بہت عرصہ پیشتر کچھ نہ کچھ ہوگیا ہوتا۔
>
> بعض آدمیوں نے ڈاکٹر عبدالحق کی ذات گرامی کو سب وشتم کا ہدف بنا رکھا ہے۔ موقع بے موقع وہ ان کے خلاف زبانی و تحریری پروپیگنڈا کرتے پھرتے ہیں۔ جو جو الفاظ میرے کانوں نے سنے ہیں ان سے میں اندازہ کر سکا ہوں کہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو انجمن سے علیحدہ کر دیا جائے۔
>
> ڈاکٹر عبدالحق نے بہت عرصہ پیشتر مجلس نظما ترتیب دی تھی تا کہ وہ انجمن کے کاموں کو سنبھال لے مگر کچھ ہی عرصہ بعد ہی اس مجلس میں انتشار پیدا ہونا شروع ہوگیا اور سیاسی جوڑ توڑ ہونے لگے جس کی وجہ سے روز مرہ کے کام میں دشواریاں ہوگئیں۔ فی الحال تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ جس مقصد

جلیلہ کے ماتحت اس مجلس کا قیام جس میں آیا تھا وہ افسوس ہے کہ پورا نہ ہو سکا۔

بابائے اردو کو مجلس سے متعدد شکایتیں ہیں اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس بڑھاپے میں انھیں یہ ذہنی تکلیفیں پہونچ رہی ہیں۔ اردو ادب پر ڈاکٹر صاحب کے جو احسانات ہیں ان کا تقاضا ہے کہ انھیں ساتھ رکھتے ہوئے انجمن کے معاملات کی اصلاح کی جائے۔ اگر موجودہ مجلس نظما یہ کام نہیں کر سکتی تو اسے دوسرے لوگوں کے لیے جگہ خالی کر دینی چاہیے۔

انجمن کو موجودہ خلفشار سے نکالنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب کو بھی اس کام میں مدد کرنی چاہیے۔ انھوں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے کو تیار ہیں۔ لیکن یہ کام محض الزام تراشی سے پورا نہیں ہو سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تطہیر کا کام بابائے اردو کے اشتراک عمل سے کیا جائے تو آج بھی انجمن کے سارے معاملات درست ہو سکتے ہیں۔

بہر حال مضامین کا سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیے۔ ساتھ ہی بہتان تراشیاں بھی ختم ہو جانی چاہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات گرامی کا احترام پورا پورا ملحوظ رہے اور انجمن کے معاملات میں ان کی سربراہی کو قائم و برقرار رکھا جائے۔

اتنا یاد رہے کہ انجمن قوم کی ایک نہایت بیش قیمت امانت ہے اور اس لیے ضرورت ہے کہ اس امانت کو قوم کی بہبود کے لیے استعمال کیا جائے۔ اختلافات جتنی جلد دور کر دیے جائیں اتنا ہی قوم کے لیے اچھا ہوگا۔

ضیاءالدین احمد برنی (۲۹)

اس صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے برنی نے مذکورہ مراسلے کی اشاعت کے بعد ضروری سمجھا کہ مولوی عبدالحق کے خیالات کی کوئی جھلک قوم کے سامنے پیش کی جائے۔ چناں چہ اپنے رسالے ''کتابی دنیا'' ستمبر ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں ایک عنوان ''خیالات مولوی عبدالحق'' اور اس پر ایک نوٹ کے ساتھ کہ ''ذیل میں بابائے اردو کی مختلف تحریروں سے چند جواہر ریزے پیش کیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔ مدیر''، عبدالحق سے اپنی محبت اور عقیدت کا تحریری ثبوت دیا۔
ان اقتباسات میں دو قابل ذکر ہیں اور اس الیے کو پیش نظر رکھتے ہوئے خیال اس طرف جاتا ہے کہ برنی نے خاص طور پر بابائے اردو کے ان خیالات کی تشہیر کی ہے تاکہ رائے عامہ ان کے حق میں ہو سکے۔ وہ دو اقتباس یہ ہیں:

## میری زندگی کا مقصد

''میری زندگی کا مقصد دنیا میں ایک ہی ہے، وہ یہ کہ اردو کو ترقی ہو اور وہ علمی زبان بن جائے''

## انسانی اعمال

''انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے۔ یہی اس کی پونجی، یہی اس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے۔''

۱۹۵۹ء میں جشن یوم پاکستان کے سلسلے میں جب صدر مملکت جنرل محمد ایوب خاں نے بابائے اردو کو بھی ایک خطاب سے نوازا تو برنی نے مارچ ۱۹۵۸ء کے ''کتابی دنیا'' کے اداریے میں انھیں ان الفاظ میں سراہا:

بابائے اردو اس خطاب کے ہر طرح سے مستحق ہیں اگر چہ وہ ہر خطاب سے بلند ہیں۔ اس خطاب سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر مملکت کے دل میں ان کی کس قدر گہری محبت اور عقیدت ہے۔ یہ بالواسطہ ان کی خدمات کا اعتراف ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس ان کے مخالفین کے منہ بند ہو جائیں گے۔ خدا بابائے اردو کو صد وسی سال کی عمر عطا کرے تا کہ وہ اردو یونیورسٹی کے خواب کی عملی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ (۳۰)

ان کے انتقال (۱۶ اگست ۱۹۶۱ء) پر برنی ''کتابی دنیا'' شمارہ اگست ۱۹۶۱ء کے اداریے میں اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا:

بابائے اردو مولوی عبدالحق تین چار ماہ کی علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ ایسا سانحہ ہے جس کا صدمہ ہمیشہ رہے گا۔ مولوی صاحب نے جس خلوص کے ساتھ اردو کی خدمت کی ہے، اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنا سارا کتب خانہ انجمن ترقی اردو کو دیدیا، نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے اپنی عمر بھر کی کمائی بھی اس کی نذر کر دی۔ وہ ایک زبردست انشا پرداز، اور غیر جانب دار نقاد اور محقق تھے۔ ان کی ذات ایک انجمن کی حیثیت رکھتی تھی وہ ایسے دور کے نمائندہ تھے جو ان کی ذات پر ختم ہو گیا۔

ان کی کتابیں اردو علم وادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کی آخری خواہش اردو یونیورسٹی کا قیام تھا۔ یقین ہے کہ موجودہ دور کے مسلمان اس یادگار کو قائم کر کے دم لیں گے۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کے شبستان خاکی کو اپنے انوار رحمت سے بھر دے ان کے مرنے سے اردو یتیم ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے انتقال پر برنی نے ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد (دکن) کے سکریٹری کو ۳۰ ستمبر ۶۲ء کو ایک خط کے ذریعے کا اظہار کیا اور اسے کتابی دنیا میں ''خبریں'' کے ذیل میں ''پیغام تعزیت'' کے عنوان سے شایع کیا۔

محترمی۔ تسلیم

میری طرف سے زور صاحب کے انتقال پر ملال پر دلی ہمدردی قبول فرمائیے۔
ان کی موت دنیائے ادب اردو کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ مدتوں اس نقصان عظیم کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں اردو کے استحکام و بقا کے لیے اتنے کام کیے ہیں کہ ان کا نام امٹ ہو گیا ہے۔

خدائے برتر سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی روح کو سکون عطا کرے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل۔ والتسلیم

شریکِ غم
ضیاءالدین احمد برنی (۳۱)

برنی کا ایک اہم خط ماہنامہ ''ہم قلم'' میں شایع ہوا تھا۔ یہ خط مدیر رسالہ کے نام ہے۔ اس خط میں ابن قصر کے ان سوالات کے جوابات پر مبنی ہے جو انھوں نے ہم قلم کی تازہ اشاعت میں اُٹھائے تھے۔ یقیناً اُن سوالات کا جواب برنی ہی دے سکتے تھے کیوں کہ پروفیسر مرزا حیرت بھی بمبئی اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس سے وابستہ رہے تھے اور برنی نے اس آفس میں کوئی ۲۷ برس خدمات انجام دی تھیں۔ علاوہ ازیں برنی ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ چناں چہ برنی نے مدیر کے نام ایک مراسلے کے ذریعے اپنی معلومات اس طرح ظاہر کی ہیں:

رسالے نے اس مکتوب کو ''تحقیقی مسائل'' کے عنوان سے شایع کیا ہے:

ابن قصر صاحب نے پروفیسر مرزا حیرت کے بارے میں ''ہم قلم'' کے تازہ شمارے میں چند اہم استفسارات کیے ہیں۔ چوں کہ میں بمبئی کے اورینٹل ٹرانسلیٹر ز آفس میں جس سے مرزا حیرت وابستہ تھے، ۲۷ برس تک کام کر چکا ہوں اور مرزا صاحب کے بعض شاگردوں سے بھی ذاتی طور پر واقف ہوں اس لیے میں ان کے سوالات کا جواب دیتا ہوں ،خدا کرے انھیں تشفی ہو جائے۔

مولوی صاحب کے مضمون میں پروفیسر حیرت کی تاریخ وفات غلط درج ہو گئی ہے ان کا انتقال اگست ۱۸۹۹ء میں نہیں ۱۱۱ کتوبر ۱۸۹۸ء کو ہوا تھا۔ ان کی وفات کے بعد الفنسٹن کالج کے پرنسپل ہتھورن ویٹ نے اس عظیم المرتبت شخص کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا اور اسے حکومت کی تمام روایات کے خلاف ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم بمبئی کی سالانہ رپورٹ برائے سال ۹۹۔۱۸۹۸ء میں بہ طور ضمیمہ کے سایع کرایا۔ (میرا اپنا یہ خیال ہے کہ چوں کہ مولوی عبدالحق محکمۂ تعلیم سے متعلق تھے اس لیے انھوں نے وہ مضمون اسی سرکاری رپورٹ میں پڑھا ہوگا۔) بہر حال یہی وہ مضمون ہے جس نے پہلی دفعہ دنیا کو پروفیسر

حیرت کے حالات اور کمالات سے روشناس کرایا۔ آج تک جتنے مضمون پروفیسر حیرت پر شایع ہوئے ہیں ان سب کی بنیاد یہی مضمون ہے۔

اورینٹل ٹرانسلیٹرز آفس سے منتقل ہوکر پروفیسر حیرت الفنسٹن کالج آگئے اور یہاں انھوں نے ۲۶ سال تک فارسی کی کرسی کو زینت دی۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ ایرانی نژاد دست کون تھے۔ اس سلسلہ میں میرا قیاس یہ ہے کہ وہ دوست مرزا صاحب کے کوئی شاگرد ہوں گے اور چاہتے ہوں گے کہ ''افسر'' میں وہ مضمون شایع ہوجائے تا کہ ان کے قابل فخر استاد کے حالات پبلک تک پہنچ جائیں۔

پروفیسر حیرت نہایت باکمال فاضل تھے۔ ان کی دو یادگاریں باقی رہ گئی ہیں، ایک سر جان مالکم کی ''تاریخ ایران''، جو حکومت بمبئی کے ایما سے انگریزی سے فارسی میں منتقل کی گئی تھی۔ دوسری ان کی غزلوں کا مجموعہ ''منظومات'' جو ۱۹۰۰ء میں چھپا تھا۔ اس میں صرف چند غزلیں ہیں اس لیے کہ پروفیسر حیرت نے مرنے سے پیشتر اپنا بیشتر کلام نذر آتش کردیا تھا۔ یہ غزلیں وہ ہیں جو ان کے شاگردوں کے پاس محفوظ رہ گئی تھیں۔

۱۹۳۵ء میں پروفیسر حیرت کے ایک ممتاز شاگرد پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز نے حکومت بمبئی کی اجازت سے تعلیمی رپورٹ والے مضمون کو ایک علیحدہ کتابچہ کی صورت میں شایع کرایا۔ اس میں پروفیسر حیرت کی غزلیں بھی ہیں جو ''منظومات' سے لی گئی ہیں۔ کچھ نایاب اصلاحیں ہیں جو انھوں نے اپنی بعض کتابوں کے حاشیوں پر لکھ دی تھیں اور ''منظومات'' کا فارسی مقدمہ ہے جسے عبدجانی قاسم تھاریانی نے تحریر کی تھا۔ اس کتابچہ میں پروفیسر حیرت کی تصویر کے ساتھ ان کے ہاتھ کی تحریر کردہ ایک غزل بھی درج ہے۔ پروفیسر حیرت کی یہ دونوں یادگاریں اب نایاب ہیں ''منظومات'' تو ملتی نہیں البتہ تاریخ کی جلدیں دنیا کی بعض لائبریریوں میں موجود ہیں۔

مرزا صاحب کے شاگردوں میں بعض بڑے نام ور اشخاص گزرے ہیں، بمبئی یونیورسٹی کے رجسٹرار خان بہادر فردونجی ایم دستور آنجہانی ان کے چہیتے شاگرد تھے۔ مغل لائن بمبئی کے دفتر میں ایک ایرانی نژاد بزرگ مرزا محمد علی بھی ان کے شاگردوں میں تھے۔

میں نے جواب میں ارادۃً چند باتوں کا اضافہ کردیا ہے تا کہ مولوی صاحب والا مضمون زیادہ مکمل ہوجائے۔

ضیاءالدین احمد برنی (۳۲)

اندازہ ہے کہ ایک بڑی تعداد برنی کے خطوط کی رسائل کے مدیران کے نام ہوگی جو تا حال سامنے نہیں آسکی ہے۔انھی میں سے ایک خط یہاں نقل کیا جاتا ہے۔یہ مدیر ماہنامہ کتاب، لاہور کے نام ہے۔

۱۱۲کتوبر۱۹۵۶ء          نمبر ۳۳۸

مکرمی ایڈیٹر صاحب ''کتاب''، تسلیم

آپ نے اپنے تازہ ترین پرچہ میں ''کتابی دنیا'' کے بعض اقتباسات درج کیے ہیں جن میں محمد رحیم صاحب چمن کا خط خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اس سے قبل بھی آپ ''کتابی دنیا'' کی بعض چیزیں اپنے موقر رسالے میں درج کر چکے ہیں۔لیکن حیرت ہے کہ آپ نے آج تک ''کتابی دنیا'' کا نام بھی اپنے جریدہ میں چھاپنا گوارا نہ فرمایا۔یہ خط جسے آپ نے ''کتابی دنیا'' نقل کیا ہے اس قابل تھا کہ آپ حوالہ دیتے۔اگر ہم دونوں میں باہمی تعاون نہ ہوگا تو ہم اردو علم وادب کی قرار واقعی خدمت نہ کر سکینگے۔آپ ہماری چیزیں شوق اور آزادی سے شایع کر سکتے ہیں لیکن دیانت داری کا تقاضا ہے کہ آپ حوالہ دیں۔اس کے علاوہ آپ نے محمد رحیم صاحب کے ادارہ کا نام بھی حذف کر دیا حالانکہ یہ ضروری چیز تھی۔میں آپ کے جواب کا منتظر رہونگا۔والتسلیم

مخلص

ضیاء الدین احمد برنی

مدیر ''کتابی دنیا''

اس خط میں دیکھا جا سکتا ہے کہ برنی کسی کی غلطی پر خواہ دانستہ ہی کی گئی ہوئی سخت برانگیختہ نہیں ہوتے بلکہ نہایت شریفانہ انداز میں قاعدے کی باتیں بتاتے ہیں۔برنی کے اس خط کا جواب نہیں دیا گیا۔برنی نے یہ اسی نوٹ کے ساتھ ''کتابی دنیا'' دسمبر ۱۹۵۶ء میں شایع کیا۔

برنی کے مطبوعہ خطوط میں ایک خط ملا واحدی کے نواسے سید اوصاف علی واحدی دہلوی کے نام ہے۔اس پر تاریخ درج نہیں یا چھپنے سے رہ گئی بہر سال شان نزول اوصاف صاحب نے ۱۹۶۵ تحریر کیا ہے۔سید اوصاف صاحب نے انھیں اپنا ایک مضمون کتابی دنیا کے لیے بھیجا تھا۔اُس سلسلے میں ہے۔

مضمون شایع ہو جانے کے بعد سید اوصاف علی واحد نے بھی ۲۴ دسمبر ۱۹۶۴ء کو برنی کو خط لکھا تھا اور اس پرچے کو طلب کیا تھا جس میں ان کا مضمون شایع ہوا تھا۔

برنی کا خط ملاحظہ فرمائیے۔

عزیزم! مضمون پہنچ گیا ہے، دسمبر کے پرچے میں انشاء اللہ نکلے گا۔ہمارا پرچہ (کتابی دنیا)

۲۰ تاریخ کو نکلتا ہے اس کے دو تین دن کے اندر پرچل جانا چاہیے۔ مضمون دینے کا شکریہ قبول فرمایئے، میں نے تقریباً تمام وکمال دے دیا ہے۔ دسمبر والے پرچے میں حیرت شملوی کی تصویر بھی دے رہا ہوں۔

والسلام　فقط　برنی (۳۳)

برنی اپنے چھوٹوں سے کس نرمی اور شائستگی سے پیش آتے ہیں اس کی مثال اس خط میں مل جاتی ہے۔

اپنے بچپن کے دوست ملا واحدی دہلوی کو برنی نے اپنے انتقال سے کوئی اٹھارا روز پیشتر خط لکھ کر اس طرح یاد کیا۔

بروز اتوار مورخہ ۱۳، اپریل ۱۹۶۹ء

برادرم! تسلیم

آج کے جنگ (۳۴) میں آپ کا دوسرا مضمون لڑکے نے پڑھ کر سنایا، جس میں میرا بھی ذکر تھا۔ ممکن ہے اور بھی مضامین نکلے ہوں، لیکن ان کے بارے میں کوئی علم مجھے نہیں ہے۔ بہر حال شکریہ قبول فرمائیں۔ بھائی! اب آخری وقت ہے چل چلاؤ ہے۔ جب تک اس قسم کی یادوں کی جھلکیاں آتی رہیں دل چسپی برقرار رہتی ہے اور دوستوں سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ غالباً یہ میرا آخری خط ہے۔

حال ہی میں میری ایک کتاب جو چالیس سال پہلے لکھی گئی تھی شائع ہوئی ہے، اس کا نام ''تعلیم وتربیت'' (۳۵) ہے ابھی میرے پاس نہیں آئی۔ بہر حال یہ تازہ خدمات میں شمار نہیں ہوتی تمنا ہے کہ مجھ پر بھی میرے بعد ایک تفصیلی مضمون آپ لکھیں۔ (۳۶)

دو سال سے میری آمدنی محدود ہے، آپ کی صحت خدا کے فضل سے مجھ سے بہتر ہے کیا ممکن ہو سکے گا کہ میری آپ کی ایک ملاقات ہو جائے؟ جلیل قدوائی صاحب وعدہ کرتے ہیں مگر آتے نہیں۔ یہی حال مشفق خواجہ کا ہے بہر حال اس دنیا کو خدا حافظ

دیکھیے اب کب ملاقات ہوتی ہے اس طویل زندگی میں کوئی بات ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔ خدا حافظ، دوستوں کو سلام۔

مخلص

ضیاء الدین احمد برنی (۳۷)

## چند نجی خطوط:

برنی کا ایک خط اپنے چچا زاد بھائی منشی رحیم اللہ خان (خطاط) (۳۸) جنڈیالہ ڈھاب والا، کے نام ہے۔ جس انھوں نے جنڈیالہ ڈھاب والا میں اپنی زمین کے بارے میں دریافت کیا ہے۔

19-8-1953

برادرم۔ تسلیم

مجھے مجید صاحب کی زبانی یہ معلوم ہوا ہے کہ میری جو تھوڑی سی زمین ہے اس کا پٹواری کے رجسٹر میں باقاعدہ اندراج موجود ہے۔ جب کہ آپ کو معلوم ہوگا یہ زمین مجھے بھائی غلام رسول (۳۹) نے اس وقت دی تھی جب میں وزیرآباد کے جوبلی اسکول میں پڑھتا تھا۔ (۴۰) اس زمین سے اس پچاس سال میں میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اب جو کچھ ہو چکا ہو چکا۔ میں اب چاہتا ہوں کہ اب براہ راست میرا تعلق اس زمین سے ہو جائے تا کہ میں اس سے استفادہ کرسکوں۔ آپ یہ کام قاضی عبدالحکیم صاحب کے ذریعے کرا سکتے ہیں۔ رحمت اللہ (۴۱) اس کام میں آپ کی امداد کرسکتے ہیں۔ اگر یہ زمین کسی کو فصل بونے کے لیے دیدی گئی ہوتو پھر اس سے کہیے کہ وہ لگان کی رقم بہ ذریعہ منی آرڈر مجھے بھیجا کرے۔

میں آپ کے جواب کا منتظر رہونگا۔ براہ کرم ضروری کارروائی کر کے مجھے شکر گزار بنائیں۔

اس طرح والد کی زمین بھی کسی کو دیجا سکتی ہے۔ اس کے لیے معاوضہ یہ ہوگا کہ وہ تیس چالیس درخت شیشم کے لگادے۔ درختوں کا فیصلہ تو آپ کرسکتے ہیں کیونکہ آپ موقع پر موجود ہیں۔ میں یہاں سے کیا بتا سکتا ہوں۔

ان دونوں باتوں کا تشفی بخش جواب جلد سے جلد بھیجیے۔

آپ کی صحت کا کیا حال ہے؟ سب کی خدمت میں سلام ودعا۔

والتسلیم

نیازمند

ضیاءالدین احمد برنی

دہلی سے بھائی (۴۲) کا خط آیا تھا۔ بواسیر کا حملہ پھر ہوگیا ہے جسکی وجہ سے کمزوری بڑھ گئی ہے۔ پرسوں ایک اور خط آیا ہے۔ جس میں افاقہ کی اطلاع دی گئی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک خط برنی کا انگریزی میں وزیرآباد کے تحصیل دار کے نام ہے۔ جسے مطلع کیا گیا ہے کہ ان کے والد کی زمین جو ان کے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر، ان کے اور ان کے چھوٹے بھائی منشی محمد یوسف دہلوی کے نام ہے تاہم وہ کسی اور نے اپنے نام اندراج کروا رکھی ہے۔ لہٰذا واگزاشت کروایا جائے۔

ان کے اس زمین کے معاملات کا کیا ہوا جس کا ذکر مذکورہ نجی خطوں میں آیا ہے، نہیں معلوم ہو سکا۔ تاہم جو بات یہاں درج کیے جانے کی ہے وہ یہ ہے کہ برنی اپنے معاملات کو مسلسل ٹھیک کرتے رہتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ کسی قسم کا الجھاؤ باقی نہ رہے۔

## خطوط کا مجموعی جائزہ:

برنی کے جو خطوط ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ ان میں یہ باتیں ہم نتیجے کے طور پر اخذ کر سکتے ہیں:

۱۔ برنی خطوط کے جواب دینے میں مستعد رہتے تھے تا آں کہ کوئی وجہ نہ ہو جائے۔

۲۔ خطوط میں القابات کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے تھے۔

۳۔ سلام کے لیے عموماً تسلیم اور وعلیکم کے لیے والتسلیم لکھا کرتے تھے۔

۴۔ اختتام پر کبھی پورا نام لکھتے تھے ورنہ صرف برنی۔

۵۔ وہ تفصیلی خط نہیں لکھا کرتے تھے، اگر کسی جواب طلب بات نے تقاضا کیا تو جواب طویل ہو جاتا تھا۔

۶۔ مدد کرنے، حوصلہ بڑھانے، داد دینے یا سراہنے، رنج و غم میں شریک ہونے یا عیادت کرنے میں عجلت کرتے تھے اور کبھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔

۷۔ موقع کی مناسبت سے پر مزاح یا طنزیہ الفاظ میں بھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

۸۔ دل آزاری یا تکلیف دہی کو انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا۔

ان کے خطوط ان کی زندگی کی طرح انسانی عیوب سے پاک ہیں۔ وہ کسی خط میں کسی سے مدد مانگتے، طعنہ دیتے یا کسی کو کوئی ہلکی یا گری ہوئی بات کہتے نظر نہیں آتے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ برنی کے خطوط مجتمع ہوں تا کہ اہل علم ان سے استفادہ کر سکیں۔ برنی کی دیگر تحریروں کی طرح ان کے خطوط بھی تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مجتمع ہونے سے تاریخ کے بعض گوشوں پر روشنی پڑنے کا امکان ہے۔ علاوہ ازیں مکتوب الیہان سے تعلقات کے ضمن میں بھی بہت سی باتیں سامنے آئیں گی۔

## حواشی وتعلیقات:

۱۔ عبدالعزیز ساحر:''عرض مرتب''، ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط، لاہور، حسنین پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء۔

۲۔ سید مظفر حسین برنی: کلیات مکاتیب اقبال، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء ص ۲۵۔

۳۔ محترم انیس شاہ جیلانی صاحب نے راقم کی درخواست پر تقریباً ستر کے قریب خطوط اصل فراہم کیے تھے جو فوٹو کاپی کروانے کے بعد بہ حفاظت لوٹا دیے گئے تھے۔

۴۔ غیر مطبوعہ۔

۵۔ برنی، ضیاء الدین احمد، حیات مولانا محمد علی جوہر، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء۔

۶۔ رئیس احمد جعفری، علی برادران، لاہور، محمد علی اکیڈمی،

۷۔ کتابی دنیا کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ کتاب برنی کے پاس آئی تھی اور برنی نے کتابی دنیا میں تبصرہ بھی کیا تھا۔

۸۔ غیر مطبوعہ۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ ایضاً۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ اعجاز احمد برنی، برنی کی دوسری بیوی سے، بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں۔ برنی زمانہ علالت میں انھوں نے ہی جواب دیا تھا۔ یہ خط بھی غیر مطبوعہ ہے۔

۱۴۔ عبداللطیف اعظمی:''مشاہیر کے خطوط'' مکتبہ جامعہ نئی دہلی، دسمبر ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۹۔

۱۵۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ابتدائی گریجویٹ تھے۔ ۱۹۲۷ء میں مکتبہ جامعہ سے وابستہ ہوئے۔ ان کے دور میں مکتبے بڑی ترقی کی۔ ان کا انتقال پیرس میں ہوا مگر تدفین جامعہ نگر نئی دہلی میں ہوئی۔ دیکھیے: مکاتیب اقبال، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، جلد اول، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء ص ۹۵۷۔ مرحوم پر ماہ نامہ جامعہ، دہلی جنوری میں، عبداللطیف اعظمی کا مضمون شایع ہوا تھا۔ دیکھیے: مشاہیر کے خطوط، مرتبہ عبداللطیف اعظمی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، دسمبر ۱۹۷۵ء۔

۱۶۔ فروری ۱۹۶۴ء کے کتابی دنیا میں برنی نے ان پر نوٹ لکھا تھا۔

۱۷۔ مکتبہ جامعہ میں علاء الدین خالد (برنی کے بھتیجے اور اردو اکیڈمی سندھ کے مالک) نے حامد علی خاں کے ساتھ کام کیا تھا۔

۱۸۔ مارچ ۱۹۶۵ء کے جامعہ میں عبداللطیف اعظمی کا مضمون مرحومہ پر شایع ہوا تھا۔ ۲۲ فروری ۱۹۶۴ء کو روزنامہ جنگ کراچی میں برنی کا مضمون ''ایک عظیم عورت'' بھی مرحومہ کی یاد میں شایع ہوا تھا۔

۱۹۔ یہ لیکچر (توسیعی خطبہ) جنوری و فروری ۱۹۳۵ء میں جامعہ ملیہ میں دیے گئے تھے اور اسی زمانے میں کتابی صورت میں سایع ہوئے تھے۔ ''ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش'' کے عنوان سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔ (مشاہیر کے خطوط، مرتبہ عبداللطیف اعظمی، ص ۱۴۲)۔

۲۰۔ ایک حامد علی خاں اور دوسری خالدہ ادیب خانم۔ (دیکھیے: مشاہیر کے خطوط، مرتبہ عبداللطیف اعظمی، ص ۱۴۳)

۲۱۔ تخلیقات و نگارشات، سید الطاف علی بریلوی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۴۰۔

۲۲۔ چوتھے اجلاس کی رپورٹ، کتابی دنیا، اپریل ۱۹۶۵ء، ص ۷۔

۲۳۔ مولانا محمد علی جوہر۔

۲۴۔ دونوں تصویریں برنی کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

۲۵۔ جیسا کہ تحریر ہو چکا ہے کہ برنی اپنی زندگی میں ''خطوطِ مشاہیر'' کے نام سے خطوط کا انتخاب کر لیا تھا تاہم وہ اسے شائع نہیں کر سکے۔

۲۶۔ مرقومہ ۲۷ مارچ ۶۳ء غیر

۲۷۔ کارواں کراچی، نومبر دسمبر ۵۷ء ص ۱۹۹۔

۲۸۔ کتابی دنیا، دسمبر ۵۷ء، ص ۷۔۸۔

۲۹۔ برنی نے اپنے خط میں جن اندوہ ناک معاملات کی جانب اشارہ کیا ہے اسے انجمن ترقی اردو پاکستان نے ''انجمن ترقی اردو کا المیہ'' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ درحقیقت یہ مولوی عبدالحق کا مضمون ہے جو ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا اور جسے جمیل الدین عالی نے ۲۰۰۲ میں حرف چند کے اضافے ،جس میں ان کے ہمدردانہ جذبات سموئے ہوئے ہیں، کے ساتھ انجمن ترقی اردو پاکستان ہی کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔

۳۰۔ اداریہ، کتابی دنیا، کراچی، مارچ ۱۹۵۹ء۔

۳۱۔ ایضاً۔

۳۲۔ ماہنامہ ''ہم قلم''، کراچی اکتوبر نومبر ۱۹۶۲ء، ص ۸۴۔

۳۳۔ ''ناقابلِ فراموش شخصیات'' از سید اوصاف علی واحدی مرتبہ اسلام شبنم، کراچی، نظام المشائخ، ناظم آباد، ۲۰۰۵ء۔

۳۴۔ روزنامہ جنگ، کراچی۔

۳۵۔ یہ کتاب اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی اس پر پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے کا مقدمہ بھی ہے۔

۳۶۔ ملا واحدی: ''ملا واحدی کے قلم سے''، رونامہ جنگ کراچی، مئی ۱۹۶۹۔

۳۷۔ یہ خط مطبوعہ ہے اور ''ناقابلِ فراموش شخصیات'' از سید اوصاف علی واحدی مرتبہ اسلام شبنم، کراچی، نظام المشائخ، ناظم آباد، ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے۔

۳۸۔ یہ برنی کے چچا منشی کرم الٰہی کے بیٹے ہیں۔ اس سلسلے میں شجرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

۳۹۔ یہ برنی کے تایا مولوی گنج بخش کے بیٹے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی شجرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

۴۰۔ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول وزیر آباد میں برنی ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۶ء تک تعلیم حاصل کی۔

۴۱۔ یہ برنی کے چچا منشی کرم الٰہی کے پوتے یعنی مولوی غلام اللہ کے بیٹے تھے۔ اس سلسلے میں بھی خاندانی شجرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

۴۲۔ منشی عبدالقدیر۔ برنی کے بڑے بھائی۔

# باب ششم

## برنی کے نام مشاہیر کے خطوط

☆۔خطوطِ مشاہیر
☆۔کتابی دنیا میں شائع ہونے والے خطوط:
☆۔برنی کی سب ایڈیٹری کا معاملہ خطوط کی روشنی میں
☆۔مولانا احسن مارہروی کے خطوط برنی کے نام
☆۔شبلی نعمانی کا خط
☆۔ملا واحدی کے خطوط
☆۔حضرت وحید الدین بیخود دہلوی کے خطوط
☆۔خواجہ حسن نظامی کے خطوط
☆۔علامہ ڈاکٹر اقبال کے خطوط
☆۔علامہ نیاز فتح پوری کے خطوط
☆۔منشی عبدالقدیر دہلوی (برنی کے بڑے بھائی) کے خطوط
☆۔برنی کے نام مطبوعہ خطوط
☆۔غیر مطبوعہ خطوط کا اہم ذخیرہ
☆۔مدیرانِ رسائل کے نام خطوط
☆۔مولانا ماہر القادری کے خطوط برنی کے نام
☆۔محمد طفیل مدیر ''نقوش'' کے خطوط
☆۔انیس شاہ جیلانی کے خطوط
☆۔علامہ محمد اسلم جیراجپوری کے خطوط
☆۔سید اکبر حسین الہ آبادی کے خطوط
☆۔عزیز حسن بقائی کے خطوط
☆۔مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کے خطوط
☆۔محمد فتح الاسلام (ضیاء الدین احمد برنی کے برادرِ نسبتی) کے خطوط
☆۔خطوط کا مجموعی جائزہ

# باب ششم:

## برنی کے نام مشاہیر کے خطوط

برنی کو یہ شرف حاصل رہا ہے کہ انھوں نے اپنے عصر کے مشاہیر مثلاً سائل دہلوی، بے خود دہلوی، باقر علی داستان گو، مولوی محمد اسحاق رام پوری،، سید احمد دہلوی، منشی ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی، علامہ راشد الخیری، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، خواجہ حسن نظامی، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، اکبر الہ آبادی، علامہ سید سلیمان ندوی، جگر مرادآبادی، علامہ نیاز فتح پوری، جلیل قدوائی، ملاواحدی، عبدالمجید سالک، عبدالمجید حیرت شملوی، ساغر دہلوی، مولوی عبدالحق، جیسے فضلاء وادباء کو نہ صرف دیکھا بلکہ بعض کی صحبتِ فیض رساں سے مستفید بھی ہوئے۔ ان میں عمر رسیدہ بھی ہیں اور ہم عمر بھی اور خوردسال بھی (۱)

تمام عمر برنی کے جن لوگوں سے تعلقات و مراسم رہے ان میں مختلف مذاہب، طبقہ، فکر مراتب اور عمر کے لوگ ہیں۔ ان سب سے برنی کی خط کتابت بھی رہی۔ ان کے تعلقات کے دائرے کو پیش نظر رکھ کر حتمی طور پر یہ نہیں کہا سکتا کہ انھوں نے کتنے خطوط لکھے اور کتنے خطوط انھیں لکھے گئے تاہم ان کے نام خطوط کی تعداد پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات بآسانی کہی جاسکتی ہے کہ ان کے خطوط کی تعداد بھی ہزاروں میں ہوگی۔

برنی کے نام دست یاب خطوط کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے زائد ہے۔ ان میں مشاہیر کے خطوط بھی بڑی تعداد میں ہیں جو کئی لحاظ سے نہایت اہم اور قیمتی ہیں۔ اس مقالے میں ان سب کا تحقیقی اور تنقیدی تجزیہ ممکن نہیں ہے چناں چہ اُن پر علاحدہ کسی

اور موقع پر گہری نظر ڈالی جائے گی۔اس باب میں بعض ان خطوط کو مثالاً پیش کیا اور جائزہ لیا جارہا ہے جن سے برنی کے سوانح،شخصیت،کردار،مکتوب نگار کی زندگی،فکر اور برنی سے تعلقات کی نوعیت پر روشنی پڑتی ہے علاوہ ازیں وہ خطوط بھی جن سے اُس عہد کے منظر نامے کا کوئی پہلو اجاگر ہوتا ہے تاہم پہلے برنی کے دست یاب اور غیر دست یاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط کی کچھ تفصیل پیش کی جارہی ہے۔

## ''خطوطِ مشاہیر'':

برنی نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں یعنی مارچ ۱۹۶۷ء میں ''خطوطِ مشاہیر'' کے نام سے اپنے نام بعض اہم اور بڑی شخصیات کے غیر مطبوعہ خطوط سے ایک انتخاب مرتب کیا تھا جس میں،ضروری حواشی بھی لکھے تھے تاہم ان کی طویل علالت اور اس کے بعد ان کی وفات کے باعث وہ انتخاب زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔

اس انتخاب میں برنی نے اپنے نظریہء صلح کل اور قدیم مشرقی روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خطوط منتخب کیے تھے۔جن کی تفصیل آگے رہی ہے۔مذکورہ انتخاب سے متعلق مزید معلومات برنی کی غیر مطبوعہ تحریرات کے ذیل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

## برنی کے نام مطبوعہ خطوط:

برنی کے نام مطبوعہ خطوط رسالہ ماہنامہ ''کتابی دنیا'' میں،وقتاً فوقتاً بہ حیثیت مدیر رسالہ،شایع ہوئے ہیں،ان خطوط کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔برنی کے نام ایک خط علامہ شبلی نعمانی کا ''باقیاتِ شبلی'' میں شایع ہوا ہے۔(۲) مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط کی تیسری جلد میں برنی کے نام مولانا کے ۱۵عدد خطوط شایع ہوئے ہیں۔(۳)اس کے علاوہ برنی کے نام علامہ اقبال کے پانچ عدد خط''انوارِ اقبال''(۴) میں اور اس کے بعد''کلیاتِ مکاتیب اقبال'' (۵) جلد اول،دو عدد جلد دوم اور ایک خط (انگریزی سے ترجمہ)(۶) جلد سوم،میں شایع ہوئے ہیں۔جلیل قدوائی کی مرتبہ''مکاتیب عبدالحق''(۷) میں برنی کے تین عدد خط شایع ہوئے ہیں۔مزید کہیں شایع ہوئے ہوں تو میرے علم میں نہیں ہیں۔ایک امکان ہے کہ ہندو پاکستان کے رسائل و جرائد میں بھی ان کے خطوط ضرور شایع ہوئے ہوں گے۔ان کی تلاش اور جمع آوری کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔

## کتابی دنیا میں شایع ہونے والے خطوط:

کتابی دنیا میں برنی کے نام بہ حیثیت مدیر درج ذیل خطوط شایع ہوئے۔یہ خطوط علمی نوعیت کے ہیں۔ان میں عموماً کتابی دنیا سے متعلق باتیں پائی جاتی ہیں۔ان خطوط سے بھی برنی کے تعلقات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ان خطوط کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ برنی نے رسالے کے لیے کس کس طرح محنت کی اور رسالے پر ہونے والی تنقید کو اصلاح کی غرض سے قبول کیا۔تفصیل کچھ اس طرح ہے:

تمکین کاظمی کتابی دنیا،جولائی ۶۱ص ا۔

محمد اعظم خان گورنر مشرقی پاکستان، کتابی دنیا، فروری ۶۲ء۔

این بی سین شاد، کتابی دنیا، مارچ ۶۲ء ص ۱۳۔

منشی عبدالرشید ختر وارثی، کتابی دنیا دسمبر ۶۱ء ص ۱۲۔۱۳۔

این، بی، سین، کتابی دنیا دسمبر ۶۱ء ص ۱۲۔۱۳۔

ناشاد، کتابی دنیا دسمبر ۶۱ء ص ۱۲۔۱۳۔

محمد حبیب الرحمٰن، کتابی دنیا جون ۶۵ ص ۱۴۔

حبیب احمد ندوی، کتابی دنیا جون ۶۵ ص ۱۴۔

آل احمد سرور، کتابی دنیا جون ۶۵ ص ۱۴۔

محمد رحیم دہلوی، کتابی دنیا جنوری ۵۶ ص ۱۵۔

سید امیر حسن نورانی، کتابی دنیا فروری ۵۶ ص ۹۔۱۰۔

مجیبی، کتابی دنیا فروری ۵۶ ص ۹۔۱۰۔

محمد اسحاق، کتابی دنیا فروری ۵۶ ص ۹۔۱۰۔

ع۔س۔ مسلم، کتابی دنیا فروری ۵۶ ص ۱۴۔

ریاض احمد، کتابی دنیا فروری ۵۶ ص ۱۴۔

ثنا اللہ، کتابی دنیا فروری ۵۶ ص ۱۴۔

سید اختر حسین، کتابی دنیا مارچ ۵۶ ص ۱۲۔

ادب لطیف، کتابی دنیا مارچ ۵۶ ص ۱۲۔

تجلی کراچی، کتابی دنیا مارچ ۵۶ ص ۱۲۔

فضل الٰہی، کتابی دنیا مئی ۵۶ ص ۶۔

تحسین سروری، کتابی دنیا مئی ۵۶ ص ۶۔

ہر مزجی اسٹریٹ، کراچی، کتابی دنیا جون ۵۸ ص ۱۰۔

محمد علی خاں، کتابی دنیا جون ۵۸ ص ۱۰۔

بعض حضرات کے خطوط کا جو برنی کو لکھے گئے کتابی دنیا میں محض ذکر ملتا ہے۔ان کے نام یہ ہیں:

اسلم جیراج پوری، کتابی دنیا فروری ۵۶ ص ۳۔

قاضی بدر جلالی، کتابی دنیا اپریل ۵۶ ص ۲،۵۔

حافظ عزیز حسن بقائی دہلوی کتابی دنیا جون ۵۷ ص ۲۔

احمق پھپھوندوی کتابی دنیا ستمبر ۵۷ ص ۵۔

## غیر مطبوعہ خطوط کا اہم ذخیرہ:

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ برنی کے تعلقات کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔اس مناسبت سے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں رہتا کہ برنی کے نام خطوط کی ایک کثیر تعداد ہوگی۔اس قیاس کو بنیاد بنا کر خطوط کی تلاش شروع کی گئی تو برنی کا مرتبہ مجموعہ خطوط "خطوطِ مشاہیر" (غیر مطبوعہ) کے دریافت کر لینے کے بعد تجسس اور تلاش وسعی میں اضافہ ہو گیا۔بالآخر نیشنل میوزیم پاکستان، کراچی میں اسے دریافت کر لیا گیا۔

برنی نے اپنے خودنوشت حالات میں اس ذخیرہ خطوط سے متعلق لکھا ہے کہ "میرے مشاہیر کے خطوط اقبال اکیڈمی کے پاس ہیں جو وہ میوزیم کے ہاتھ فروخت کریں گے۔" ۲۲ اپریل ۱۹۶۹ء کو یہ یادداشت قلم بند ہوئی "اقبال اکیڈمی کے پاس 'بڑے لوگوں کے خط برنی صاحب کے نام' ہیں۔"

مذکورہ ذخیرے میں ایک خط برنی کا بھی ہے جو اقبال اکیڈمی، کراچی کو ۶ دسمبر ۱۹۶۸ء کو لکھا گیا تھا جس میں اسی امر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

۶ دسمبر ۶۸ء

مکرمی

تسلیم۔مجھے مطلع فرمائیے کہ میرے خطوط کے متعلق کیا فیصلہ ہوا ہے۔ممتاز حسن صاحب کو کہیے کہ جلد سے جلد اس کام کو پوری توجہ کے ساتھ انجام دیدیں میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے اور جو باقی حساب کتاب ہے وہ صاف کر دیں۔آپ بھی جو باقی حساب کتاب ہے وہ صاف کر دیں مہربانی ہوگی۔قیمت کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

والسلام

آنکھوں سے معذور

ضیاء الدین احمد برنی

دو تین تحریریں نایاب اور ملی ہیں۔جوش۔صہبائی۔جگر کی۔آدمی کو بھیج کر منگوالیں۔(۸)

میوزیم کے Accession رجسٹر کے مطابق یہ خطوط ۲۹ جولائی ۱۹۶۹ء کو ان کی بیگم آمنہ بیگم نے جمع کروائے۔ان کے عوض انھیں میوزیم کی جانب سے ۴۰۰۰ روپے دیے گئے تھے۔(۹)

برنی کے مذکورہ بالا بیانات سے اور ان کی بیگم کے، خطوط نیشنل میوزیم میں جمع کروانے سے مذکورہ بات کسی قدر پیچیدہ ہو جاتی ہے۔

غالباً اس الجھن کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ برنی نے اپنے نام مشاہیر کے خطوط اقبال اکیڈمی کے پاس ممتاز

حسن کے توسط سے وہاں امانت رکھوائے تھے اور انھیں اختیار دیا تھا کہ وہ نیشنل میوزیم کو فروخت کر کے برنی کو رقم دیں گے، لیکن برنی کے اچانک انتقال کر جانے کی وجہ سے غالباً ممتاز حسن کی کوششوں سے کہ وہ برنی کے رشتے دار تھے مذکورہ خطوط نیشنل میوزیم کو برنی کی بیگم کے نام سے فروخت کیے گئے اور ان کی فروخت کی رقم انھیں دی گئی۔

اس ذخیرے کے دریافت ہو جانے کے بعد میں نہایت بے چینی سے مسلسل کوشش کرتا رہا کہ وہ تمام کے تمام خطوط فوٹو کاپی ہو جائیں مگر افسوس کہ وہاں کے منتظم نے میرے صبر کو بہت آزمایا اور میری پیاس کو اور بڑھایا۔ میں پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا۔ بہت چکر لگائے بہت فون کیے روپیہ بھی خرچ کیا مگر ہمت نہیں ہاری بالآخر ان خطوط کے فوٹو حاصل کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔ میری کئی سالوں کی محنت رنگ لائی اور اللہ تعالیٰ نے میرے شوق، میری محنت اور میری جستجو کو دیکھتے ہوئے مجھے کامیابی سے ہم کنار کیا۔ یہ وہ خطوط ہیں جن سے برنی نے ''خطوطِ مشاہیر'' کے نام سے انتخاب مرتب کیا تھا۔

اس ذخیرے میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سے زائد خطوط ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ تعداد بھی مکمل نہیں ہے، اصل تعداد اس سے زیادہ ہوگی۔ ان خطوط میں سے چند کے سوا باقی تمام کے تمام غیر مطبوعہ ہیں۔ (۱۰) بڑی تعداد اردو خطوط پر مبنی ہے جب کہ انگریزی میں بھی خاصے خطوط ہیں۔ یہ خطوط ۱۹۱۳ء سے ۱۹۶۹ء کی زمانی مدت کو محیط ہیں۔ مکتوب نگاروں میں ادبی، سیاسی اور سماجی شخصیات کے علاوہ، برنی کے اساتذہ، ہم جماعت، دوست، احباب اور عزیز واقارب بھی ہیں۔

چند اہم مکتوب نگاروں کے نام ملاحظہ فرمائیں:

آل احمد سرور، ابو تمیم، ابوالاثر حفیظ جالندھری، احسن مارہروی، ادیب سہارنپوری، ارونا (آصف علی)، اسلم جراجپوری، مولانا، اسلم فرخی، اقبال شیدائی، اقبال، علامہ، اکبر الہ آبادی، امام اکبر الہ آبادی، امداد صابری، امین زبیری، انیس شاہ جیلانی، سید، ایس۔ اے نصرت، اے اے نامی، برناڈ شا، بے خود دہلوی، پریم پال اشک، تقی محمد خان، جگر مراد آبادی، جلیل قدوائی، جی الانا، حامد حسن حامد، حسن یار جنگ، خلیق انجم، خواجہ حسن نظامی، خواجہ غلام السیدین، دیا نرائن نگم، ذوالفقار علی بھٹو، رشید احمد صدیقی، رئیس احمد جعفری، سید، سخی احمد ہاشمی، سراج احمد چشتی، سعید احمد، سلیمان ندوی، سید، سہیل عظیم آبادی، سی ایف اینڈ ریوز، شاہ حسن عطا (دسمبر ۶۵ء ص ۷)، شاہد احمد دہلوی، شبلی نعمانی، صباح الدین عبدالرحمٰن، سید، طالب جیپوری، ظفر حسن ایبک، عابد رضا بیدار، عبداللطیف اعظمی، عبدالماجد دریابادی، مولانا، عمر محمد داؤد پوتا، ڈاکٹر، شمس العلماء، عندلیب شادانی، غلام محمد (مکتبہ ء کائنات، لاہور)، غلام مصطفیٰ خان، فرمان فتح پوری، قزلباش، ماہر القادری، مولانا، محفوظ علی، محمد اقبال انصاری، محمد طفیل، محمد علی جوہر، مولانا، محمد مارما ڈیوک پکتھال، محمد اسد ندوی، مکتبہ جامعہ دہلی، ملا واحدی، منشی پریم چند، مہر محمد خان، نصیر الدین ہاشمی، سید، نیاز فتح پوری۔

اکبر الہ آبادی کے خطوط سے متعلق برنی نے کتابی دنیا اپریل ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں لکھا کہ ''میرے پاس ان کے بہت سے خطوط تھے جو ۴۷ء کی بھگدڑ میں تلف ہو گئے۔'' (۱۱)

ان خطوط سے برنی کے دائرہ ءتعلقات و مراسم کا پتا چلتا ہے۔ یہ خطوط جہاں برنی کے سوانح اور ان کی علمی و ادبی خدمات کے حوالے سے اہم مآخذ کی حیثیت رکھتے ہیں وہاں مکتوب نگاروں کے سوانح، فکر اور احباب سے ربط وتعلق کے معاملات پر

نئے پہلو سے روشنی بھی ڈالتے ہیں۔علاوہ ازیں ایک بڑے عہد کے سماجی، سیاسی، علمی، ادبی اور تنقیدی منظر نامے کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

## برنی کی سب ایڈیٹری کا معاملہ:

مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ''ہمدرد'' سے برنی کی وابستگی بہ حیثیت ''سب ایڈیٹر'' برنی ہی کے بیان تک محدود تھی۔(۱۲) اس بنا پر ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے اس ضمن میں تشکیک کا اظہار کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں ''برنی صاحب نے ہمدرد کی مجلس ادارت سے بہ حیثیت نائب مدیر اپنی وابستگی کا ذکر خود ہی کیا ہے۔ملا واحدی یا مولانا عبدالماجد دریابادی نے جو ہمدرد کی مجلس ادارت کے متعلق معلومات کا آج سب سے بڑا اور مستند ماخذ ہیں، ان کے بارے میں بالکل ذکر نہیں کیا۔''(۱۳)

اول تو دو شہادتیں فوری طور پر پیش کی جاسکتی ہیں ایک یہ کہ برنی کے انتقال پر ملا واحدی نے ایک مضمون بہ عنوان ''ملا واحدی کے قلم سے'' لکھا تھا جس میں انھوں نے برنی کو سب ایڈیٹر ہی لکھا ہے۔(۱۴) دوسری شہادت یہ کہ برنی نے اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں جب اس امر کا اظہار کیا تو اس کتاب کے پیشِ لفظ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے برنی کے اس دعوے کی تردید نہیں کی۔(۱۵)

اس ذخیرے میں برنی کے نام ایک خط ایسا بھی ہے جو کامریڈ کے لیٹر پیڈ پر دفتر ہمدرد سے ۱۰ر جون ۱۹۱۴ء کو جاری ہوا تھا اور جس میں مالکِ ہمدرد کی جانب سے ادارتی عملے میں کمی کرنے کی غرض سے، انھیں ایک ماہ پیشتر سبک دوش کیے جانے کی اطلاع دی گئی تھی۔خط ملاحظہ فرمایئے:

> As some reduction in the Editorial staff of the Hamdard is considered extremely desirable. I therefore, am directed by the proprietor to give you one month's notice in accordance with the office rules. Which I do with many regrets.Please note that you will be relieved of your services on the 10th
> (۱۶)of July.

برنی کے نام قاضی عبدالعزیز، سب ایڈیٹر ''ہمدرد'' (۱۷) کا ۱۴ر نومبر ۱۹۱۴ء کا وہ خط بھی مذکورہ ذخیرے میں شامل ہے جس سے پیشِ نظر مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔خط وہ حصہ نقل کیا جاتا ہے:

> آپ کی پریشانی حالت سے مجھے بہت صدمہ ہوا۔میں نے آپ کو مدرسہ اسلامیہ کی ملازمت قبول لنے پر توجہ دلائی تھی مگر آپ نے اس وقت اڈیٹری کی شان کو کبیر سمجھا۔خیر اس میں بھی خدا کی مصلحت ہے۔اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ جلد آپ کو سرکار دولت مدار

کے حاشیہ برداروں میں منسلک کرے۔ آمین۔

## مولانا احسن مارہروی کے خطوط برنی کے نام:

انھی خطوط میں احسن مارہروی کے چودہ عدد خط ہیں۔ یہ خطوط نہ صرف غیر مطبوعہ ہیں بلکہ ان میں احسن کی خانگی اور ذاتی زندگی سے متعلق جو دردانگیز باتیں آگئی ہیں وہ بھی اب تک پردہء اخفا میں تھیں اور یہ کہ احسن کے تعلقات اپنے تلمیذ عزیز مصطفیٰ خاں مداحؔ (احمق) پھپھوندوی سے کس طرح خراب ہوئے اور کس طرح انھوں نے ان کے باعث اذیت و ہزیمت اٹھائی۔

برنی اور احسن کے تعلقات سے متعلق بہت سی باتیں گزشتہ اوراق میں آچکی ہیں۔ انھی خطوط سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دونوں فضلاء کے تعلقات کا آغاز ۱۹۳۴ء سے ہوا جب احسن برنی کی دعوت پر بمبئی میں ''بزمِ خیال'' کے تحت ہونے والے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ یہ تعلقات ۱۹۳۶ء تک رہے۔ ممکن ہے اس کے بعد تک رہے ہوں تاہم ان خطوط کے علاوہ کوئی اور شہادت اس سلسلے میں بازیافت نہیں ہوسکی لہٰذا انھی خطوط پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ان تعلقات پر چوں کہ ابھی تک قلم نہیں اٹھایا گیا تھا چناں چہ یہ پردہ اخفا ہی میں تھے اور پہلی مرتبہ سامنے آرہے ہیں۔

اس ذخیرے میں احسن کے چودہ عدد خط ہیں۔ برنی نے اپنے انتخاب ''خطوطِ مشاہیر'' میں احسن کے بارہ خط منتخب کیے تھے۔ جو خطوط منتخب کیے ان کے بہت سے حصے بہ وجوہ قلم زد کردیے تھے جس کے باعث بعض مقامات پر عبارت کا نہ صرف حسن متاثر ہوا بلکہ عبارت کی تفہیم کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ ان خطوط میں انھوں نے برنی سے کھل کر اپنے خانگی ترددات کا اظہار کیا ہے۔ احسن مارہروی نے ان خطوط میں بلا تامل جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے ان کا ذکر بھی کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔

خطوط کے حقیقی حسن، لطف اور کیفیت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ حصے جنھیں برنی نے پردہ داری کی غرض سے یا بعض مقامات پر طوالت کے باعث حذف کردیا تھا انھیں اصل خطوط سے ملا کر متن میں اپنے صحیح مقام سے جوڑ دیا گیا ہے۔ خطوط کے نقل کرنے میں برنی سے جہاں جہاں سہو ہوگیا تھا اسے درست کرکے اصل کے مطابق کردیا گیا ہے۔

خطوط اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ دونوں کے تعلقات احترام، اخلاص اور محبت کی بنیاد پر قائم تھے۔ احسن کو برنی پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے اپنے ذاتی اور خانگی حالات کا تذکرہ اُن سے کھل کر کیا ہے یہی وجہ تھی کہ برنی نے احترام واعتماد کی پاس داری کرتے ہوئے ''خطوطِ مشاہیر'' مرتب کرتے وقت ان کے خطوط میں سے وہ حصے حذف کردیے جن سے اُن کے خیال میں احسن کی شخصیت یا ان کی شہرت پر کوئی حرف آتا۔ احسن کے جذبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اتنے قلیل عرصے میں برنی نے اپنے حسنِ سلوک سے احسن کے دل میں ایک سچے اور حقیقی دوست کی جگہ پیدا کرلی تھی جس کے باعث احسن یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ ''اپنے چندروزہ سرسری تجربے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ جناب اپنے اخلاق خصوصی سے نمایاں امتیاز کے حامل ہیں۔'' ''آپ کے خلوص اور بے لاگ شفقتوں نے گرویدہ کرلیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں آپ کو نہ بھولوں۔''

بہر حال ان خطوط میں بالخصوص احسن مارہروی کے حوالے سے ان کے سوانح، فکر و خیال اور حلقہء احباب کے متعلق ایسے نکات سامنے آگئے ہیں جو احسن کے حوالے سے ہونے والے تحقیقی کاموں پر نظرِ ثانی کا موجب ہوں گے۔ خطوط ہی کے

مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ برنی کے تمام خطوط جو احسن کے خطوط کے جواب میں لکھے گئے تھے دست یاب نہیں ہو سکے ہیں، جو ہو سکے ہیں انھیں پیش نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیا جاتا ہے۔

مولانا نے برنی کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے یکم ستمبر ۱۹۳۴ء کو ایک خط لکھا، اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا احسن مارہروی کا خلوص اور محبت، برنی کے لیے کتنی زیادہ تھی۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں برنی سے کس قدر متاثر ہوئے اور اپنے دل میں برنی کے لیے کیسے جذبات رکھتے تھے۔ اس سے جہاں احسن کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے وہاں برنی کے اخلاق پر روشنی بھی پڑتی ہے۔

اس خط کا جواب برنی نے ۷ ستمبر ۱۹۳۴ء کو دیا تھا۔ احسن کی شکایت کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ مشاعرے کے کوئی دو ماہ بعد ان کی پہلی بیوی کا انتقال گیا جس کے بعد وہ بہت زیادہ پریشان رہے۔ بعض دیگر مسائل کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ (۱۸)

اسی ذیل میں ایک اور خط ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا نے ایک خط ۱۰ ستمبر ۱۹۳۴ء کو مسلم یونیورسٹی علیگڑہ سے برنی کو لکھا۔ اس خط کا ایک بڑا حصہ محذوف عبارت پر مبنی ہے جسے برنی نے یقیناً احسن کے معاملات کی پردہ داری کی غرض سے حذف کیا ہوگا۔ قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ عام طور پر انسانی رویہ ایسے معاملات میں یہ ظاہر ہوا ہے کہ جب اس سے اس قسم کا کام لیا جائے یا اسے کسی امتحان میں ڈالا جائے تو وہ کنارہ کر جاتا ہے اور خط کتابت منقطع ہو جاتی ہے تاہم برنی نے نہ صرف خط کتابت جاری رکھی بلکہ حتی المقدور احسن کی امداد بھی کی۔ احسن کے اس خط کا جواب برنی کے بازیافتہ خطوط میں نہیں ہے۔

مولانا کی جانب سے ایک خط ۱۲/ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو لکھا گیا یہ ان کا طویل تر خط ہے اس میں انھوں نے اپنے بمبئی کے سفر کی روداد عبرت آموز برنی ایسے ہمدرد دوست کو تحریر کی ہے۔ اس خط سے احسن کی زندگی کے وہ اہم واقعات سامنے آجاتے ہیں جو ان کی سوانح میں بھی نہیں ملتے۔ ان پر لکھے جانے والے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ان کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

اس خط کا مرکزی نقطہ بھی احسن کی پریشانیوں کا تسلسل ہے۔ یہ تمام باتیں نہایت تکلیف دہ ہیں۔ احسن کے سوانح میں اہمیت رکھتے ہیں اور احسن کے نفسیاتی اور سماجی معاملات کی تفہیم میں معاون و مومد ہوتے ہیں۔ اس خط کی روشنی میں برنی کی اخلاقیات کا تجزیہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ برنی کی فطرت میں ہے کہ وہ کسی شخص کو پریشان نہیں دیکھ سکتے۔ مدد کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ احسن کے خطوط کا اگر حقیقی نظر سے تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تمام خط برنی سے تعاون ہی کی غرض سے لکھے گئے تھے۔ برنی سے اپنے جذبات کا اظہار انھوں نے اس شعر سے بھی کیا ہے:

نہ نکلا کوئی بات کا اپنی پورا
جو نکلا تو بس ایک منصور (برنی ہی) نکلا

دست یاب خطوط میں سے احسن مارہروی کا آخری خط نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس خط میں احسن کا رنج سمٹ کر آ گیا ہے۔ انھوں نے کس دکھ کے ساتھ اپنی پریشانیوں میں برنی کو اپنا دم ساز اور راز دار بنایا ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ برنی کے رویے نے احسن کے دل میں ایک غیر متزلزل مقام حاصل کر لیا تھا جو آخر تک بھی اُسی استحکام کے ساتھ قایم رہا۔ یہ آخری خط مکمل متن

کے ساتھ نقل کیا جارہا ہے:

Muslim University

Aligar

۷۔فروری ۳۶ء

شفیقی و محبی ۔سلام مسنون۔کئی ہفتوں سے محبت نامہ جواب طلب فائل میں رکھا ہوا تھا۔قریب قریب روزانہ نظر سے گزرتا تھا،اور برابر ایک انتظار کی وجہ سے جواب ملتوی ہورہا تھا۔آج خدا خدا کر کے اس قابل ہوسکا کہ کچھ دکھ درد سناؤں۔سب سے پہلے یہ دعا ہے کہ آپ کا مزاج قرین عافیت ہو اور شکایات مرض ختم ہوگئی ہوں قبل اس کے کہ میں اپنا حال لکھوں اپنی حالت پریشاں اور اوقات بے سروپا کا مختصر اور ادنیٰ ثبوت یہ پیش کرتا ہوں کہ ۷۔مئی کو یہ خط لکھنا شروع کیا۔ڈیڑھ سطر لکھی تھی کہ کوئی حائلہ درمیان میں آگیا اور اُس وقت سے اِس وقت تک کہ ۱۲ فروری ہے کوی حرف نہ لکھ سکا۔اس وقت بھی کہ ۹ بج گئے ہیں اور ادھ گھنٹے کے بعد یونیورسٹی جاؤں گا۔یہ تحریر شروع کی ہے جو غالباً اس وقت بھی تمام نہ ہو سکے گی۔تاہم جس قدر لکھا گیا لکھوں گا۔آپ کے خط میں شاہ صاحب (۱۹) کی خفگی کا حال معلوم ہوا۔میرے پاس بھی ان کا کارڈ آیا تھا اور میں نے یہی جواب دے دیا تھا کہ جنوری فروری میں سبکدوشی کی کوشش کروں گا۔محترماً اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے میں ہر چند سعی و تدبیر کرتا ہوں مگر کیا عرض کروں کہ کیا واقعات اور موانع سامنے آجاتے ہیں۔مجملاً میری پریشانیوں کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ چند ماہ سے میرے بڑے فرزند مرض اختلاج میں مبتلا ہیں اسی کے ساتھ اور شکایات بھی ہیں۔پہلے لکھنؤ کے حکیم مربی صاحب کا علاج ہوا۔پھر علیگڑھ کے اطبا کا پھر دہلی کے حکیم محمد احمد خاں صاحب کا اب پھر علیگڑھ کے ایک ہومیوپیتھک ڈاکٹر کا ہورہا ہے۔ان کے اس مرض کے ساتھ ان کا توحشر اور دماغی توازن کا جادہ اعتدال سے ہٹا ہوا ہونا جس قدر متردد ایک باپ کو کرسکتا ہے اس کا اندازہ صاحب اولاد کرسکتا ہے خصوصاً اس حالت میں کہ ان کے ساتھ ۵۔۶ بچوں کا ساتھ ہو اور علی الخصوص اس صورت میں کہ موجودہ فضا یہاں چاہتی ہے کہ وہ ہر وقت مستعد اور اپنے کام پر متوجہ رہیں۔

۲۔ انھیں فرزند کا چھوٹا شیر خوار بچہ عجب قسم کے مرض میں مبتلا ہے۔ایک خاص قسم کے دورے مثل صرع کے ہوتے ہیں۔ایک طرف کا ہاتھ اور پاؤں اچھی طرح نہیں پھیلتا وغیرہ

وغیرہ۔

۳۔ چھوٹے فرزند جو میرے ساتھ بمبئی آئے تھے، ان کی اہلیہ علیل ہوئیں اور بحالت حمل پٹنہ کے ہسپتال میں بھیجی گئیں۔ وہاں ایک مہینہ رہنے کے بعد ولادت ہوئی اور ۲۔۳۔ دن کے بعد نومولود فوت ہو گیا۔ زچہ دوبارہ بیمار ہو گئیں ابھی تک وہیں پڑی ہوئی ہیں۔

۴۔ پٹنہ میڈیکل کالج میں میرا تیسرا فرزند، ڈاکٹری پڑھ رہا ہے اور یہ فائنل ہے ۴۔۵۔ ماہ بعد امتحان دیں گے انھیں کم سے کم۔۔۔(۲۰) ماہوار بھیج رہا ہوں اور اب وہ ان کے ختم امتحان تک بھیجنے ہیں۔

۵۔ میری ذاتی جائداد کی مالگزاریاں ۴۔ سال وصول نہیں ہوئیں۔ ایک سال کی معیاد خارج ہو گئی ۳ برس کی نالش کی بدبختی سے مجوز اول نے ڈگری اتنی کم کی ہے کہ اس کو اگر مان لیا جائے تو ہمیشہ کے لیے نقصان عظیم ہوگا۔ اب اس کی اپیل دائر ہے۔ اس مقدمے میں اب تک دوڈھائی سو خرچ ہو گئے ہیں۔

۶۔ ایک نالش خود مجھ پر ایک دستاویز رہن کی ہو گئی ہے جس کی دو پیشیاں ہو چکی ہیں اور معلوم [نہیں] کہ کتنا دوران ہو اور پھر کیا نتیجہ نکلے۔

۷۔ میری ایک لڑکی بہت دنوں سے شادی کے قابل ہے اس کے فرض سے سبکدوش ہونا بروقت پیش نظر ہے۔ بے ماں کی بچی ہے اور کوئی بہترین نگراں نہیں۔ اب فریق ثانی کی طرف سے اصرار ہے اور میں بھی چاہتا ہوں کہ جلد اس فرض سے سبکدوش ہوں مگر کوئی سروبرگ نظر نہیں آتا۔

۸۔ دو مہینے سے میرے دو ماموں زاد بھائیوں کی بیویاں بیمار ہو کر علیگڑھ کے ڈاکٹروں کے زیر علاج ہیں جب میں یہاں موجود ہوں تو ایسے عزیز قریب اور کہاں مقیم ہوتے۔ مبتلا ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر کا مضمون ہے۔(۲۱)

## مولانا ماہر القادری کے خطوط برنی کے نام:

یہ امر بھی اہل علم سے پوشیدہ تھا کہ برنی ہی نے مولانا ماہر القادری کو ۱۹۴۱ء میں ''بزمِ خیال'' کے تحت ہونے والے مشاعروں کے ذریعے بمبئی کی ادبی سرگرمیوں میں متعارف کروایا تھا۔(۲۲)

''بزمِ خیال'' کے تحت ۱۹۴۱ء 'یومِ اکبر' (جلال الدین اکبر) منایا گیا۔ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے برنی نے ماہر کو مدعو کیا۔ یہی وہ موقع تھا کہ دونوں حضرات کے تعلقات کا آغاز ہوا اور پاکستان ہجرت کرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ برنی کی وفات تک قائم رہا۔

میری نظر سے تا حال ایسی کوئی تحریر نہیں گزری جس میں برنی نے ماہرؔ سے اپنی دوستی کا تذکرہ کیا ہو۔ مشیت ایزدی کہ برنی نے ماہرؔ کی زندگی میں دنیا سے کوچ کیا اگر اس کے برعکس ہوتا تو یقیناً حسبِ روایت برنی اپنے رسالے ''کتابی دنیا'' میں ماہرؔ سے اپنے دیرینہ تعلقات کا حال ''وفیات'' کے ذیل میں ضرور تحریر کرتے، تاہم مولانا ماہرؔ کی بعض تحریروں سے اور برنی کے نام ان کے چند غیر مطبوعہ خطوط سے نہ صرف اُس پہلی ملاقات کا حال معلوم ہوتا ہے بلکہ برنی کے شخصی، علمی اور ادبی اوصاف بھی نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں اور برنی سے ان کی شیفتگی کا بھی پتا چلتا ہے۔

مولانا ماہرؔ نے برنی کی وفات (۴ مئی ۱۹۶۹ء) پر ماہنامہ ''فاران'' میں بہ سلسلہ یادِ رفتگاں ایک مضمون ''ضیاء الدین احمد برنی'' کے عنوان سے تحریر کیا تھا۔ یہ مضمون ان کے اور برنی کے دوستانہ تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں برنی کی بعض شخصی خوبیوں کا اعتراف کیا گیا ہے اور ان کی علمی، ادبی اور صحافتی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا ماہر لکھتے ہیں:

> غالباً ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے، بمبئی میں 'یومِ اکبر' منایا گیا اور اس سلسلے میں ایک مشاعرہ بھی ہوا، اس تقریب میں بعض مسلمانوں، ہندوؤں اور پارسیوں نے مل کر حصہ لیا، یہ اکبر لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نہیں مغلیہ شہنشاہ جلال الدین اکبر تھا۔ ضیاء الدین احمد برنی نے مشاعرے کے لیے بمبئی سے دعوت نامہ بھیجا، میں ان دنوں حیدر آباد دکن میں رہتا تھا...... بہت سی کتابوں کے مصنف، مؤلف اور مترجم تھے، ان میں 'عظمتِ رفتہ' خاص طور سے ذکر کے قابل ہے، پاکستان اور ہندوستان کی بڑی سے بڑی شخصیتوں کو انھوں نے قریب سے دیکھا اور بہت سوں سے روابط بھی رہے۔
>
> ضیاء الدین احمد برنی مرحوم کا مطالعہ وسیع تھا، اور اندازِ تحریر متین و سنجیدہ۔ دینی مزاج رکھتے تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مداح اور ان کی علمی و دینی عظمت کے معترف۔ 'فاران' میں راقم الحروف کے لکھے ہوئے مضامین کا اپنے رسالہ 'کتابی دنیا' میں ذکر فرماتے اور ہمیشہ تحسین وستائش کرتے۔
>
> ضیاء الدین احمد برنی مرحوم کی موت نے اردو ادب میں کوئی شک نہیں ایک خلا پیدا کر دیا۔ ادب کے اس افراتفری کے دور میں برنی صاحب کی کتابیں نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ان کا دماغ سلجھا ہوا تھا، یہی سلجھاؤ ان کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہے، اردو ادب کی تاریخ میں ان کا ذکر آنا چاہیے۔ (۲۳)

اسی واقعے کو عطیہ فیضی والے مضمون میں بھی بیان کیا ہے مگر یہ فقرہ ''انھی کی دعوت پر میں حیدر آباد دکن سے بمبئی پہنچا'' ظاہر کرتا ہے کہ ماہرؔ برنی سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ محبت رکھتے تھے کہ ان کی دعوت پر حیدر آباد دکن سے بمبئی پہنچے۔ واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

(غالباً) ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے جب بمبئی میں 'یوم اکبر' منایا گیا اور اس سلسلے میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا، مشہور اہل قلم جناب ضیاء الدین احمد برنی اس مشاعرے کے داعی تھے۔ انھی کی دعوت پر میں حیدرآباد دکن سے بمبئی پہنچا۔ کرافٹ مارکیٹ سے متصل شاہجہان ہوٹل تھا، وہاں مجھے ٹھہرایا گیا۔ صوبو صدیق ہال میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا، ان دنوں مجھ پر کبھی کبھار دل کا دورہ پڑ جایا کرتا تھا، مشاعرے میں پہلی غزل کے بعد سامعین نے دوسری غزل کی فرمائش کی، دوسری کے بعد تیسری کی! چوتھی غزل پر میں دل میں گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگا، تکلیف بڑھنے لگی، میں نے جیسے تیسے غزل ختم کی، اسی عالم میں ہال سے باہر آ کر سبزے پر لیٹ گیا۔ شدید قسم کی قے ہوئی بدن پسینے میں شرابور! میں سبزے پر بے قابو ہو کر لوٹ رہا تھا اور ایک مجمع میرے اردگرد تھا، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ 'ہزار منہ ہزار باتیں' لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں، کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ! مگر زیادہ لوگوں کا گمان یہ تھا کہ ماؔہر نے زیادہ شراب پی لی تھی، اس کے سبب یہ حادثہ پیش آیا۔ (۲۴)

اُس مشاعرے (یوم اکبر) میں شرکت کے بعد ماؔہر کا بمبئی آنا جانا شروع ہو گیا اور یوں برنی اور ماؔہر کے تعلقات استوار ہوئے جو پاکستان بننے اور برنی کے انتقال تک رہے۔

بمبئی میں اپنے ورود اور آرزوؔ سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ماہر نے ضیاء الدین احمد برنی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس تذکرے میں برنی کی امن پسندی، بمبئی میں ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور برنی سے ماؔہر کی قلبی وابستگی کا پتا چلتا ہے۔ لکھتے ہیں:

ہندوستان پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جب کہ بعض نیک نہاد اور امن پسند افراد کسی نہ کسی تقریب سے اتحاد اور یگانگت کا اظہار چاہتے تھے اور اس کے لیے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر موقعے نکالتے تھے، ۱۹۴۱ء (۲۵) میں ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں نے مل جل کر بمبئی میں 'یوم اکبر اعظم' منایا، اس سلسلے میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا، جناب ضیاء الدین احمد برنی اس مشاعرے کے منتظم تھے، میں حیدرآباد دکن سے چل کر بمبئی آچکا تھا مگر اس طرح کہ کسی نے نہ جانا، اس مشاعرے میں پہلی بار میں نے بمبئی میں اپنا کلام سنایا اور پھر دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ (۲۶)

اب دست یاب خطوط سے دونوں کے تعلقات کا جائزہ لیا جاتا ہے یہ تعلقات تا حال پردہ راز میں تھے۔ ایک خط جس پر تاریخ درج نہیں اس کے متن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں حضرات کی پہلے سے نہ صرف واقفیت تھی بلکہ دوستانہ تھا ماؔہر کا یہ جملہ "آپ کی خاطر میں ان شرائط میں بڑی حد تک کمی کر سکتا ہوں" اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔

ایک اور خط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ برنی کے لیے مولانا ماہر کے جذبات بھی احسن مارہروی کی طرح محبت آمیز تھے اور یہ برنی ہی کے اچھے اخلاق کی وجہ سے تھے۔

جناب مکرم

سلام ورحمت

شکریہ۔ فاران (۲۷) میں جب یہ مضمون (۲۸) شائع ہوگا تو ولیم میور کا نام کارلائل کے نام کی جگہ لکھ دیا جائے گا۔

............مگر...........

بھائی، یورپ کے تمام مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں کچھ نہ کچھ زہرافشانی ضرور کی ہے، مدح کے ساتھ قدح بھی۔ یہاں تک کہ اس زمانے میں ٹائن بی تک نے رسول اللہ کی ذاتِ گرامی کا ذکر برے الفاظ میں کیا ہے اور اس طرح لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

آپ کی کتاب پر جنوری کے فاران میں مفصل تبصرہ آرہا ہے۔ (۲۹)

امید کہ مزاج گرامی بہ خیر ہوگا۔ والسلام

مخلص

۲۰ دسمبر

ماہر القادری (۳۰)

ماہر نے اس خط میں مستشرقین کے جس رویے کے بارے میں اشارہ کیا ہے۔ اسی طرح کا اشارہ انھوں نے ''سی۔ ایف اینڈریوز'' پر تبصرے میں بھی کیا ہے۔ یہ برنی کی فراخ دلی اور حقیقت پسندی ہے کہ انھوں نے کہیں بھی ماہر کے ان خیالات سے اختلاف نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے خود ''تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی'' میں حواشی کے ذریعے اپنے استاد سی ایف اینڈریوز کے بعض خیالات کی تکذیب کی ہے۔

ایک خط اور ملاحظ فرمایئے جو کئی لحاظ سے اہم ہے۔ برنی نے اپنے انتخاب میں جگہ نہیں دی۔ جس سے صاف اور واضح وجہ وہی ان کی پردہ پوشی کی صفت اور خاص ان افراد کی جن کا مرتبہ بلند ہو۔

جناب مکرم

سلام ورحمت

عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مولٰینا آزاد کی کس کس غلط بیانی کی آپ صفائی پیش فرمائیں

گے۔اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں اس شخص نے اللہ معاف۔ فرمائیے صریح جھوٹ گھڑے ہیں۔آپ سے کسی دن ملنا ہوگا تو ان کی تفصیلات بتاؤں گا کہ بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بڑا آدمی اور اس کمزوری میں مبتلا۔

والسلام

مخلص۔ماہر القادری

مولانا ماہر القادری نے جہاں جہاں اپنی بمبئی کی زندگی کا تذکرہ کیا ہے وہاں وہاں ضیاء الدین احمد برنی کا تذکرہ بھی نہایت خلوص سے کیا ہے۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھیں برنی سے کس قدر قلبی لگاؤ تھا۔اگست ۱۹۸۰ کے ماہنامہ ''سب رس''،شمارہ:۹،کراچی کے ''ڈاکٹر سجاد نمبر'' میں ایک تصویر صفحہ:۴۰ پر شائع ہوئی ہے،جس کا کیپشن(Caption) ہے ''ضیاء الدین احمد برنی کی قیام گاہ کی ایک محفل،(دائیں سے بائیں) مظفر حسین شمیم،مولانا ماہر القادری،ضیاء الدین احمد برنی، نامعلوم،ڈاکٹر سید سجاد''۔یہ تصویر بھی دونوں حضرات کے دوستانہ تعلقات کی آئینہ داری کرتی ہے۔

## مولانا شبلی نعمانی کا خط برنی کے نام:

ایک خط مولانا شبلی کا ملاحظہ فرمایئے جو دونوں حضرات کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔اس سلسلے میں برنی کی تصنیف ''عظمت رفتہ''،میں شبلی کا خاکہ بھی دیکھا جاسکتا ہے:

مولانا ضیاء الدین احمد برنی (۳۱)

مجی

تسلیم۔آپ تحریر فرمائین کہ کسقدر [ماہوار آپ] (۳۲) منظور فرمائینگے اور کتنے دنوں تک کام اسٹاف میں رہ سکینگے۔

آج کل میں کئی مھینہ تک (۳۳) بمبئی میں رہوں گا،کیا آپ بمبئی آنا پسند کرینگے۔(۳۴)

از بمبئی،پالن جی کا ہوٹل　　　　شبلی۔از بمبئی۔پالن جی کا ہوٹل

۳۱مئی ۱۹۱۳ء

برنی نے اس کی تفصیل ''عظمتِ رفتہ''،میں لکھی ہے''۱۹۱۲ میں جب علامہ شبلی نے سیرت نبوی کے سلسلے میں اپنا پروگرام شائع کیا تو اس وقت انھوں نے انگریزی داں حضرات کو بھی عملے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔راقم الحروف بھی درخواست دینے والوں میں تھا۔اس سلسلے میں میری ان سے کچھ خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔علامہ کا ایک خط میرے پاس محفوظ رہ گیا ہے۔''

مزید لکھتے ہیں''مجھے اب یاد نہیں رہا کہ میں نے اس آفر کو قبول کرنے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔لیکن مجھے آج تک افسوس ہے کہ میں نے کیوں نہ اپنے آپ کو ان کے دامن سے وابستہ کرلیا۔''(۳۵)

برنی کے مذکورہ بیان سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ ان کی شبلی سے خط کتابت رہی تاہم صرف اس خط کے اور کوئی خط ان کے ذخیرے میں بازیافت نہیں ہوا خیال ہے کہ وہ ضایع ہوگئے۔

برنی نے شبلی کے حوالے سے اپنی یادداشتوں کو عظمتِ رفتہ میں ''علامہ شبلی نعمانی'' کے عنوان سے جمع کردیا

ہے۔اس خاکے میں برنی کی ان سے نیازمندانہ عقیدت بآسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔پھر یہ الفاظ'' مجھے آج تک افسوس ہے کہ میں نے کیوں نہ اپنے آپ کو ان کے دامن سے وابستہ کرلیا،'' ان کی حقیقی محبت اور عقیدت کو ظاہر کرتے ہیں۔

چوں کہ ذکر شبلی کا ہو رہا ہے تو مناسب معلوم ہوتا کہ یہاں سید سلیمان ندوی کا خط بھی نقل کردیا جائے جس میں اس کتاب کا تذکرہ ہے اور برنی کو سراہا گیا ہے۔یہ خط برنی کے خط کے جواب میں لکھا گیا تھا۔کاش کہ برنی کا خط بھی ہوتا تو معاملے کو بہتر طور پر پرکھا جاسکتا تھا۔سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> خوشی ہوئی کہ آپ نے ''حیاتِ شبلی'' کو پسند کیا اور اس کو غور و تحمل سے پڑھا۔آپ نے جن اغلاط کی طرف متنبہ کیا ہے انشاء اللہ ان کی تصحیح کردی جائیگی۔اس قسم کے اغلاط کی نشاندہی مصنف کی سب سے بڑی مدد ہے۔ہمارے یہاں جب تک لائق مصححین پیدا نہ ہونگے، یہ فروگزاشتیں دور نہیں ہوسکتیں۔آپ اگر مزید اغلاط سے اطلاع دیں تو اور بھی خوشی ہوگی۔(۳۶)

## محمد طفیل مدیر ''نقوش'' کے خطوط برنی کے نام:

محمد طفیل مدیر ''نقوش'' کے خطوط بہت دل چسپ ہیں جن سے ان کی زندہ دلی پھوٹ رہی ہے۔ان کے خطوط میں انجمن ادبی رسائل کے بعض مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ایک خط ملاحظہ فرمائیے اس میں برنی کی قدر و منزلت کا کیسا زبردست اعتراف ہے۔

> برنی صاحب،　　　　سلام مسنون!
>
> آپ باتیں کرنے اور باتیں بنانے میں بڑے ماہر ہیں۔یہ فن بھی قدرت ہر کو نہیں بخشتی۔کاش میں بھی کچھ ایسا ہی کاریگر ہوتا۔
>
> قبلہ قصہ یہ ہے کہ یہ خاکسار ایک خاص نمبر نکال رہا ہے۔ارادہ ہے کہ زوردار پرچہ نکلے۔ظاہر ہے ایسی صورت میں آپ کا مضمون بھی چاہیے ورنہ پرچہ زوردار کیسے نکلے گا۔لہذا اس شکل میں میرا ساتھ دیجیے اور کسی اہم موضوع پر ایک شاندار مضمون جلد بھجوائیے۔
>
> ہاں، آپ کی کتاب پر اگر کوئی صاحب معقول قسم کا تبصرہ کرکے بھجوادیں گے تو وہ بھی چھاپ دوں گا۔خود سے اتنا کہاں سے نکالوں۔دوسرے آپ کا اور میرا موضوع بڑی حد تک ایک ہی ہے۔(اس کتاب کے سلسلہ میں)(۳۷) اس لیے میں ضرور ڈنڈا ماروں گا۔
>
> امید ہے آپ چہک ہی رہے ہوں گے۔
>
> محمد طفیل
>
> (۳۸)21/x/62

اب جو خط نقل کیا جارہا ہے اس میں اس مضمون کی تفصیل ہے جس کا تذکرہ اوپر آیا ہے۔ یہ خط نہایت دل چسپ اور پرلطف ہے چناں اس کے مکمل متن کا سامنے ضروری ہے تاکہ برنی کے مزاج، ان کے تعلقات اور قدر اور اہمیت پر روشنی بھی پڑتی ہے:

برادرم

بالآخر آپ نے مضمون بھیجا (۳۹)۔ میں خوش ہوگیا۔ اگر آپ ذرا اور تفصیل میں جاتے تو اور اچھا ہوتا۔ موجودہ صورت میں یہ مضمون تشنہ رہا جارہا ہے۔ موضوع اچھا ہے۔ اس کے ساتھ اور یگانگی برتی جانی چاہیے تھی۔

میں اس موضوع پر اور مواد مہیا کرنے کی فکر میں ہوں۔ مل گیا تو پیش کردوں گا۔ اور اس مضمون کا مکمل کراؤں گا۔ آپ بھی ٹوہ میں رہیں۔

امید ہے قہقہے اُڑ رہے ہوں گے اور ''بوڑھا نوجوان'' خوش ہوگا۔

مرحوم انجمن (۴۰) کا چہلم کر ڈالیے۔

آپ کا۔ محمد طفیل

27/3/63

## ملا واحدی کے خطوط برنی کے نام:

برنی کے نام ملا واحدی کے گیارہ عدد خط ہیں (۴۱) جب کہ برنی نے اپنے انتخاب میں دو عدد خط شامل کیے۔ ان تمام خطوط میں کتابی دنیا، مضامین کے تذکرے ہیں، گزری ہوئی اور بھولی بسری یادیں ہیں اور گزرنے والوں کا ماتم ہے۔

ملا واحدی اپنے خطوط میں اپنے ہاں ہونے والی جمعہ وار نشستوں میں برنی کو شرکت کی بہ اصرار دعوت دیتے ہیں اور حیرت شملوی اور جلیل قدوائی کا تذکرہ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

## انیس شاہ جیلانی کے خطوط برنی کے نام:

انیس شاہ جیلانی کے خطوط میں بھی حیرت شملوی کا تذکرہ کثرت سے ہے۔ انیس شاہ جیلانی کے خطوط سے پتا چلتا ہے کہ حیرت کے خطوط ان کے انتقال کے بعد ان کے احباب سے برنی ہی نے وصول کر کے انھیں محمد آباد پہنچائے۔ اب یہ خطوط انھی کے پاس محفوظ ہے۔

انیس شاہ جیلانی کے تمام خطوط علمی نوعیت کے ہیں۔ برنی کے نام خطوط میں انیس شاہ جیلانی کے خطوط ہی کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ان خطوط میں شخصیات اور کتب سے متعلق معلومات ہیں۔ اُس دور کے بعض مسائل پر بحث ہے اور ان کے نقطہ ہائے نظر ہیں۔ اپنے مطالبات میں ان کا لہجہ تند اور نہایت روکھا ہوجاتا ہے۔ وہ برنی کی مصروفیت اور ان کی علالت کی بھی پروا نہیں کرتے۔

## شاہد احمد دہلوی کے خطوط برنی کے نام:

برنی کے نام شاہد احمد دہلوی کے خطوط کی تعداد اٹھارہ ہے۔ یہ سب غیر مطبوعہ ہیں۔ یہ خطوط علمی نوعیت کے ہیں۔ ان میں اُس عصر کے مسائل بھی ہیں، شاہد احمد دہلوی کی زندگی کے قصے بھی ہیں۔ یہ خطوط جہاں برنی کی زندگی کے بعض معاملات پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں شاہد احمد دہلوی کی زندگی کے بھی بعض گوشوں کی عکاسی کرتے ہیں اور ان کے مزاج کی جھلکیاں بھی دکھاتے ہیں۔ ایک خط میں حیرتؔ شملوی کا تذکرہ اس تفصیل سے آیا ہے کہ اس کی حیثیت مختصر مضمون کی سی ہوگئی ہے۔

دو مختصر خط نقل کیے جاتے ہیں تاکہ شاہد احمد دہلوی کے اسلوب سے لطف اندوز بھی ہوا جائے اور دونوں کے تعلقات پر روشنی بھی پڑ جائے:

۱۹۶۳/۴/۲۳ء

حضرتِ مکرم۔ سلام مسنون

۳ مئی کو ڈپٹی نذیر احمد کی برسی گلڈ کی طرف سے۔۔۔ ہال (۴۲) میں منائی جانے والی ہے۔ میں نے بغیر آپ کی اجازت کے مقالہ نگاروں میں آپ کا نام دے دیا ہے۔ آپ نے مرحوم کو اکثر دیکھا ہے۔ آپ اپنے تاثرات قلمبند فرمادیں۔ عنوان ہوگا:۔

"میں نے انھیں دیکھا ہے"۔

اس موضوع پر صرف آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس نوازش سے ہمیں محروم نہیں فرمائیں گے۔ (۴۳)

خاکسار

شاہد احمد

۱۹۶۴/۱/۲۵ء

حضرتِ محترم۔ سلام مسنون

"کتابی دنیا" میں میری تصویر اور حالات شایع کرنے کا شکریہ۔ (۴۴)

حفیظ نمبر پر آپ کا دلچسپ تبصرہ بھی دیکھا۔ (۴۵) اتنی سچی باتیں ناگوار گزرتی ہیں۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار

شاہد احمد

اس ذخیرے میں ایسے خطوط بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ برنی نے اردو اور انگریزی میں کیسے کیسے عنوانات

اور موضوعات پر قلم اُٹھایا اور ان کی تحریریں برصغیر کے کن کن رسائل وجرائد میں شائع ہوئیں۔

بمبئی کرانیکل اپنے وقت کا مشہور ومعروف اخبار تھا۔گزشتہ اوراق میں تذکرہ ہو چکا ہے کہ برنی نے ایک عرصے تک مذکورہ اخبار کے توسط سے اردو کی کس طرح خدمت کی۔اس کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی برنی کے قریبی دوست تھے۔عظمتِ رفتہ میں ان پر خاکہ دیکھا جا سکتا ہے۔

بمبئی کرانیکل میں شائع ہونے والے مضامین دست یاب نہیں ہو سکے۔برنی نے اپنے انگریزی مضامین مرتب کر لیے جانے کی اطلاع ایک مقام پر دی ہے ممکن ہے وہ مضامین بھی اس میں شامل ہوں۔بہر حال اس امر کا تذکرہ اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے کہ یہ خطوط کن کن حوالوں سے اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ خطوط اس بات کی شہادت بھی دیتے ہیں کہ بمبئی کا مشہور انگریزی اخبار ''بمبئی کرانیکل''،''الناظر''، لکھنؤ، دیا نرائن نگم کا ''زمانہ'' کانپور خواجہ حسن نظامی کا ''منادی''، محمد طفیل کا ''نقوش''، شاہد احمد دہلوی کا ''ساقی'' اور اختر شیرانی کا ''بہارستان'' وغیرہ انھیں بہ اصرار لکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

ان خطوط سے برنی کی اس اخلاقی خوبی کا بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی کسی کتاب یا رسالے میں کسی کتاب یا رسالے سے کوئی عبارت یا اشعار بلا اجازت نقل کرنا نہیں چاہتے چناں چہ صاحبِ کتاب، صاحبِ مضمون یا مدیر رسالہ سے اس کی اجازت لینا ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے بعد ہی وہ اسے نقل کرتے ہیں۔

جب انھوں نے اپنی کتاب ''اخباری لغات'' کا انتساب علامہ اقبال کے نام کرنا چاہا تو انھوں نے اس سلسلے میں اقبال سے خط کتابت کی اور اقبال کی اجازت کے بعد ہی کتاب کو ان سے منسوب کیا۔(۴۶)

ان خطوط میں برنی اور برنی کی تصانیف کے بارے میں مشاہیر کی آرا بھی سامنے آتی ہیں۔برنی کے بچپن کے دوست عارف ہسوی کا وہ آخری خط بھی اسی ذخیرے میں محفوظ ہے، جو انھوں نے اپنے انتقال سے چند دن قبل لکھا تھا اور اس میں انھوں نے نہایت مایوسی اور افسردگی کے عالم میں برنی سے دعا کی درخواست کی تھی۔

اقبال اور اقبالیات کے ذیل میں بھی بعض اہم باتیں ان خطوط میں پائی جاتی ہیں۔اس ضمن میں برنی کی دل چسپی اور شوق اور ان کی اقبال سے محبت وعقیدت کا بڑا واضح اظہار ہوتا ہے۔شاہد احمد دہلوی اپنے خطوط میں ساقی کے ''جوش نمبر'' کے لیے سرگرم نظر آتے ہیں۔علاوہ ازیں جوش کے حوالے سے شاہد احمد دہلوی اور صہبا لکھنوی کی چشمک کی بھی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

مشاہیر کے ذخیرۂ خطوط سے چند خط ملاحظہ فرمائیے:

## حضرت وحید الدین بیخود دہلوی

(جانشینِ داغ دہلوی)

۳۱/اگست ۴۶ء

دلی ٹیامحل

عزیز القدر گرامی شان منشی ضیاء الدین برنی سلمہ الرحمان

آپ کا کارڈ اور پیکٹ وصول ہوا۔ میں آپ کی کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ مگر اس قسم کی پیٹی کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ کلکتہ سے میرے ایک دوست نے امید دلائی ہے۔ غالباً مل جائے گی۔ اپنے بچوں کو میری دعا کہنا۔

بیخود دہلوی (۴۷)

## علامہ محمد اسلم جیراجپوری

(جامعہ ملیہ دہلی کے مشہور پروفیسر اور مصنف۔ علی گڑھ کالج میں اسلامیات کے معلم رہے)

اخبار ''الہلال'' (۴۸) بمبئی کے متعدد نمبروں میں میں نے اردو کی تیسری کتاب مصنف عطا حسین صاحب دکتورالآداب (۴۹) و مولانا محمود اسرائیل (۵۰) پر تنقید دیکھی جس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ صاحبان ممدوح نے اس تصنیف میں میری کتاب ''خواتین'' کے بعض بعض بیانات کو بلا حوالہ نقل کر لیا۔ اخبار ''اجمل'' میں ان صاحبان کی طرف سے اس الزام کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو بھی دیکھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ عمل اگر غلط تھا تو کم سے کم قول تو صحیح ہوتا۔ جواب کا سارا زور اس بات پر صرف کیا گیا ہے کہ یہ سرقہ نہیں ہے بلکہ توارد ہو گیا ہے۔ مگر کیا توارد اس طرح کا ہوتا ہے کہ فقرے کے فقرے اور سطر کی سطر ا یکساں ہوں؟ مجھے تو اس ذہنیت پر ماتم کرنا پڑتا ہے کہ دوسرے کے نوشتہ کو اپنا بنا لینا کہاں کا انصاف اور کہاں کی دانش مندی ہے! کیا حوالہ دے دینے سے ان حضرات کے علم، لیاقت یا شرافت میں کوئی نقصان آجاتا؟ پھر کیوں نہ ایسا کیا گیا؟

مجھے صرف انھی لوگوں سے اس کی شکایت نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے مسلمان اہل قلم میں سے ایک کثیر تعداد ایسی ہی ہے۔ اس سے قبل میری کتاب ''حیات حافظ'' بلا اظہار نام اور بلا اجازت بنگالی زبان میں منتقل کر لی اور اگر ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمٰن صاحب مجھے اس کی اطلاع نہ دیتے تو شاید میں واقف بھی نہ ہوتا۔ اسی طرح ایک صاحب نے حیدر آباد دکن میں اس کتاب کا ایک حصہ جس میں فالیں ہیں، اپنے نام سے شایع کر لیا جب ان کو لکھا گیا تو ایسے دم بہ خود ہوئے کہ سانس نہ لی۔ ایک دوست نے لکھا کہ وہ مدرس ہیں اور قابل معافی۔

پھر میری تصنیف ''تاریخ نجد'' جوں ہی شایع ہوئی بنگالی میں ترجمہ کر لی گئی اور مجھے خبر نہ دی گئی نہ اجازت لی گئی، حالاں کہ اگر اجازت مانگی جاتی تو مجھے کچھ عذر نہ ہوتا۔ چناں چہ ہیں کے ایک صاحب نے میری تصنیف ''تاریخ القرآن'' کے ترجمہ کی اجازت طلب کی، میں خوشی کے ساتھ ان کو اجازت دے دی۔ علیٰ ہٰذا ''تاریخ الامت'' کے ترجمہ کی ملابار سے اجازت طلب کی گئی، میں نے اس کو بھی منظور کر لیا۔ چناں چہ اب تک اس کے تین حصے ملیالم زبان میں ترجمہ ہو کر داخل نصاب ہو چکے ہیں۔

میری گزارش صرف یہی ہے کہ مصنف کا قلم ہاتھ میں لے کر اس کی حرمت قائم رکھنی چاہیے اور سیدھا راستہ

یہی ہے کہ جس کتاب سے کوئی قول یا مقالہ نقل کرے۔ اس کا حوالہ دے دے۔

محمد اسلم جیراجپوری۔ جامعہ ملیہ قرول باغ۔ نئی دہلی

## سید محمد علی حسن نظامی المعروف خواجہ حسن نظامی

(۲۷دسمبر ۱۸۷۸ء۔ ۳ جولائی ۱۹۵۵ء)

۱۱ جولائی ۱۹۲۵ء

پیارے برنی۔ السلام علیکم

روزنامچوں (۵۱) کے ترجمے کے ساتھ آپ کا خط بھی پہنچا۔ سفارشی خط ارسال خدمت ہے۔ ٹوانہ صاحب کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ اگر آپ کو وہاں معلوم ہو جائے تو خط لفافے میں رکھ کر وہاں بھیج دیجیے۔

اس ترجمہ کا کیا معاوضہ بھیجوں؟ مطلع کیجیے۔ جو کم سے کم معاوضہ آپ کہیں گے وہ زیادہ سے زیادہ فوراً آپ کو بھیج دوں گا اور اول تو امید ہے کہ آپ یہ لکھیں گے کہ واہ خواجہ صاحب معاوضہ کی کیا ضرورت ہے آپ اس کا کچھ بھی خیال نہ کیجیے، مگر میں جب بھی کچھ نہ کچھ بھیجوں گا کہ معاملہ علیحدہ چیز ہے اور تعلق علیحدہ۔

ڈاکٹر اقبال صاحب سے میرے تعلقات کچھ خراب نہیں ہیں، مگر ڈاکٹر صاحب اب اتنے اونچے ہو گئے ہیں کہ مجھ سے بھی بڑے بڑے آدمیوں کا نام اپنے کلام میں لکھنا خلاف شان سمجھتے ہیں اور بات بھی ٹھیک ہے۔ (۵۲)

از درگاہ شریف۔ دہلی

۲۸ جون ۱۹۵۰ء

ہلو۔ ہلو۔ مائی ڈیر برنی دہلوی۔

کل ساڑھے بارہ بجے دہلی پہنچا۔ ہوائی جہاز میں دل کا دورہ ہو گیا۔ اب اچھا ہوں اور اس قابل ہو گیا ہوں کہ کل شام کو اس دعوت میں جاؤں جو صدر ری پبلک شری راجندر پرشاد نے مجھے دی ہے۔

آپ کی سچی محبت جو کراچی میں آپ کے برتاؤ سے ظاہر ہوگئی، دل پر نقش ہے۔ آپ کا بھیجا ہوا میرا مضمون جن اخباروں میں چھپا میں نے اسے دیکھا۔ مسٹر عبدالحمید اسمٰعیل (۵۳) تو امریکہ چلے گئے ہوں گے لیکن اس سلسلہ میں اگر آپ کو کمپنی کی نشریات کی تجویز معلوم ہوں تو مجھے لکھیے تا کہ میں ''منادی'' میں شائع کروں۔

مخلص قدیمی

حسن نظامی

## سید اکبر حسین الہ آبادی

(۱۶نومبر ۱۸۴۶ء۔۹ ستمبر ۱۹۲۱)

الہ آباد

۲۸دسمبر ۱۹۱۲ء

مکرمی۔تصویریں (۵۴) لوگ لے گئے۔اب میرے پاس نہیں ہیں۔جو دو ایک ہیں وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ حسن پر نظر ہوتی تو تکلف کی ضرورت تھی محض نام اور فیشن کی بات ہے۔چند نقوش مظہر پیکر انسانی کافی ہیں۔اگر ارشاد اور ضرورت ہو فوٹو کھنچوا کر حاضر کروں۔شکر گزار یاد آوری۔

نیاز مند

اکبر حسین

## علامہ ڈاکٹر اقبال

(۹ نومبر ۱۸۷۷ء۔۲۱ اپریل ۱۹۳۸)

لاہور۔۲۰ اپریل ۱۵ء

مکرم بندہ السلام علیکم

آپ کا خط مل گیا ہے۔اگر کتاب (۵۵) کو میرے نام سے معنون کرنے میں اس کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ ہو سکتا جو آپ کی مالی منفعت یا کسی اور فائدہ کا باعث ہوتا تو میں ضرور اجازت دے دیتا مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا یہ اثر نہیں ہو سکتا۔مجھے اخباری دنیا یا اخبار نویسی سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر چوں کہ آپ مصر ہیں اس واسطے میں اپنا پہلا خط واپس لیتا ہوں (۵۶) اور یہ عرض کرتا ہوں کہ میں کتاب دیکھ کر اس امر کا فیصلہ کروں گا۔لیکن آپ مجھ سے یہ عہد کریں کہ اگر کتاب دیکھ کر میں نے اجازت نہ دی تو آپ اس سے ناراض نہ ہوں گے۔

اس واقعہ (۵۷) کا کوئی اثر میرے دل پر نہ تھا اور نہ اب ہے۔آپ بلا تکلف جب چاہیں میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔والسلام

آپ کا خادم محمد اقبال

مکرم بندہ

آپ کی کتاب (۵۸) مفید ثابت ہوگی۔اردو خوانوں کے لیے بالخصوص اس قسم کی کتاب کی ضرورت تھی۔ اگر آپ اس کتاب کے ڈیڈیکیشن (۵۹) سے مجھے معزز کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کی راہ میں حائل ہونا نہیں چاہتا۔شوق سے ڈیڈیکیٹ کیجیے۔والسلام

آپ کا خادم محمد اقبال۔لاہور

۲۲ مئی ۱۵ء

ذخیرہ خطوط میں اقبال کے چھے عدد خط ہیں، جو شایع ہو چکے ہیں۔

## عزیز حسن بقائی

برنی کے دوست عزیز حسن بقائی، ایڈیٹر ''پیشوا'' دہلی کے خطوط اس ذخیرے میں موجود ہیں جن میں نظر آئے گا کہ وہ اپنے بعض معاملات میں نہایت پر جوش اور ہٹیلے ہونے کے باوجود برنی کے مشوروں کا احترام کرتے ہیں اور اپنے فیصلوں کو تبدیل کر لیتے ہیں۔ یہ خطوط اُس زمانے کا سماجی اور سیاسی منظر نامہ بھی کسی قدر پیش کرتے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک خط نقل کیا جاتا ہے:

عید مبارک

۳۰ر دسمبر ۱۹۴۱ء

''وحدت'' کے خلاف دوسرا مقدمہ عدالت کھلتے دائر ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ان کے معاون ''طارق'' کے خلاف بھی۔

ممکن ہے یہ سچ ہو کہ ایڈیٹر ''طارق'' ایسے مفلس ہوں کہ وہ بمبئی سے دہلی تک کا تھرڈ کلاس کا کرایہ ادا نہ کر سکیں لیکن یہ بات ان کو اس وقت سوچنی چاہیے تھی جب انھوں نے میرے خلاف وہ شرمناک الزام لگایا تھا جس کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہ تھا۔ وہ اگر سمن پر نہ آئیں گے تو عدالت وارنٹ جاری کرے گی اور اس پر بھی وہ حاضر عدالت نہ ہوئے تو میرے مقدمے کے علاوہ توہین عدالت کا کیس ان کے خلاف چلے گا۔ یہ تو ان کے طے کرنے کی بات ہے۔ مجھے اور آپ کو اس سے کیا واسطہ؟

کیسے مزے کی بات ہے کہ ''طارق'' کے ایڈیٹر صاحب کو ''سنڈے نیوز'' کے گستاخانہ مضمون پر تو جوش آیا نہیں، مجھے عضو ضعیف سمجھ کر نزلہ گرا بیٹھے۔۔۔

آپ کو جو تکلیف اس سلسلہ میں ہوئی اس کے لیے معافی خواہ ہوں۔ لیکن ایک بات اگر دریافت کروں تو آپ کو غصہ تو نہ آئے گا؟ اور وہ یہ کہ آپ کے والد کے تعلقات تھے اور جس کی ماں کو آپ کی ماں کو بہت عزیز اور جو ذاتی حیثیت سے بھی آپ کا ایسا نیاز مند کہ پوری پچاس سالہ زندگی میں بھائیوں کی طرح رہا اور کبھی آپ کو شکایت کا موقع پوری زندگی میں نہیں دیا۔

چاہیے تو یہ تھا کہ اس مضمون کے لکھنے والے کو میرے علم کے بغیر آپ خود سزا دیتے لیکن اس کو تعزیر سے بچانے کے لیے مجھے مشورہ اس لیے دینا کہ اخلاقی دنیا میں اس کا اچھا اثر ہوگا، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید آپ اپنی مصروفیت کے باوجود اس پر مزید روشنی ڈال سکیں اور میں مطمئن ہو جاؤں۔

جس اخلاقی دنیا میں آپ میرے لیے نیک جذبات چاہتے ہیں اس کو میں نے اور آپ نے بہت دیکھا

ہے، بہت برتا ہے، بہت سمجھا ہے۔ اس میں صرف جرائم پیشہ کے لیے عزت ہے۔ حرام زادوں کے لیے وقعت ہے، محسن کشوں کے لیے احترام ہے اور اس میں کوئی جرم جرم ہی نہیں، اگر مجرم میں ڈیفنس کرنے رشوت دینے اور سفارش پہنچانے کی اہلیت اور طاقت ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر طلب

عزیز حسن بقائی

ان تمام خطوط میں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ برنی مسلسل اپنے دوستوں کے درمیان مصالحت کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے اخلاق کے زور پر عزیز حسن بقائی جیسے تند اور پر جوش اور ہٹ دھرم دوست کو کسی دوسرے پر مقدمہ داخنے نے باز رکھ لیتے ہیں۔ اگر برنی کے خطوط بھی بازیافت ہو جاتے جو نہیں ہو سکے، تو بات اور زیادہ واضح ہو جاتی۔ انھی خطوط سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ برنی اگر چہ براہ راست میدانِ سیاست کے خارزار میں نہ کبھی کودے اور نہ اپنے ملازمت کے زمانے میں بعض ذمے داریوں کے پورا کرنے میں سیاست کے بہت نزدیک رہے مگر کبھی باقاعدہ حصہ نہیں لیا۔ ان کے بھائی منشی عبدالقدیر بھی ایک قومی خدمت گار کی حیثیت سے سیاست سے وابستہ رہے۔

## علامہ نیاز فتح پوری

(۱۸۸۴ء بارہنکی۔ ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کراچی)

برنی کے نام نیاز فتح پوری کے خطوط کی تعداد ۳۶ ہے۔ برنی نے اپنے انتخاب ''خطوطِ مشاہیر'' میں ۱۳ خط شامل کیے ہیں ان میں سے ایک خط نقل کیا جاتا ہے جو دونوں حضرات کے تعلقات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں:

بھوپال۔ ۲۰ جون (۶۰)

صدیقی العزیز۔ نامہء گرامی کا شکریہ

آپ انڈیا انڈر رپن (۶۲) کا ترجمہ بالاقساط بواپسی ڈاک میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں اس کو دیکھ کر اپنی رائے سے مطلع کروں گا کہ آیا بالاقساط نگار میں شایع ہونا مناسب ہے یا کتابی صورت میں۔

محمد علی قصوری کا ریویو میں نے دیکھا افسوس ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کو پیش نظر نہ رکھا کہ یہ صرف سیاسی تبصرہ تھا اور اس میں علوم وفنون کا ذکر نہیں آسکتا تھا ورنہ یوں تو عہد بنی امیہ و بنی عباس کی ترقی علوم وتمدن پر خود ایک مستقل کتاب جرجی زیدان نے لکھی ہے۔

آپ کا ریویو نگارستان پر دیکھا۔ لیکن میرے نزدیک اس میں پہلے فقرہ کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ تاریخ الدولتین میری تاریخی تحقیق کا نتیجہ نہ تھی بلکہ وہ تو صرف اقتباس وترجمہ تھا۔ صحابیات کی نسبت شک کیا جاسکتا ہے کہ وہ

میری تاریخی تحقیق ہے اور اس کی ناکامی میری تاریخی ناکامی کہی جاسکتی ہے۔ صحابیات پر ریویو جلد شایع کیجیے۔

یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ''ریویو شایع ہونے کے بعد ریویو کے صحیح یا غلط ہونے پر بحث کا موقع نہیں رہتا۔'' کیا ریویو کوئی وحی ہے جس میں غلطی کا امکان نہیں؟ وہ صرف ایک ذاتی رائے ہے، جس میں غلطی بھی ہوسکتی ہے اور غلطی پر تنقید کرنے کا ہر شخص کو اسی طرح حق حاصل ہے، جس طرح ریویو نگار کو۔

خاکسار

نیاز

## مولوی عبدالحق (بابائے اردو)

اورنگ آباد۔ ۱۰ رمئی ۲۳ء

مکرمی زادلطفہ تسلیم

عنایت نامہ پہنچا۔ میں ممنون ہوں کہ آپ نے ترجمہء لغت میں شرکت کی آمادگی ظاہر فرمائی۔ انگریزی لغت کے اوراق مرسل خدمت ہیں۔ افسوس ہے کہ فیلن کی ڈکشنری اب تک دست یاب نہیں ہوئی ورنہ اس کے اوراق بھی ساتھ کے ساتھ بھیج دیتا اگر آپ کو پتہ معلوم ہو جہاں یہ ڈکشنری مل سکتی ہو تو ضرور مطلع فرمائیے۔

عبدالحق

۲۶ راگست (کرم خوردگی کے باعث سن ندارد)

مکرمی و معظمی زادلطفہ۔ تسلیم

آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ ممنون فرمایا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے انجمن کی مطبوعات اور اردو پر ریویو کرنے کا خیال ظاہر فرمایا ہے۔ اس سے انجمن کے مقاصد میں بہت بڑی مدد ملے گی میں نے دفتر کو ہدایت کر دی ہے کہ رسالہ اردو باقاعدہ آپ کے نام جاری کر دیا جائے اور اس سال کے رسالے بھی آپ کی خدمت میں بھیج دیے جائیں۔

یہ سب چیزیں براہ راست آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کریں گی۔ آپ کی اس اعانت کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔

نیازمند

عبدالحق

مولوی عبدالحق سے برنی کو جو تعلق خاطر تھا اس کا اظہار گزشتہ اوراق میں ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں مزید مثالیں دی جاسکتی تھیں تاہم محدودیت کے باعث ایسا نہیں کیا جا رہا۔ علاحدہ سے کسی موقع پر تفصیلاً لکھا جائے گا۔

ان خطوط سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ برنی نے اردو لغت کی تیاری میں از خود اپنی دل چسپی ظاہر کی وہاں تعاون

کی پیش کش بھی کی جسے مولوی صاحب نے قبول کر لیا اور انھیں انگریزی لغت ...کے اوراق بھیجے۔ اسی طرح برنی نے اردو کی خدمت ہی کے جذبے سے سرشار ہو کر انجمن ترقی اردو کی کتابوں پر بمبئی کرانیکل میں تبصرے کے لیے مولوی صاحب از خود پیشکش کی جسے انھوں نے بہ خوشی قبول کر لیا اور انھیں رسالہ اور انجمن کی مطبوعات فراہم کی گئیں۔

خطوط کے القابات اور مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولوی صاحب برنی کی کسی قدر عزت کیا کرتے تھے بلکہ ان کے لہجے سے احترام مترشح ہوتا ہے۔

بہر حال اسے بھی برنی کی اردو اور بابائے اردو سے محبت پر محمول کیا جائے گا۔ اسی محبت کا تقاضا تھا کہ انھوں نے اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' کی جلد بندی رکوا کر بابائے اردو سے متعلق اپنے تاثرات کو اس میں شامل کیا۔

عزیز اقارب کے ذیل میں بھی چند خط ملاحظہ فرمائیے:

## منشی عبدالقدیر دہلوی (برنی کے بڑے بھائی)

عزیز من۔ بعد دعوات آملہ

پہلے سے اب بہتر ہوں۔ نزلہ بہت ہو گیا تھا۔ اب بہت گھٹ گیا ہے۔ نزلہ کا اثر دانتوں پر بھی پڑا۔ تقریباً سارے دانتوں نے اثر لیا۔ ڈیڑھ ڈاڑھ میں درد رہا۔ اب اسے بھی آرام ہے اور آسانی سے کھانا کھا رہا ہوں۔ اس درد پر دو شیشی امرت دھارا اور ایک شیشی قلزم صرف ہو گئی۔ دوسری شیشی آج اور منگائی ہے۔

حسب ذیل تین پتے نوٹ کر لیجیے:۔ علمی کتاب خانہ۔ اردو بازار۔ دہلی، عزیزیہ کتب خانہ اردو بازار۔ دہلی، ڈاکٹر ایم حفیظ سید۔ 13/G، Chatham lines، الہ آباد نمبر ۴۔ انھوں نے ......... منی آرڈر سے ارسال کیے۔ کل ........ ہوئے۔ اسباب بغاوتِ ہند اور تاریخ ممتاز وغیرہ مل گئیں۔ مطلع کر دیں۔ عزیزی خالد (۶۳) کے بارے میں نے ایک خط عزیزہ فاطمہ (۶۴) کا لکھا۔ دوسرا عزیزی صلاح (۶۵) کو۔ دونوں سے جواب کا منتظر ہوں۔ اس میں نفس مضمون فقط اتنا تھا کہ عزیزی نے جو جگہ خود پسند کر لی ہے اس سے آپ بھی متفق ہو کر ایکتائی امور کو انجام دے دیں۔ اس کی عمر ضائع نہ کریں اور کسی قسم کا اختلاف نہ کریں اس لیے کہ نبھانا تو اسے ہی ہے اور اب مزید ایام گذاری سے احتراز کریں۔ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی پسندیدگی کو ترجیح دی جائے۔ آمنہ کے انکار کو بھی بہت عرصہ گزر گیا۔ (۶۶)

دیوان سنگھ نے ناقابلِ فراموش لکھی تو ہے لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ریاست (۶۷) کا اقتباس ہے سالنامہ تیج غالباً صلاح الدین کے گھر ہوگا۔ اس میں میرا ایک مضمون ہے اسے ضرور پڑھ لیں۔ وہ انبالہ کا واقعہ ہے اور یہ بھی ناقابلِ فراموش اسکی زندگی کا حصہ ہے۔ کیوں کہ دیوان سنگھ اور لالہ روپ نرائن وغیرہ پانچ سات قیدیوں نے باہم کوشش کی کہ وہ جیل میں رہ کر ایماندار بننے کی کوشش کریں اور اس میں وہ سب کے سب ناکام رہے۔ ایک ہفتہ بھی ایماندار نہ رہ سکے۔ یہ واقعہ اس کے ساری زندگی کے جملہ واقعات سے زیادہ اہم ہے۔ اگر مناسب خیال کریں تو اس کا حوالہ دے دیں۔

ایماندار بننے کی مہم کے عنوان سے میں اس واقعہ کو تین مرتبہ شائع کرا چکا ہوں۔ نذیریہ کتب خانہ آج کل بند ہے۔ مسلم صاحب نے مجھے نہ تو روپیہ دیا نہ اس کے بارے میں میں کوئی بات کی۔ یہ قطعاً جھوٹ یا دھوکا ہے۔ مسلم صاحب کراچی گئے ہوئے ہیں اور وہ غالباً شاہد صاحب کے گھر مقیم ہوں گے۔ مسلم صاحب سے تو میرا کوئی میل جول ہی نہیں۔ کہیں کبھی سلام ہو جاتا ہے اور بس۔

عرش ملسیانی صاحب کی بیوی کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ آپ ان کو آجکل کے پتہ پر افسوس کا خط لکھدیں۔ برادرم عبدالقادر (۶۸) کے کراچی پہنچنے سے پہلے میں بھی لاہور پہنچا ہوا ملوں گا۔ ارادہ ہے کہ شروع اپریل میں لاہور پہنچوں اور دو ہفتہ بعد بقیہ موسم سرما کراچی گزاروں۔ عزیزوں کو دعوات۔ ذرا یہ تو معلوم کریں کہ خاموشی کیوں ہے۔ خیر طلب

عبدالقدیر (دست خط) ۵۸۔۲۔۸

**محمد فتح الاسلام** (ضیاءالدین احمد برنی کے برادرِ نسبتی)

ایک خط برنی کے برادرِ نسبتی محمد فتح الاسلام کا ملاحظہ فرمائیے:

۲۹ر دسمبر ۱۹۴۸ء

مکرمی بھائی جان صاحب۔ السلام علیکم

یہ میموکل رجسٹرڈ پوسٹ سے آپ کے نام ملی ہے یہ اُسی درخواست کے جواب میں ہے جو آپ نے روانگی سے پہلے میرے اصرار پر information & Broadcasting DN میں دی تھی اور میں آپ کو ایک صاحب کے پاس لے بھی گیا تھا۔ امید قوی ہے کہ یہ جگہ آپ کو ضرور مل جائے گی۔ لہذا آپ اپنے دوسرے کاموں کو جلدی جلدی ختم کر کے جنوری کے پہلے ہفتہ میں ۷ یا ۸ تک ضرور پہنچ جائیں تا کہ ۱۰ جنوری کو دفتر پہنچ سکیں۔ یہ موقع بہت اچھا ہے اور اس کو ہاتھ سے نہ کھونا چاہیے۔

ایک خط حامد حسین صاحب (الطاف صاحب کے سالے) کا الطاف صاحب کے کرایہ دار کے نام ارسال ہے۔ اگر ہو سکے تو یہ خط اس کو پہنچا دیں اور اس سے کرایا لینے کی کوشش فرمائیں۔ اس کو یہ بہانہ ہے کہ حامد صاحب جنھوں نے اس کو مکان میں بسایا تھا کا خط کرائے کے بارے میں آئے گا تو کرایہ دوں گا۔ یہ مکان وہی ہے جس میں الطاف رہتے تھے (گلی ننھے خان۔ مسجد کالے خان)

آپ ہو سکے تو فوراً بہ ذریعہ تار اپنے روانہ ہونے کی اطلاع دیں تا کہ اطمینان ہو۔

فقط والسلام

خاکسار محمد فتح الاسلام عفی اللہ عنہ

(۶۹)29/12/48

ایک خط برنی کے بیٹے محمد احمد برنی کا ملاحظہ فرمائیے جو اوپر دیے گئے موضوع کا تسلسل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

## محمد احمد برنی (۷۰) (برنی کے بیٹے)

۲۹ر دسمبر ۱۹۴۸ء

جناب والد صاحب۔ السلام علیکم

کل Information BroadacastingDn سے آپ کی درخواست کا جواب آیا تھا۔ آپ کو 10-1-49 کو انٹرویو اور ٹیسٹ کے لیے بلایا ہے۔ اب آپ فوراً سب کام چھوڑ کر آجایئے۔ باقی کام صلاح الدین بھائی کرلیں گے۔ آپ کسی صورت سے بھی 9-1-49 کو کراچی پہنچ جایئے۔ یہ بہت ہی اچھا موقع ہے اور اس کو کھونا نہیں چاہیے۔ میں نے کل ایک کارڈ بھی ڈال دیا تھا امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کے Behalf انھیں جواب دے دوں۔ میں ماموں جان (۷۱) سے پوچھ کر جواب دے دوں گا۔ جیسا مناسب ہوگا وہی کروں گا۔ مگر آپ جلدی آجایئے۔ والسلام (۷۲)

فقط

محمد احمد برنی

''خطوطِ مشاہیر'' کا ایک حصہ انگریزی خطوط پر مبنی ہے۔ اس حصے میں برنی کے بزرگ بھی ہیں اساتذہ بھی اور دوست بھی ہیں۔ اس حصے میں خطوط کی تعداد ۵۴ ہے۔ کچھ ان کے علاوہ بھی ہیں جو دریافت شدہ ذخیرہ خطوط میں ہیں، یہ سب غیر مطبوعہ ہیں۔ اس مقالے میں صرف اردو خطوط کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ انگریزی خطوط کو کسی اور موقع پر منظر عام پر لایا جائے گا۔

آخر میں ایک خط مولانا الطاف حسین حاؔلی کا نقل کیا جاتا ہے۔ یہ خط اگرچہ برنی کے والد منشی محمد الدین کے نام ہے اور غیر مطبوعہ ہے تاہم اس میں بالواسطہ برنی کا تذکرہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ حاؔلی کے تعلقات منشی محمد الدین سے کیسے تھے اور حالی برنی نہ صرف انھیں اچھی طرح جانتے تھے بلکہ بزرگانہ شفقت بھی رکھتے تھے۔ خط ملاحظہ فرمایئے:

> الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ ضیاء الدین احمد صاحب بی اے کے امتحان میں پاس ہوگئے ہیں۔ وہ دو تین دفعہ دلّی میں مجھ سے ملے ہیں۔ نہایت لایق اور ہونہار نوجوان ہیں۔ اب ان کو ایسا پیشہ سکھانا چاہیے جس سے اُن کی طبیعت کو زیادہ مناسبت اور جس کام کی ان میں کافی قابلیت ہو۔ اور اس کا فیصلہ وہ خود ہی کر سکتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا میلان خود ان کا رہنما ہوگا۔ مجھے ضرور مطلع کیجیے گا کہ وہ منجملہ لا، انجینیر نگ، میڈیسن، وغیرہ کے کون سا پیشہ اختیار کرنے کی طرف راغب ہیں۔ خاکسار الطاف حسین حالی ۳ راگست ۱۹۱۳ء۔

غرض اس ذخیرہ خطوط میں متعدد خطوط ایسے ہیں جو علاحدہ علاحدہ مضمون کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس مقالے میں مشاہیر کے اور برنی کے متعلقین کے ایسے خطوط شامل کیے گئے ہیں جن سے بنیادی طور پر برنی کے سوانح اور ان کی خدمات کے

حوالے سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ گزشتہ اوراق میں پیش کیے گئے خطوط سے جہاں برنی کے حوالے سے معلومات سامنے لائی گئی ہیں وہاں خطوط نگاروں کے حوالے سے بھی مفید اور قیمتی اور نادر معلومات سامنے لائی گئی ہیں۔

خطوط کی تعداد بہت زیادہ اور اس مقالے میں سب کا احاطہ ممکن نہیں ہے چناں چہ تمام خطوط کو علاحدہ سے حواشی اور تعلیقات کے ساتھ سامنے لایا جائے گا۔

## حواشی وتعلیقات:

۱۔ برنی کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' ان شخصیات کے علاوہ اور بھی شخصیات ہیں جن سے برنی کے نیاز مندانہ اور دوستانہ تعلقات رہے۔

۲۔ ''باقیاتِ شبلی'' لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۵ء، ص ۲۱۲۔

۳۔ مکتوباتِ ماجدی (جلد سوم) مرتبہ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، ادارہ انشائے ماجدی، ۱۴۷۔ رابندر سران، کلکتہ۔۷۳، انڈیا۔

۴۔ ''انوارِ اقبال'' مرتبہ بشیر احمد ڈار، کراچی، اقبال اکادمی پاکستان، مارچ ۱۹۶۷ء۔

۵۔ ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'' مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۳ء۔

۶۔ یہ انگریزی خط بشیر ڈار کی کتاب Letters of Iqbal، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور میں ہوا ہے۔ یہ انگریزی خط ایک ویب سائٹ: www.brain.net.pk پر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

۷۔ ''مکاتیب عبدالحق''، مرتبہ جلیل قدوائی، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء۔

۸۔ یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔ اس خط میں جن مزید چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے نہ وہ چیزیں میوزیم سے ملی ہیں اور نہ ان کے بارے میں پتا چل سکا کہ آیا وہ مضامین تھے یا کچھ اور۔

۹۔ ان خطوط کا رجسٹر میں اندراج نمبر ہے N.M.1769.371/1-120 to N.M.1969.539 صفحہ نمبر 291 تا 308۔

۱۰۔ میرے علم کے مطابق برنی کے نام مشاہیر کے خطوط میں سے صرف اقبال کے خطوط شایع ہو کر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ برنی نے اپنی زندگی میں اپنے نام علامہ اقبال کے خطوط اقبال اکیڈمی بھجوادیے تھے چناں چار اردو خطوط ''کلیاتِ مکاتیبِ اقبال'' مرتبہ سید مظفر حسن برنی، جلد اول، دوم، اردو اکادمی دہلی، میں شایع ہو گئے ہیں جب کہ انگریزی زبان میں ایک خط بشیر احمد ڈار کی کتاب Letters of Iqbal، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور میں شایع ہو گیا ہے۔

۱۱۔ کتابی دنیا، اپریل ۱۹۶۴ء ص ۸۔۹

۱۲۔ عظمتِ رفتہ، محولہ بالا، ص ۴۸۔ یہ تذکرہ برنی نے بلا خوف تردید ہر اس مقام پر کیا ہے جہاں مولانا محمد علی جوہر یا ''ہمدرد'' کا ذکر آیا۔

۱۳۔ مولانا محمد علی اور ان کی صحافت از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، کراچی، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، اول دسمبر ۱۹۸۳ء، ص ۹۵۔

۱۴۔ ملا واحدی کے قلم سے از ملا واحدی، روزنامہ جنگ کراچی، مئی ۱۹۶۹ء۔

۱۵۔ دیکھیے ''پیش لفظ'' عظمتِ رفتہ، محولہ بالا۔

۱۶۔ یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔

۱۷۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری اخبار ''ہمدرد'' دہلی کے دورِ اوّل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: دورِ اوّل کے سب ایڈیٹروں میں قاضی عبدالغفار مرادآبادی، عارف ہسوی، قاری عباس حسین، محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری، قاضی عبدالعزیز منصور پوری کے نام آتے ہیں۔ (ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری: مولانا محمد علی اور ان کی صحافت، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، کراچی، دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۹۱۔) ''ہمدرد'' دہلی کی مجلس ادارت سے تعلق و وابستگی کا تذکرہ ضیاء الدین احمد برنی نے بھی عظمتِ رفتہ صفحہ ۴۹ پر کیا ہے۔ قاضی عبدالعزیز منصور پوری اور برنی کا تعلق ہمدرد کے پہلے دور سے تھا۔

۱۸۔ ملا واحدی نے ''میرے زمانے کی دلی'' میں انھیں رئیس الاحرار محمد علی کا پرسنل اسسٹنٹ لکھا ہے۔ دیکھیے (ملا واحدی، میرے زمانے کی دلی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰۸) ۔ ماہنامہ سب رس کراچی کے سید سجاد نمبر میں بھی تذکرہ ہے وہ ڈاکٹر سید سجاد کے چھوٹے بھائی تھے۔ گزشتہ اوراق میں تذکرہ ہو چکا ہے کہ وہ برنی کے بہت اچھے دوست تھے۔

۱۹۔　　باوجود کوشش کے یہ لفظ نہیں پڑھا جاسکا۔

۲۰۔　　یہ لفظ بھی نہیں پڑھا جاسکا۔

۲۱۔　　۱۹۳۰ء یا اُس کے چند سال بعد ضیاء الدین برنی اور ان کے چند دوستوں نے بمبئی میں ایک انجمن ''بزمِ خیال'' کے نام سے قایم کی تھی۔ برنی اُس کے صدر تھے اور مولوی نذیر احمد خجندی نائب صدر تھے۔ برنی کے سوا باقی تمام عہدے داران شاعر تھے۔ اس انجمن کے تحت کئی آل انڈیا مشاعرے منعقد کیے گئے۔ شعرخوانی کے علاوہ تقاریر بھی کی جاتی تھیں۔ ان مشاعروں میں مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، نے کئی مرتبہ شرکت کی۔ جوش ملیح آبادی، آزاد انصاری، سیماب اکبرآبادی، بسمل الہ آبادی، ساغر میرٹھی، احسن مارہروی اور مولانا ماہر القادری جیسے بلند پایہ شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

مرحوم صادق دہلوی نے اپنے مجموعہ رباعیات ''رباعیات صادق'' میں ''بمبئی کا کل ہند مشاعرہ'' کے عنوان سے ۱۹۳۴ کے ایک مشاعرے کی روداد اس طرح قلم بند کی ہے:

> ۱۲/مارچ ۱۹۳۴ء کو بمبئی میں ''بزمِ خیال'' کی جانب سے ایک آل انڈیا مشاعرہ میری صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ صحبت دو دن جاری رہی۔ ۱۲مارچ کو شام کے وقت پہلی نشست میں بہ عنوان ''وطن''، نظمیں پڑھی گئیں اور دوسرے روز ۱۳مارچ کو بہ وقت شب طرحی غزلیں۔ پہلے دن میں نے اپنی نظم سے ''وطن'' سے متعلق جو رباعیاں عرض کی تھیں۔
>
> نوٹ
>
> اس مشاعرے میں حکیم آزاد انصاری، حضرت جوش ملیح آبادی، جناب ساغر نظامی، جناب منظر صدیقی، جناب مولانا بدر جلالی (ایڈیٹر اخبار مدینہ)، جناب آغا سروش لکھنوی، جناب شہاب صاحب اور دیگر مشاہیر شعرائے ہند نے شرکت فرمائی تھی۔ (ستمبر ۱۹۶۸ء بزمِ صادق، کھائی روڈ حیدرآباد، ص ۲۰۲)

۲۲۔　　بزمِ خیال، بمبئی کے سیکریٹری وسیم الدین چشتی۔ (برنی)

۲۳۔　　[غلام احمد خان آرزو،] مدیر، ہندوستان، بمبئی۔ (برنی)

۲۴۔　　۱۹۲۹ء میں ضروری ترمیمات کے ساتھ بہ صورتِ کتاب کیمبرج سے شایع ہوئی۔ برنی کا ترجمہ ۱۹۵۲ میں اپنے ہی ادارے ''تعلیمی مرکز''، کراچی سے مجلد ایک ہزار کی تعداد میں شایع کیا۔ تفصیل چوتھے باب میں کتابوں کے ذیل میں دیکھیے۔

۲۵۔　　یہ اشارہ سید راس مسعود کے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ چھوڑ کر بھوپال چلے جانے کی جانب ہے۔

۲۶۔　　ضیاء الدین احمد برنی اُس زمانے میں ''اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس بمبئی'' میں بہ طور ٹرانسلیٹر ملازم تھے۔

۲۷۔　　یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔

۲۸۔　　برنی کا یہ خط باب ۷ میں دیکھیے۔

۲۹۔　　یہ امر برنی کی شرافت اعلا کردار پر دال ہے کہ انھوں نے احسن کے اظہارِ شرمندگی کا پردہ رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ''خطوطِ مشاہیر'' مرتب کرتے وقت اس عبارت کو حذف کر دیا جسے بریکٹ میں دیا جارہا ہے۔

۳۰۔　　یہ اشارہ ضیاء الدین احمد برنی کی پہلی بیوی کے انتقال کی جانب ہے۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی کا نام محمودہ بیگم تھا۔ وہ آگرہ کے ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کا انتقال ۸/جون ۱۹۳۴ء کو ہوا۔ جب کہ دوسری بیوی آمنہ بیگم تھیں جن کا تعلق دہلی سے تھا۔ ان کا انتقال ۲۸/اکتوبر ۱۹۹۰ء کو کراچی میں ہوا۔ برنی نے ''خطوطِ مشاہیر'' کو محمودہ بیگم کے نام سے منسوب کیا ہے۔ برنی نے اپنی تصنیف ''عظمتِ

رفتہ'' میں محمودہ بیگم کا تذکرہ اکثر جگہ کیا ہے۔

۳۱۔　مولانا احسن نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی اُن کے ماموں حافظ سید عبدالجلیل کی صاحب زادی افضال فاطمہ تھیں۔ یہ شادی ۱۸۹۶ء میں ہوئی تھی۔ ۱۰ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو انھوں نے داغ مفارقت دیا۔ انھی کے انتقال پر مولانا نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ''مکاتیب احسن'' جلد دوم میں مکتوب بہ نام متین مچھلی شہری اور بہ نام ساغر نظامی میں یہ جذبات اور بھی شدت کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔ متین مچھلی شہری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ''میں چند ماہ سے مسلسل تفکرات اور پریشانیوں کا شکار رہا ہوں جس کی انتہا ۱۰ر ستمبر میں خانہ ویرانی پر ہوئی۔ یہ سانحہ میرے لیے آخر عمر میں زندہ درگور کردینے کے لیے کافی ہے۔'' (دیکھیے: مکاتیب احسن، مرتبہ ڈاکٹر عنوان چشتی، صغیر احسنی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی، مارچ ۱۹۸۳ء، ص ۸۱)

۳۲۔　غالباً برنی نے اس عبارت کو اشاعت کی غرض سے شایع کرنا ضروری نہیں سمجھا چناں چہ حذف کردیا۔

۳۳۔　ایضاً۔

۳۴۔　اتنی طویل عبارت برنی نے یقیناً اسی غرض سے حذف کی ہوگی کہ احسن مارہروی کی زندگی کا یہ پہلو پردہ اخفا میں رہے۔

۳۵۔　یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔

۳۶۔　اس خط سے قبل برنی نے احسن کو ایک خط لکھا تھا جس پر تاریخ درج نہیں ہے اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ''ذاتی طور پر مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کے لئے مفید ثابت نہ ہوسکا۔'' جس کا جواب احسن نے ان الفاظ میں دیا۔

۳۷۔　باوجود کوشش کے یہ لفظ نہیں پڑھا جاسکا۔

۳۸۔　یہ عبارت بھی برنی نے یقیناً اس خیال سے حذف کی ہوگی کہ احسن کا راز افشاں نہ ہوجائے۔

۳۹۔　مشہور شاعر احمق پھپھوندوی [م ۸ر اگست ۱۹۵۷ء]۔ (برنی) [اصل نام محمد مصطفیٰ خاں تھا۔ پھپھوند ضلع اُٹاوہ (یوپی) میں پیدا ہوے۔ اوّل احمق تخلص اختیار کیا بعد میں مدّاح۔ عبدالمجید حیرت شملوی نے تبدیلی تخلص کے تعلق سے بڑی دل چسپ بات لکھی ہے۔ ''جناب مدّاح کو اوّل اوّل خلافت ایجی ٹیشن کے دور میں زمیندار میں دیکھا تھا۔ مداح صاحب اس وقت احمق تھے آگے چل کر توقع یہ تھی کہ عاقل نظر آئیں گے یا حضرت یاس یگانہ کی تقلید میں فرزانہ مگر ہوگئے مداح۔ خیر یہ بھی اچھا ہوا، ورنہ ان کے مداح بڑی مشکل میں تھے اور انھیں احمق کہتے ہوئے شرماتے تھے۔ ویسے احمق تو وہ نہ جب تھے نہ اب ہیں اور اب تو اپنے مداحوں کے مداح ہیں بلکہ ممدوح''۔ (''مخلصے دیدم'' مرتبہ سید انیس شاہ جیلانی، حیرت شملوی اکادمی، محمد آباد، ضلع رحیم یار خاں، اول ۱۹۸۱ء، ص ۴۵) مولانا احسن مارہروی کے خاص اور عزیز تلامذہ میں شمار ہوتا تھا۔ وہ طنزیہ و مزاحیہ اور قومی شاعر کے طور پر مشہور تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں۔ تمام عمر کھدر پہنا۔ انجمن ترقی اردو ہند کی اردو ہندی ڈکشنری میں بھی بھرپور تعاون کیا۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور ہندی زبان سے خوب آگاہ تھے۔ مولانا احسن مارہروی کے تلامذہ میں سب سے زیادہ قابل آدمی تھے۔ (مولانا احسن مارہروی، آثار و افکار، مصنفہ ڈاکٹر صابر حسین خاں جلیسری، انجمن ترقی اردو پاکستان، اول ۱۹۸۹ء، ص ۱۲۱۔) ان کے کئی مجموعے شایع ہوچکے ہیں۔ جن میں سنگ و خشت، نقشِ حکمت، زندانِ حماقت اور جوش و عمل قابل ذکر ہیں۔ ان کے انتقال پر ضیاء الدین احمد برنی نے مختصر تحریر کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ دیکھیے: ماہ نامہ کتابی دنیا، ستمبر ۵۷ء، ص ۵۔ برنی نے کتابی دنیا اکتوبر ۵۷ء کی اشاعت میں ''جوش و عمل'' سے ایک نظم ''شراب کہن'' کے طور پر شایع کی۔ دیکھیے: ص ۱۴۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

جوانانِ وطن بس خواب سے بیدار ہوجاؤ　　بہت غافل رہے اٹھو بس اب ہوشیار ہوجاؤ
یہ روز بد تمھاری غفلتوں ہی نے دکھایا ہے　　بس اب کروٹ بدلنے کے لیے تیار ہوجاؤ
گئے وہ دن کہ تھا جب اختلاف مذہب و ملت　　بس اب اک دوسرے کے مونس و غم خوار ہوجاؤ

بس اب باہم دگر سیکھو رواداری و ہم دردی　بس اب آپس میں سب کے دوست سب کے یار ہو جاؤ

۴۰۔　شاہ جہاں پیلیس ہوٹل، بمبئی کے مالک۔(برنی) [ہوٹل کے اصل مالک سید یوسف شاہ تھے۔ان کے انتقال کے بعد کاروبار ان کے بھتیجے سید فضل شاہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد فضل شاہ کراچی آ گئے۔ طویل بیماری کے بعد ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو انتقال ہوا۔ سید یوسف شاہ اور فضل شاہ نہایت ادب نواز اور انسانی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے تھے۔(دیکھیے: ''سید فضل شاہ''، مشمولہ عظمتِ رفتہ، مصنفہ ضیاء الدین احمد برنی، ۱۹۶۱ء، تعلیمی مرکز، کراچی۔)

۴۱۔　خط کا یہ حصہ ضائع ہو چکا ہے لہذا پڑھا نہیں جا سکتا، غالباً لفظ ''پچاس'' تحریر ہوگا چوں کہ آگے اس کا ذکر آئے گا۔

۴۲۔　یہ حصہ بھی غالباً اسی لیے حذف کیا گیا کہ برنی اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں سید فضل شاہ کی تعریف کر چکے ہیں اور نہیں چاہتے ہوں گے کہ ان کے اس کم زور پہلو پر روشنی پڑے۔ یا یہ وجہ ہو کہ چوں کہ یہ احسن مارہروی کا بیان اور اُس کی تصدیق ہونا باقی تھا لہذا انھوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ بلا تحقیق کوئی بات ان سے منسوب کی جائے۔

۴۳۔　بمبئی کے ایک علم دوست شاعر، حال مقیم کراچی۔

۴۴۔　ضیاء الدین احمد برنی کے تین بچوں، احمد برنی، جمال برنی اور اقبال برنی نے جامعہ ملیہ میں کوئی تین سال تعلیم حاصل کی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ تھے۔

۴۵۔　یہ خط صدر شعبہء اردو کے لیٹر پیڈ پر لکھا ہوا ہے جس پر انگریزی عبارت ایک جانب: Deparment of Urdu Muslim University, Aligarh اور دوسری جانب: Chairman تحریر ہے۔ افسوس کہ اس خط کے جواب میں برنی کا خط بازیافت نہیں ہو سکا۔ احسن کا یہ خط غیر مطبوعہ ہے۔

۴۶۔　غالباً اس حصے کے حذف کرنے کا مقصد بھی سید فضل شاہ کی شرافت اور نیک نامی کو داغ دار ہونے سے بچانا تھا، جس کا تذکرہ برنی نے عظمتِ رفتہ میں کیا ہے۔

۴۷۔　اس خط کا جواب بھی برنی کے دست یاب خطوط میں نہیں ہے۔

۴۸۔　یہ لفظ بھی باوجود کوشش کے نہیں پڑھا جا سکا۔

۴۹۔　خط کے اختتام سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط ناتمام ہے۔ احسن مارہروی عموماً خط کے اختتام پر اختتامی الفاظ ضرور لکھتے ہیں اور اپنا تخلص بھی۔ یہ خط برنی کے انتخاب میں جگہ نہیں پا سکا۔ اس خط کے مندرجات سے اندازا ہوتا ہے کہ یہ خط احسن نے مئی میں لکھنا شروع کیا اس درمیان برنی کا محررہ ۱۹۳۵/۹/۱۸ء کا خط پہنچا چناں چہ انھوں نے اس کا جواب بھی شامل کر لیا ہے۔ ان کا یہ لکھنا کہ '' آپ کے خط میں شاہ صاحب کی خفگی کا حال معلوم ہوا۔'' اس امر کی تصدیق کرتا ہے۔

۵۰۔　مولانا ماہر القادری اور ضیاء الدین احمد برنی از رفیق احمد خان، (الف) سہ ماہی نوائے ادب، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی، اکتوبر ۲۰۰۶ء، ص ۳۶-۳۲۔ (ب) سالانہ مجلّہ ''الماس''، شعبہء اردو، شاہ عبداللطیف یونی ورسٹی، خیر پور، سندھ، شمارہ ۹، ۲۰۰۷ء، ص ۱۷۹-۱۹۱۔

۵۱۔　مولانا ماہر القادری: ضیاء الدین احمد برنی، مشمولہ ''یادِ رفتگاں''، طالب ہاشمی (مرتب)، طبع اول، لاہور، البدر پبلی کیشنز،، مارچ ۱۹۸۴ء، حصہ اول، ص: ۳۸۳-۳۸۴۔

۵۲۔　مولانا ماہر القادری: عطیہ فیضی، ''یادِ رفتگاں'' طالب ہاشمی (مرتب)، طبع اول، لاہور، حسنات اکیڈمی (پرائیوٹ) لمیٹڈ، ۱۹۸۴ء،، حصہ دوم، ص: ۱۴۰۔

۵۳۔　مولانا ماہر لکھتے ہیں: '' ۱۹۴۳ء میں ماہر القادری بمبئی کے آل انڈیا مشاعرے میں گیا تو وہاں خاص پذیرائی ہوئی۔ فلم انڈسٹری کے بعض

ارباب کار ماہر کی طرف متوجہ ہوئے۔'' دیکھیے: مولانا ماہرالقادری: ''خودنوشت''، فاران، کراچی، ماہرالقادری نمبر، دسمبر ۱۹۷۸ء۔ چناں چہ یہ معاملہ ابھی تحقیق طلب ہے کہ مذکورہ مشاعرہ ۱۹۴۱ء، ۴۲، یا ۱۹۴۳ء میں ہوا تھا۔

۵۴۔ مولانا ماہرالقادری: حضرت آرزو لکھنوی: ''یادِ رفتگاں''، طالب ہاشمی (مرتب)، طبع اول، لاہور، البدر پبلی کیشنز، مارچ ۱۹۸۴ء، حصہ اول، ص: ۳۲۔

۵۵۔ اصل خط میں -/۶۰ روپے تحریر ہے تاہم برنی نے خطوط کا انتخاب ''خطوطِ مشاہیر'' کرتے ہوئے غالباً رازداری ہی کی غرض سے رقم نہیں لکھی۔

۵۶۔ خط پر تاریخ اور مقام درج نہیں ہے تاہم متن سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ خط حیدر آباد دکن سے لکھا گیا ہے اور اس کا زمانہ وہی ''اکبر اعظم'' کے موضوع پر ہونے والے مشاعرے کا ہے۔

۵۷۔ حکیم مرزا حیدر بیگ دہلوی کا مطب (بمبئی) علم و ادب کی مجلسوں کا مرکز رہ چکا ہے۔ (برنی)، برنی کے نام مولانا ماہر کے خط کا حاشیہ۔

۵۸۔ اس خط پر بھی تاریخ درج نہیں۔

۵۹۔ مولانا ماہرالقادری کا رسالہ، کراچی سے شائع ہوتا تھا۔

۶۰۔ فاران میں برنی کے دو مضمون شائع ہوئے تھے ''مجھے اختلاف ہے'' جون ۱۹۵۲ء میں، جس کا تعلق غالب کے ایک شعر سے ہے اور دوسرا ''حضرت عمر بن عبدالعزیز (حالات)''، مارچ ۱۹۵۹ء میں۔ ممکن ہے یہ اشارہ اس دوسرے مضمون کی جانب ہو۔

۶۱۔ برنی کی کتابوں پر جو تبصرے میری نظر سے گزرے ہیں ''اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں'' مئی ۱۹۵۱ء ''سی۔ ایف اینڈریوز'' دسمبر ۱۹۵۲ء، ''تذکرہ مولوی ذکاءاللہ دہلوی'' مارچ ۱۹۵۳ء اور ''لطائف ملانصرالدین'' پر بھی تبصرہ ہوا۔ جنوری میں تو کوئی بھی تبصرہ شائع نہیں ہوا۔ ''سی۔ ایف اینڈریوز'' اور ''تذکرہ مولوی ذکاءاللہ دہلوی'' پر تبصرے نسبتاً طویل ہیں۔

۶۲۔ یہ ان کے لیٹر پیڈ پر ہے، جس پر ماہنامہ فاران کی مہر ثبت ہے۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں۔

۶۳۔ یہ پوسٹ کارڈ ہے۔

۶۴۔ شبلی کی اس وقت تک چوں کہ برنی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لہٰذا انھوں نے برنی کو مولانا لکھ کر خطاب کیا۔

۶۵۔ انتخاب کرتے ہوئے یہ الفاظ برنی سے رہ گئے تھے۔

۶۶۔ خط میں وہی املا برقرار رکھا گیا جو اصل خط میں ہے۔

۶۷۔ یہ خط جس زمانے میں لکھا گیا اس زمانے میں برنی دہلی میں تھے اور اخبار ہمدرد سے وابستہ تھے۔ خط کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط برنی کے خط کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

۶۸۔ ''عظمتِ رفتہ''، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۶۱ء، ص ۲۶۹۔۲۶۸۔

۶۹۔ عظمتِ رفتہ، ص ۲۵۵۔

۷۰۔ برنی کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' کی جانب اشارہ ہے۔

۷۱۔ یہ خط لیٹر پیڈ پر ہے۔ جس کے دائیں جانب نقوش، پتا اور فون نمبر چھپا ہوا ہے۔

۷۲۔ نقوش میں برنی کا ایک مضمون ''میں نے جو لڑائیاں دیکھیں'' ۱۹۶۵ء، میں شائع ہوا تھا ممکن ہے یہی مضمون ہو جسے دو سال تک مکمل کیا گیا۔

۷۳۔ یہ اشارہ انجمن ادبی رسائل پاکستان کی جانب ہے۔

۷۴۔ یہ خطوط تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔

۷۵۔ ہال کا نام کچھ اس طرح لکھا ہوا ہے باوجود کوشش کے نہیں پڑھا جا سکا۔

۷۶۔ یہ مضمون میری نظر سے گزرا ہے۔ حوالہ یاد نہیں آ رہا۔

۷۷۔ شمارہ اجنوری ۶۴ ص ۷ پر تصویر اور مختصر حالات برنی ہی کے قلم سے نکلے تھے۔

۷۸۔ ''حفیظ نمبر''، افکار کراچی، یہ تبصرہ کتابی دنیا، جنوری ۱۹۶۴ص ۱۱ پر شایع ہوا۔

۷۹۔ کلیات مکاتیب اقبال مرتبہ سید مظفر حسن برنی، جلد اول، اردو اکادمی دہلی، ص ۳۶۰۔

۸۰۔ ذخیرہ خطوط میں بیخود دہلوی کے دو عدد خط ہیں۔ برنی نے بیخود سے اپنے تعلقات کے بارے میں اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں تفصیل سے لکھا ہے۔

۸۱۔ الہلال ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں جاری ہوا۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں ضمانت ضبط کر لی گئی۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو اس کا پہلا دور ختم ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں الہلال کی تجدید اشاعت کی گئی تو نمایاں مقبولیت کے باوجود چند ماہ کے بعد ہی پرچہ بند ہو گیا۔ (ڈاکٹر انور سدید: ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ''، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، اول، جنوری ۱۹۹۲ء)

۸۲۔ ان دونوں نے ابتدائی اور ثانوی مدارس کے لیے جو اردو نصاب تیار کیا تھا اس میں مولانا اسلم صاحب کی کتاب ''خواتین'' سے بلا حوالہ ۵ مضامین نقل کر لیے تھے۔ (برنی)

۸۳۔ ایضاً۔

۸۴۔ علاء الدین خالد، منشی عبدالقدیر کے بیٹے، برنی کے بھتیجے۔

۸۵۔ ایضاً۔

۸۶۔ یہ اشارہ برنی کی مترجمہ ''دلی کی صبح شام'' کی جانب ہے، تفصیل کے لیے کتابوں والا باب دیکھا جائے۔ خواجہ حسن نظامی نے ضیاء الدین احمد برنی سے انگریزی کتاب Two Native Narratives of the Mutiny in Delhi by C.T.Metcalfe,First Edition 1889, London and Second Edition 1975 Al-Biruni,Lahore,Pakistan. کا اردو ترجمہ ''غدر کے صبح شام۔ غدرِ دہلی ۱۸۵۷ء کی نسبت ایک ہندو اور ایک مسلمان کے لکھے ہوئے دو خفیہ روزنامچے''، کے نام سے کروایا۔ یہ کتاب مارچ ۱۹۲۶ء میں کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو دہلی سے شائع کی گئی۔ ستمبر ۱۹۹۹ء میں ادارہ تخلیقات، مزنگ روڈ، لاہور نے ''جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء، دو خفیہ روزنامچے''، مترجم ضیاء الدین احمد برنی کے نام سے دوبارہ شایع کیا۔

۸۷۔ سلطان نظام الدین اولیاء کے مزار پر جو نظم ولایت جاتے وقت ڈاکٹر اقبال نے پڑھی تھی اس میں ایک شعر خواجہ صاحب کے بارے میں بھی تھا ۔''بانگِ درا'' میں یہ شعر حذف کر دیا گیا ہے، اس وجہ سے میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ وہ شعر یہ ہے:

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا　　ملا ہے جس کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

۸۸۔ چین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی، کراچی کے بانی، اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ (برنی) گزشتہ اوراق میں ذکر ہو چکا ہے کہ وہ برنی کے دوست تھے ۔برنی نے کچھ عرصہ اس کمپنی میں ملازمت بھی کی تھی۔

۸۹۔ استاذی اینڈریوز اپنی کتاب ''ذکاءاللہ دہلوی'' میں لسان العصری کی تصویر دینا چاہتے تھے۔ اسی سلسلے میں یہ خط و کتابت ہوئی تھی۔ (برنی)

۹۰۔ آخری عمر میں اکبر کو یکے بعد دیگرے دو صدمات سے دوچار ہونا پڑا ۱۲۳۱ کتوبر ۱۹۱۰ء کو بیوی کا انتقال ہوا اور ۵ جون ۱۹۱۳ء کو چھوٹے بیٹے سید ہاشم حسین نوجوانی میں انتقال کر گئے اُس پر علالت۔

۹۱۔ یہ انگریزی لفظ BUST (جسم کا بالائی حصہ) ہے، یعنی جسم کے بالائی حصے کا فوٹو۔

۹۲۔ مولوی ذکاءاللہ کے صاحب زادے اردو کے مشہور مترجم۔ (برنی)

۹۳۔　اکبر نے دو شادیاں کی۔ پہلی بیوی سے عابد حسین اور نفیر حسین پیدا ہوئے جن کا جوانی ہی میں انتقال ہوگیا۔ دوسری بیوی سے سید عشرت حسین اور ہاشم حسین ہوئے۔ ہاشم کا جوانی سے پہلے انتقال ہوگیا۔ عشرت حسین کی شادی خان بہادر سید احمد حسین رئیس پریاں واں کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ (نقی محمد خان خورجوی: عمر رفتہ، ادارہ علم وفن، کراچی، ۲۰۰۳ء)

سید عشرت حسین (م ۱۹۴۵ء) کیمبرج کے گریجویٹ تھے۔ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ پنشن کے کچھ ہی روز بعد وفات پا گئے (مولانا عبدالماجد دریابادی: معاصرین، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۴ء)

۹۴۔　ان مکاتیب میں جو کیفیات پائی جاتی ہیں وہ ''خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی''، ۱۹۵۳ء میں زیادہ شدت سے محسوس کی جاسکتی ہیں۔

۹۵۔　اخباری لغات بہ کلید اخبار بینی، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، اپریل 1915ء۔

۹۶۔　پہلے خط میں ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا تھا: ''میں اس عزت کا نہایت مشکور ہوں جو آپ مجھے دینا چاہتے ہیں مگر افسوس ہے کہ میں اسے قبول کرنے سے قاصر ہوں اور اس وجہ سے کہ مجھے اس قسم کی نام ونمود سے قطعی اجتناب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے معاف فرمادیں گے۔ تعجب ہے کہ اس واقعہ کو آپ کشیدگی تعلقات سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اس واقعہ سے پہلے میرے آپ سے کوئی تعلقات نہیں تھے اور میں نے اس موقع پر جو کچھ عرض کیا تھا اس میں اخلاقی اعتبار سے بالکل حق بجانب تھا اس کو آپ بخوبی سمجھتے تھے اور یقیناً اب بھی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اور معاملہ ہوتا یا اب ہو تو میں ہر طرح آپ کی مدد کے لیے حاضر ہوں۔ والسلام''۔ ۱۷/ اپریل ۱۵ء۔ (برنی)

۹۷۔　یہ واقعہ مکتوب الیہ کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' کے ص ۲۷۰۔۲۷۱ پر صراحت کے ساتھ تحریر ہے۔

۹۸۔　اخباری لغات بہ کلید اخبار بینی، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، اپریل 1915ء۔

۹۹۔　میں نے از راہ محبت وعقیدت انتساب پر اصرار کیا تھا۔ کتاب دیکھنے کے بعد وہ اس پر راضی ہوگئے تھے۔ (برنی)

۱۰۰۔　حافظ عبدالمنان ہمارے بچپن کے دوست ہیں۔ (برنی)

۱۰۱۔　عبدالباری ساقی مرحوم مغل لائن بمبئی میں پبلسٹی آفیسر تھے۔ (برنی)

۱۰۲۔　مولانا شوکت علی کے صاحب زادے اور ''خلافت'' بمبئی کے مدیر۔ (برنی)

۱۰۳۔　یہ حالت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک دونوں مملکتوں میں باہمی سمجھوتا نہیں ہوجاتا۔ اس وقت حالت یہ ہے ''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی''، یعنی یہاں کی کتابیں وہاں اور وہاں کی یہاں چھپ رہی ہیں۔ اگر کوئی کاپی رائٹ دے جائے تو شاید صورت حالات بہتر ہوجائے۔ (برنی)

جس امر قبیح کی جانب عزیز حسن بقائی نے توجہ دلائی ہے اس پر برنی کا قلم بار بار احتجاج کرتا رہا ہے۔ ان کے رسالے ''کتابی دنیا'' میں اس کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ کاپی رائٹ کے سلسلے میں برنی رسالہ ''ہم قلم'' میں اس موضوع پر ایک مقالہ بھی سپرد قلم کر چکے تھے۔

۱۰۴۔　خط پر روانگی کی مہر سے ۱۹۵۴ء کی ہے۔

۱۰۵۔　جہاں آرا بیگم، بنت شاہجہاں بادشاہ، پہلا ایڈیشن: ۱۹۲۱ء، دہلی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء، تعلیمی مرکز، ۵۰۱۔ گدول لکھراج روڈ، نزد پاکستان، کراچی ۱۔

۱۰۶۔　نیاز نے تاریخ بہ غیر مہینے اور سال کے لکھی ہے جب کہ خط کی مہر سے دیکھ کر تاریخ کو مکمل کیا گیا ہے۔

۱۰۷۔　'' آغا حشر پر بہتان'' برنی کا مضمون مہر نیم روز، کراچی میں ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا شائع تھا، ممکن ہے نگار کو بھی بھیجا گیا ہو۔

۱۰۸۔　برنی نے یہ حصہ حذف کر دیا تھا۔

۱۰۹۔　برنی کے پرانے دوست۔ دہلی کے رہنے والے۔ برنی نے علامہ نیاز فتح پوری اور محمد الدین خلقی کے تعلقات کے حوالے سے لکھا ہے ''وہ (خلقی) درحقیقت ''نگار'' کے معماروں میں سے تھے اور ان کی امداد واعانت کا واحد مقصد یہ تھا (جیسا کہ وہ خود مجھ سے کہا کرتے تھے) کہ نیاز کو آگے

بڑھایا جائے۔ بعد کو باہمی تعلقات میں قدرے تلخی آ گئی تھی۔'' (عظمتِ رفتہ، ص ۹۶)

۱۱۰۔　برنی نے یہ حصہ حذف کر دیا تھا۔

۱۱۱۔　یہ خط ان کے لیٹر پیڈ پر تاہم سن ندارد ہے۔

۱۱۲۔　جنوری ۱۹۲۶ء سے یہ کتاب بہ عنوان 'لارڈ رپن کا عہد حکومت'' قسط وار نگار میں شایع ہونا شروع ہوئی۔ برنی نے کتابی صورت میں مرتب کر لیا تھا تاہم شایع نہیں ہو سکی۔

۱۱۳۔　یہ خط جلیل قدوائی کی مرتبہ مکاتیب عبدالحق میں نہیں ہے۔

۱۱۴۔　علاء الدین خالد (بیٹا)۔

۱۱۵۔　فاطمۃ الکبریٰ (بہن)۔

۱۱۶۔　صلاح الدین (بیٹا)۔

۱۱۷۔　یہ اشارہ غالباً اس تنازع کی جانب ہے جس کا تذکرہ برنی نے اپنے خودنوشت حالات میں کیا ہے۔ جس کے باعث منشی عبدالقدیر کی اولاد نے برنی کو اخیر زمانے میں تنہا کر دیا تھا۔

۱۱۸۔　دیوان سنگھ مفتون کا اخبار کو وہ دہلی سے نکالا کرتے تھے۔

۱۱۹۔　منشی عبدالقدیر اور برنی کے چچازاد بھائی ولد کرم الٰہی۔

۱۲۰۔　برنی کی دوسری بیگم آمنہ بانو کے چھوٹے بھائی، ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، پی اینڈ ٹی، کراچی۔

اس خط کی بابت ریاض برنی صاحب سے معلوم کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ برنی صاحب پاکستان آ کر دوبارہ دہلی گئے تھے۔ پاکستان آ جانے کے بعد انھیں اپنی کتابوں کی خاص طور پر فکر تھی۔ بمبئی سے پانی کے جہاز کے ذریعے سامان لایا جا چکا تھا۔ دہلی میں بہت کچھ رہتا تھا۔ چناں چہ وہ اسی کی فکر میں دہلی گئے تھے۔ یہاں کسی ملازمت کے لیے غالباً درخواست دی تھی جس کے سلسلے میں محمد فتح الاسلام صاحب نے یہ خط لکھا تا کہ وہ جلد آ کر اس ملازمت کو اختیار کر لیں۔

۱۲۱۔　برنی کے بیٹے۔ امریکی سفارت خانہ، کراچی اور اسلام آباد میں رہے۔

۱۲۲۔　غالباً محمد فتح الاسلام ہی مراد ہے کیوں وہ بھی اس سلسلے میں متفکر تھے اور انھوں نے بھی انھی تاریخوں میں برنی کو دہلی خط لکھا تھا۔

۱۲۳۔　یہ خط برنی کو کراچی سے دہلی لکھا گیا تھا۔ یہ خط محمد فتح الاسلام کی جانب سے لکھے جانے والے خط کے تسلسل میں ہے۔ اس میں بھی اسی ممکنہ ملازمت کے حوالے سے لکھا گیا ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ وہ جلد کراچی پہنچے تا کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

# باب ہفتم

## ماہنامہ ''کتابی دنیا'' ایک جائزہ

☆۔ برصغیر میں اردو رسائل کی روایت
☆۔ کتابی دنیا کے ہم مزاج رسائل
☆۔ ''کتابی دنیا'' کراچی، کا اجراء
☆۔ رسالے کا ڈکلریشن:
☆۔ برنی بہ حیثیت مدیر رسائل
☆۔ مدیر رسالہ کا عجز وانکسار
☆۔ انسانی ہمدردی اور امداد کی فکر
☆۔ ادیبوں کی وفات
☆۔ خبریں
☆۔ مراسلات
☆۔ رسالوں پر طائرانہ نظر
☆۔ کتابی دنیا کا ''اقبال نمبر''
☆۔ مولانا محمد علی جوہر اور کتابی دنیا

☆۔ ''کتابی دنیا'' سے پیشتر کی صورت حال
☆۔ ''کتابی دنیا'' کا آغاز
☆۔ ''کتابی دنیا'' کے مقاصد
☆۔ رسالے میں رونما ہونے والی بعض تبدیلیاں
☆۔ مدیر رسالہ کی بے باکی
☆۔ اصلاح اور تعمیر کی فکر اور سعی:
☆۔ رسالے کے اداریے
☆۔ مضامین ومقالات
☆۔ اقتباسات
☆۔ زیر طبع کتابیں
☆۔ تبصرہ ء کتب
☆۔ علامہ اقبال اور کتابی دنیا
☆۔ مولوی عبدالحق اور کتابی دنیا

# باب ہفتم:

## ماہنامہ ''کتابی دنیا'' ایک جائزہ

ادبی دنیا میں، تخلیقی، تنقیدی، تاریخی اور تحقیقی حوالوں سے رسائل کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی رسائل عوام میں زبان وادب کی ترویج واشاعت اور ذہنی وفکری تربیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ عموماً ہر رسالہ اپنا علاحدہ مزاج اور منہاج رکھتا ہے، جس میں مدیر کے فکری رجحان کو محسوس کیا جاسکتا ہے، مدیر کے اسی فکری رجحان کے باعث رسالہ اپنی منفرد سمت اور رفتار متعین کرتا ہے۔ جو رسالے کسی خاص فکر کے ساتھ جنم لیتے ہیں اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہیں، ان رسالوں کا سفر جاری وساری رہتا ہے اور وہ تادیر پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایسے رسالوں رجحان ساز اور علمی وادبی روایتوں کا امین قرار دیا جاتا ہے۔

اداروں، انجمنوں یا تنظیموں کے نقیب یا ترجمان رسائل بھی خاص فکر یا نظریے کے پابند ہونے کے باوجود مدیر کے ذوق وشوق، رجحان اور رویے کے آئینہ داری کرتے نظر آتے ہیں۔

### برصغیر میں اردو رسائل کی روائت:

۱۹۳۶ء کے بعد ایک بڑی تعداد میں رسائل نے پاک وہند میں جنم لیا۔ یہ وہ رسائل ہیں جنھوں نے برصغیر پاک و ہند میں اُس روایت کو مستحکم کیا۔ اسی روایت کا تسلسل پاکستان وہندوستان کے قیام کے بعد دیکھا گیا۔

تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان وہند میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں چند معروف نام درج کیے جاتے ہیں:

علیم الدین احمد کی ادارت میں ''معاصر'' (پٹنہ ۱۹۳۷ء)، محی الدین قادری زور اور میر محمد علی کافت روزہ ''شیرازہ'' (لاہور۔۱۹۳۸ء)، قاضی عبدالغفار کا ''ہماری زبان'' (علی گڑھ۔۱۹۲۸ء)، سعید احمد اکبرالہ آبادی کا ''برہان'' (دہلی۔۱۹۳۹ء) ساغر نظامی کا ماہ نامہ ''ایشیا'' (بمبئی۔۱۹۳۹ء)، مولانا تاجور کا ''شاہکار'' (لاہور۔۱۹۴۰ء)، محمد صدیق کا ''ترقی'' (لکھنؤ۔۱۹۴۰ء) ہفت روزہ ''قندیل'' (لاہور۔۱۹۴۱ء)، ہندوستانی ادب (حیدرآباد دکن۔۱۹۴۱ء)، ''افکار'' (بھوپال، ۱۹۴۲ء) پندرہ روزہ ''آجکل'' (دہلی۔۱۹۴۲ء)، قابلِ ذکر ہیں۔ (تاریخ ادبیاتِ مسلمانان پاکستان و ہند، دسویں جلد ''اردو ادب'' پنجم، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، فروری ۱۹۷۲ء)

''کتابی دنیا'' بھی انھی رسائل میں سے ایک ہے جو انجمن ناشران و تاجران کتب کراچی کا نقیب و ترجمان بن کر کراچی کے ادبی افق پر نمودار ہوا۔ اگر چہ اس کا موضوع اور مقصد ناشران و تاجران کتب کے مسائل اور مشکلات کو زیر بحث لانا، ان کی کارکردگی اور کارگزاریوں کا سامنے لانا، ان کی اہمیت سے افراد معاشرہ کا آگاہ کرنا، انھیں متحد کرنا تھا تاہم ضیاء الدین احمد برنی نے اس کی اس ضرورت کو بھی پیش نظر رکھا اور اپنے ہم ذوق افراد کے لیے بھی اس کا رخ علم و ادب کی جانب بھی رکھا۔ ''کتابی دنیا'' کو نیم ادبی رسالہ کہا جاسکتا ہے۔ برنی کو مدیر بنائے جانے کی بہت سی وجوہات میں سے ایک یہ بھی ہوگی کہ برنی ادیب تھے اور ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ساری زندگی وہ ادب سے وابستہ رہے۔

## ''کتابی دنیا'' سے پیشتر کی صورت حال:

۱۹۴۷ء کے بعد کراچی کے ادبی افق پر نمودار ہونے والے رسالوں میں ماہنامہ عصمت (مدیر: رازق الخیری ۱۹۴۷)، ماہنامہ ماہ نو (مدیر: وقار عظیم اپریل ۱۹۴۸)، ماہنامہ ساقی (مدیر: شاہد احمد دہلوی، ستمبر ۱۹۴۸)، دو ماہی نیا دور (مدیر: جمیل جالبی ۱۹۴۹ء)، سہ ماہی اردو، (مدیر: مولوی عبدالحق، ۱۹۵۱ء)، ماہنامہ افکار (مدیر: صہبا لکھنوی، ۱۹۵۱ء)، ماہنامہ ادب (مدیر: کلیم شیرازی، رحیل آذری، اور انجم سلمانی، اپریل ۱۹۵۱)، سہ ماہی العلم (مدیر: الطاف حسین بریلوی، جولائی ۱۹۵۱ء)، ماہنامہ فاران (مدیر: مولانا ماہر القادری، ۱۹۵۳ء)، ماہنامہ عکس نو (مدیر: بیگم حسن زمانی عالم گیری، ۱۹۵۵ء) قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ رسالے ہیں جو ''کتابی دنیا'' کے اجراء سے پیشتر اپنی جداگانہ ساکھ قائم کر چکے تھے۔ یہ رسائل اگر چہ کتابی دنیا سے علیحدہ مزاج رکھتے تھے اور ان کے مقاصد بھی کسی قدر مختلف تھے تاہم جزوی طور پر بعض موضوعات میں یکسانیت بھی تھی۔ باوجود اس کے کہا جاسکتا ہے کہ ''کتابی دنیا'' میں ایک اچھوتا پن اور ایک جدت تھی۔ ایسے رسائل بھی میری نظر سے گزرے ہیں جو کتابی دنیا کے ہم مزاج تو تھے مگر ''کتابی دنیا'' نہیں تھے۔

## کتابی دنیا کے ہم مزاج رسائل:

''کتابی دنیا'' کے مزاج اور نام سے مطابقت رکھنے والے چند رسائل کی تفصیل پیش کی جارہی ہے جو یا تو کتابی دنیا سے پیشتر جاری ہوئے یا بعد میں۔

☆۔ ''ہماری کتابیں'' حیدر آباد دکن

انجمن ترقی اردو (ہند) حیدر آباد دکن کا آرگن ہے۔مدیر سید علی شبیر حاتمی ہیں۔پہلا شمارہ، جلد ۱ جون ۱۹۴۳ء میں شایع ہوا۔نقشِ اولین کے نام سے ''اداریہ'' لکھا گیا ہے۔اداریے کے الفاظ یہ ہیں:

آج کتب خانہ ان نیک ارادوں کے ساتھ اپنا ایک ماہ وار ترجمان آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔جس کا مقصدِ اولیں یہی ہے کہ زبان اردو کی ترویج و اشاعت اور عوام میں صحیح ذوقِ مطالعہ پیدا کرے ہر ممکنہ جدو جہد کی جائے۔پس اس ترجمان اردو اور پیامبر ادب کو زیادہ دل کش و مفید بنانے کے لیے اس کی ترتیب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔۱۔ تبصرہ: اس ضمن میں جدید مطبوعات پر بے لاگ اور غیر جانب دارانہ اظہارِ خیال کیا جائے۔۲۔تذکرہ: اس میں محسنینِ اردو کی علمی و ادبی خدمات اور ان کے زریں کارناموں پر روشنی ڈالی جائے گی۔۳۔تکملہ: اس کے ذیل میں ان کتب کی فہرست ہوگی جو اس ماہ کے آخر تک گشتی کتب خانہ میں شامل کی جائیں گی۔۴۔تعارف: ان جدید مطبوعات سے کرایا جائے گا جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ ریز ہوتی رہیں گی۔۵۔مقالات: ملک کے ممتاز اہلِ قلم حضرات اور نام ور انشا پردازوں سے مفید عنوانات پر بیش قیمت اور معلومات افزا مضامین لکھوائے جائیں گے تاکہ ادبی ذوق کو معیاری بنایا جاسکے۔(۱)

☆۔ ماہ نامہ ''کتاب''، لاہور

پہلا شمارہ قیوم نظر کی ادارت میں شایع ہوا۔مدیر مسئول ایم ظہیر الدین ہیں۔اردو بک اسٹال، بیرون لوہاری دروازہ، لاہور سے ۱۹۴۲ء میں جاری ہوا۔''اردو زبان کی اور اچھی کتابوں کا تعارف'' جس کا نصب العین تھا۔

سردار پور جھنڈیر، میلسی، بہاولپور کی لائبریری میں جولائی ۱۹۴۸ کا پرچہ دیکھا تھا۔جس سے ظاہر ہوا کہ اس کا بھی بنیادی مقصد قاری کو نئی کتابوں سے آشنا کرنا اور علم و ادب کو فروغ دینا تھا۔

☆۔ ماہ نامہ ''کتاب'' لاہور

اس کے مرتب عبدالسلام خورشید ہیں۔کتاب منزل، لاہور سے دسمبر ۱۹۵۰ء میں جاری ہوا۔اس کا موضوع بھی کتاب تھا۔اس میں مضامین، شاعری، کتابوں پر تبصرے، نئی کتابوں کا تعارف اور فہرستیں شایع ہوا کرتی تھیں۔سردار پور جھنڈیر لائبریری میں اس کا پہلا شمارہ نظر سے گزرا تو مندرجہ بالا کوائف نوٹ کیے۔

☆۔ ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ

اس رسالے کے مدیر سید جمیل احمد ہیں۔ماہنامہ کتاب چوک، لکھنؤ سے شایع ہوا۔کتاب نما، دہلی، دسمبر ۱۹۶۲ء کے

شمارے میں مذکورہ پرچے پر تبصرہ شایع ہوا تھا جس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۶۲ء کے کسی مہینے میں ''کتاب'' کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ اس کی مجلسِ مشاورت میں حیات اللہ انصاری، احتشام حسین اور جاوید سہیل کے نام ہیں۔ جس شمارے کا مطالعہ سردار پور جھنڈیر لائبریری میں کیا تھا، اس میں مختلف اداروں کی زیرِ طبع کتابوں کی اطلاع کے علاوہ چار مختصر افسانے، چھے مختلف مضامین، چار غزلیں تین نظمیں، ادبی ثقافتی خبریں شایع ہوئی ہیں۔

☆۔ ماہ نامہ ''کتاب'' لاہور

اس کے نگراں ابن انشا اور مدیر سید قاسم محمود ہیں۔ قومی کتاب مرکز پاکستان کا ترجمان۔ اس کا پہلا شمارہ ستمبر ۶۲ء میں شایع ہوا۔ اخبار و افکار کے عنوان سے خبریں شایع ہوئی ہیں۔ انداز تعلیمی و ادبی ہے۔ رہنمائے کتاب کے عنوان سے کتابوں اور رسالوں کے خاص نمبروں پر تبصرے شایع ہوتے رہے ہیں۔

☆۔ ''کتاب نما'' دہلی

اس رسالے کے نگراں غلام ربانی تاباں ہیں۔ مکتبہء جامعہ لمیٹڈ، دہلی کا ترجمان ہے۔ شمارہ اپریل ۱۹۶۱ء کے مشمولات اس طرح ہیں: اداریہ، نئی مطبوعات کی فہرست، زیرِ طبع کتابوں کے جائزے، ادبی خبریں، کسی شاعر یا ادیب کا مختصر تعارف انتخابِ کلام۔ اس رسالے کا مقصد بھی علم و ادب اور خاص کتابی دنیا سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔ یہ رسالہ اب بھی جاری ہے۔

☆۔ ماہ نامہ ''اردو بک ریویو'' دہلی

اس رسالے کے مدیر محمد عارف اقبال اور مدیر معاون ارشد سراج الدین ہیں۔ دریا گنج نئی دہلی سے شایع ہوتا ہے۔ ۱۹۹۶ سے تا حال جاری ہے۔ اس کا موضوع بھی کتاب ہے۔ نئی کتابوں کا تعارف کروایا جاتا ہے۔ مضامین بھی شایع ہوتے ہیں۔ اردو میں ہونے والے اہم علمی ادبی کاموں کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اہل علم حضرات کے انتقال کی خبریں اور مضامین شایع ہوتے ہیں علمی ادبی خبریں بھی شایع ہوتی ہیں۔ مکتبوں کی کتابوں کی فہرستیں تعارف کے طور پر شایع ہوتی ہیں۔ یہ رسالہ جامعات میں ہونے والی تحقیقی سرگرمیوں سے بھی آگاہ کرتا ہے۔

☆۔ ماہ نامہ ''کتابی دنیا'' لکھنؤ

اس رسالے سے متعلق تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔ کتابی دنیا کراچی میں اس ذکر آیا ہے۔ برنی نے اس کی زیرِ طبع مطبوعات کی فہرست شایع کی تھی۔

## ''کتابی دنیا''، کراچی، کا آغاز:

ماہ نامہ ''کتابی دنیا'' پر براہ راست لکھنے سے پیشتر اس کے آغاز پر روشنی ڈالی جاتی ہے تا کہ یہ بات ہمارے سامنے آجائے کہ کن حالات میں اور کن مقاصد کے تحت اور کن عزائم نے اس اجراء کی صورت اختیار کی۔

۱۹۳۷ء میں علاء الدین خالد یعنی ضیاء الدین احمد برنی کے بھتیجے جنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے تعلیم حاصل

کی تھی ان کا تعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے بہ حیثیت معلم ہوگیا۔ ایک سال معلمی کے فرائض انجام دینے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے انھیں مکتبہء جامعہ ملیہ کی ذمے داریاں سونپ دیں۔ اُس زمانے میں مکتبہ سے رسالہ ''کتاب نما'' شایع ہوا کرتا تھا۔(۲)

یہ رسالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو کا پہلا رسالہ تھا۔ اس کی ادارت محمد یوسف جامعی کے سپرد تھی۔ جنگ کا زمانہ تھا چناں چہ بعض دشواریوں کے باعث ''کتاب نما'' بند کردیا گیا۔ اسی زمانے میں حالی پبلی شنگ ہاؤس، دہلی نے ''کتابی دنیا'' کے نام سے اسی موضوع پر ایک رسالہ جاری کردیا۔ ۱۹۴۴ء میں انتظامی اختلاف کی بنا پر علاء الدین خالد نے مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ چھوڑ دیا اور حالی پبلی شنگ ہاؤس، دہلی کے تمام حصص خرید لیے۔ کتابی دنیا بہ دستور جاری رہا تا آں کہ برصغیر کو آزادی حاصل ہوئی اور دنیا کے نقشے پر پاکستان اور ہندوستان دو علاحدہ مملکتیں وجود میں آگئیں۔ حالی پبلی شنگ ہاؤس، دہلی نیلام کردیا گیا۔(۳)

علاء الدین خالد کراچی منتقل ہوگئے۔ یہاں انھوں نے اردو اکیڈمی سندھ کے نام سے طباعت واشاعت کا ادارہ قائم کیا۔ اسی زمانے میں ضیاء الدین احمد برنی نے بھی ''تعلیمی مرکز'' کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی جس کے تحت انھوں نے اپنی مطبوعات کو زیور طباعت سے آراستہ کیا۔

## ''کتابی دنیا'' کراچی، کا اجراء:

جنوری ۱۹۵۱ء میں کراچی شہر کے ناشران و تاجرانِ کتب نے اپنے مسائل کی تفہیم اور تحلیل کے لیے باہمی ربط و تعلق سے ایک انجمن ''انجمنِ ناشران و تاجرانِ کتب، کراچی'' قائم کی۔ اس انجمن کے بنیادی ارکان میں ضیاء الدین احمد برنی، علاء الدین خالد، حافظ وصی اشرف، سراج الدین ظفر، رازق الخیری، ارشاد احمد اور کرمانی کے نام لیے جاتے ہیں۔(۴)

علاء الدین خالد اس کے اجراء اور برنی کی مساعی بے بدل کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

جب فضا میں ٹھہراؤ پیدا ہوا تو ''کتابی دنیا'' کا دوبارہ اجراء کراچی سے ہوا۔ اس کے مدیرِ اعلیٰ ضیاء الدین احمد برنی صاحب مرحوم ہوئے تھے۔ ادارہء تحریر میں ادریس صدیقی صاحب، سراج الدین ظفر صاحب، رازق الخیری صاحب اور راقم تھے۔ ''کتابی دنیا'' کا پہلا پرچہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ قبلہ برنی صاحب کو یا اردو اکیڈمی سندھ کو اس پرچہ سے کوئی مالی منفعت نہیں تھی۔ اس کا مالی نقصان ہمارے ذمہ تھا اور باقی سارا کام برنی صاحب اعزازی طور پر کیا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے چند سال بعد یہ پرچہ بند کردیا گیا۔

میں برنی صاحب کا بھتیجا ہوں مگر کسی لحاظ سے بھی ان کا نعم البدل نہیں ہوسکتا انھوں نے نامساعد حالات میں اس رسالے کو زندہ رکھا اور باقاعدگی سے شائع کرتے رہے۔(۵)

## ''کتابی دنیا'' کے مقاصد:

''کتابی دنیا'' کے پہلے شمارے، دسمبر ۱۹۵۵ء کے اداریے میں اس کے مقاصد کا تعین ان الفاظ میں کیا گیا:

> انجمن ناشران و تاجران کتب کراچی کو قائم ہوئے تقریباً چار سال ہوئے ہیں۔ اس اثنا میں اسے متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ان کے باوجود وہ مختلف طریقوں سے اپنے ممبروں کی تھوڑی بہت خدمت کرتی رہی۔ اب انجمن نے نیا قدم اٹھایا ہے اور ''کتابی دنیا'' کے نام سے ایک ماہ نامہ رسالہ کی اشاعت کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ یہ رسالہ ہمارے تمام مسائل کا آئینہ دار ہوگا اور حکومت کے سامنے ناشران و تاجران کتب کی مشکلات کو پیش کریگا۔ یہ رسالہ شخص واحد کی آواز نہیں ہے بلکہ ان تمام اشخاص کی آواز ہے جو یا تو ناشر ہیں یا تاجر۔
>
> یہ رسالہ انفرادی پروپیگنڈے کے لیے جاری نہیں کیا گیا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ جماعتی بھی نہیں ہے بلکہ نشر و اشاعت اور کتب فروشی کے مقصد جلیلہ کا علم بردار ہے۔ اس میں اس فن کو ترقی دینے کی اسکیموں پر بھی غور کیا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ مغربی ممالک میں اس فن نے کتنی ترقی کی ہے۔ جلد سازی، بچوں کے لٹریچر وغیرہ موضوعات پر بھی اس میں وقتاً فوقتاً مضامین درج ہوں گے۔ (۶)

ان مقاصد کی آئندہ شماروں میں بھی تجدید کی گئی ہے۔ بعد کے شماروں کے ملاحظے اور مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جیسے جیسے رسالہ ترقی کرتا گیا ویسے ویسے رسالے کے مقاصد میں کسی قدر تبدیلی بھی آئی یعنی اس کے اصل اور بنیادی مقاصد جن کا ذکر مذکورہ الفاظ میں کیا گیا ہے کے علاوہ علم و ادب کی ترویج و اشاعت کو اس کے مقاصد میں خاموشی سے شامل کر دیا گیا اور یہ یقیناً برنی ہی کے مزاج کے سبب ہوا ہوگا۔ آخر آخر تو اس کا مزاج اور منہاج علمی و ادبی ہو گیا تھا۔

فرور ۱۹۵۶ء کے شمارے میں الیاس احمد مجیبی نے اپنے ایک مراسلے کے ذریعے بھی برنی کی توجہ اس جانب دلائی تھی۔ انھوں نے لکھا تھا ''کچھ ایسی علمی، ادبی دل چسپیاں اور کارآمد معلومات آپ یقیناً فراہم کر سکتے ہیں جن سے ہم ایسے استفادہ کریں۔'' (۷)

علاء الدین خالد ایک عرصے بعد بھی کتابی دنیا کے بنیادی مقصد سے غافل نہیں ہوئے انھوں نے ستمبر ۱۹۸۹ء کے کتابی دنیا میں اس کا اظہار اس طرح کیا:

> اردو ادب کے فروغ میں کتابی دنیا کا کردار منفرد رہا ہے ہم یقین کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ ہم اس رسالے کی غرض و غایت اور اس کی پالیسی یعنی کتاب اور علم کے فروغ میں بھر پور حصہ لیں گے۔ اور دیانت داری کا دامن نہ چھوڑیں گے۔ (۸)

## رسالے کا ڈکلریشن:

''کتابی دنیا'' کے پہلے شمارے ہی میں برنی نے ''اظہارِ تشکر'' کے عنوان سے جہاں رسالے کے ڈکلریشن سے متعلق لکھا ہے وہاں اس سلسلے میں پیش آنے والی دشواریوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ کتابی دنیا کو ڈکلریشن جلد اور آسانی سے مل گیا تھا، اس سلسلے میں انھوں نے دو شخصیات کا شکریہ ادا کیا ہے، مسٹر نذر محمد صاحب فاروقی، اے۔ڈی۔ایم اور پریس برانچ کے انچارج مسٹر فضل محمد خان صاحب کا۔ رسالے کو جو رجسٹرڈ نمبر دیا گیا وہ تھا۔ S-1975۔

## ''کتابی دنیا'' کا پہلا پرچہ:

پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۵۵ء میں جاری ہوا۔ رسالے پر برنی کے گھر کا پتا ۵۰۱ گیدو مل لیکھراج روڈ، کراچی۔۱، درج ہے۔ ناشر اور طابع کے طور پر ضیاء الدین احمد برنی ہی کا نام ہے اور مطبع فیروز سنز ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۵ ہے۔ قیمت فی پرچہ ایک آنہ اور سالانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔ ''کتابی دنیا'' کے الفاظ برنی کے چھوٹے بھائی محمد یوسف دہلوی کی خوش نویسی کا نمونہ ہیں۔ تمام رسالہ ٹائپ میں ہوتا تھا۔ اندرونی صفحات پر بعض عنوانات بھی محمد یوسف دہلوی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں جیسے اداریہ، نوٹ، اشتہارات، خبریں، تبصرے، زیر طبع کتابیں وغیرہ۔

پہلے شمارے میں فہرست نہیں ہے۔ ''پہلے صفحے کی زینت ہے۔ مضمون صرف ایک ہے۔ ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' سید یوسف بخاری کا۔ علاوہ ازیں ''نوٹ'' عنوان کے تحت بعض مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ''ادیبوں کی وفات'' کے تحت منٹو، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر سید سجاد، ڈاکٹر ناظم، بے خود دہلوی، حسن نظامی، اختر جونا گڑھی اور پنڈت کیفی کے انتقال پر ایڈیٹر کی جانب سے اظہار افسوس کیا گیا ہے۔ برنی نے اپنی یادداشتوں سے ان شخصیات کی خدمات کو اجاگر کر کے ان سے اپنی محبت اور خلوص کا اظہار کیا ہے۔

''خبریں'' عنوان کے تحت علمی ادبی خبریں دی گئی ہیں۔ جیسے: کتابوں کی سالانہ نمائش، ریڈرس ڈائجسٹ کا اردو ایڈیشن، علامہ اقبال کا مسودہ، دارالترجمہ کو آگ لگ گئی، حسرت کے بال بچوں کے لیے گزارہ، روس میں پریم چند کی برسی، درسی کتب فروشوں کی توجہ کے لیے اور حضرت جوش کے بارے میں وغیرہ۔

اس پرچے میں ایڈیٹر کی جانب سے ہندوستان و پاکستان کے ناشران و تاجران کتب کی خدمت میں گزارش کی گئی ہے کہ وہ اس پرچے کو پڑھیں اور واقفیت حاصل کریں کہ ناشران و تاجران کیا کیا منصوبے بنا رہے ہیں اور کیا کیا منصوبے رکھتے ہیں۔ اگر ان کے بھی کوئی منصوبے ہیں تو وہ ان کا اظہار کریں۔ اس طرح دونوں ملکوں کے ناشران و تاجران نزدیک آئیں گے اور تعلقات ہموار ہوں گے۔

پہلے ہی شمارے میں سید یوسف بخاری، آفس سیکریٹری، کے ایک مضمون سے یہ صورت حال سامنے آتی ہے کہ جوں جوں ''انجمنِ ناشران و تاجرانِ کتب'' کے ارکان میں اضافہ ہوتا گیا۔ توں توں اختلافِ آرا کا دامن بھی وسعت اختیار کرتا چلا گیا جو بالآخر انتشار و پراگندگی پر منتج ہوا۔ اُس صورتِ حال کو سید یوسف بخاری، نے بڑی دل چسپ تصویر کھینچی ہے:

خود ستائی، خود غرضی، بے ضابطگی، بے آئینی، ذاتی چشمک، اور حربے جماعت کے نظم

،اتحاد، وقار اور مفاد کے لیے قاتل ہیں۔ درمیانی سالوں میں ان ٹھوکوں سے انجمن کو زبردست نقصان پہنچا۔ ڈھول پھٹ گیا ڈفلیاں بن گئیں۔ انجمن کی آواز صدا بہ صحرا ہوگئی۔ اب کاروان صحرا میں ہے۔ صدائے کارواں اب بھی آرہی ہے لیکن اہلِ کارواں مضمحل اور سالارانِ کارواں مجنوں نظر آتے ہیں۔ (۹)

رسالے کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ باوجود اس صورت حال کے انجمن کسی نہ کسی طور کام کرتی رہی اور رسالہ اسی انجمن کا نقیب بن کر اپنی خدمات انجام دیتا رہا۔ (۱۰)

## رسالے میں رونما ہونے والی بعض تبدیلیاں:

رسالے کے اجراء کے تیسرے ماہ یعنی فروری ۱۹۵۶ سے رسالے کے سرورق پر ''انجمن ناشران و تاجران کتب کراچی کا نقیب'' کے الفاظ درج کیے جانے لگے۔ اس کے علاوہ ادارہ تحریر کا اضافہ بھی کیا گیا۔ ادارہ تحریر میں یہ لوگ شامل تھے:

۱۔　سراج الدین ظفر

۲۔　رازق الخیری

۳۔　علاء الدین خالد

شمارہ اجنوری ۱۹۵۹ء سے ''انجمن ناشران و تاجران کتب کا نقیب'' کا عنوان ختم کر دیا گیا اور نیا عنوان ''پبلشرز و بک سیلرز آف پاکستان کا واحد نمائندہ رسالہ'' کا عنوان لکھ دیا گیا۔ (۱۱)۔ رسالے میں فروری ۱۹۵۹ء سے ایک اور تبدیلی رونما ہوئی رسالے کے سرورق پر ''پبلشرز و بک سیلرز آف پاکستان کا واحد نمائندہ رسالہ'' رسالے کی لوح ''کتابی دنیا'' سے اوپر اور نیچے ''رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان'' بھی لکھا جانے لگا۔

جولائی ۱۹۶۱ء سے عنوان ''پبلشرز و بک سیلرز آف پاکستان کا واحد نمائندہ رسالہ'' اور ''رکن انجمن ادبی رسائل پاکستان'' بھی خارج ہوگیا اور انگریزی میں صرف KITABI DUNYA,KARACHI لکھا گیا۔ ان تبدیلیوں کی وجہ کہیں بھی تحریر نہیں ہوئی۔ غالباً اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر سید یوسف بخاری اپنے مضمون میں کر چکے ہیں۔

''اِدھر اُدھر سے'' کے عنوان سے کتابوں سے اہم، حیرت انگیز یا خوش گوار باتیں نقل کی جاتی تھیں۔ یہ عنوان مستقل نہیں رہا۔ فروری ۱۹۶۶ء کے شمارے میں احادیث نقل کی ہیں اور آبِ حیات سے واقعات نقل کیے ہیں۔

بعض تبدیلیاں اندرونی موضوعات میں بھی آتی ہیں جن کا آگے ذکر آئے گا۔

شمارہ نومبر ۱۹۵۹ء سے ''کچھ اپنے بارے میں'' کے عنوان سے برنی نے رسالے کے چار سال مکمل ہونے پر تعاون کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ رسالے کے سالانہ چندے سے متعلق اپنی گزارشات پیش کی ہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جو رسالے کو جاری رکھنے والی ہیں۔ برنی اس سلسلے میں بہت محنت کیا کرتے تھے۔

## برنی بہ حیثیت مدیر رسائل:

برنی کی صحافتی خدمات کے حوالے سے گزشتہ اوراق میں تفصیل آ چکی ہے۔ اخبارات و رسائل سے دل چسپی انھیں ورثے میں ملی تھی۔ اپنے شوق کا آغاز انھوں نے مولانا ظفر علی خاں کے اخبار کے ادارتی عملے میں کچھ عرصے کام کر کے کیا اس کے بعد کوئی پندرہ ماہ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "ہمدرد" کے پہلے دور میں خدمات انجام دیں۔

جب انھیں کانپور کے "تھیوسوفیکل ہائی" میں بہ طور مدرس ملازمت مل گئی تو انھوں نے وہاں اپنے شوق کا مظاہرہ کیا اور وہاں انھوں نے اسکول کے ایک رسالے کو ترتیب دیا جس کی تفصیل گزشتہ اوراق میں آ چکی ہے۔

۱۹۱۸ء میں برنی کانپور سے بمبئی بہ غرض ملازمت منتقل ہو گئے تھے ان کی زندگی کا طویل عرصہ بمبئی میں گزرا۔ وہاں اسکول کی ملازمت کے علاوہ اپنے ادبی اور صحافتی مشاغل کی تکمیل بھی۔

قیام بمبئی ہی میں انھوں نے عبدالباری ساقی (م ۱۱ر اپریل ۱۹۶۴ء) (۱۲) کی معیت میں ایک مجلّہ "فردوس" نکالا تھا۔ برنی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> دوران جنگ میں انھوں نے راقم الحروف کی معیت میں ایک ادبی مجلّہ "فردوس" فوجی سپاہیوں کے پڑھنے کے لیے نکالا تھا۔ لیکن ابھی ایک ہی نمبر شائع ہوا تھا کہ جنگ کے ختم ہونے کے آثار ظاہر ہو گئے اور رسالہ بند ہو گیا۔ (۱۳)

اس سلسلے میں تفصیل معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ برنی کا بمبئی میں ورود جولائی ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ برنی کے مذکورہ بیان میں جس جنگ کا تذکرہ ہے غالباً وہ اشارہ پہلی جنگ عظیم کی جانب ہے جو ۲۸ جون ۱۹۱۴ء سے شروع ہو کر ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو ختم ہو گئی۔ یقیناً جولائی ۱۹۱۸ء کے بعد اور نومبر سے پہلے کا کوئی مہینہ ہے جس میں انھوں نے مذکورہ رسالہ جاری کیا جس کا ایک ہی شمارہ نکل سکا۔

برنی کے بیٹے ریاض احمد برنی صاحب کا خیال ہے کہ بمبئی ہی سے برنی نے ایک اور رسالہ "فانوس" بھی نکالا تھا۔ ان کے اس بیان کی تصدیق برنی کے ایک خط سے کسی قدر ہوتی ہے۔

جنوری ۱۹۵۴ء میں برنی نے اپنے کسی دوست کو (جس کا نام خط پر درج نہیں ہے) لکھا تھا، وہ خط جس لیٹر پیڈ پر ہے اس کی عبارت اس طرح:

**THE FANUS**

**AN ILLUSTRATED URDU MAGZINE DEVOTED**

**TO LIGHT LITERATURE**

**GOOLSAH MAHAL**

**55-B,Lady Jamshedji, Road, Mahim Bombay**

ریاض صاحب کا کہنا ہے کہ اس پر پتا ان کے گھر ہی کا ہے جس میں وہ ۱۹۴۷ء تک رہے تھے۔ برنی نے بمبئی کے مشہور انگریزی اخبار بمبئی کرانیکل (Bombay Chronicale) میں اردو کتابوں اور رسالوں پر ۱۹۴۷ء تک تبصرے تحریر کیے۔

یہ وہ پس منظر ہے جس سے برنی کی ادبی اور صحافتی کی خدمات اور تجربات پتا چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ''کتابی دنیا'' کی ذمے داریاں برنی کے سپرد کی گئیں تو انھوں نے نہایت احسن طریق سے انھیں نبھایا۔

برنی نے کتابی دنیا کی ادارت دسمبر ۱۹۵۵ء سے اپنے انتقال ۲۸ مئی ۱۹۶۹ء تک کی۔ انھوں نے اس کی اشاعت اور ترقی میں جس شوق، محنت اور جستجو کا مظاہرہ کیا اس اصل شہادت تو خود ''کتابی دنیا'' ہے جو بہ غیر کسی تعطل کے ۱۹۶۹ء تک جاری رہا، علاوہ ازیں اس میں شایع ہونے والے خطوط اور بعض غیر مطبوعہ خطوط بھی شاہد ہیں۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ کتابی دنیا کا اصل مقصد تو کتاب اور کتابی دنیا کی خبر رکھنا اور خبر دینا ہی تھا تاہم برنی نے اپنے مزاج اور شوق کے باعث اس کا رخ ادبی اور علمی بھی رکھا اور اسے محض کتابوں کی تشہیر یا فہرستِ کتب کی اشاعت کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

جس زمانے سے یہ انجمن ناشران و تاجران کتب کا آرگن نہیں رہا اس کے بعد سے اس میں ادبی اور علمی مضامین کی اشاعت زیادہ ہونے لگی۔ کبھی کبھی شاعری سے بھی اس کو زینت بخشی جاتی تھی اور کبھی کبھی حیرت انگیز یا عجیب یا پر لطف یا معلومات افزا واقعات سے یا کبھی لطائف سے اس میں مختلف ذائقہ پیدا کر دیا جاتا تھا اور یہ کام برنی ہی کیا کرتے تھے۔

## مدیر رسالہ کی بے باکی:

بہ حیثیت مدیر برنی کی بے خوفی اور بے باکی بھی مثالی ہے۔ درحقیقت مدیر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ گزشتہ اوراق میں کتنی ہی مثالیں ایسی آ گئی ہیں جس سے برنی کی بے خوف حق گوئی ظاہر ہو چکی ہے۔ اسے ان کی انصاف پسندی پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔

کتابی دنیا میں بھی ایسی مثالیں جا بہ جا مل جاتی ہیں جن میں برنی ایک بے باک، نڈر، مخلص، ہمدرد، انصاف پسند اور مددگار کے طور پر نظر آتے ہیں۔

برنی کے نام ایک میں برنی کے رویے کی تعریف کی گئی ہے۔ یہ خط کتابی دنیا مئی ۱۹۶۷ء میں شایع ہوا ہے۔ ہری پور ہزارہ سے محمد اسحاق بی اے کا مراسلہ ملاحظہ فرمایئے:

> سچ تو یہ ہے کہ آپ کا ماہنامہ اور خصوصاً آپ کا ''خاص نمبر'' ماہ جنوری، فروری ۱۹۶۷ء قابل صد ستائش ہے۔ آپ کا قومی احساس اور تعلیم کو صحیح راستے پر لانے کا عزم بالجزم جس بے باک طریق سے آپ کے اداریہ اور دوسرے مضامین میں نظر آتا ہے مشکل ہی ہے کسی اور رسالے میں نظر سے گزرا ہو۔ آپ کا ماہنامہ ''کتابی دنیا'' اسم بامسمیٰ ہے۔ کلاسیکی ادب اور تحقیق میں آپ کا ماہ نامہ پیش پیش ہے۔

**مدیر رسالہ کا عجز وانکسار:**

اس بات کا سبھی نے اعتراف کیا ہے کہ کتابی دنیا برنی ہی کی کوششوں سے نکلتا رہا۔اس میں سب سے زیادہ محنت انھی کی تھی۔باوجود اس امر کے انھوں نے کبھی اپنا احسان نہیں جتایا بلکہ یہی کہتے رہے کہ یہ کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں۔

انھوں نے رسالے میں ایسے خطوط بھی شایع کیے ہیں جن میں اُن کے تسامحات کی نشان دہی کی گئی مگر برنی نے ان کی اشاعت میں کسی قسم کا تامل نہیں کیا۔

برنی کے نام خطوط میں ایسے بہت سے خطوط ہیں جن میں ان کی مدیرانہ کارکردگی کی تعریف کی گئی ہے مگر برنی نے ایسے خطوط کی اشاعت سے اجتناب کیا یقیناً وہ اپنی تعریف کو منظر عام پر لانے کے قائل نہیں تھے۔کہا جا سکتا ہے کہ انھیں شہرت پسند نہیں تھی۔یہ ان کا عجز وانکسار ہی تھا۔

**اصلاح اور تعمیر کی فکر اور سعی:**

رسالے میں ایسے خیالات بکھرے ہوئے ہیں جن میں برنی افراد،معاشرہ اور کتاب کی اصلاح کی فکر کرتے نظر آتے ہیں۔کتابی دنیا کے دوسرے ہی شمارے کے اداریے کا عنوان ''فحش نویسی کے خلاف جہاد'' تھا جس کے توسط سے وہ نہایت بے باکی سے قارئین کو یہ پیغام دیتے نظر آتے ہیں:

> آزادی کے بعد سے ہمارے کردار میں جو ''گراوٹ'' ہوئی ہے اس کی ایک شکل یہ ہے کہ ہماری تحریر وتقریر میں فواحشات کو نمایاں مقام حاصل ہوگیا ہے۔پاکستان جس نازک دور سے گزر رہا ہے اس کا تقاضا ہے کہ اسے ایسے عناصر سے پاک کیا جائے جو آبادی کے ایک حصے کے خیالات کو زنگ آلود کرتے ہیں۔جنسی معاملات پر آپ لکھیں اور ضرور لکھیں لیکن طریقہء تحریر ایسا ہونا چاہیے جو ہر قسم کے اشتعال سے پاک ہو۔جنسی ترغیبات کو خواہ مخواہ اکسانا یا ابھارنا کوئی ادبی خدمت نہیں کہلائی جا سکتی۔
>
> ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ناشر اس قسم کے غیر صحت بخش عناصر کو جن کی وجہ سے ملک کے ایک مخصوص طبقے کو گھن لگ جائے،دور رکھنے کی سعی بلیغ کریں گے۔(۱۴)

مولانا محمد علی جوہر کی برسی کی اطلاع دیتے ہوئے وہ اپنے ملی اور قومی جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں اور ان خواہشات کا بھی جو ملک وملت کے لیے ہر لحاظ سے سود مند ہوں:

> ملک میں چار جنوری کو مولانا محمد علی جوہر کی برسی منائی جا رہی ہے۔خدا کرے کہ یہ برسی ایسے طریقے سے منائی جائے کہ جس ان کی تعلیم ہماری نئی پود کے دل و دماغ میں سرایت کر جائے۔آج کو اگر وہ زندہ ہوتے اور ہمارا یہ معاشرہ دیکھتے تو یقیناً اس کے خلاف بھی پورا

حکومت پاکستان نے اپنے بجٹ میں مصنفین ،شعرا وغیر کے متوسلین کے لیے ایک امدادی فنڈ قائم کیا ہے۔لیکن ہمیں ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا کہ کن کن کے اہل وعیال کو اس فنڈ میں سے مدد دی جارہی ہے۔پچھلے ڈیڑھ سال میں ہم متعدد دفعہ حکومت کی توجہ مصنفین ،شعرا ،ادبا کے اہل وعیال کی امداد کی جانب مبذول کرا چکے ہیں اور اس موقع پر ہم ان کے نام اس لیے دینا نہیں چاہتے کہ پہلے یہ معلوم کرلیں کہ خود حکومت نے اپنے وسیع معلومات سے کام لے کر کن کن اصحاب کے خاندانوں کو نوازا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ حکومت پبلک کو اعتماد میں لے کر ان کے نام اور امدادی رقوم کی مقدار ظاہر کردے گی۔اگست ۵۷ء کے کتابی دنیا میں برنی ''نوٹ''عنوان کے تحت حکومت پاکستان کی جانب سے اس وقت جتنی امداد دے چکی تھی اس کی ایک فہرست شایع کی ہے۔

برنی کی اس مسلسل کوشش سے ان کے اخلاص کا درست اندازہ لگالینا مشکل نہیں رہتا۔جو کام کسی ادارے کا ہوا کرتا ہے وہ برنی اکیلے اپنی کوشش سے کرتے رہے ہیں۔

## رسالے کے اداریے:

اردو رسائل کی یہ بھی ایک روایت رہی ہے کہ ان کا آغاز ''اداریہ'' سے ہوتا ہے کتابی دنیا میں بھی اس روایت کی پاس داری کی گئی اور پہلے شمارے میں ''اداریہ'' کو عنوان بنایا گیا اور اُس میں رسالے کے مقاصد اور عزائم کی ذکر کیا گیا۔یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

ابتداء میں جو اداریے لکھے گئے ان کے باقاعدہ عنوان ہوتے تھے۔جیسے:

جنوری۱۹۵۶ء　''فحش نویسی کے خلاف جہاد''

فروری۵۶ء　''حضرت جوش کی آمد''

مارچ۵۶ء　''بچوں کا لٹریچر''

اپریل۵۶ء　''جمہوریہ اسلامیہ پاکستان کا قیام''

مئی۵۶ء ''پاکستان میں تعلیم بالغان کی ضرورت اور اہمیت''

جون۵۶ء　''ہمارا پنج سالہ منصوبہ''

جولائی۵۶ء　''ہمارے نئے میئر اور ڈپٹی میئر''

اگست۵۶ء　''رسالوں کی مشکلات''

اکتوبر۵۶ء　''لونگ بایوگرافیز آف ریلیجس لیڈرز''

نومبر۵۶ء　''اظہار تشکر و اظہار شکایت''

دسمبر۵۶ء ''لیاقت نیشنل لائبریری''

یہ ایک سال کے اداریوں کے عنوانات مثالاً دیے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی پر اداریہ نگار کا نام نہیں تاہم اردو رسائل کی اس روایت کے پیشِ نظر کہ اداریہ مدیر رسالہ ہی لکھا کرتا ہے، کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ اداریے برنی ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ داخلی شہادتوں سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تحریر برنی ہی کی ہے۔

آئندہ کے بعض پرچوں پر برنی کا باقاعدہ نام تحریر ہے جیسے:

مارچ ۵۸ء　　بجٹ

جولائی ۵۸　　بچوں کے لیے کتابیں

نومبر ۵۹ء بنیادی جمہوریتیں

جنوری ۶۰ء　　بنیادی جمہوریت کے انتخابات

اگست ۶۱ء　　بابائے اردو کا انتقال

ستمبر ۶۱　　ایک قابل اعتراض کتاب

نومبر ۶۱ء بشیر ساربان

نومبر ۶۱ء فحش لٹریچر

بعض اداریے ایسے بھی ہیں جن پر علاء الدین خالد کا نام تحریر ہے اور بعض پر کسی اور شخص کا تاہم ایسے اداریے کم ہیں۔ اداریوں میں علاء الدین خالد کا موضوع عموماً طباعت و اشاعت کے مسائل رہا ہے جب کہ برنی کے موضوعات عموماً علمی اور ادبی رہے ہیں۔

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اداریے کی جگہ رسالے کے مندرجات کی فہرست دی گئی ہے اور اداریہ اندرونی صفحے پر دیا گیا ہے مگر ایسا بھی کم ہوا ہے۔

بہت کم شمارے ایسے ہیں جن پر اداریہ نہیں لکھا گیا۔ اگر کوئی خاص شمارہ جاری ہوا تو اسی مناسبت سے اداریہ لکھا گیا۔ برنی کی بڑی بہن فاطمۃ الکبریٰ کا انتقال ہوا تو علاء الدین خالد نے ''فاطمۃ الکبریٰ۔ قرآن پاک کی پہلی خاتون کاتب'' کے عنوان سے اداریہ لکھا۔

''کتابی دنیا'' کا ایک سال مکمل ہونے پر نومبر ۱۹۵۶ء کے شمارے کے اداریے میں برنی نے ''اظہار تشکر و اظہار شکایت'' کے عنوان کے تحت انھوں نے لکھا:

> اس نمبر کے ساتھ ''کتابی دنیا'' اپنی زندگی کا ایک سال پورا کر رہا ہے۔ اس عرصے میں جو خدمت اس نے کی اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اتنا یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ یہ پرچہ انجمن ناشران و تاجران کتب کراچی کی زیر سرپرستی اسکے نقیب کی حیثیت سے نکل رہا ہے اور یہ کسی شخص واحد کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اظہار خیال میں بالکل

بے لاگ ہے۔

اپنی اس تھوڑی سے زندگی میں اسے جن دوستوں، بہی خواہوں اور مشتہرین کا اشتراک عمل حاصل رہا ہے اس کے لیے وہ دلی شکر گزار ہے۔

اسی طرح جب ''کتابی دنیا'' کی اشاعت کو گیارہ سال ہو گئے تو علاء الدین خالد کی جانب سے برنی کی اور رسالے کی خدمات کو ان الفاظ میں سراہا گیا:

''کتابی دنیا کو نیا سال مبارک!''

اس رسالے کو شروع ہوئے تقریباً گیارہ برس ہو چکے ہیں اور باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا ہے جس کا سہرا ہمارے بزرگ، مشہور ادیب، مورخ، مترجم صحافی نقاد، سوانح نگار جناب ضیاء الدین احمد صاحب برنی کے سر ہے، جو ان دنوں عارضہ دل میں صاحب فراش ہیں خدا ان کو جلد صحت دے اور لمبی عمر عطا کرے۔ آمین برعظیم ہندو پاکستان کی صحافتی تاریخ میں یہ واحد مثال ہے کہ کتابی دنیا سے تعلق رکھنے والا کوئی اردو رسالہ پوری باقاعدگی سے اتنے طویل عرصے سے جاری رہا ہو۔ پچھلے پچاس سال میں اس موضوع پر کتنے ہی رسائل جاری ہوئے، جو بعض انفرادی اور بعض اداروں کی پر خلوص کوششوں کا نتیجہ تھے مگر سب کے سب تھک ہار کر دم توڑ گئے۔ خدا کرے اس رسالہ کی ہمتیں قائم رہیں اور مقاصد کو پورا کرے۔ (۱۶)

جنوری ۱۹۶۷ء کے شمارے میں علاء الدین خالد نے ''کتابی دنیا'' کی جانب سے قارئین کو نئے سال کی مبارک باد دی۔ گزشتہ سال کے محاسبے کی فکر کی نئے سال کے لیے اپنے عزم کا اظہار کیا:

۱۹۶۶ء ختم ہوا اور ۱۹۶۷ء شروع ہو چکا ہے۔ ہم اپنے قارئین کو نئے سال کی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ نیا سال جانے والے سال سے ہر لحاظ سے خوش آیند ہوگا۔ ہمیں نئے سال کے شروع ہی میں جائزہ لینا ہوگا کہ پچھلے سال ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ ہمارا دائرہ عمل چونکہ کتابی دنیا سے متعلق ہے لہذا ہم اپنے محاسبہ کو کتابوں کی حد تک محدود رکھتے ہیں۔

''اداریہ'' کے علاوہ اب ان عنوانات کا مختصر مختصر جائزہ پیش کیا جاتا جن کی بنیاد پر رسالہ ایک خاص شکل اختیار کرتا چلا گیا اور جس سے اُس کی انفرادیت وجود میں آئی۔ ان عنوانات جگہ تبدیل ہوتی رہی ہے کبھی تبصرہ کتب کو آخر میں کبھی اداریے کے فوراً بعد جگہ دی گئی۔

''نوٹ'':

یہ عنوان ابتداء میں قائم کر دیا گیا تھا۔ اس عنوان کے تحت اُس وقت کے اہم مسائل کو زیرِ بحث لایا جاتا تھا تاہم اس میں کبھی کبھی خبروں کو بھی شامل کر لیا گیا اور ''نوٹ'' اور ''خبریں'' میں کوئی فرق نہیں رہا۔ یہ عنوان مستقل نہیں رہا۔ چند عنوانات دیکھیے: کاپی رائٹ کا مسئلہ، گتّے کی کمیابی، مولانا محمد علی کی برسی، اردو بازار کا قیام، مرکزی اردو لائبریری، بھارت اور پاکستان میں وی پی سسٹم کے اجرا کی ضرورت، اسرار الحق مجاز وفات پا گئے، تجویز تعزیت، سائنس اور فلسفہ میں عربوں کی ترقی، مرزا غالب کے سکونتی مکان کو محفوظ یادگار قرار دینے کا مطالبہ، جوش صاحب کا مقدمہ، وحشت کلکتوی کی علالت، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، اردو زبان کی مخالف بد دیانتی اور تنگدلی ہے، حضرت جوش اور سلطان حسین کے مقدمے کا خاتمہ وغیرہ۔

اس کے ذریعے برنی کتابی دنیا اور علمی و ادبی کے توجہ بعض اہم مسائل کے جانب دلانے میں کامیاب ہوئے۔ جن مرحومین کے ورثہ کی زبوں حالی کی جانب اس عنوان کے تحت حکومت اور اربابِ اختیار کو توجہ دلائی گئی، ان ورثہ کی مالی امداد کی اطلاعیں بھی دی گئیں۔

مرکزی اردو لائبریری کی ضرورت کا احساس بھی اسی عنوان کے توسط سے نہ صرف دلایا گیا بلکہ اس میں کامیابی کی اطلاع بھی دی گئی۔

اس سلسلے میں ایک صاحب تحسین سروری نے برنی کی تجویز کو سراہاتے ہوئے مدیر رسالہ کو خط لکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> مدیر ''کتابی دنیا'' نے اس کی (مرکزی لائبریری) اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے، اور اس کے ساتھ ہی حکومت اور بہی خواہان اردو سے مطالبہ کی ہے کہ کراچی میں ایک مرکزی لائبریری کے قیام کی کوشش کریں۔ موصوف کی سب سے زیادہ قابلِ قدر اور عمدہ تجویز یہ ہے کہ ''پریس ایکٹ میں اگر ذرا سی ترمیم کر دی جائے اور پبلشروں پر اس پر اس لائبریری کے لیے ایک ایک زائد کتاب حکومت کو دینے کا انتظام کر دیا جائے تو جدید مطبوعات خود بہ خود بہ غیر کسی قیمت کے حکومت کے پاس اس لائبریری کے لیے پہنچ جایا کریں گے۔ یہ ترمیم ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے عمل میں آنی چاہیے۔''
>
> مدیر ''کتابی دنیا'' کے یہ الفاظ پڑھ کر بعض پبلشر صاحبان کو غصہ آیا ہوگا لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ نہایت کارآمد تجویز ہے جس میں مدیر ''کتابی دنیا'' کا کوئی ذاتی فائدہ نہیں بلکہ اس میں سراسر قومی مفاد مضمر ہے۔ (۱۷)

کراچی اردو بازار کے لیے کوششوں کا آغاز بھی اسی عنوان سے کیا گیا اور اُس میں بھی کامیابی ہوئی۔

## ''ادیبوں کی وفات'':

یہ عنوان بھی مختلف شکلوں میں مستقل رہا۔ اس عنوان کے تحت برنی ہی معلومات فراہم کرتے تھے اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا کرتے تھے۔ یہ موضوع برنی کی خاص دل چسپی کا ہے۔ برنی کو مرحومین سے اور خاص اُن لوگوں سے جن کی

تاریخ میں یادگار رہے ہوں ضرور یاد اور یادرکھتے ہیں اور ان کا تذکرہ اپنے رسالے میں تو نہایت محبت اور عقیدت سے کرتے ہیں ۔جن حضرات سے ان کا کوئی تعلق رہا ہو یا جنھیں وہ اچھی طرح جانتے ہوں ان سے متعلق بہت اہم اور ضروری تاریخی نوعیت کی معلومات فراہم کرتے ہیں ۔اس ذیل میں مثالاً نام دیے جا رہے ہیں ان میں بیشتر وہ ہیں جنھیں برنی جانتے تھے اور جن کے بارے میں انھوں نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں:

آزاد سبحانی، مولانا ۔آغا اشہر (لکھنؤ) ۔آغا محمد طاہر دہلوی ۔اثر رامپوری ۔احسان اللہ بدوی، پروفیسر ۔احمد سعید دہلوی، حافظ، مولوی ۔احمد شاہ، سید (لاہور) ۔احمق پھپھوندوی ۔اختر جونا گڑھی ۔ارم لکھنوی ۔اسد ملتانی ۔اسرار الحق مجاز ۔اسلم جیراجپوری، مولانا (برنی کے نام خطوط ہیں) ۔اشرف، ڈاکٹر ۔الما لطفی، ڈاکٹر ۔الیاس احمد مجیبی ۔الیاس برنی ۔امام اکبر آبادی (کراچی) (برنی کے نام خطوط ہیں) ک ۔د ۔دسمبر ۶۶ء ۔۳۰ ۔امجد حیدرآبادی ۔امین شرق پوری، محمد، مولانا (لاہور) ۔انوار ہاشمی (لاہور) ۔ایم ۔عباس اورنگ آبادی (بمبئی) ۔اے ۔آر ۔خاتون ۔اے ۔ٹی ۔ایم ۔مصطفیٰ ۔بدرالحسن جلالی (دہلی) ۔بشیر احمد، مولوی ۔بشیر الدین احمد محمود، مرزا ۔بھگوان داس، ڈاکٹر ۔بیخود دہلوی ۔پنڈت کیفی ۔تلوک چند محروم (دہلی) ۔تمکین کاظمی ۔ٹی ایس ایلیٹ ۔جعفر حسین منظر ۔جمیل بدایونی (کراچی) ۔جواہر لال نہرو، پنڈت ۔چراغ حسن حسرت ۔حامد حسن قادری ۔حامد علی خاں (دہلی) ۔حبیب اللہ، ڈپٹی ۔حرماں خیر ابادی ۔حسن نظامی، خواجہ ۔حسین احمد مدنی، مولوی ۔حسین جولی، محمد (وزیرآباد) ۔حسین ہمدانی، ڈاکٹر ۔حفظ الرحمٰن، مولانا ۔حیدر دہلوی ۔خیام ہند ۔حیرت شملوی، عبدالمجید ۔خالدہ ادب خانم (ترکی) ۔خلیل حسین، حافظ ۔خواجہ دل محمد ۔خواجہ نبی احمد، حافظ (دہلی) ۔خورشید علی مہر تقوی، سید (کراچی) ۔داؤد پوتا، ڈاکٹر ۔ذکاء درانی (لاہور) ۔راجہ مہدی علی خاں ۔رازیزدانی ۔رام بابو سکسینہ ۔رشید احمد خاں امروہوی، حکیم ۔رضوان اللہ، سید رفعت یار خان (برنی کے برادر نسبتی) ۔رؤف الرحمان ۔زبید احمد، ڈاکٹر ۔سردار جگت سنگھ ۔سرشار دہلوی ۔سرفراز حسین ۔خبیر لکھنوی ۔سرونسٹن چرچل ۔سعید بریلوی، ڈاکٹر ۔سعید نفیسی، علامہ ۔سعیدالدین زاغ (مزاحیہ شاعر) ۔سلطان شاہ، سید (پشاور) ۔سمیع آرٹ ۔سہروردی، پروفیسر ۔سید سجاد، ڈاکٹر ۔سید کاظم حسین زار (پٹنہ) شاہد احمد دہلوی ۔شاہد صدیقی ۔شبیر بیگ مرحوم ۔شفیق حسین اختر، سید، مولوی ۔شمس لکھنوی ۔شیخ عبداللہ ۔صدیق ۔جائسی (کانپور) ۔صدیق حسن ۔صلاح الدین احمد، مولانا (مدیر ادبی دنیا) ۔ظریف جبلپوری ۔ظریف دہلوی (کراچی) ۔ظفر علی خاں، مولانا ۔ظفر نیازی، مولانا ۔عابد علی بلہوری، قاضی ۔عاشق عباس، سید (کراچی) ۔عباس حسن، قاری ۔عباس حسین دہلوی، قاری (کراچی) ۔

عبدالباری ساقی (پٹنہ) ۔عبدالحمید (ایڈیٹر "مولوی"، لاہور) ۔عبدالرحمٰن کابلی ۔عبدالسلام ندوی، مولانا ۔عبدالشکور، مولوی ۔عبدالماجد سالک ۔عثمان علیم حیدرآبادی (کراچی) ۔عرش تیموری ۔عزیز حسن بقائی، حافظ ۔عطا حسین شاہ موسوی (روہڑی) ۔علامہ احمد الشبلی ۔علی جعفری، سید ۔علی مقدس رضوی، سید ۔عنایت اللہ مشرقی، علامہ ۔غلام حسین

کاپڑیا، ڈاکٹر۔غلام محی الدین صوفی، ڈاکٹر۔غلام یزدانی، ڈاکٹر۔فضل الرحمٰن، مولوی (ڈھاکا)۔فیاض احمد، حافظ (دہلی)۔فیاض علی۔فیضی رحیمن۔قابل اجمیری۔قاضی بدر جلالی۔قاضی عبدالغفار۔کرار حسین قزلباش۔کلیم احمد آبادی۔کیفی چڑیا کوٹی، مولانا۔مائی جائسی (بجنور)۔مجید حسن (بجنور)۔مجید لاہوری۔محمد حفیظ سید، ڈاکٹر۔محمد سلیم پروفیسر۔محمد شفیع پروفیسر۔محمد علی ردولوی، چودھری۔محمد نصیر الدین، ڈاکٹر۔محمد نصیر موسوی، مولانا (لکھنؤ)۔محمد ہاشم اسمٰعیل۔محمد یامین، نواب، سر۔محمد رضا علی خان، سر، نواب (رامپور) محمود علی خاں جامعی۔محمود علی خاں ماہر، حکیم۔محی الدین قادری زور، ڈاکٹر۔مرزا محمد سعید، پروفیسر۔معجز سہوانی۔ملک عبدالقیوم (برنی کے نام خطوط ہیں)۔مناظر احسن گیلانی۔منٹو۔منشی رحمان علی (حیدرآباد)۔منوہر سنگھ صحرائی (بمبئی)۔منیر الہ آبادی۔مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ناظم ،ڈاکٹر۔نخشب جارچوی (کراچی)۔نذر سجاد (بیگم سجاد حیدر یلدرم)۔نظر حیدرآبادی۔نواب علی، سید، پروفیسر۔نوح ناروی۔نور احمد (کراچی)۔نور احمد (مصور، کراچی)۔نیاز فتح پوری۔وحشت کلکتوی۔ویکنٹھ لال مہتا۔ہادی حسن، ڈاکٹر۔ہاشم حزیں، محمد، سید (لکھنؤ) (میر انیس کے پرپوتے)۔ ہری چند اختر، پنڈت۔یحییٰ تنہا، محمد، مولوی (کراچی)۔یگانہ چنگیزی۔

### مضامین ومقالات:

کتابی دنیا میں شایع ہونے والے مضامین بھی دو طرح کے ہیں ایک وہ جن کا تعلق کتاب سازی یا کتاب کی خرید وفروخت یا طباعت واشاعت سے متعلق ہوتا ہے یا وہ ہیں جن کا تعلق خالصتاً علم یا ادبی ہے۔انھی میں بعض کی نوعیت تنقید اور بعض کی تحقیقی ہے۔

ساٹھ کی دہائی میں مضامین کی اشاعت میں اضافہ ہوجاتا ہے جو برنی کے انتقال تک برقرار رہا۔برنی نے شخصیات پر مضامین کو اہمیت دی اور انھیں ایک عہد کی تاریخ کے طور پر پیش کیا ہے۔اسی طرح کتب خانوں کی بازیافت کے سلسلے کو بھی برنی رسالے میں اس کی اہمیت کے پیش نظر جگہ دی۔اداروں کی سرگرمیوں اور کارگزاریوں سے متعلق مضامین کو بھی برنی اپنے رسالے میں جگہ دی ہے۔بعض اہم اور ضروری نوعیت کے مذہبی اور قومی مضامین کو بھی رسالے کی زینت بنایا ہے۔

حصہ مضامین تقاضا کرتا ہے کہ اس کا جائزہ بالتفصیل علاحدہ لیا جائے تاہم مقالے کی محدودیت اس کی اجازت نہیں دیتی چناچہ علاحدہ ہی اس پر قلم اٹھایا جائے گا۔یہاں چند شماروں سے مضامین بعض کوائف کے ساتھ دیے جارہے ہیں۔ان سے یہ اندازہ قایم کرنا مشکل نہیں رہے گا کہ ''کتابی دنیا'' مضامین کے اعتبار سے بھی اہم رسالہ تھا۔اس میں علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور مذہبی نوعیت کے مضامین ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| دسمبر ۵۵ء | اے بسا آرزو کہ خاک شدہ | سید یوسف بخاری |
| فروری ۵۶ء | ٹیپو سلطان کا کتب خانہ | نادم سیتاپوری |
| مارچ ۵۶ء | نواب ہوش یار جنگ | حضرت ساحل بلگرامی |

| | | |
|---|---|---|
| اپریل ۵۶ء | خدا بخش لائبریری | حبیب لکھنوی |
| اپریل ۵۶ء | جمہوریہء اسلامیہء پاکستان کا قیام (اداریہ) | برنی |
| مئی ۵۶ء | پاکستان میں تعلیم بالغان کی ضرورت اور اہمیت (اداریہ) | مرتضیٰ شفیع ایم اے |
| | بزم اقبال لاہور کی سرگرمیاں | کریم احمد خاں، معتمد بزم |
| | اقبال، لاہور | |
| جون ۵۶ء | مولانا حافظ محمد اسلم جے راجپوری | الیاس احمد مجیبی |
| | مجلس ترقی ادب کی کارگذاری | کریم احمد خاں معتمد مجلس |
| | ترقی ادب، لاہور | |
| جولائی ۵۶ء | مجاز کی موت۔خودکشی یا قتل؟ | سلامت علی مہدی |
| اگست ۵۶ء | بدر جلالی مرحوم | کیف مرآبادی |
| ستمبر ۵۶ء | نوخواندہ لوگوں کے لیے مطبوعات: ایشیائی | |
| | ماہرین تعلیمات کے مابین تبادلہء خیالات | نامعلوم |
| | نظامی گنجوی | برنی |
| | ادیبوں کی کہانی ٹکٹوں کی زبانی | برنی |
| اکتوبر ۵۶ء | بوعلی سینا کی قانون الطب کے قدیم نسخے | محمد آغا سلطانوف ایم ایس سی |
| جنوری ۵۷ء | ادیبوں کی وفات (مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا کیفی چریاکوٹی) | برنی |
| | اردو ادب میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کا مقام | ہیرالال چوپڑا ام اے |
| فروری ۵۷ء | ایشیا کے ادیبوں کی کانفرنس | عبدالمجید سالک |
| مئی ۵۷ء | کتابیں جو مجھے یاد ہیں | ڈاکٹر کے این کاٹجو |
| جون ۵۷ء | روس میں ناخواندگی کس طرح ختم کی گئی | نیکولائی سولوف |
| | | بیف/؟ |
| اگست ۵۷ء | ماں کا دل (فارسی سے ترجمہ) | مترجم برنی |
| ستمبر ۵۷ء | افق ادب کا ایک درخشندہ ستارہ غروب ہوگیا (سرشار دہلوی) | آزاردہ دہلوی |
| دسمبر ۵۷ء | احسن پھپھوندوی | نثار احمد فاروقی |
| فروری ۵۸ء | پنڈت ہری چند اختر (اداریہ) | بالکند عرش ملسیانی |
| اپریل ۵۸ء | کتب خانہء حبیب گنج | حبیب الرحمٰن خاں شروانی |

| | | |
|---|---|---|
| | امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد | برنی |
| اگست ۵۸ء | سید ابوظفر ندوی | عبدالقوی دسنوی |
| ستمبر ۵۸ء | خیالات مولوی عبدالحق | برنی |
| اکتوبر ۵۸ء | بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں (گاما پہلوان) (۱) ایم شاہ/ برنی | لفٹنٹ کرنیل ڈاکٹر جلال |
| نومبر ۵۸ء | مردے از غیب بروں آید و کارے بکند | برنی |
| | روس میں ہندوستانی زبانیں | (ہماری زبان سے) |
| | بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں (مسز اینی بیسنٹ، نائیڈو) (۲) ایم شاہ/ برنی | لفٹنٹ کرنیل ڈاکٹر جلال |
| دسمبر ۵۸ء | بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں (شاہ مرزا بیگ) (۳) ایم شاہ/ برنی | لفٹنٹ کرنیل ڈاکٹر جلال |
| جنوری ۵۹ء | بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں (مولانا محمد علی، مسز سوکھی) (۴) ایم شاہ/ برنی | لفٹنٹ کرنیل ڈاکٹر جلال |
| فروری ۵۹ء | بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں (جی کے گوکھلے، شریف حسین) (۵) لفٹنٹ کرنیل ڈاکٹر جلال ایم شاہ/ برنی | |
| مارچ ۵۹ء | ادیبوں کا کنونشن خطبۂ صدارت (بابائے اردو) سے اقتباسات | برنی |
| مارچ ۵۹ء | بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں (مہاتما گاندھی) (۶) ایم شاہ/ برنی | لفٹنٹ کرنیل ڈاکٹر جلال |
| اپریل ۵۹ء | بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں (پنڈت جواہر لال نہرو) (۷) ایم شاہ/ برنی | لفٹنٹ کرنیل ڈاکٹر جلال |
| مئی ۵۹ء | اشاعت ادب ناشرین کی مشکلات اور ان کا حل (۱) | ڈاکٹر عبدالوحید |
| مئی ۵۹ء | بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں (ترجمہ) (۷) | لفٹنٹ کرنیل ڈاکٹر جلال ایم شاہ/ برنی |
| جون ۵۹ء | کتابوں کی فہرست (کیٹیلاگ) | برنی |
| جون ۵۹ء | اشاعت ادب ناشرین کی مشکلات اور ان کا حل (۲) | ڈاکٹر عبدالوحید |
| جولائی ۵۹ء | علی شیر نوائی | محمود ضیاموف |

| | | |
|---|---|---|
| | چہ دلاور است دزدے | عبدالمجید قریشی، جہانیاں |
| اگست ۵۹ء | مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی | معارف اعظم گڑھ |
| | مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی | مائل ملیح آبادی (فروغ اردو لکھنؤ) |
| اکتوبر ۵۹ء | چودھری محمد علی ردولوی (صدق جدید سے ماخوذ) | مولانا عبدالماجد |
| فروری ۶۰ء | بک سیمینار (خطبہ) | جسٹس شریف |
| مارچ ۶۰ء | جگر صاحب سے ایک حالیہ ملاقات کا اثر | گلزار دہلوی |
| | آل انڈیا ریڈیو جے پور کا مشاعرہ | ہفتہ وار ''بے داغ''، دہلی |
| جون ۶۰ء | منظوم ترجمہ قرآن | برنی |
| | میری علالت | برنی |
| | کاپی رائٹ | برنی |
| جنوری ۶۱ء | جرمنی کا مشرقی شاعر۔ گوئٹے | ممتاز حسن |
| | چند تلخ حقیقتیں: جعلی کتابیں | شاہد علی خاں |
| فروری ۶۱ء | مولانا محمد علی بہ حیثیت صحافی کے | برنی |
| مارچ ۶۱ء | سرسید اور اردو | برنی |
| | بچوں کے لیے کتابوں کا انتخاب (ترجمہ) | یونیسکو/ برنی |
| اپریل ۶۱ء | حضرت امجد حیدر آبادی (اداریہ مختصر نوٹ کی صورت میں) | برنی |
| | کیا آپ محب وطن ہیں؟ (ترجمہ از برکلے) | برنی |
| | ہمارا رسم الخط | حامد علی خاں، لاہور |
| جولائی ۶۱ء | دیسنہ لائبریری مرحوم | سید شہاب الدین دسنوی |
| | ایم اے | |
| اگست ۶۱ء | بابائے اردو کا انتقال (اداریہ مختصر نوٹ) | برنی |
| | ایک نہایت فحش کتاب | عبدالماجد دریابادی |
| | کتابیں | میکسم گورکی مترجم اجمل |
| | اجملی | |
| ستمبر ۶۱ء | کتابیں جو قید خانوں میں لکھی گئیں | حامد اللہ افسر |

| | | |
|---|---|---|
| اکتوبر ۶۱ء | ہمارے شعرا | وقار عظیم |
| نومبر ۶۱ء | مطبع صدیقی بریلی | محمد ایوب قادری |
| جنوری ۶۲ء | غالب و مومن | امام اکبرآبادی |
| | ڈاکٹر محمد حفیظ سید | برنی |
| فروری ۶۲ء | کتابیں جو زندہ ہیں | آل احمد سرور |
| اپریل ۶۲ء | دیا شنکر نسیم | ڈاکٹر محمود الٰہی |
| مئی ۶۲ء | غزل کیا ہے؟ | فراق گورکھپوری |
| جون ۶۲ء | کچھ اردو رسائل کے متعلق | مولانا صلاح الدین، مدیر "ادبی دنیا" |
| جولائی ۶۲ء | صنعت طباعت و اشاعت کے مسائل | ڈاکٹر اے۔ وحید |
| اگست ۶۲ء | حضرت امجد حیدرآبادی | محترمہ زینت ساجدہ |
| | "تاریخ اسلام" کی ضبطی | برنی |
| ستمبر ۶۲ء | اردو ادب پر ٹیگور کا اثر | سید احتشام حسین |
| اکتوبر ۶۲ء | اردو رسائل کی کہانی | ڈاکٹر عبدالسلام خورشید |
| دسمبر ۲ء | رضا لائبریری (رامپور) | عابد رضا بیدار |
| جنوری ۶۳ء | میر تقی میر (۲۴-۱۷ء-۱۸۱۰ء) | ماخوذ "کتاب نما" دہلی |
| فروری ۶۳ء | چند ہم عصر | سید امجد علی اشہری |
| مارچ ۶۳ء | آزاد بہ حیثیت شاعر | محمد صالح قاضی |
| اگست ۶۳ء | حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی | برنی |
| | شیعہ سنی تنازعہ پر مولوی محمد حسین آزاد کی رائے | ماخوذ "دربار اکبری" |
| اکتوبر ۶۳ء | پریس آرڈیننس | برنی |
| | نیوز پرنٹ کی ہوش ربا گرانی | برنی |
| | اردو کے دو ادیب (ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر عبدالقیوم) | برنی |
| نومبر ۶۳ء | ناگن کا انتقام۔ ۵ سال کے بعد | ماخوذ "دور جدید"، دہلی |
| دسمبر ۶۳ء | غازی مصطفیٰ کمال پاشا | برنی |
| جنوری ۶۴ء | مولانا محمد علی جوہر | برنی |

| | | |
|---|---|---|
| فروری ۶۴ء | کتب خانہ کی سیر: خدا بخش لائبریری پٹنہ | ماخوذ "تعمیر حیات"، لکھنؤ |
| مارچ ۶۴ء | ایک پارسی فاضل کی وفات۔ جہانگیر ایدلجی سنجانا | برنی |
| اپریل ۶۴ء | حضرت اکبر الہ آبادی | خان بہادر نقی محمد خان خورجوی |
| | حضرت اکبر کے لطیفے | ملا واحدی |
| اکتوبر ۶۴ء | یادِ حیرت | ادیبوں کی آرا |
| | پہلا قومی کتاب میلہ | ابراہیم سعد |
| | انگلستان کے بچے کیا پڑھتے ہیں؟ | لیونرڈ ماکسن / برنی |
| | اچھی کتابیں | مولانا ماہر القادری |
| | کتابیں مہنگی کیوں ہیں؟ | سلطان حسین |
| | جب اور اب | ملا واحدی |
| نومبر ۶۴ء | پچاس سال پہلے کی چند کتابیں | شاہد احمد دہلوی |
| فروری ۶۵ء | امن کا نوبل پرائز پانے والا حبشی۔ مارٹن اوتھر کنگ | نامعلوم (برنی) |
| اپریل ۶۵ء | دارالمصنفین کی طلائی جوبلی | عبداللطیف اعظمی |
| | قاتل کی نئی سراغ رسی | برنی |
| مئی ۶۵ء | پانیر کی کہانی | برنی |
| اگست ۶۵ء | رشوت | برنی |
| | کاپی رائٹ | امیر حسین نورانی |
| ستمبر ۶۵ء | کتاب اور ہم | محمد طاہر فاروقی |
| نومبر ۶۵ء | عبدالماجد | شاہد احمد دہلوی |
| دسمبر ۶۵ء | صحافی کا مذہب | (والٹر ولیمز/ برنی) |
| | کیا ابرہہ کے ساتھ ایک ہاتھی تھا؟ | شاہ حسن عطا |
| جنوری ۶۶ء | آہ! بدرالحسن چل بسے! | علاء الدین خالد |
| | ظفر کی شاعری | سید مبارز الدین رفعت |
| | انکم ٹیکس | شیخ اختر |
| فروری ۶۶ء | سالار جنگ میوزیم۔ دنیا کا عظیم ترین شخصی ذخیرہ | ڈاکٹر محمد حسن |

| | | |
|---|---|---|
| | برٹش میوزیم۔ لاکھوں کتابوں کا گھر | جان گیسلی/؟ برنی |
| | کپلنگ کی صد سالہ سالگرہ | برنی |
| مارچ ۶۶ء | ایک کتاب کتنے عرصے میں تیار ہوتی ہے | ''عالمی ڈائجسٹ'' کراچی |
| | آل انڈیا مشاعرہ | محمد اسمٰعیل بنگلوری |
| مارچ ۶۶ء | غالب اور غزل | کمال کبریا |
| | پاکستان رئٹرز گلڈ کی ساتویں سالگرہ (تقریر) | چیف جسٹس انعام اللہ |
| اپریل ۶۶ء | نئی کتاب لکھنے سے پہلے (اداریہ) | ادریس صدیقی |
| | اقبال اور بیداری ایشیا | شاہ حسن عطا |
| | بیاد مجلس اقبال | برنی |
| | آغا حشر کاشمیری۔ ''شکریہ یورپ'' | منشی اختر وارثی |
| | پاکستان رائٹرز گلڈ کی ساتویں سالگرہ (خطبہء استقبالیہ) | قائم مقام سیکریٹری |
| مئی ۶۶ء | کاپی رائٹ کی خلاف ورزی۔۔۔ لمحہ فکر! | علاء الدین خالد |
| | ہماری ترجمہ پسندی | ادریس صدیقی |
| | انسانی تاریخ کا پہلا جمہوری حاکم | شاہ حسن عطا |
| | ذوق اور ظفر کے محاورے | ادریس صدیقی |
| | میرا دوست۔۔۔ ماتری | شاد عظیم آبادی |
| جون ۶۶ء | جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں کتابوں کی صنعت | مفتاح الدین ظفر |
| جولائی ۶۶ء | مولانا نیاز فتح پوری | برنی |
| | مثنوی سحر البیان | کمال کبریا |
| | مانگے کی کتابیں | ''صدق جدید'' |
| | نیاز ایک منارہء ادب | برنی |
| اگست ۶۶ء | ولی | کمال کبریا |
| | کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا! | شاہ حسن عطا |
| | کچھ کتابوں کے بارے میں | جان رسکن/ احمد جمال |
| | پاشا | |
| | ڈاکٹر ہادی حسن۔ چند یادیں | ڈاکٹر محمد احسن فاروقی |

| | | |
|---|---|---|
| | ذکر محرم | محمد ایوب واقف |
| ستمبر ۶۶ء | رانی کیتکی کی کہانی | کمال کبریا |
| | تعلیم یافتہ | فاروقی |
| | ملیالم ادب | محمد اسحاق صدیقی |
| اکتوبر ۶۶ء | باشرین اور ارباب حل وعقد ذرا سوچیں تو (اداریہ) | علاء الدین خالد |
| | شبلی | "شبلی نیشنل کالج میگزین |
| | کتابوں کی باتیں | محمد دین تاثیر |
| | جلد سازی اور اس کا مستقبل | شیخ محمد قریشی |
| | کلام نبوت | مولانا حبیب الرحمان |
| | | ندوی |
| | جسٹس کیانی مرحوم کے افکار پریشاں | سید سبط حسن |
| نومبر ۶۶ء | قومی تعمیر و ترقی میں لائبریری کی اہمیت | انیس خورشید |
| | کتابیں جو زندہ۔ دیوان غالب | آل احمد سرور |
| | سید قطب کی شہادت | سید محمد الحسنی |
| دسمبر ۶۶ء | اعلیٰ انسانیت کی ایک مثال | مولانا سعید احمد اکبر آبادی |
| | حاصل مطالعہ | ادریس صدیقی |
| | کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا | ڈاکٹر فرمان فتح پوری |
| | بچوں کا ادب۔ ایک اجمالی جائزہ۔ ایک وقت کی ضرورت | حکیم محمد سعید دہلوی |
| جنوری، فروری ۶۷ء | بچوں کی کتابیں۔ مصنفین کی اہم ذمے داری | سلمان شاہ رخ |
| | کتب خانوں کی اہمیت | انیس خورشید |
| | فانی | کمال کبریا |
| | حاصل مطالعہ | ادریس صدیقی |
| | مشاہیر ہند | خواجہ حسن نظامی |
| | تعلیم یافتہ ممالک میں مطالعہء کتب کے مسائل | مائل سلوا/ادریس صدیقی |
| | نام تیرا ہی اگر لے لیا سودائی نے؟ | وحشی محمود آبادی |
| | کتابوں اور پڑھنے والوں کے بارے میں عام مشاہدات | ول ذکا/ادریس صدیقی |

| | | |
|---|---|---|
| | فرخ آباد کے دو گمنام شاعر | محمد احسن |
| | لاہور میں درسی کتابوں کے جعلی ایڈیشن فروخت ہو رہے ہیں | ''روز نامہ مشرق'' |
| مارچ ۶۷ء | مولانا ابوالکلام آزاد پر پہلی کتاب | ابوسلمان شاہ جہاں پوری |
| | کتب خانوں کی اہمیت | سید ولایت حسین |
| | پڑوسیوں کے حقوق | محمد یونس نگرامی ندوی |
| | بچوں کے لیے علیحدہ لائبریریوں کی ضرورت | شفیع عقیل |
| | خورشید بہو کا قضیہ (یہ مضمون تحقیقی نوعیت کا ہے اس میں مصنف کے جعل کی نشان دہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب ہادی رسوا کی نہیں بلکہ اسے ظاہر کیا گیا ہے۔) | |
| عبدالسلام | | |
| | حاصل مطالعہ | ادریس صدیقی |
| اپریل ۶۷ء | کتابیں حسن ظاہر بھی چاہتی ہیں | ابن انشاء |
| | اقبال اور اشتراکیت | عبدالسلام |
| | اردو میں سائنسی تعلیم کا مستقبل۔ایک جائزہ | نعمت علی اختر بھٹی |
| | امیر عبدالرحمٰن خاں ''والیِ دولت خداداد افغانستان'' کے دل چسپ واقعات | |
| | | محمد احسن |
| | غبار خاطر پر ایک نظر | امین عالم رابن |
| | دنیا میں بہترین ساتھی کتاب ہے | اکرام احمد |
| مئی ۶۷ء | قومی زبان کے مسائل | علاء الدین خالد |
| | شاہد احمد دہلوی | کمال کبریا |
| | دورِ عباسیہ کے کتب خانے | اشرف علی |
| | مولانا سیماب اکبر آبادی | جوہر شفائی جام نیری |
| | سر جادو ناتھ سرکار | محمد ایوب واقف |
| | کچھ علمی اداروں کے بارے میں | مشفق خواجہ |
| جون ۶۷ء | جعفر علی خاں اثر کی یاد میں | آل احمد سرور |
| | ''یوم محمد قلی قطب شاہ'' کا آنکھوں دیکھا حال | وقار خلیل |
| | مومن فارسی غزل کے آئینے میں | محمد شکیل احمد ایم۔اے |

| | | |
|---|---|---|
| | کتب خانہ دارالعلوم مئو | مولانا حبیب الرحمان ندوی |
| | انڈیا ونس فریڈم | مولانا غلام رسول مہر |
| جولائی ۶۷ء | کتاب ایک عذاب | واصل رشید عثمان |
| | مفتی محمد کفایت اللہ صاحب | برنی |
| | انڈیا ونس فریڈم۔کیا مولانا آزاد کی تصنیف ہے؟ | عبداللطیف اعظمی |
| اگست وتمبر ۶۷ء | دنیا کی کوئی قوم بغیر اپنی قومی زبان میں ترقی کیے ہوئے ترقی نہیں کرسکتی | ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی |
| | انڈیا آفس لائبریری کی داستان | خالد جمال |
| | سیرت اور کردار کی تشکیل | ڈاکٹر ذاکر حسین |
| | غبار خاطر کا نیا ایڈیشن | مشفق خواجہ |
| | اقبال کا فلسفہء خودی | (فوٹو کاپی ناقص ہونے کی وجہ سے نہیں پڑھا گیا) |
| اکتوبر نومبر دسمبر ۶۷ء | فاطمۃ الکبریٰ۔قرآن پاک کی پہلی خاتون کاتب | علاء الدین خالد |
| | محترمہ فاطمۃ الکبریٰ کی وفات پر تعزیت نامے | ادارہ |
| | قرآن پاک کے تراجم | مولانا عبدالماجد دریابادی |
| | شاہد احمد دہلوی | سید مجیب الدین |
| | ایک عظیم ناول کا پس منظر | جون ویسٹن (''آئینہء برطانیہ، کراچی) |
| | ایک کتاب کتنے عرصہ میں تیار ہوتی ہے | ڈاکٹر محمد شفاعت |
| | پاکستانی ادب کو اپنی سماجی اور ثقافتی روایات کا علم بردار ہونا چاہیے | نامعلوم |
| | دو ناشر۔ملک عدم کو سدھارے: سید حمید علی، محمد یوسف جامعی | علاء الدین خالد |
| جنوری فروری مارچ ۶۸ء | نظام تعلیم کا مقصد | علاء الدین خالد |
| | غزل کا فن | ڈاکٹر مسعود حسین خاں |
| | شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی | محمد یحیٰ تنہا |
| | ترقی پذیر ملکوں میں کتابوں کی مانگ | جارج ریہاتھ |

| | | |
|---|---|---|
| | ہندوستان کے مسلم دور حکومت میں کتب خانے | اختر حسن صدیقی/محمد حسان علوی ایم اے |
| | ایک قوم کی کہانی۔دستاویزات کی زبانی | پروفیسر لارنس فریڈرک رشبروک ولیمز |
| اپریل، مئی اور جون ۶۸ء | حضرت خواجہ حسن نظامی کے غیر مطبوعہ خطوط | شاہ اکرام حسین سیکری |
| | کردار کی تعمیر و تخریب میں کتاب کا حصہ | محمد اسلم جعفری |
| | جگر مرادآبادی۔حیات اور شاعری۔ایک تاثر اور تعارف | ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی |
| | لیموں عجیب وغریب چیز ہے | ڈاکٹر سعید احمد |
| | شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں تحقیقی کام کی رفتار | ادارہ |

یہ امر قابل غور ہے کہ رسالے کے مضمون نگاروں میں اردو زبان و ادب کے بیشتر بڑے ادیب شامل ہیں اور موضوعات بھی عصر کی ضرورت اور تقاضوں کے مطابق ہیں۔

## ''خبریں'':

یہ عنوان بھی پہلے شمارے ہی سے قایم کر دیا گیا تھا۔اس کا تعلق انسانی فطرت سے ہے۔انسان نئی بات سننے اور سنانے کا شوق رکھتا ہے۔معلومات کا حاصل کرنا بھی اس کی جہاں ضرورت ہے وہاں شوق بھی۔

''کتابی دنیا''جن مقاصد کے جاری ہوا تھا اُس کے لیے ضروری تھا کہ اس کے پڑھنے والے کو باخبر رکھا جائے چناں چہ برنی نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔

اس عنوان کے تحت علم و ادب اور کتابی دنیا کے علاوہ مذہبیات اور سماجیات سے متعلق خبریں دی جاتی تھیں۔افسوس کہ ان خبروں کا مآخذ نہیں دیا جاتا تھا۔ان خبروں میں بھی برنی کا انفرادی ذوق اور مطالعہ جھلکتا اور چمکتا ہے۔چند خبریں ملاحظہ کیجیے:

ریڈرس ڈائجسٹ کا اردو ایڈیشن۔

فحش نگاری پر سزا۔

کتابوں کی سالانہ نمائش۔

حسرت کے بال بچوں کے لیے گزارہ۔

علامہ اقبال کا مسودہ۔

دارالترجمہ کو آگ لگ گئی۔

نولکشور پریس کی مطبوعات۔

روس میں پریم چند کی برسی۔

بہترین ادبی تخلیق۔

حضرت جوش کے بارے میں۔

اردو کی خدمت کے صلہ میں انعامات۔

منٹو انعام۔

پشتو زبان کا پمفلٹ ضبط۔

مولانا آزاد کی ۶۴ ویں برسی۔

میں نے غلام احمد قادیانی کے جنازے میں شرکت نہیں کی تھی۔

یوم سید جمال الدین افغانی۔

یوم مخمور۔

برنی کو علامہ اقبال سے خاص عقیدت ومحبت تھی۔ جس کا ذکر گزشتہ اوراق میں بھی آچکا ہے۔ یہاں کتابی دنیا سے ''خبریں'' کے ذیل میں اقبال سے متعلق خبروں کو علاحدہ دیا جارہا۔ یہ خبریں معلومات فراہم کرنے کے علاوہ برنی کے جذبات کی عکاسی بھی کرتی ہیں:

۱۔اقبال اکیڈمی کے نائب صدر مسٹر ممتاز حسن کو مسٹر شفیع ایم ایل اے (پنجاب) اور ایڈیٹر ''اقدام'' نے علامہ محمد اقبال کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مسودہ تحفہ کے طور پر دیا ہے۔ کتابی دنیا، دسمبر ۵۵ء۔ ۷

۲۔فرنسیسی زبان میں اقبال پر پہلی کتاب، کتابی دنیا، اپریل ۵۶ء۔ ۷

۳۔علامہ اقبال کی مشہور تصنیف پیام مشرق کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ، کتابی دنیا جون ۵۶ء۔ ۶۔

۴۔اقبال کی یاد، کتابی دنیا مارچ ۵۷ء۔ ۱۰

۵۔اقبال کے خطوط وغیرہ کی نمائش، کتابی دنیا مارچ ۵۷ء، ۱۱

۶۔نہرو نے اقبال کا شعر پڑھا، کتابی دنیا مارچ ۵۷ء ۱۲

۷۔اقبال ڈے، کتابی دنیا، مئی ۵۷ء۔ ۱۰

۸۔اقبال اکیڈمی کو دو کتابیں پیش کی گئیں (جن پر اقبال کے دست خط ہیں) کتابی دنیا اگست ۵۷ء۔ ۱۱

۹۔اقبال پر مضمون نویسی کا مقابلہ، کتابی دنیا، ستمبر ۵۷ء۔ ۱۳

۱۰۔اقبال کی فلاسفی امریکہ اور مشرق کے مابین اتحاد کی کڑی ہے، کتابی دنیا اکتوبر ۵۷ء۔ ۱۲

۱۱۔ڈاکٹر اقبال کی یاد میں (۲۱ اپریل ۵۸ء میں پاکستان میں پہلی مرتبہ پاکستانی ٹکٹ سیکیورٹی پریس میں ڈاکٹر اقبال کی یاد میں چھپے)، کتابی دنیا مئی ۵۸ء۔ ۵

۱۲۔ واشنگٹن میں یوم اقبال، کتابی دنیا جولائی ۵۸ء۔۱۲۔

۱۳۔ علامہ اقبال کا مکان (مرکزی حکومت نے تاریخی عمارت قرار دے دیا) کتابی دنیا اکتوبر ۵۸ء۔۱۲

## ''اقتباسات'':

اسی طرح ایک عنوان ''اقتباسات'' قایم کیا گیا تھا۔ اس میں دیگر اردو رسائل سے اہم اقتباسات نقل کیے جاتے تھے تاہم کبھی حوالے دیے گئے اور کبھی نہیں۔ یہ عنوان بھی مستقل نہیں رہا۔ ان میں بعض اقتباسات تو مضمون کی صورت میں ہیں اور بعض مختصر۔ چند عنوانات ملاحظہ فرمائیے:

غم مجاز (ہماری زبان، دہلی)۔

اردو کی جہانگیری (صدق جدید)۔

منٹو اور مجاز (ساقی، کراچی)۔

اردو کتابوں کی تجارت (امروز، کراچی)۔

اردو کی جہاں گیری (صدق جدید)۔

اردو کتابوں کی تجارت (امروز، کراچی)

## ''مراسلات'':

دیگر رسائل کی طرح کتابی دنیا میں بھی قارئین کی اُن آرا کو جو رسائل کی بہتری کے لیے دی گئیں رسالے میں شایع کیا گیا۔ برنی کے نام ایک بڑی ایسے خطوط کی جس میں اُن کے اقدامات کو سراہا گیا ہے، مگر برنی نے انھیں غالباً اس لیے شایع نہیں کیا کہ ان میں ان کی تعریف کا پہلو بھی نکلتا تھا۔ وہ خطوط جن میں واضح طور پر کتابی دنیا کی بات کی گئی انھیں رسالے میں شایع کیا گیا۔ یہ آرا ''کتابی دنیا دوسروں کی نظر میں'' کے عنوان سے شایع کی گئیں۔ چند مراسلے ملاحظہ فرمائیے۔

محمد رحیم دہلوی صاحب نے ۱۷ ستمبر ۱۹۵۵ء کو برنی کو خط کے ذریعے اپنی یوں دی:

> آپ کا عنایت نامہ اور ''کتابی دنیا'' ملا۔ نہایت نیک اقدام ہے۔ مصنفین اور ناشرین بہت بے زبان تھے، آپ نے انھیں زبان دیدی۔ پہلے وہ سب کی سنتے تھے، اب اپنی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد سے باخبر رہ سکتے ہیں۔ (جنوری ۵۶ء ص ۱۵)

ماہ نامہ ''ادب لطیف'' لاہور کی جانب سے ایک خط میں اس طرح رائے کا اظہار کیا گیا:

> اس پرچہ کے ذریعہ آپ بلاشبہ اردو ادب کی اہم اور قابل قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اردو میں اس پرچہ کی کمی محسوس کی جارہی تھی۔ آپ کے اقدام نے اس کمی کو پورا کر دیا

ہے۔(۱۸)

ماہنامہ ''تجلی''، کراچی نے مراسلے کے ذریعے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا:

یہ رسالہ صرف کتابوں کی اشاعت یا ناشران کتب کی مصروفیت کے لیے ہی وقف نہیں بلکہ ہر وہ خبر یا اطلاع درج کی جاتی ہے جو علم و ادب کے کسی نہ کسی مسئلے سے تعلق رکھتی ہے۔ادیبوں اور شاعروں کے ذاتی حالات مختلف تعلیمی ثقافتی اور علمی و ادبی اداروں کی سرگرمیوں کا حال بھی بیان کیا جاتا ہے۔ بہر حال یہ رنگا رنگ رسالہ بڑا اہم ہے اور اردو میں اس نوعیت کا یہ پہلا رسالہ ہے، اس لیے ہر اردو خواں کو چاہیے کہ اسے خریدے اور پڑھے۔(۱۹)

مذکورہ بالا دونوں خطوط وہ ہیں جو رسالے کے ابتدائی شماروں کے فوراً بعد لکھے گئے ہیں۔لہٰذا ان میں مدیر اور دیگر متعلقین کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

بعض مراسلات کی اشاعت سے بھی یہ بات سامنے آتی ہے برنی کتابی دنیا کے ذریعے محض معلومات ہی بہم پہچانا نہیں چاہتے تھے بلکہ صحیح اور مکمل معلومات کا پہنچنا عزیز تھا۔

امتیاز علی خاں عرشی نے خط کے ذریعے برنی کو کتابی دنیا میں در آنی والی تسامح کی جانب توجہ دلائی اگر چہ وہ معمولی نوعیت کی تھی تاہم برنی چوں کہ تحقیقی اور تنقیدی رجحان رکھنے والے شخص تھے چناں چہ انھوں نے اس مراسلے کو کتابی دنیا میں شایع کیا۔خط ملاحظہ فرمائیے:

''کتابی دنیا'' شمارہ ۱۰ میں صفحہ ۱۳ پر نظامی گنجوی کی مثنوی کا نام ''گنجینہء اسرار'' لکھا گیا ہے۔ یہ دراصل ''مخزن اسرار'' کے نام سے مشہور ہے۔شاید اس مقالے کے مترجم نے نام کے انگریزی ترجمہ سے اردو میں ''گنجینہ'' ترجمہ کر دیا ہے۔(۲۰)

ایک اور مراسلے سے اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں رسالے کے اجراء کو سراہا گیا ہے اور رسائل کی دنیا میں ایک بڑی کمی پورے ہو جانے پر مبارک باد دی ہے۔اس خط کی اشاعت کا مقصد اس سوا کچھ نہیں کہ حوصلے مزید بڑھیں۔برنی اس خط کی اشاعت سے یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہوں گے کہ ان کا شروع کیا ہوا کام واقعتاً اہم تھا۔

۸ دسمبر ۵۵ء

مکرم و محترم۔تسلیم

''کتابی دنیا'' کا پرچہ نظر نواز ہوا۔دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ایسے ایک پرچے کی ضرورت مجھے مدت سے محسوس ہو رہی تھی۔جس میں پاکستان اور ہندوستان کے ناشرین کے لیے مفید باتیں ہوں اور دونوں مملکتوں کے ناشرین میں ارتباط و اتحاد پیدا ہو۔

آپ نے ''کتابی دنیا'' جاری کر کے ایک بڑی خدمت کی اور ایسی کمی کو پورا کیا جس کو عام طور سے محسوس کیا جارہا تھا۔(۲۱)

اب کتابی دنیا میں شایع ہونے والے مراسلوں کا ایک مختصر اشاریہ تحریر کیا جارہا ہے۔ بعض غیر مطبوعہ خطوط اس کے علاوہ ہیں جن میں کسی نہ کسی حوالے سے کتابی دنیا کا ذکر ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| فروری ۵۶ء | راجہ رام کشن نولکشور بکڈپو لکھنؤ، | مرقومہ ۸ دسمبر |
| | الیاس احمد مجیبی | مرقومہ ۱۶ دسمبر |
| | محمد اسحاق صدیقی | مرقومہ ۸ دسمبر |
| | ع۔س۔مسلم | |
| | ریاض احمد چودھری، لاہور | |
| | ثناء اللہ بھٹہ، لاہور | |
| | باغ و بہار (مجلّہ) کراچی | |
| | افکار (مجلّہ) کراچی | |
| | سید اختر حسین، لاہور | |
| | ادب لطیف (مجلّہ) لاہور | |
| | تجلی (مجلّہ) کراچی | |
| | فضل الٰہی (فضل بک بائنڈر کراچی) | |
| | تحسین سروری (مرکزی اردو لائبریری) | |
| | محمد رحیم (چمن) | مرقومہ اگست ۵۶ء۔ |
| جنوری ۵۷ء | شاکی ارشدی | |
| جون ۵۷ء | اے بی راجپوت (سکریٹری، انجمن ناشران و تاجران کتب) | مرقومہ ۲۷ مئی ۱۹۵۷ء |
| جون ۵۸ء | مطبوعات مشرق | |
| جولائی ۵۸ء | محمد علی خاں | |
| اگست ۵۸ء | شہزادہ اعجاز مرادآبادی | |
| ستمبر ۵۸ء | قیس الفاروقی | |
| اکتوبر ۵۹ء | عبدالمجید سالک (آخری خط برنی کے نام) | مرقومہ ۱۴ ستمبر ۵۹ء۔ |
| جولائی ۶۱ء | تمکین کاظمی (برنی کے نام) | مرقومہ ۶ جولائی ۶۰ء |

| | | |
|---|---|---|
| اگست ۶۱ء | میر نذر علی درد کاکوروی بہ نام مدیر | |
| دسمبر ۶۱ء | منشی عبدالرشید اختر وارثی، کراچی | مرقومہ ۹ دسمبر ۶۱ء |
| | این۔ بی۔ سین۔ ناشاد، دہلی | |
| فروری ۶۲ء | منیجر عصمت، جوہر نسواں و بنات | |
| اکتوبر ۶۲ء | عندلیب شادانی | |
| اکتوبر ۶۳ء | ایم عباس اورنگ آبادی (امیر معاویہ کے موضوع پر) | |
| | شفیع محمد عثمان دہلوی (محمد حسین آزاد کے مضمون سے متعلق) | |
| دسمبر ۶۳ء | خواجہ غلام السیدین (عظمت رفتہ سے متعلق) | |
| | جلیل قدوائی (کتابی دنیا سے متعلق) | |
| جون ۶۵ء | محمد حبیب الرحمٰن، چٹاگانگ | مرقومہ ۲۳ مئی ۶۵ء |
| | حبیب احمد ندوی، کراچی | مرقومہ ۲۴ مئی ۶۵ء۔ |
| | آل احمد سرور، علی گڑھ | مرقومہ ۵ مئی ۶۵ء |
| جولائی ۶۵ء | جلیل قدوائی | |
| دسمبر ۶۵ء | شاہ حسن عطا | |
| جولائی ۶۷ء | ابن انشاء (طویل خط) کتابی دنیا سے متعلق ہے۔ | |

## ”زیر طبع کتابیں“:

یہ عنوان بھی پہلے شمارے ہی میں قایم کر دیا گیا تھا۔ اس عنوان کے تحت مختلف پبلی شروں کی زیر طبع کتابوں سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ اس کا انداز فہرستیں شایع کرنے کا نہیں تھا بلکہ برنی بیانیہ انداز میں طلع کرتے تھے۔ کتاب سے متعلق مکمل معلومات فراہم کی جاتی تھیں، کتاب کا سائز بھی بتایا جاتا تھا۔

اس عنوان کے قایم کیے جانے کا ایک مقصد تو یقیناً قاری کو مطبوعہ اور زیر طبع کتابوں سے آگاہ رکھنا ہے اور دوسرے اُن حضرات کو جو کتاب کی خریداری میں دل چسپی رکھتے، کتاب کی کمیت و کیفیت اور قدر و قیمت سے آگاہ کرنا بھی تھا۔

پہلے شمارے میں برنی درج ذیل کتابوں سے متعلق اطلاع دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً چند اطلاعات نقل کی جاتی ہیں:

عصمت بک ڈپو (کراچی) نے اعلان کیا ہے کہ وہ دسمبر ۱۹۵۵ء میں مولانا رازق الخیری کی مرتبہ کتاب ”مسلمان

مائیں''، شائع کر رہا ہے۔ کتاب ۱۶/۳۰x۲۰ سائز پر چھپیگی اور اس کے ۴۴۰ صفحات ہوں گے۔ قیمت ساڑھے پانچ روپے رکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں غیر مسلمانوں کے اعتراضات کا محققانہ جواب دیا گیا ہے جو وہ اسلام، پیغمبر اسلام اور ازواج مطہرات پر کرتے رہتے ہیں۔

اردو اکیڈمی سندھ، کراچی کا ادارہ دسمبر میں ۱''نظیر، اس کی شاعری اور عہد'' از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ۲''رہائی (Out of Red China) مترجمہ بشیر حسین ضیائی علیگ، ۳''فن تدریس'' (The Art of Teaching) مترجمہ پروفیسر مشرف علی انصاری، ۴''اردو ڈراما اور اس کی تاریخ و تنقید'' از عشرت رحمانی، ۵''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ۶''مختصر تاریخ ادب اردو'' از اعجاز حسین اور ۷''آبلہ دل کا'' (ناول) از ڈاکٹر احسن فاروقی شایع کر رہا ہے۔ اسی طرح سلطان حسین اینڈ سنز (کراچی)، فیروز سنز (لاہور)، مکتبہ الشرق (کراچی) اور شیخ غلام علی اینڈ سنز کی زیر طبع کتابوں سے متعلق معلومات دی ہیں۔

کتابوں کے اشتہار جو کتابی دنیا میں دیے جاتے تھے یہ سلسلہ اس کے علاوہ تھا اور اس کی نوعیت اُس سے مختلف تھی جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔

''شائع شدہ کتابیں'' کے عنوان سے بھی مختلف ناشروں کی کتابوں کی برنی اطلاع دیتے نظر آتے ہیں مگر یہ مستقل عنوان نہیں ہے اس کی نوعیت بھی اشتہار سے مختلف ہے۔ یہ کسی ناشر یا پبلی شر کی جانب سے نہیں بلکہ مدیر کی جانب سے ہے۔

## ''رسالوں پر طائرانہ نظر'':

''کتابی دنیا'' میں یہ عنوان اپریل ۱۹۶۲ء سے شروع ہوا۔ طائرانہ نظر کے متعلق مدیر رسالہ (برنی) کی جانب سے اس موضوع سے متعلق یہ وضاحت کی گئی:

> ان کالموں میں صرف ان رسالوں پر طائرانہ نظر ڈالی جاتی ہے جو بالعموم تبادلہ میں موصول ہوتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ قارئین کرام ادب کی رفتار سے واقف رہیں۔ ۔مدیر (۲۲)

بنیادی طور پر رسائل میں کتابوں اور رسالوں پر تبصرے اس لیے کیے جاتے رہے ہیں کہ قارئین تازہ کتب اور رسائل سے آگاہ ہو جائیں۔ جن افراد کی رسائل کتاب یا رسالے تک نہیں ہے وہ مبصر کی آنکھ سے کتاب یا رسالہ میں جھانک لے اگر قاری کی دل چسپی کی چیز ہوتی ہے تو وہ اس کے خریدنے کی فکر کرتا ہے۔

ایک یہ فائدہ بھی اس کے ذریعے قاری کو پہنچتا ہے کہ وہ تھوڑے وقت میں کم رقم میں یعنی صرف ایک رسالہ خرید کر وہ بہت سی کتابوں اور رسالوں کی کمیت و کیفیت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اگر چہ برنی نے ابتداء ہی میں واضح کر دیا کہ وہ طائرانہ نظر ڈالیں گے مراد اس سے یہ ہے گہری نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔ یہ صدق گوئی ہے کہ وہ اپنی مصروفیت میں سے یقیناً اتنا ہی وقت نکال سکتے ہوں گے چناں چہ اسی لیے انھوں نے ''طائرانہ نظر'' اس کا عنوان رکھا مگر سرسری نظر ڈال کر گزر جانا برنی کی فطرت میں نہیں تھا چناں چہ رسائل سے متعلق جب ان کی وضاحت کا بہ غور

جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے ایک ایک مضمون کو نہایت گہری نظر سے دیکھا ہے۔ وہ تنقید بھی کرتے ہیں۔ تحقیق کر کے اصل اور سچ بات بھی لکھتے ہیں۔ تسامحات کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ اچھی تحریر کی جائز تعریف بھی کرتے ہیں اور بے کار اور فضول تحریر کے عیوب بھی گناتے ہیں۔ یہ سب بہ غیر گہرے مطالعے کے نہیں ہوتا۔

وہ رسائل جن پر کتابی دنیا میں ''طائرانہ نظر ڈالی گئی ان میں سے چند کے نام درج کیے جاتے ہیں ۔وہ رسائل یا خاص نمبر جن پر تبصرہ کتب والے حصے میں تبصرہ کیا گیا ہے وہ اس کے علاوہ ہیں۔ اس کے بعد بعض تبصروں سے اقتباسات کے ذریعے مذکورہ دلائل کی تصدیق کی جائے گی۔

کتاب ( لکھنؤ)، بصائر ( کراچی)، سب رس ( حیدرآباد دکن)، عصمت ( کراچی)، فاران ( کراچی)، پیام حق ( کراچی)، قریش (دہلی)، صبح امید ( بمبئی)، جامعہ ( نئی دہلی)، ساقی ( کراچی)، معارف ( اعظم گڑھ)، اردو نامہ ( کراچی)، نگار پاکستان ( کراچی)، شاعر ( بمبئی)، جام نو ( کراچی)، نوائے ادب ( بمبئی)، محور ( کراچی)، نزہت ( لاہور)، منادی ( دہلی)، الشجاع ( کراچی)، اقبال ریویو ( کراچی)، سیارہ ( لاہور)، مشرق ( کراچی)، ادیب (علی گڑھ)، قومی زبان ( کراچی)، کتاب ( لکھنؤ)، کتاب (لاہور)، ہم قلم ( کراچی)، آج کل ( دہلی)، سیارہ (لاہور)، عصمت ( کراچی)، سفینہ ( کراچی)، پگڈنڈی ( امرتسر)، العلم ( کراچی)، صبح نقش ( کراچی)، سیارہ ڈائجسٹ (لاہور)، ادبی دنیا (لاہور)، رہنمائے تعلیم ( دہلی)، خاتون پاکستان ( کراچی)، فروغ اردو ( لکھنؤ)، نیرنگِ خیال ( لاہور)، عارف ( لاہور)، بیانِ اردو ( لاہور)، پیامِ تعلیم (نیو دہلی)، ماہ نو ( کراچی)، پیامِ حق ( کراچی)، ادبِ لطیف (لاہور)۔

اگست و ستمبر ۱۹۶۷ء کے شمارے میں ماہنامہ کتاب لاہور کا تعارف کروایا گیا ہے اور محض طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے جب کہ مذکورہ رسالے کے جون کے شمارے میں انڈیا آفس لائبریری کا مالک کون؟ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

> لیکن یہ کلیتاً صحیح نہیں ہے کہ اس لائبریری میں زیادہ حصہ لوٹ کھسوٹ کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی خود جا جا کر کلکٹروں کو قیمتی مخطوطے دیا کرتے تھے اور اس کے بدلے میں خطابات سے نوازے جاتے تھے۔ رجسٹری کتب کے قانون کے نفاذ کے بعد سے تو کتابیں باقاعدہ لندن بھیجی جاتی تھیں اور یہ سلسلہ تقسیم ہند تک قائم رہا۔(۲۳)

اسی طرح کتابی دنیا فروری ۶۶ء کے شمارے میں سیارہ ڈائجسٹ، لاہور کے جنوری کے شمارے کا تعارف کرواتے ہوئے اس میں مولانا محمد علی جوہر پر سراج نظامی کے مضمون کی ایک غلطی کی نشان دہی کروائی ہے کہ ''گول میز کانفرنس کے جس جلسے میں مولانا نے تقریر کی تھی اس کی تاریخ ۱۹ نومبر ہے نہ کہ ۱۹ دسمبر''۔ ان کی اس گرفت سے اندازا ہوتا ہے کہ وہ رسائل کو اور خاص کر اہم مضامین کو کس خاص توجہ سے پڑھتے تھے۔ علاوہ ازیں مولانا محمد علی جوہر کی حیات اور کارناموں پر ان کی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ مذکورہ غلطی بہ ظاہر معمولی ہے تاہم برنی نے اسے محسوس کیا بلکہ درست بھی کیا۔

تبصروں میں برنی کے نقطہء نظر کا پتا ان کے اس بیان سے بھی چلتا ہے، جس میں مولانا ماہر القادری کے ایک

مضمون ''فاران کی تنقیدیں'' پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ماہر کا یہ مضمون فاران اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ برنی لکھتے ہیں:

''فاران کی تنقیدیں'' موضوع ہے ایک طویل مضمون کا جس میں انھوں (مولانا ماہرالقادری) نے اپنے کیے ہوئے تبصروں سے بحث کی ہے اور دل چسپ انداز میں بتایا ہے کہ اس کا ردِ عمل کیا ہوا ہے۔ ہر ایڈیٹر کا جو پڑھ کر کتابوں پر تبصرہ کرتا ہے، قریب قریب یہی تجربہ ہے۔ صحیح تبصروں سے دشمن بنانا زیادہ آسان ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ میں نے دو رسالوں پر تنقید کی انھوں نے پرچہ بند کر دیا اور اپنے پندار میں بہت بڑی سزا دے ڈالی۔ بہر حال ماہر صاحب کا ''تبصرہ'' متوازن ہے اور اسے پڑھ کر ان کی نیت پر حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ (۲۴)

اس عنوان کے تحت اور بھی بہت سی مثالیں کتابی دنیا سے دی جاسکتی ہیں تاہم محدودیت کے باعث چند مثالیں دی جارہی ہیں۔ یقیناً اس سے برنی کے نقطہءِ نظر سمجھنا دشوار نہیں ہوگا۔

## ''تبصرہ ءِ کتب'':

اردو ادب میں مبصرِ کتب کی حیثیت سے برنی کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ برنی نے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۷ء تک ''بمبئی کرانیکل'' میں اردو کتابوں اور رسائل پر تبصرے لکھے۔ (۲۵) اس کے علاوہ انھوں نے اس میں مضامین بھی لکھے جس کی تفصیل تو برنی کہیں تحریر نہیں کر سکے تاہم عظمتِ رفتہ میں ایک واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد اتنا لکھا ''اس ہڑبونگ کا میرے دل پر بہت اثر پڑا اور میں نے سوچا کہ اگر غنڈا کردی کی قسم کی چیزیں ہماری سیاسی زندگی میں داخل ہوگئیں تو پھر ہماری آئینی ترقی کا خدا ہی حافظ ہے۔ میں نے اس ہنگامہ پر ایک شاہد کی حیثیت سے یکے بعد دیگرے تین گمنام مضمون ''کرانیکل'' میں شائع کرائے جن میں حکومت اور خلافتیوں کے طرزِ عمل پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی۔'' (۲۶)

اس اخبار میں برنی نے ''خوشہ چینیاں'' کے عنوان سے اردو اخبار سے اقتباسات انگریزی میں ترجمہ کر کے ہندوستان کے رہنماؤں کی اچھی تصویر پیش کیا کرتے تھے۔ یہ مضمون ہفتہ وار شایع ہوا کرتا تھا۔ (۲۷)

ممکن ہے کہ برنی نے بمبئی کرانیکل اور کتابی دنیا کے علاوہ اور بھی کسی اخبار اور رسالے میں تبصرے لکھے ہوں اس وقت سامنے نہیں آسکے ہیں سوائے ''العلم'' کراچی، اکتوبر ۱۹۵۱ء کے جس میں ''نقد و نظر'' کے عنوان سے تین کتابوں اور دو رسالوں کے خاص نمبروں پر تبصرے شایع ہوئے ہیں۔

تبصرہ ءِ کتب کا مقصد قاری کو تازہ تر شایع ہونے والی کتابوں سے واقف کروانا ہوتا ہے۔ بعض صاحبِ کتاب کی خواہش ہوتی ہے کہ صرف کتاب کے کوائف تحریر کر دیے جائیں اور ان پر تنقید نہ کی جائے۔ برنی کا طرز ایک مبصر کا طرز ہے جس کا کام کتاب کو پرکھ کر، جانچ کر اور تحقیق کر کے اپنی رائے قائم کرنا ہوتا ہے اور پھر قاری کو خوب و زشت سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے

کہ برنی منجھے ہوئے اہل قلم اور کارآگاہ مبصر تھے۔ بہت کم ان کے تبصرے ایسے ہیں جو ظاہر کرتے ہوں کہ انھوں کتاب کو سرسری نظر سے دیکھا ہو۔ اگر کتاب معمولی نوعیت کی ہوئی تو اس پر مختصر تبصرہ کیا اور اگر کتاب کو موضوع ان کی دل چسپی کا ہوا تو برنی نے نہایت مفصل اور جامع تبصرہ کیا جس سے کتاب کی قدر و قیمت واضح ہوگئی۔ ایسے تبصرے ایک مضمون کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ سردار دیوان سنگھ کی کتاب ''ناقابل فراموش'' پر ان کا تبصرہ اسی نوع کا ہے۔ تبصرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ برنی اس ضخیم کتاب کو بالاستعاب پڑھا چوں کہ یہ کتاب ان کی دل چسپی کی تھی چناں چہ مبصر کا قلم خوب دوڑا۔ (۲۸) سعید محمد خاں اے کی کتاب ''مولانا محمد علی'' پر بھی ان کا تبصرہ طویل ہے۔ برنی نے اس کتاب پسند کیا ہے اور اپنی پسندید کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ''اس رسالہ کا ایک ہی سب سے بڑا ''نقص'' یہ ہے کہ بہت مختصر ہے۔'' (۲۹) جمیل جالبی کی کتاب ''پاکستانی کلچر'' پر برنی کا تبصرہ بھی اس مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

بعض تبصروں سے برنی کے مذہبی خیالات بھی واضح ہو جاتے ہیں اور یہ امر بھی سامنے آجاتا ہے کہ مبصر کو کسی غلط بات پر خاموش نہیں رہنا چاہیے یا پہلو تہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ جراءت سے حق بات کا دفاع کرنا چاہیے۔

مولانا حکیم ابوالبرکات، عبدالرؤف دانا پوری کی کتاب ''اصح السیر'' پر تبصرہ کرتے ہوئے برنی نے ان کے بعض تسامحات پر اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا:

> پردہ کی بحث میں مولانا نے ''الا ما ظہر منہا'' میں چہرہ کو شامل کرنا نہیں چاہا ہے حالانکہ ایسی حدیثیں بھی ہیں جن میں آں حضرت نے چہرہ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اسلام نے در حقیقت جس شے سے منع کیا ہے وہ بے حیائی ہے اور مردوں اور عورتوں کے بے محابا اختلاط ہے اور بس۔ اس کی تعلیم کا مقصد ہر گز یہ نہیں ہے کہ عورتیں ''اپنے گھروں میں جمی بیٹھی رہیں۔'' بہر حال ضرورت تھی کہ اجتہاد سے کام لیا جاتا اور محض فقہا کی رائے نقل کرنے تک اپنے آپ کو محدود نہ رکھا جاتا۔
>
> اسی طرح حضرت عائشہ کی عمر کے بارے میں مزید چھان بین کی ضرورت تھی۔ مولانا نو برس لکھتے ہیں حالانکہ عیسائی مورخین نے باوجود مخالفت ان کی عمر دس سال سے اوپر بتائی ہے۔
>
> مولانا نے یہ حدیث درج کی ہے کہ آں حضرت ایک رات میں سب ازواج سے مل آتے تھے۔ یہ حدیث بدیہی طور پر کم زور ہے اسلیے کہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جس میں کہا گیا ہے: قل انما انا بشر مثلکم۔ حدیث کا مطلب محض یہ ہے کہ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا کہ آپ سب کے یہاں نہ ہو آتے ہوں۔ (۳۰)

اس کتاب میں بعض اور بھی پہلو ہیں جو برنی کی تنقید کا نشانہ بنے ہیں۔

تاریخی شخصیات اور تاریخی واقعات سے متعلق کتاب پر تبصرے میں بھی برنی کا قلم نہایت پر جوش ہو جاتا ہے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر سبق

آموز باتیں سامنے لاتے ہیں۔رنج بھی کرتے ہیں مگر پر عزم بھی رہتے ہیں۔

ملا واحدی کی تصنیف ''سوانح عمری خواجہ حسن نظامی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں ان الفاظ میں سراہتے ہیں ''بہر حال یہ کتاب خلوص اور صداقت کے جذبات سے بھرپور ہے اور چونکہ ع: دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے اس لیے یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا شمار ان کتابوں میں ہوگا جو ''ناقابل فراموش'' سمجھی جاسکتی ہیں۔''(۳۱)

ایسی کتابیں جن میں کسی مذہب یا فرقے پر جانب دارانہ تنقید کی گئی بلاوجہ کی تنقیص کی گئی یا ان میں توہین کا پہلو نکلا تو برنی نے اپنے نقطہ ءنظر سے معاملے کو صاف کیا اور ان پہلوؤں کی نشان دہی کی جن سے دل آزاری کا امکان تھا یا حقیقت پر ضرب لگتی تھی۔ایسے معاملات میں برنی کا قلم نہایت پرجوش اور رواں ہوجاتا ہے۔

ماہ نامہ ''جام نو'' کو رسائل طائرانہ نظر کے بہ جائے تبصرہ ءکتب میں جگہ دی اور اس اکتوبر ۱۹۶۷ء کے شمارے میں ایک تاریخ غلطی پر کیسی کڑی تنقید کی ہے:

> مجھے ایک مضمون پر اعتراض ہے جس میں جہاں آرا بیگم بنت شاہ جہاں کے ''فرضی عشق'' کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ایک انگریزی کتاب پر مبنی ہے جس میں مصنف نے جھوٹے اور بے بنیاد واقعات کو حقائق کو شکل دے دی ہے۔ یہ مضمون سرتاپا لغو ہے، اور اس قابل نہیں کہ اس پر ذرا بھی التفات کیا جائے۔
>
> میں چھے مہینے سے بیمار ہوں ورنہ یہ نوٹ اتنی تاخیر سے شائع نہ ہوتا۔ میں اس مضمون کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔(۳۲)

رشید احمد صدیقی کی خودنوشت ''آشفتہ بیانی میری'' پر ان کا تبصرہ ان کے بہت اچھے تبصروں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> انھوں نے طنز و مزاح کو شخصیت نگاری میں سمو کر ایک دل کش اور حسین امتزاج ''آشفتہ بیانی میری'' کی شکل میں پیش کیا ہے۔'آشفتہ بیانی میری'' بہ ظاہر ایک فرد کی خودنوشت حیات ہے لیکن وہ آپ بیتی ہی کیا جس کے ساتھ جگ بیتی نہ ہو۔(۳۳)

محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی اور بالخصوص جوہؔر سے برنی کو جو محبت اور عقیدت رہی ہے اس کا ذکر گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔کتابی دنیا میں بھی یہ پہلو بہت واضح ہوجاتا ہے۔برنی کو ''جوہریات'' پر جو دست رس حاصل ہے وہ بہت کم لوگوں کو رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ برنی جوہؔر سے متعلق کوئی غلطی نہ برداشت کرتے ہیں اور نہ نظر انداز۔

رئیس احمد جعفری کی کتاب ''علی برادران'' شایع ہوکر تبصرے کے لیے آئی تو برنی نے اس کا بہ غور مطالعہ کیا۔ظاہر ہے یہ ان کا اپنا موضوع رہا تھا اور اسی زمانے میں وہ مولانا پر ایک کتاب تصنیف کررہے تھے جو برنی کی وفات کے بعد اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے مارچ ۲۰۰۱ء میں ''حیاتِ مولانا محمد علی جوہؔر'' کے نام سے شایع کی، چناں چہ انھوں نے اس کے بعض پہلوؤں پر سخت تنقید کی:

میں کہہ سکتا ہوں کہ بعض واقعات کے بارے میں مرتب کے مشاہدات یا تو سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں یا پھر ان کی یادداشت نے ان کی رفاقت نہیں کی۔ کریمی پریس والے واقعہ کے بیان کرنے میں ان سے کچھ کوتاہیاں ہوئی ہیں جس کی وجہ سے تفصیلات مبالغہ آمیز بن گئی ہیں۔(۳۴)

جولائی ۶۴ء میں ''حیات حسن'' پر برنی کا تبصرہ بھی اچھے تبصروں میں شمار ہوتا ہے اس میں ان کی انصاف پسندی اور مذہبی رواداری نمایاں نظر آتی ہے۔

بچوں کی کتابوں کے تبصرے سے متعلق برنی نے نہایت حقیقت پسندانہ اور دل چسپ بات لکھی ہے۔ ''جب کبھی میرے پاس بچوں کی کتابیں آتی ہیں تو میں اپنے بچوں کے حوالے کر دیتا ہوں اور ان کی رائے کے مطابق ریویو لکھتا ہوں۔'' (۳۵)

برنی کے تبصروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے ''کتابی دنیا'' کے آغاز ہی سے ''تبصرے'' کے عنوان سے تبصرہ کتب کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ یقیناً برنی تبصرہ کتب کو وفیات اور خبروں ہی کی طرح اہم سمجھتے تھے۔ یہ عنوانات یادوں کو تازہ کرنے تاریخ کو یاد رکھنے اور حال سے باخبر رکھنے والے ہیں۔

تبصروں کے لیے آنی والی کتابوں کے لیے برنی نے رسالے ہی میں ہدایت کر دی تھی کہ وہ کتاب کی ایک ہی جلد ارسال فرمائیں۔ یہ بالکل منفرد مثال تھی ورنہ رسالوں کے مدیران دو کتابوں کا مطالبہ کیا کرتے ہیں۔

جون ۶۰ء کے کتابی دنیا میں برنی کے تبصرے نہیں ہیں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ برنی بیمار تھے۔(۳۶)

کتابی دنیا میں برنی کے علاوہ بعض دوسرے تبصرہ نگار نظر آتے ہیں جیسے وحشی محمود آبادی، وفا راشدی، احسن فاروقی، ادریس صدیقی، بیگم انیس خالد، زبید احمد، علاء الدین خالد، ممتاز حسن اور کمال کبریا وغیرہ۔

آخر میں کتابی دنیا سے بعض کتابوں اور رسائل کے خاص نمبروں کی مختصر فہرست دی جا رہی ہے۔ دسمبر ۵۵ء

| | | |
|---|---|---|
| اقبالیات کا تنقیدی جائزہ | | قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی |
| فروری ۵۶ء | تذکرہ اہل دہلی | سرسید احمد خاں |
| مئی ۵۶ء | مکاتیب اقبال | نیاز الدین خاں |
| | اقبال اور ملا | خلیفہ عبدالحکیم |
| | یارانِ کہن | عبدالمجید سالک |
| | ڈھائی ہفتہ پاکستان میں | عبدالماجد دریابادی |
| | اقبال (مجلّہ) | بزم اقبال |
| جون ۵۶ء | شمائل ترمزی | مولانا محمد زکریا سہارنپوری |

ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات کی نشو ونما　ڈاکٹر محمد اقبال

| | | |
|---|---|---|
| جولائی ۵۶ء | حکمت قرآن | جرنیل محمود مختار پاشا |
| | تقاریر یوم اقبال | بزم اقبال |
| | علامہ اقبال | آقائی مجتبیٰ مینوی مترجم صوفی غلام مصطفیٰ تبسم |
| | اصول قانون | احمد عبداللہ المسدوسی |
| | پاکستان میں اردو کا المیہ | بابائے اردو |
| اپریل ۵۶ء | کتاب (ماہنامہ) | |
| | ذکر اقبال | عبدالمجید سالک |
| | مسلمانوں کی مائیں | مولانا رازق الخیری |
| | ببلیوگرافی آف اقبال | عبدالغنی و خواجہ نور الٰہی |
| اگست ۵۶ | منٹو (میرا دوست) | محمد اسداللہ |
| | کربلا کی کہانی | الیاس احمد مجیبی |
| | اقبال (ماہ نامہ) | بزم اقبال |
| | مرغی اجمیر چلی | ڈاکٹر ذاکر حسین |
| ستمبر ۵۶ء | سیرۃ الرسول | شاہ ولی اللہ |
| | بھگوت گیتا منظوم | شیشور پرشاد منور |
| | منادی کا خواجہ نمبر | خواجہ حسن ثانی نظامی |
| | قدیم خورجہ | تقی محمد خان |
| | ساز صدف | عدم |
| اکتوبر ۵۶ء | مرقع شعرا | ممتاز حسن (مبصر) |
| | مثنویات میر بخط میر | ممتاز حسن (مبصر) |
| | آہنگ موسیقی | ممتاز حسن (مبصر) |
| | خیابان پاک | ممتاز حسن (مبصر) |
| نومبر ۵۶ء | بہادر شاہ اور ان کا عہد | رئیس احمد جعفری ندوی |
| | نظام معاشرہ اور تعلیم | برٹرانڈرسل / جی۔آر۔عزیز |
| | شخصیات نمبر (نقوش) | محمد طفیل (مدیر) |
| | اقبال (مجلّہ) | بزم اقبال |

| | | |
|---|---|---|
| جنوری ۵۷ء | اردو زبان کا ارتقا | ڈاکٹر شوکت سبزواری |
| مارچ ۵۷ء | اسلام اور جنسیات | بدر شکیب بی اے |
| | نیا راہی (مجلّہ) | مدیر: ع۔س۔ مسلم |
| | تاریخ آزاد پٹھان | اللہ بخش یوسفی |
| اپریل ۵۷ء | مشاہیر جنگ آزادی | مفتی انتظام اللہ شہابی |
| | مختصر تاریخ ادب اردو | ڈاکٹر سید اعجاز حسین |
| مئی ۵۷ء | موازنہء اسلام کمیونزم | مرزا بشیر احمد |
| | بنگال میں اردو | وفا راشدی |
| | حیات حضرت امیر خسرو | خان بہادر نقی محمد خان |
| | فروغ اردو (جنگ آزادی نمبر) | ناشر: محمد حسین شمس |
| جون ۵۷ء | اشتراکیت اور اسلام | ڈاکٹر محمد صغیر حسن المعصومی |
| | فن تدریس | مشرف علی انصاری |
| | ادارہء ادبیات اردو | |
| | دانش عرب وعجم | غلام جیلانی برق |
| | فن اور تنقید | انور کمال حسینی |
| | نفسیات (مجلّہ) | جناح کالج |
| جولائی ۵۷ء | انتخاب غالب | ممتاز حسن |
| | حیات آشوب | امداد صابری |
| | اقبالیات | قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی |
| اپریل ۵۸ء | اردو نثر کا تاریخی سفر | محمد زبیر |
| | مولانا محمد علی | سعید محمد خاں |
| مارچ ۶۷ء | علامہ اقبال کی داستان دکن | میر محمود حسین |
| | بہترین مقالات | اختر جعفری |
| اگست وستمبر ۶۷ء | محاورات غالب | نریش کمار شاد |
| | فارس اور سلمان فارسی | محمد سلطان نظامی |
| | سب رس پر ایک نظر | ڈاکٹر سہیل بخاری |

| | | |
|---|---|---|
| اکتوبر ۶۷ء | لغات القرآن | مولوی شہید الدین |
| | ادبی خطوط غالب | مرا محمد عسکری |
| | انتخابات کلام وجد | سکندر علی وجد |
| | مشرق (خاص نمبر) | |
| نومبر ۶۷ء | مولانا شبلی | سعید انصاری |

علامہ اقبال سے برنی کو خاص عقیدت تھی۔اس کا اظہار مذکورہ تبصروں میں بھی نظر آئے گا۔اقبال پر برنی کے تبصروں کے حوالے علاحدہ سے دیے جا رہے ہیں تا کہ اُس تعلق خاطر کو بآسانی دیکھا جا سکے:

۱۔اقبالیات کا تنقیدی جائزہ از قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، اقبال اکیڈمی کراچی۔کتابی دنیا، دسمبر ۵۵ء،ص ۱۴۔

۲۔ذکر اقبال از مولانا عبدالمجید سالک، بزم اقبال، لاہور، کتابی دنیا، اپریل ۵۶ء۔۱۱

۳۔ببلیو گرافی آف اقبال از عبدالغنی وخواجہ نورالہی، بزم اقبال، لاہور، کتابی دنیا، اپریل ۵۶ء۔۱۴

۴۔مکاتیب اقبال، بزم اقبال، لاہور، کتابی دنیا مئی ۵۶ء۔۱۳۔

۵۔اقبال اور ملا از خلیفہ عبدالحکیم، بزم اقبال، لاہور، کتابی دنیا مئی ۵۶ء۔۱۳۔

۶۔مجلّہ اقبال، بزم اقبال، لاہور، کتابی دنیا مئی ۵۶ء۔۷!

۷۔ایران میں فلسفہء مابعد طبیعات کی نشو و نما، بزم اقبا، لاہور، کتابی دنیا جون ۵۶ء۔۱۵

۸۔علامہ اقبال از آقائی مجتبیٰ مینوی مترجم صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، بزم اقبال، لاہور، کتابی دنیا جولائی ۵۶ء۔۸

۹۔مجلّہ اقبال، بزم اقبال، لاہور، کتابی دنیا اگست ۵۶ء۔۵

۱۰۔مجلّہ اقبال، بزم اقبال، لاہور، کتابی دنیا، نومبر ۵۶ء۔۹

۱۱۔اقبالیات از قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، تبصرہ ممتاز حسن، کتابی دنیا جولائی ۵۷ء۔۱۳

۱۲۔مجلّہ اقبال، بزم اقبال، لاہور، کتابی دنیا، دسمبر ۵۷ء۔۴

## کتابی دنیا کا ''اقبال نمبر'':

کتابی دنیا کا اقبال نمبر اپریل ۱۹۶۶ء میں شایع ہوا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب برنی عارضہء قلب میں مبتلا تھے۔چناں چہ جس شان سے نمبر نکلنا چاہیے تھا اُس شان سے نہیں نکل سکا۔ممکن ہے کوئی اور وجہ بھی ہو جو میرے علم میں نہیں آئی ہے۔بڑی وجہ غالباً یہی ہے۔

اگر چہ یہ نمبر ۸۶ صفحات پر مبنی تھا تا ہم اس میں اقبال پر خاطر خواہ لوازمہ نہیں پایا جاتا۔اداریہ بھی ادریس صدیقی کا تحریر کردہ ہے تا ہم اُس کا موضوع اقبال نہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نمبر ارادے سے نہیں بنایا گیا بلکہ بنا دیا گیا۔براہ راست اقبال پر تازہ مضمون ایک ہے شاہ حسن عطا کا ''اقبال اور بیداریِ ایشیا'' برنی کا مضمون ''بیا بہ مجلس اقبال'' شامل کیا گیا ہے جو ۱۹۶۱ء میں برنی کی تصنیف ''عظمتِ

رفتہ'' میں شایع ہو چکا تھا غالباً یہ مضمون اس لیے شامل کر دیا گیا ہو کہ برنی بیمار تھے۔ ایک مضمون '' آغا حشر کاشمیری۔ شکریہ یورپ'' منشی اختر وارثی کا، برنی کی وضاحت کے ساتھ کہ ''اسی مہینے ۲۸ تاریخ کو آغا حشر کاشمیری کی بھی برسی ہے جن کا انتقال لاہور میں ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا۔ اس موقع پر ان کے ایک ممتاز رفیق کار اور میرے دوست منشی اختر وارثی نے یہ چھوٹا سے مضمون لکھ کر عنایت کیا ہے۔ منشی صاحب بہ نفس نفیس انجمن حمایت اسلام کے اس جلسہ میں موجود تھے جس میں آغا صاحب نے ''شکریہ یورپ'' جیسی روح پرور نظم ڈاکٹر اقبال کی موجودگی میں پڑھی تھی۔''

''فرمودات اقبال (تہذیب فرنگ کے بارے میں)'' کے عنوان سے برنی نے اقبال کے فارسی اور اردو کلام سے مذکورہ موضوع پر چند شعر نقل کیے ہیں اور اقبال اکیڈمی کراچی کے طاعتی کام کی ایک رپورٹ شایع کی ہے۔ یہ کل سرمایہ اس نمبر کی ملکیت ہے۔ جیسا کہ گزشتہ اوراق میں تحریر ہو چکا ہے کہ برنی اقبال سے تعلق خاطر رکھتے تھے اور تحریر و تقریر کے ذریعے وہ اس کا اظہار بھی کر چکے ہیں چناں چہ اس نمبر میں بھی ان کے جذبات کا اظہار ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا خواہ وجہ کچھ بھی رہی ہو اس نمبر کو اقبال پر شایع ہونے رسائل کے نمبروں کے مقابلے میں رکھنے سے یہ کوئی بلند مقام حاصل نہیں کر پاتا بس ایک نمبر ہے اور کچھ نہیں۔

کتابی دنیا باقاعدگی سے نکلتا رہا اور کبھی وقفہ نہیں آیا۔ برنی کی مسلسل علالت کے باعث ۱۹۶۸ء میں رسالہ وہ باقاعدگی برقرار نہیں رکھ سکا جو اس کا امتیاز تھا۔ جنوری فروری مارچ اور اپریل مئی اور جون کے شمارے مشترکہ نکالے گئے۔ ''تبصرے'' ۔مطبوعہ جدیدہ کے تحت کتابوں کے علاوہ رسالوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ برنی صاحب نے رسالوں کے لیے'' طائرانہ نظر'' کا عنوان قائم کر رکھا تھا۔ اپریل مئی اور جون والے شمارے میں برنی کے تبصرے نہایت مختصر ہو گئے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب'' کتابی دنیا'' پر برنی کا کنٹرول کم ہو گیا چناں چہ بعض تبدیلیاں اسی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ تاہم رسالہ جاری رہا۔

جیسا کہ گزشتہ اوراق میں لکھا جا چکا ہے کہ برنی کو مولانا محمد علی جوہر، اقبال اور مولوی عبدالحق سے خاص عقیدت تھی۔ کتابی دنیا میں مضامین میں، خبروں میں، اقتباسات اور نوٹ وغیرہ میں انھوں نے ان حضرات کی یاد کو زندہ رکھا ہے۔ تمام تفصیل کئی صفحات پر چلی جائے گی چناں چہ صرف اشارۃً ان شماروں کی نشان دہی کی جا رہی جن میں ان حضرات کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے آ گیا ہے:

## علامہ اقبال:

کتابی دنیا جولائی ۶۰ء ص ۳

کتابی دنیا مئی جون ۶۱ء ص ۱۷، ۱۸

کتابی دنیا مارچ ۶۲ء ص ۱۴

کتابی دنیا دسمبر ۶۱ء ص ۹

کتابی دنیا ستمبر ۶۱ء ص ۱۰

کتابی دنیا اگست ۶۱ء ص ۴

کتابی دنیا دسمبر ۵۵ ص ۱۴

کتابی دنیا اپریل ۵۶ ص ۷

کتابی دنیا اپریل ۵۶ ص ۱۱

کتابی دنیا اپریل ۵۶ ص ۱۴

کتابی دنیا مئی ۵۶ ص ۴

کتابی دنیا مئی ۵۶ ص ۱۰

کتابی دنیا مئی ۵۶ ص ۱۳

کتابی دنیا مئی ۵۶ ص ۱۷

کتابی دنیا دسمبر ۵۷ ص ۴

کتابی دنیا اکتوبر نومبر دسمبر ۶۷ ص ۲۹

کتابی دنیا اکتوبر نومبر دسمبر ۶۷ ص ۲۴

**مولانا محمد علی جوہر:**

کتابی دنیا، جنوری ۶۰ء، ص ۱۶

کتابی دنیا، فروری ۶۱ ص ۱

کتابی دنیا مارچ ۶۲ء ص ۱۵

کتابی دنیا جون ۶۴ ص ۲۵

کتابی دنیا مئی اکتوبر ۶۴ ص ۷

کتابی دنیا جون ۶۵ ص ۱۰۔۱۱

کتابی دنیا اکتوبر ۶۶ ص ۲۱

کتابی دنیا جنوری ۵۶ ص ۲

کتابی دنیا اپریل ۵۶ ص ۳

کتابی دنیا اپریل ۵۸ ص ۱۰۔۱۱

کتابی دنیا جون ۵۸ ص ۸

**مولوی عبدالحق:**

کتابی دنیا ستمبر ۶۲، ص ۱۲۔۱۱

کتابی دنیا جنوری ۶۰، ص ۵

کتابی دنیا مئی ۶۰،ص ۷۔۶

کتابی دنیا مئی ۶۲،ص ۱۱

کتابی دنیا فروری ۶۲،ص ۱۲

کتابی دنیا اگست ۶۱ ٹائٹل،ص ۲، ۱۴

کتابی دنیا نومبر ۶۶،ص ۱۹۔

کتابی دنیا اکتوبر ۶۶،ص ۱۸

کتابی دنیا فروری ۵۶،ص ۷

کتابی دنیا جون ۵۸،ص ۱ (''انجمن ترقی اردو پاکستان'' مولوی عبدالحق کا دفاع)

کتابی دنیا ستمبر ۵۸ء۔ ۷ (خیالات مولوی عبدالحق) مولوی عبدالحق کی تحریروں سے اقتباسات

کتابی دنیا اکتوبر ۵۸ء، ۹۔ انجمن ترقی اردو کا المیہ از مولوی عبدالحق

ڈاکٹر عبدالحق کا نیا عہدہ، اردو ڈکشنری کمیٹی کے مدیر اعزازی، کتابی دنیا دسمبر ۵۸، ۵

برنی کے انتقال کے بعد رسالہ جاری تو رہا مگر وہ باقاعدگی برقرار نہیں رکھ سکا بلکہ بند ہو کر بعض نئی تبدیلیوں کے ساتھ دوبارہ جاری ہوا مگر پھر نہیں نئی زندگی نہیں پا سکا۔ برنی کے بعد ادارت کی ذمے داری علاء الدین کے سپرد ہوئیں۔

مجموعی طور پر جب اس رسالے کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کتابی دنیا میں برنی کی خدمات سب سے زیادہ ہیں۔ انھوں نے ہر حالت میں اس کی باقاعدگی کو برقرار رکھا۔ ان کے نام بیشتر خطوط ایسے ہیں جن میں کتابی دنیا کا تذکرہ ہے۔ بعض میں کتابی دنیا کی وصولیابی کی رسید دی گئی ہے۔ بعض میں اس کی خوبیاں گنائی جارہی ہیں اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا جارہا ہے۔ بعض خطوط میں برنی کے مطالبے پر کتابی دنیا کے لیے کچھ بھیجنے کی اطلاع دی جارہی ہے۔ بعض میں رسالے کے چندے کا تذکرہ ہے۔ بہرحال رسالے کو سامنے رکھیں تو اول تا آخر یہ نظر آتا ہے کہ برنی نے اپنا وقت، صلاحیت اور سرمایا سبھی کچھ رسالے کے لیے وقف کیا اور اس کا مقصد علم و ادب اور اردو زبان کی خدمت تھا۔ انھوں نے یہ رسالہ ہی کیا تمام عمر اردو ہی کی خدمت کی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ضیاء الدین احمد برنی حیات رہتے تو رسالہ کتابی دنیا اور ترقی کرتا اور ایک خالص ادبی صورت اختیار کر لیتا۔

## حواشی و تعلیقات:

۱۔　یہ رسالہ انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی کے شعبہ تحقیق میں دیکھا گیا۔

۲۔　علاءالدین خالد کا انٹرویو، ماہنامہ کتاب، فروری ۱۹۶۷۔

۳۔　اداریہ، کتابی دنیا، ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۲۔

۴۔　''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' از سید یوسف بخاری کتابی دنیا دسمبر ۵۵ء ص ۱۱۔

۵۔　اداریہ، کتابی دنیا، ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۲۔۳۔

۶۔　اداریے پر کسی کا نام درج نہیں۔ اکثر اداریے علاءالدین خالد نے لکھیں تاہم برنی بھی اداریہ لکھا کرتے تھے۔ مذکورہ اداریے کے متعلق معلوم نہیں ہوسکا کہ کس کا تحریر کردہ ہے۔

۷۔　کتابی دنیا، فروری ۱۹۵۶ء، ص ۹۔

۸۔　اداریہ، کتابی دنیا، ستمبر ۱۹۸۹ء۔

۹۔　''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' کتابی دنیا، دسمبر ۱۹۵۵ء ص ۱۲۔

۱۰۔　اس سلسلے میں کتابی دنیا کے شمارے گواہ ہیں کہ جن میں انجمن کی کارروائی اور اس سے متعلق خبریں شایع ہوتی تھیں۔

۱۱۔　غالباً ان دونوں میں کوئی فرق نہیں تھا اردو اور انگریزی کا فرق تھا۔

۱۲۔　جون ۱۹۶۴ء کے کتابی دنیا میں ''وفیات'' کے ذیل میں برنی نے ان سے متعلق یہ معلومات فراہم کی ہیں: وہ جنگ آزادی کے زبردست سپاہی تھے۔ شاعر بھی تھے۔ انھوں نوید، غریب کی دنیا، ستارہ کے نام سے اخبار اپنے وطن پٹنہ سے جاری کیے۔

۱۳۔　کتابی دنیا، جون ۱۹۶۴ء ص ۱۷۔

۱۴۔　اداریہ، کتابی دنیا، جنوری ۱۹۵۶ء۔

۱۵۔　ایضاً، ص ۲۔

۱۶۔　کتابی دنیا، جنوری ۱۹۶۶ء۔

۱۶۔　کتابی دنیا، جنوری ۱۹۵۶ء، ص ۲۔

۱۷۔　کتابی دنیا، مئی ۵۶ء ص ۶۔

۱۸۔　کتابی دنیا، مارچ ۵۶ء ص ۱۲۔

۱۹۔　کتابی دنیا، مارچ ۵۶ء ص ۱۲۔

۲۰۔　کتابی دنیا، نومبر ۵۶ء ص ۱۵۔

۲۱۔　کتابی دنیا، فروری ۵۶ء ص ۹۔

۲۲۔　کتابی دنیا، اکتوبر، ۶۵ء، ص: ۱۳۔

۲۳۔　کتابی دنیا، اگست و ستمبر، ۱۹۶۷ء، ص ۳۱۔

۲۴۔　کتابی دنیا، اکتوبر ۶۵ء، ص ۱۴۔

۲۵۔ ''سید عبداللہ بریلوی، عظمتِ رفتہ، ص ۲۹۹۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۳۰۴۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۹۹۔

۲۸۔ کتابی دنیا، فروری، ۵۸ء۔

۲۹۔ ایضاً، اپریل ۵۸ء۔

۳۰۔ ایضاً، جون ۵۸ء۔

۳۱۔ ایضاً، جولائی ۵۸ء۔

۳۲۔ ایضاً، اپریل، مئی، جون ۶۸ء۔

۳۳۔ ایضاً، اکتوبر ۵۹ء۔

۳۴۔ ایضاً، جون ۶۴ء۔

۳۵۔ ایضاً، جنوری ۵۸ء ص ۱۰۔

۳۶۔ ایضاً، شمارہ جون ۶۰ء ص ۹۔

۳۷۔ ''اداریہ''، کتابی دنیا، جنوری ۶۶ء۔

# باب ہشتم

## غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں کا تحقیقی جائزہ

☆۔دست یاب، مرتب و مدون، غیر مطبوعہ کتب

☆۔وہ کتب جن کا صرف ذکر ملتا ہے

☆۔''میری ادبی زندگی کے بارے میں''

☆۔مطبوعہ اور مدون مضامین

☆۔غیر دست یاب (گم شدہ) مضامین

☆۔دست یاب، غیر مدوّن و مرتب کتب

☆۔یادداشتیں

☆۔ڈائری

☆۔مطبوعہ غیر مدون ادبی مضامین

☆۔مجموعی جائزہ ء کتب و مضامین

# باب ہشتم:

# غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں کا تحقیقی جائزہ

برنی کی غیر مطبوعہ اور غیر مدون تحریروں کی نوعیت دو طرح کی ہے ایک مضامین کی صورت میں اور دوسری کتابوں کی صورت میں۔ ان میں وہ مضامین اور کتب بھی شامل ہیں جو دست یاب ہیں اور وہ بھی جو دست یاب نہیں ہیں مگر ان کے حوالے موجود ہیں۔ جب کہ بعض مضامین اور کتب وہ ہیں جن کا صرف ذکر ملتا ہے مگر کوئی باوثوق ذریعہ ان تک رسائی کا دست یاب نہیں ہو سکا۔ ان تحریروں کو دو حصوں میں منقسم کر کے جائزہ لیا جائے گا۔

**ا۔ حصہ اول: کتب**

**۲۔ حصہ دوم: مضامین**

## حصہ اوّل، کتب:

پہلا حصہ تین حصوں میں تقسیم ہے ایک اُن کتابوں پر مشتمل ہے جو دست یاب ہیں، مرتب و مدون بھی کی گئیں مگر زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکیں۔ دوسرا حصہ ان کتابوں پر مشتمل ہے جو دست یاب نہیں اور جن کے محض حوالے موجود ہیں۔ تیسرا حصہ ان کتابوں پر مشتمل ہے جن کا صرف ذکر ملتا ہے اور ان تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں۔

اولاً برنی کی ان تمام کتابوں کی ترتیب وار فہرست دی جا رہی ہے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے اور اس کے بعد ہر حصے کا مکمل جائزہ لیا جائے گا۔

(الف): دست یاب، مرتب و مدوّن، غیر مطبوعہ کتب:

۱۔ ''لارڈ رپن کا عہد حکومت''

۲۔ ''صنائع بدائع''

۳۔ ''خطوطِ مشاہیر''

۴۔ Jesus Christ - A critical study of the Four GOSPELS

(ب): وہ کتب جو دست یاب ہیں مگر غیر مدون و مرتب ہیں:

۱۔ ''مشاہیرِ عالم''

۲۔ ''یادداشتیں''

۳۔ ''میری ادبی زندگی کے بارے میں'' (خودنوشت حالات)

۴۔ ''ڈائری''

(ج): وہ کتب جن کا صرف ذکر ملتا ہے:

۱۔ ''سلطان محمود غزنوی''

۲۔ ''انگریزی مضامین کا مجموعہ''

۳۔ ''اردو مضامین کا مجموعہ''

۴۔ ''تعلیم کے چار پہلو''

۵۔ ''خالدہ ادیب خانم''

۶۔ ''رنگیلا رسول''

۷۔ ''حیات و خدمات مولانا محمد علی جوہر''

## (الف): وہ کتب جو مرتب و مدون ہیں، دست یاب بھی ہیں، مگر زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں:

### ۱۔ ''لارڈ رپن کا عہد حکومت'' (۱۹۲۶ء):

برنی نے اپنی اس کتاب سے متعلق یہ معلومات فراہم کی ہیں ''میری تیسری کتاب بلنٹ Blunt کی مشہور کتاب ''لارڈ رپن کا عہد حکومت'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب میں نے چالیس سال قبل ''نگار'' کے لیے ترجمہ کی تھی۔ میرا ترجمہ ''نگار'' میں ماہ بہ ماہ چھپتا تھا۔ یہ تاریخ ہند کی اہم کڑی ہے۔''

برنی کی مذکورہ کتاب ''نگار'' لکھنؤ میں، جنوری ۱۹۲۶ء سے ماہ بہ ماہ چھپنا شروع ہوئی اور کئی ماہ میں مکمل ہوئی۔

برنی اس مضمون کے آغاز میں لکھتے ہیں:

میں نے اس کتاب کا ترجمہ ایسے زمانے میں کیا تھا جب کہ تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی۔ بعض وجوہ سے میرے اختیارات سے باہر تھے۔ میں اب اس کی اشاعت کرنے سے قاصر رہا۔ اب جب کہ ملک کی فضا میں ایک گونہ سکون پیدا ہوگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کتاب کی اشاعت جو اپنی وضع میں عجیب وغریب ہے، بہت مفید ثابت ہوگی۔ اس میں بہت سے ایسے امور سے بحث کی گئی ہے جو آج بھی ویسے ہی صحیح ہیں جیسے کہ ۱۸۸۶ء میں تھے جب کہ مصنف نے اپنا سفر اختیار کیا تھا، بعض بعض جگہ مصنف کی غیر معمولی فہم وفراست اور دماغی قابلیت خراج تحسین وصول کیے بغیر نہیں رہ سکتی کیوں کہ (میرے علم میں) یہی پہلا انگریز ہے جس نے تحریک عدم تعاون کے شروع کے کئی سال پیشتر یہ پیشن گوئی کردی تھی ایک زمانہ ایسا آئے گا جب ہندوستانی نان کواپریشن کرنے پر مجبور ہوں گے۔ بہر حال نہیں کہا جاسکتا کہ وہ نان کواپریشن جس کا خواب مصنف نے دیکھا تھا پورا ہوچکا یا اس تعبیر باقی ہے۔ بہر حال سوچنے والے شخص کے لیے غور وفکر کرنے کے واسطے اس کتاب میں بہت کچھ مفید مواد ملے گا۔

اس کتاب کی اشاعت ایک اور لحاظ سے بھی مفید ہے یعنی یہ کہ ہمارے ملک کے سیاحوں کو سفر کی صحیح یادداشتیں رکھنے کا طریقہ معلوم ہوجائے گا اور یہ کہ کس طرح سے ایک معمولی واقعہ کو پڑھنے والے کے لیے زیادہ دل چسپ بنایا جاسکتا ہے۔(۱)

اس کتاب میں لارڈ رپن (۲) کے عہد حکومت کے واقعات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں جدید تحریک آزادی جنم لے کر اپنے ابتدائی زمانے سے گزر رہی تھی۔ اس میں ان واقعات کی پیشن گوئی کی گئی ہے جو اُس دور میں وقوع پذیر ہورہے تھے جب یہ کتاب ترجمہ کی گئی۔ بنیادی طور پر یہ مضمون تاریخ سے متعلق ہے تاہم اسے زبان وبیان کے علاوہ اس نظر سے بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ برنی بہ حیثیت ایک ادیب اپنے ماحول سے بے خبر نہیں تھے بلکہ قوم وملک کے لیے فکری ذہن رکھنے والے شخص تھے۔ حقائق کی بازیافت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

برنی نے اپنی آخری تحریروں میں اسے قابلِ اشاعت قرار دیا ہے۔ ''کتابی دنیا'' اگست تمبر ۱۹۶۷ء کے شمارے میں اردو اکیڈمی سندھ، کراچی کی جانب سے شائع جانے کی اطلاع شائع ہوئی تھی۔ خیال اغلب ہے کہ کتاب کا مسودہ اکیڈمی کو دے دیا گیا اور اس کی کاپی برنی کے پاس محفوظ نہیں رہی ہو، تاہم یہ مکمل مسودے کی صورت میں دست یاب نہیں ہوسکی ہے۔ نگار سے تمام اقساط مجتمع کر کے شائع کیا جانا چاہیے۔

## ۴۔ صنائع بدائع:

برنی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف۔ جن کا ذکر انھوں نے اپنی آخری ذاتی تحریروں میں کیا ہے یا کہیں اور کسی مقام

پر اُن کا ذکر آ گیا ہے، ان کے علاوہ بھی کچھ مکمل اور کچھ نامکمل مسودے ان کے کاغذات میں ملے ہیں، ان میں سے جو اردو تصانیف ہیں ان میں سب سے اہم کتاب ''صنائع بدائع'' ہے جسے انھوں نے بڑے سلیقے اور غیر معمولی خوش خط انداز میں اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ یہ کتاب اکانوے صفحات پر مشتمل ہے۔

فارسی اور اردو شعری ادب میں حسنِ کلام کے لیے مستند صنعتوں کے استعمال کو تسلیم کیا گیا ہے۔ برنی نے اُن فارسی اور اردو کی قدیم اور مروجہ صنعتوں کی تعریفات تحریر کی ہیں اور اردو اور فارسی اشعار کی مثالوں سے ان تعریفات کو زیادہ جامع اور پرمعنی بنایا ہے۔ علاوہ ازیں حواشی کے اہتمام سے ان کی معنویت کو اور بھی زیادہ واضح اور وقیع بنا دیا ہے۔ ان کے اس اہتمام سے ان کے تحقیقی رجحان کا پتا چلتا ہے۔

ایک تو وہ زمانہ کہ جب فارسی کا چلن عام تھا اور جس کا اختیار کرنا مہذب و مؤدب ہونے کی نشانی تھی اس پر مستزاد برنی نے ابتداً مولوی محمد اسحاق دہلوی رامپوری سے فارسی پڑھی پھر الہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے سال اول کا امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ فارسی سے برنی دل چسپی سے متعلق تفصیلاً گزشتہ اوراق میں لکھا جا چکا ہے۔

بہ قول ریاض احمد برنی (۳) غالباً برنی نے یہ اپنے زمانۂ طالب علمی میں یہ نوٹس بنائے تھے۔ بعد میں انھیں بہتر بنایا، خوش خط لکھا، ان میں اضافہ کیا، ان میں حواشی کا اہتمام کیا، صفحات نمبر ڈالے اور انھیں کتاب کی صورت دی، شایع کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے مگر غالباً اس موقع نہیں ملا، وجوہ کچھ بھی رہی ہوں۔

اس سلسلے میں ریاض احمد برنی بھی میرے ہم خیال ہیں وہ لکھتے ہیں ''گمان غالب ہے کہ وہ آگے چل کر اس کتاب کو طبع کراتے گو کہ یہ اُن کی ترجیحات میں شامل نہیں رہی ہوگی یہی وجہ ہے کہ کتاب کا کوئی پیش لفظ یا تعارف بھی نہیں لکھا۔ چند ایک صنعتوں کی تعریف ہے، لیکن مثالوں کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔ (۴) ریاض صاحب کا یہ بھی کہنا ہے کہ کبھی کبھار برنی جب اپنے بچوں کو اردو پڑھانے بیٹھتے تو شاعری کی ضمن میں اپنی مرتبہ یہ قلمی کتاب نکالتے اور اس میں سے کچھ دل چسپ نمونے پڑھ کر سناتے۔

کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ برنی نے مذکورہ کتاب بڑی محنت اور اہتمام سے مرتب کی ہے۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے یہ کس زمانے میں مرتب کی۔ یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے اس میں پیش کی گئی صنعتوں کی تعریفات اور ان کی فارسی اور اردو مثالوں کے لیے کن کن کتابوں سے استفادہ کیا۔ یقیناً یہ دل چسپ معلومات افزا تالیف اردو اور فارسی زبان کے شعراء کے لیے بھی اور ادب کے محققین اور طلبا کے لیے بھی یکساں مفید ہوگی۔ اسے حوالے کی اہم کتاب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

## ۲۔ ''خطوطِ مشاہیر'' (۱۹۶۷ء):

جیسا کہ گزشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ''برنی نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں یعنی مارچ ۱۹۶۷ء میں ''خطوطِ مشاہیر'' کے نام سے اپنے نام بعض اہم اور بڑی شخصیات کے غیر مطبوعہ خطوط سے ایک انتخاب مرتب کیا تھا جس میں، ضروری حواشی بھی لکھے تھے تاہم ان کی طویل علالت اور اس کے بعد ان کی وفات کے باعث وہ انتخاب زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔

اس انتخاب کا انتساب برنی نے اپنی پہلوی بیوی محمودہ بیگم اکبر آبادی کے نام کیا ہے۔ انتساب کے الفاظ اس

طرح ہیں:

میں خطوط کے اس مجموعہ کو اپنی پہلی بیوی محمودہ بیگم اکبرآبادی کے نام نامی سے نسبت دینا چاہتا ہوں جو بہت شستہ ادبی ذوق رکھتی تھیں اور ساڑھے پندرہ سال تک میری رفیق زندگی رہنے کے بعد ۸ جون ۱۹۳۴ء کی صبح بمبئی میں یکایک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئیں۔ ضیاءالدین احمد برنی، کراچی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۶۷ء

انتساب کے اندرونی صفحے پر برنی نے مذکورہ کتاب سے متعلق لکھا ہے ''ان بے شمار خطوط میں سے چند [اردو انگریزی] جو راقم الحروف کو گزشتہ ۵۰ سال کی مدت میں موصول ہوئے۔'' برنی نے اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے پہلے حصے میں اردو خطوط ہیں اور دوسرے حصے میں انگریزی خطوط ہیں۔ برنی کے انتساب سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ برنی نے یہ مجموعہ مارچ ۱۹۶۷ء میں مرتب کر لیا تھا۔ یقیناً اگر وہ مزید زندہ رہتے تو یہ کتاب بھی زیورِ طباعت سے ضرور آراستہ ہوتی۔

برنی نے تمہید میں جہاں اپنے انتخاب سے متعلق لکھا ہے وہاں خطوط نگاری کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ہمارے اردو ادب میں خطوط کو ابھی تک وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو اسے حاصل ہونا چاہیے مگر اب گزشتہ چند برس میں جو توجہ اس شعبے کی جانب مبذول کی جارہی ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ خطوط بھی ہمارے ادب کا جز ولاینفک بن جائیں گے اور اپنا جائز مقام حاصل کر سکیں گے۔

انھیں پیش کرتے وقت مجھے دلی مسرت ہوتی ہے اس لیے کہ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے انھیں دست بردِ زمانہ سے بچایا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بعض بہت قیمتی ہیں اور اہم واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ۱۲ فروری ۱۹۶۷ء۔

یہ جن اہم شخصیات کے خطوط ہیں وہ سب دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔ ان میں برنی کے بزرگ بھی ہیں ہم عمر دوست احباب اور ہم عصر ساتھی بھی اور ان سے چھوٹے بھی۔ ان میں سے بہت سوں کے نام گزشتہ باب میں آچکے ہیں۔ برنی نے اپنی آخری زمانے کی تحریروں میں اس کا ذکر کیا ہے جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ ذخیرہ خطوط اقبال اکیڈمی کراچی میں رکھوا دیے گئے تھے غالباً اس شرط کے ساتھ کہ وہ ممتاز حسن کے توسط سے انھیں نیشنل میوزیم کراچی کو فروخت کر کے رقم برنی کے دیں گے۔ مگر شاید برنی کی زندگی میں یہ خطوط فروخت نہیں ہو سکے چناں برنی کے انتقال کے بعد ان کے ممتاز حسن مرحوم کے توسط سے یہ خطوط برنی کی دوسری بیوہ آمنہ بیگم کی جانب سے چار ہزار روپے میں فروخت کیے گئے (۵)، تاہم اُس ذخیرے سے بہت سے خطوط غائب ہیں مثلاً علامہ اقبال کے خطوط ، مولانا محمد علی کے خطوط، ذوالفقار علی بھٹو کا خط وغیرہ۔

خطوط کا یہ انتخاب برنی نے اپنے نظریہ صلح کل اور قدیم مشرقی روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہے اور ان خطوط

میں سے بعض خطوط سے وہ حصے حذف کر دیے جن سے خط نگار کی حیثیت کم زور ہوتی ہو یا اس پر آیندہ حرف گیری کا خدشہ ہو۔

برنی نے حواشی کے ذریعے اگر چہ بہت سے امور کو زیادہ واضح اور سہل بنا دیا ہے تاہم پھر بھی بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ برنی کو واضح کرنا چاہیے تھا اور وہ برنی ہی کر سکتے تھے۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ برنی نے یہ اس زمانے میں مرتب کی جب وہ زیادہ بیمار رہا کرتے تھے اور وہ انتقال سے ایک سال قبل کا زمانہ تھا۔ اس میں ان کی اس وقت کی کم زور یادداشت کو بھی دخل ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ بعض مقامات کی وضاحت برنی نے قصداً نہیں چاہی ہو۔ واللہ عالم بصواب۔

کتاب بہت اہم اور قابل اشاعت ہے۔ مشفق خواجہ مرحوم نے اپنے انتقال سے کوئی سال بھر پہلے مذکورہ کتاب پر مزید حواشی اور تعلیقات کے لیے راقم کو یہ مسودہ دیا تھا (۶) لہذا راقم نے حواشی لکھ کر انتقال سے چند دن قبل انھیں فون پر اطلاع دی کہ کام ہو گیا۔ وہ اس انتخاب کو ادارہ یادگار غالب سے شایع کرنا چاہتے تھے۔ مسودہ کمپوز کیا ہوا اسی ادارے کی جانب سے ملا تھا وہ کام مکمل ہے اور اشاعت کے لیے تیار ہے۔

### ۶۔ "Jesus Christ - A critical study of the Four GOSPELS" (۱۹۶۶ء):

ضیاء الدین احمد برنی کی کئی تصانیف جو شایع نہیں ہو سکی ہیں ان میں مذکورہ کتاب قابل ذکر اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ اردو میں اس کے عنوان کا ترجمہ اس طرح کیا جا سکتا ہے "انجیل کے چاروں صحیفوں کا ایک ناقدانہ جائزہ"۔ اس کتاب کا مسودہ انھوں نے ستمبر ۱۹۶۶ء میں کئی بار نظر ثانی کے بعد مکمل کیا تھا۔ برنی کے سب سے چھوٹے بیٹے جناب ریاض احمد برنی اپنے بچپن کی یادوں کو کریدتے ہوئے بتاتے ہیں کہ "اباجی اپنی انگریزی کتابیں، مضامین اور خطوط ٹائپ رائٹر ہی پر ٹائپ کرتے تھے، گو کہ انھوں نے "ٹچ ٹائپنگ" (Touch Typing) نہیں سیکھی تھی لیکن ایک طویل عرصے تک ٹائپنگ کرتے کرتے ان کی انگلیوں نے اپنا ایک سسٹم اختیار کر لیا تھا جس کو استعمال کرتے ہوئے وہ کافی تیزی سے ٹائپ کر لیتے تھے۔ ان کے پاس ایک زمانے میں دو دو ٹائپ رائٹر تھے۔ یہ کتاب بھی انھوں نے پوری ٹائپ کی تھی۔ پھر بعد میں جب میں نے میٹرک کرنے کے بعد ٹچ ٹائپنگ سیکھ لی تو اس کا فائنل نسخہ میں نے ٹائپ کیا۔"

اس کتاب میں برنی کی غیر معمولی دل چسپی، انہماک اور لگن کا ذکر کرتے ہوئے ریاض احمد برنی لکھتے ہیں کہ "میں نے بچپن سے روزانہ ان کو دن اور رات تھوڑا تھوڑا کام اس کتاب پر مستقل مزاجی سے کرتے دیکھا۔ دوسری تصانیف اور لکھنے کے کاموں کے درمیان بڑی باقاعدگی سے بائبل کا مطالعہ اور اس کتاب کے مسودے پر وقفے وقفے سے کام جاری رکھتے تھے۔ اسی سلسلے میں قرآن مجید کے تراجم کو بھی کراس ریفرین کی غرض سے دیکھتے جاتے تھے۔ اردو تراجم اور تفاسیر کے علاوہ ان کے استعمال میں محمد مارماڈیوک پکتھال کا انگریزی ترجمہ بھی رہتا تھا۔" (۷) ریاض احمد برنی مزید لکھتے ہیں۔ "اباجی کے پاس بائبل کے دو نسخے تھے اور ان دونوں کا کوئی صفحہ ایسا نہ تھا جس پر انھوں نے مخصوص سطروں کو سرخ قلم سے نشان زد نہ کیا ہو۔ اسی طرح جا بہ جا حاشیے بھی ان کے نوٹس اور ریمارکس، تاثرات، یادداشتوں کے اشارات اور نکتہ چینیوں سے سرخ تھے۔" (۸)

اس زمانے میں اور کسی حد تک اب بھی، عائشہ باوانی ٹرسٹ، خیراتی کاموں اور اسلام کی تبلیغی اور دیگر کتابوں کی

اشاعت پر کام کر رہا تھا۔ برنی خاص طور پر ٹرسٹ کے سکریٹری احمد باوانی سے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں، ملے جنھوں نے اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کے حقوق عائشہ باوانی ٹرسٹ کے لیے اشاعت کی غرض سے خرید لیے تھے غالباً ۲۰۰۰ روپے میں لیکن بدقسمتی سے اس کی اشاعت کی نوبت نہ برنی کی زندگی اور نہ انتقال کے بعد آسکی۔(۹)

ٹرسٹ کے پروجیکیٹ اور پروگرام میں کئی مطبوعات تھیں لیکن اس کا نمبر نہ آسکا۔ ایک مرتبہ بہ قول ریاض احمد برنی کہ وہ خود ایک بار برنی کی زندگی میں یاددہانی کے لیے باوانی سے حبیب سکوائر میں جاکر ملے تھے۔ اب برسوں بعد ریاض احمد برنی باوانی ٹرسٹ والوں سے ملے تو معلوم ہوا کہ احمد باوانی صاحب برسوں پہلے انتقال کر چکے ہیں۔ ٹرسٹ کے آفس میں اس مسودے کا کچھ پتا نہیں۔ ان کے ریکارڈ میں کہیں بھی کوئی بھی تحریر اس کتاب کی خریداری، رقم کی ادائی یا اشاعت کے بارے میں موجود نہیں۔

ریاض احمد برنی کے بہ قول ان کا مقصد احمد باوانی سے اجازت لے کر اس کتاب کو خود شائع کرنے کا تھا لیکن اب چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد اس اجازت کی کوئی ضرورت اور اہمیت نہیں رہی۔ اب اصل مسودے کی نامکمل نقل (۱۰) رہ گئی ہے۔

کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ انگریزی کے سابق چیر مین جناب منیر واسطی انگریزی ادب کے علاوہ عربی اور فارسی کے فاضل، مورخ اور ادیب بھی ہیں۔ برنی کی مذکورہ کتاب کے مسودے کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے اس کے بارے میں ان کی رائے اہمیت کی حامل ہے۔ چوں کہ منیر واسطی کی رائے انگریزی زبان میں ہے اس لیے اس کا اردو ترجمہ ملاحظے کے لیے پیش کیا جاتا ہے: ''یہ کتاب بائبل (انجیل) کے مندرجات کا ایک تنقیدی اور علمی جائزہ ہے۔ جب (۱۹۶۶ء میں) یہ لکھی گئی تھی اس وقت تک کسی بھی مسلمان کی تصنیف کردہ اس طرح کا مطالعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ برنی کی کتاب ان کے کئی سالوں کو محیط بائبل کے عمیق مطالعے پر مبنی ہے۔ یقیناً ایک علمی کارنامے کی حیثیت سے یہ کام شائع ہونے کا مستحق ہے۔''(۱۱)

مذکورہ کتاب کے پہلے باب کا عنوان ہے۔ ''was jesus a World Teacher?''
(کیا یسوع مسیح پوری دنیا کے لیے ایک معلم تھے؟) اس کے آغاز ہی میں برنی رقم طراز ہیں:

''میں نے ڈگری (بی اے) کا امتحان ۱۹۱۳ء میں پاس کیا تھا۔ نتائج کے اعلان کے بعد مجھے ایک تحفے کا پارسل باطانوی اور فارین بائبل سوسائٹی کی طرف سے ایک گفٹ پارسل ملا تھا جس میں ''انجیل مقدس'' کا انگریزی نسخہ تھا اس وقت سے یہ کتاب میرے مستقل مطالعے میں رہی ہے۔''(۱۲) ریاض احمد برنی اپنے والد کی دوسری تصانیف کے ساتھ ساتھ اس کتاب کو بھی شائع کرنے کے خواہش مند ہیں اور انھوں نے اس کی طباعت و اشاعت کا کام جاری رکھا ہوا ہے۔ وہ خود اس کو کمپیوٹر پر کمپوز کر رہے ہیں۔ ۲۵۰ صفحات کی اس کتاب کے ابواب یہ ہیں:

9 Kyaa MaseeH (AS) poori duniya ke mu'allim 1.Was Jesus a world teacher?

thay?

2.Temptation of Jesus, 3 (ShaiTaan kaa) MaseeH ko behkaanaa/

warghalaanaa.

3.Jesus and John the Baptist, 3 MaseeH aur Yuhanna Sabbaagh.

4.The Chosen Twelve, 10 Baaraa (12) Hawaariyeen.

5.Unfulfilled Prophecies, 3 Paisheen-goiyaan jo poori na huween.

6.An unfinished mission, 5 Aik naa-mukammal fareeza.

7.Jesus - a Prophet of God, 3 MaseeH - Khudaa kay aik Rasool.

8."Paraclete" - "the Promise of my Father" - I, 4 FaarqaleeT, mairay Baap ka wa'da.

9."Paraclete" - "the Promise of my Father" - II, 4 - ayzan - (- ditto - ).

10.Was there any betrayal? 6 Kyaa koi daghaabaazi hui thee?

11.Arrest and trial of Jesus, 7 MaseeH ki giriftaari aur 'adaalat mein muqadma.

12.The fate of Judas, 3 Daghaabaaz Yahood kaa anjaam.

13.Did Jesus die on the cross? 6 Kyaa MaseeH Saleeb par maray?

14.Promise to a robber, 2 Aik chor se kiyaa gayaa wa'da.

15.Sonship of Jesus, 3 MaseeH kaa 'baitaa' honaa.

16.Jesus and the Jews, 4 MaseeH or Yahudi.

17.Missing.

18.Jesus and Moses, 4 MaseeH or Hazrat Moosaa (AS).

19."One greater than Solomon" 3 MaseeH kaa apne baaray mein baRaai (greatness) ka da'wa (claim) Hazrat Sulymaan (AS) ke muqaable mein.

20.Jesus and woman, 4 MaseeH aur aurat.

21."The only begotten son of God", 5 "Khudaa kaa iklautaa baitaa".

22.Trinity, 3 Taslees (Tathleeth).

23.The original sin, 6 Gunaah-e Awwal (laghzish-e- Aadam AS).

24.Are the Gospels pure and complete? 6 Kyaa Injeel kay chaaron saHeefay

khaaliS aur mukammal hain?

25.Faith versus Works, 7 E'teqaad ba-muqaabela a'maal.

26.Jesus and Fetishism, 3 MaseeH aur tawah-ham parastee.

27.Jesus on himself, 10 MaseeH (AS) apnay baaray mein.

28.Paul's innovations, 6 Pauloos ki ikhteraa'aat / jiddatein.

( teHreefaat? Riaz)

فروری ۱۹۶۴ء کے ''کتابی دنیا'' میں برنی کی اس کتاب سے متعلق ایک اعلان ان الفاظ میں کیا گیا:

**عیسائیت پر برنی کی انگریزی کتاب**

ضیاءالدین احمد برنی عیسائیت پر ایک معرکہ کی کتاب لکھنے میں مصروف ہیں جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے حضرت مسیح کے بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے، اس کی پوری تائید موجودہ اناجیل سے بھی ہوتی ہے۔

## (ب): وہ کتب جو دست یاب ہیں مگر غیر مدون و مرتب ہیں:

### ا۔ ''مشاہیر عالم'':

یہ کتاب اصل میں ایک نوٹ بک کی صورت میں ہے۔ جس میں برنی نے چند مشاہیر عالم کے تفصیلی تذکرے قلم بند کیے ہیں۔ یہ غالباً انھوں نے انگریزی مضامین سے اردو میں ترجمہ کیے ہیں۔ اس میں مندرجہ ذیل تاریخی شخصیات شامل ہیں:

۱۔ Joan of Are(1412-1431) فرانس سے تعلق۔

۲۔ Florence Nightingle(1820-1910) انگلستان سے تعلق، نرسنگ کی پیش رو خاتون۔

۳۔ Thomas Elva Edison(1847-1931) امریکی موجد۔

۴۔ Herodotus(408-484BC) پانچویں صدی قبلِ مسیح کا یونانی مورخ جو اپنی متنازع شخصیت کے باوجود بابائے تاریخ کے لقب سے مشہور ہے۔

مشاہیر عالم پر یہ کتاب نامکمل ہے اور قیاس غالب ہے کہ برنی کو مزید شخصیتوں پر مضامین لکھنے یا ترجمہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُن سے جو مضامین کی فرمائش رسائل و جرائد کی جانب سے ہوا کرتی تھی ان کو بھیجنے کی غرض سے برنی نے یہ سلسلہ شروع کیا ہو۔

بالعموم برنی جب بھی تاریخ کی یا ماضی قریب کی اُن شخصیات کے بارے میں پڑھتے تھے جن کے کارنامے اس بات کے متقاضی نظر آتے کہ اُن سے نئی نسل کو آگاہ کیا جائے تاکہ نئی نسل ان سے متاثر ہو اور ان میں ترقی کی ترغیب پیدا ہو تو وہ ضرور

ان کو اپنی فکر سے ضبطِ تحریر میں لاتے یا ترجمے کی صورت میں، مضمون یا کتاب کی شکل میں پیش کرتے۔

اس مترجمہ کتاب کو مرتب کرنے کا بھی وہی مقصد ہے جو ان کی دیگر مترجمہ کتابوں میں پایا جاتا ہے یعنی اُن تراجم سے اُس اردو داں طبقے کو متعارف کرانا تھا جو انگریزی سے یا تو نابلد تھے یا پھر انگریزی کتابوں اور مضامین سے کم استفادہ کرتے تھے۔

یہ کتاب ایک ڈائری کی صورت میں ہے۔ اس کے پہلے صفحے پر جس کی حیثیت سرورق کی ہے برنی کے ہاتھ کا نمایاں طور پر "مشاہیرِ عالم" لکھا ہوا ہے۔

## ۲۔ "یادداشتیں" (۱۹۶۸ء):

برنی نے انتقال سے چند ماہ قبل موقع بہ موقع اپنی یادداشتیں محفوظ کروائی تھیں۔ یہ یادداشتیں بیس صفحات پر مبنی ہیں۔ اس کے آخر میں برنی "میرا المیہ" کے عنوان سے اپنے خاندان کے ایسے المیے کا تذکرہ کیا ہے جو برنی کے لیے اُس آخری زمانے میں نہایت تکلیف دہ رہا ہوگا۔ اس کا کوئی عنوان تو نہیں ہے تاہم چند مختلف عنوانات ہیں جن کی ایک فہرست اول صفحے پر دے دی گئی ہے۔ عنوانات یہ ہیں:

۱۔ ضیاء الدین احمد برنی (مرحوم) کے خاندانی اور ذاتی حالات (خودنوشتہ)

۲۔ مالیات کے بارے میں ہدایات

۳۔ یادداشت

۴۔ متفرقات

۵۔ میرا المیہ

۶۔ میری ادبی زندگی کے بارے میں (خودنوشتہ یادداشت)

یہ یادداشتیں ماہ اگست ۱۹۶۸ء کے مختلف دنوں میں لکھوائی گئیں۔ ایک یادداشت ۲۲راپریل ۱۹۶۹ء بہ وقت ۸ بجے شب لکھوائی گئی۔ اس آخری یادداشت کے چند دن بعد ۴مئی ۱۹۶۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا انتقال سے قبل ان کی یہ یادداشتیں نہایت اہم ہیں ان پر کئی پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ انھیں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ برنی اس بیماری کی حالت میں بھی اپنے معاملات میں کتنے احتیاط پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کی یادداشت بلا کی تھی۔ انھیں ان اخیر ایام میں بھی یاد تھا کہ کسے کیا دیا جائے گا اور کس سے کیا وصول کیا جائے گا، کس کا کیا حق ہے اور کس پر کیا فرض ہے۔

ان یادداشتوں کے آئینے میں ان کی زندگی اور سیرت دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔ برنی نے چھوٹی سے چھوٹی اور اہم سے اہم اور بڑی سے بڑی بات بھی لکھوادی۔ بعض یادداشتیں گزشتہ اوراق میں بھی نقل ہو چکی ہیں۔ چند اور نقل کی جاتی ہیں:

۱۸راگست ۱۹۶۸ کو انھوں نے لکھوایا۔

۱۔ رائٹرز گلڈ کو پچاس روپے دیے گئے تاکہ وہ گلشن اسکیم میں رائٹرز کی مکان دے۔ لیکن شرائط بدل گئیں اور وہ رقم

ابھی تک واپس نہ ہوسکی۔

۲۔ کتابوں کے علاوہ میرے خطوط بھی چھانٹے جائیں گے جو میوزم میں دیے جاسکتے ہیں۔ان کی قیمت اندازاً دو ۔تین ہزار کے قریب ہوگی۔

۳۔ میرے ایک ایک کاغذ کو دیکھا جائے اور اس کو غور سے پڑھا جائے۔ایسا نہ ہو کہ اسے بغیر دیکھے ردی میں پھینک دیا جائے۔

۴۔ رسالہ ''معارف'' اور ہفت روزہ ''صدق'' کے مدیر کو خط لکھ کر دریافت کرنا ہے کہ اباجی کے ذمہ کتنی رقم بہ طور سالانہ چندہ واجب ہے اور ہم اس رقم کے بدلہ میں اپنی کتابیں رجسٹری پوسٹ سے بھیجدیں گے۔

متفرقات کے ذیل میں لکھوایا ہے:

۱۔ ۲۵ روپے جماعت اسلامی کو دینے ہیں۔

۲۔ ۲۵ روپے صدیقہ کو اس کی لڑکی کی شادی کے سلسلے میں دینے ہیں۔

۳۔ روپے کا منی آرڈر حیدر آباد سندھ بھیجنا ہے پروفیسر یحییٰ احمد، سندھ یونی ورسٹی حیدر آباد سندھ۔

۴۔ میرے ذمے کسی کی کوئی رقم باقی نہیں ہے۔

اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جو انھیں یاد آتی گئیں اور وہ لکھواتے گئے۔اس سے ان کی صاف گوئی اور دیانت داری کا پتا چلتا ہے۔

''میرا المیہ'' کے عنوان سے برنی نے نہایت دکھ کے ساتھ اپنے بھتیجوں کے رویوں پر غم و غصے کا اظہار کیا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی بعض ایسی باتیں لکھیں جن کے اظہار سے شاید انھیں وقتی سکون ملا ہو تاہم نہایت تکلیف دہ ہیں۔یہ باتیں انھوں نے اسے عام انسانوں کی عبرت کے لیے لکھا ہے۔

## ۳۔''میری ادبی زندگی کے بارے میں'' (خودنوشت حالات):

بارہ صفحات کے اس رسالے کو جس میں برنی نے اپنی زندگی کے واقعات کو تسلسل کے ساتھ لکھوایا ہے اس کی نوعیت خودنوشت کی ہے۔اس کے عمیق مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسے ایک بار لکھ کر بار بار اس کی اصلاح کی گئی ہے۔اولاً اس کا عنوان ''میری ادبی زندگی کے بارے میں'' رکھا گیا تاہم بعد لفظ ''ادبی'' قلم زد کردیا گیا۔چوں کی اس میں ان کی ادبی زندگی نمایاں ہے اس لیے میں نے اس کا عنوان ''میری ادبی زندگی کے بارے میں'' ہی رکھا ہے۔

عنوان کے دائیں جانب لکھا ہوا ہے ''One copy to AL-ILM'' تاہم میرے علم کے مطابق برنی کے یہ خودنوشت حالات ''العلم'' کراچی کے کسی شمارے میں شایع نہیں ہوئے۔اندرونی صفحات میں بھی جا بہ جا عبارتیں قلم زد کر کے دوبارہ لکھی گئی ہیں جس سے اصل عبارت کا پڑھا دشوار ہوگیا ہے۔

یہ یادداشتیں چوں کہ برنی کے انتقال سے چند ماہ قبل لکھی گئیں اور ان دنوں برنی بیمار رہا کرتے تھے لہذا حافظے نے جتنا ساتھ دیا انھوں نے قلم بند کروادیں تاہم بہت سی باتیں جو آنی چاہیے تھیں نہیں آسکیں۔ اس میں برنی کا بچپن اور لڑکپن گم ہے سوائے ابتدائی تعلیم کے ذیل میں ایک مدرسے اور وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی اسکول، گوجرانوالہ کا ذکر ہے۔ اس زمانے کے برنی کے مشاغل، دل چسپیاں وغیرہ کا حال نہیں معلوم ہوتا۔ دلّی کی زندگی کے بارے میں بھی مختصراً معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح قیام کانپور کے بارے میں تفصیل کی ضرورت تھی مگر وہاں بھی اختصار نظر آتا ہے۔ بمبئی کی زندگی جہاں ان کی مجموعی زندگی کا زیادہ عرصہ گزرا، وہاں کی ادبی اور سماجی اور ملازمتی سرگرمیوں کے بارے میں بھی جو سارا عرصہ تفصیل کا متقاضی تھا، اختصار نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برنی یہ معلومات خودنوشت کے طور پر نہیں لکھوائی ہوں گی بلکہ یادداشت کے طور پر جو یاد آتا گیا لکھواتے گئے۔ اضافہ چاہا اضافہ کردیا کم کرنا ہوا کم کردیا۔

اگرچہ یہ رسالہ ان کی زندگی کے کئی اہم گوشوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے تاہم یہ مجھے اس وقت ملا جب میں برنی زندگی اوران کے خاندان کے بارے میں بہت کچھ معلومات اپنے طور پر دیگر مصادر سے حاصل کر چکا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے بازیافت ہوجانے کے بعد میں نے بہت سی معلومات کو درست کرلیا۔ جیسے میں اپنے ایک مضمون میں برنی کی پیدائش سے متعلق لکھ چکا تھا کہ وہ کوچہء چیلاں میں مسجد کالے خاں کے پاس پیدا ہوئے تھے۔ یہ قیاس مجھے برنی پر ایک مضمون پڑھ کر ہوا تھا چوں کہ برنی کے والد محلّہ نیا محل، چوڑی والاں اور کوچہء چیلاں بھی رہے تھے، ابھی میں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ یہ رسالہ بازیافت ہوا اس میں برنی نے لکھا ہے کہ وہ دلی کے محلے نیا محل میں پیدا ہوئے۔

اس میں برنی اپنی کتابوں کے بارے میں تفصیل نہیں لکھا بعض کے بارے میں تو صرف یہ لکھ دیا کہ میری کچھ کتابیں میرے نام چھپیں اور کچھ کسی اور کے نام سے اور بعض پر کسی کا نام نہیں۔ اس خودنوشت میں تو وضاحت ہونی چاہیے تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ برنی نے یہ ان کتابوں کے بارے میں لکھا ہے جن کا ترجمہ کر کے انھوں نے اس کا حق ترجمہ نگاری فروخت کردیا۔ جیسے اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں خواجہ حسن نظامی پر خاکے میں لکھا ہے کہ غدر کے حوالے سے دو کتابیں انھوں نے ترجمہ کر کے خواجہ صاحب کو دیں۔ ممکن ہے اس میں ان کا لحاظ بھی ہو کہ انھوں نے کتابوں کا نام لینا دوستی اور احترام کے خلاف خیال کیا ہو، ورنہ غدر کے حوالے سے خواجہ صاحب کی بارہ کتابوں میں تین کتابیں ایسی ہیں جو ترجمہ ہیں انگریزی سے ایک فارسی اخبارات سے جب کہ خواجہ صاحب نے برنی کو ایک خط میں لکھا بھی ہے کہ جب ترجمہ کروایا جائے تو سب سے پہلے انھی کا خیال آئے گا۔ اس امر سے میرے اس خیال تقویت ملتی ہے۔

اس کے اختتام سے ایک صفحہ قبل ۲۲/ ۸/ ۱۹۶۸ء کی تاریخ درج ہے۔ اخیر میں برنی نے اپنی بیمار کا حال لکھا ہے۔ اسے ان کی ایک نامکمل خودنوشت کہا جاسکتا ہے۔ اگر وہ مزید زندہ رہتے تو وہ عظمتِ رفتہ جیسی پائے کی خودنوشت لکھ سکتے تھے اور وہ نہایت اہم، دل چسپ اور پر لطف ہوتی۔

**۴۔ ''ڈائری'':**

برنی کی ایک چھوٹی سی ڈائری بڑی دل چسپ ہے جس میں انھوں نے عالمِ ارواح سے رابطوں کا ریکارڈ رکھا ہے نوٹس کی شکل میں۔ برنی کی تصنیف کردہ کتاب جمال الدین افغانی کے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے ''روحِ جمال الدین سے گفتگو'' اس میں ایک خاتون عامل (Medium) کے ذریعے سے برنی نے جمال الدین افغانی کی روح سے کچھ سوالات کیے تھے، اُن کی زندگی کے ان گوشوں کے بارے میں جن پر تواریخ میں تفصیلی تذکرہ نہیں یا جن کے بارے میں متنازع روایات ہیں، جن کی تصدیق نہیں ہوسکی تھی۔ اُن سوالات کے جواب اُس عامل سے سن لین کے بعد برنی نے جمال الدین افغانی کی روح سے مسلم اُمہ کے نام ایک پیغام کی درخواست کی جو اُنھوں نے پوری کی۔ وہ پیغام پورا کا پورا اُس کتاب میں درج ہے۔ اُن عامل خاتون کا نام شعلہ (۱۳) تھا۔ وہ موجود صاحب کہ اہلیہ ہیں۔ اُس زمانے میں (۱۴) اس زمانے میں وہ خاتون اسلامیہ کالج کی طالبہ تھیں اور برنی کے دلّی کے دوست ڈاکٹر سید سجاد دہلوی وہاں پڑھاتے تھے۔ وہ ان کے تاریخ یا فلسفے کے استاد تھے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر سید سجاد کو علم ہوا کہ اُن کی شاگرد شعلہ بانو پہلے ہی سے ایک غیر معمولی میڈیم ہیں۔ دراصل شعلہ بانو کے والد ایک دین دار اور عبادت گزار بزرگ تھے اور انھیں روحانیات سے شغف تھا۔ انھی سے شعلہ بانو نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ روحانیات کا علم سیکھا تھا۔ یا تو پہلے ہی یا بعد میں وہ باقاعدہ نقشبندیہ سلسلے سے بیعت ہوئیں اور عبادت اور ذکر کی طرف زیادہ مائل ہوتی گئیں۔ پھر ان کے گھر واقع باتھ آئی لینڈ اور ڈیفنس سوسائٹی میں ہفتہ وار ذکر کی مجالس کا باقاعدہ اہتمام ہونے لگا۔

برنی ڈاکٹر سید سجاد دہلوی کے عالم ارواح سے رابطے کی نشستوں میں ان کے ہم راہ موجود صاحب کی رہائش واقع جہانگیر روڈ کواٹرز گئے کم از کم دو ایسی ہی نشستوں کے عینی شاہد ریاض برنی خود تھے جو گو کہ کم عمر تھے لیکن کچھ باتیں اب تک یاد ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ موجود صاحب کے سرکاری کوارٹر کے برآمدے کے چھوٹے سے لان میں کرسیوں پر رات کے وقت سب بیٹھ جاتے تھے۔ روشنی بہت کم ہوتی تھی۔ شعلہ بانو جب کسی شخصیت کی روح کہ بلانے کے لیے کہا جاتا تو وہ اپنی آنکھیں بند کر کے کچھ زیرِ لب پڑھتیں اور پھر تصور میں غرق ہو جاتی تھیں۔ ان کی کشادہ پیشانی رات کے اندھیرے میں کافی چمک رہی ہوتی تھی۔ پھر وہ کچھ دیر کے بعد بتاتی تھیں کہ ہاں ان کو وہ شخصیت نظر آرہی ہے اور پھر اس کا حلیہ بیان کرتی تھیں۔ برنی اور ڈاکٹر سید سجاد دہلوی کی طرف سے سوالات کیے جاتے تھے جن کا جواب وہ اپنی زبان سے دونوں حضرات کہ سنا دیتی تھیں۔ بہ قول ریاض احمد برنی اُس وقت شعلہ بانو کے بولنے کا انداز اُن کا اپنا نہیں بلکہ اس روح کا سا ہوتا تھا جس کے جوابات وہ اپنی زبان سے دوہرا رہی ہوتی تھیں۔

برنی اپنی ڈائری میں سب جوابات جلدی جلدی لکھتے جاتے تھے۔ وہ زمانہ ٹیپ ریکارڈر کا نہیں تھا، اور برنی شورٹ ہینڈ بھی نہیں جانتے تھے۔ بس شورٹ ہینڈ کی طرح سے جلدی جلدی لکھتے جاتے تھے۔ اسی لیے کہیں کہیں وہ شکستہ تحریر مشکل سے پڑھی جاتی ہے۔۔۔

ریاض احمد برنی کو شعلہ بانو کا یہ کہنا یاد ہے کہ مومن روحیں عالمِ برزخ میں عبادت کے معمولات میں مستقل مشغول رہتی ہیں۔ یوں ایک تو ان کو ان معمولات میں مخل کیا جانا برا لگتا ہے دوسرے انھیں اس پاک ماحول سے اس کثیف اور گندی دنیا میں آنا کافی ناگوار گزرتا ہے۔ یوں وہ آنے کے بعد یہاں سے جلد از جلد واپسی کے لیے بے چین رہتی ہیں۔

شعلہ بانو یہ بھی کہتی تھیں کہ اچھا خاصا زور پڑتا ہے روح کو بلانے اور اس سے گفتگو کرنے میں۔ سید جمال الدین افغانی کی روح کے علاوہ جن شخصیات سے گفتگو کے نوٹس برنی کی ایک چھوٹی سی ڈائری میں محفوظ ہیں وہ یہ ہیں:

قائداعظم محمد علی جناح

بہادر یار جنگ

بہادر شاہ ظفر

لارڈ بائرن

ہٹلر

ہٹلر کی روح کو بلانے کے بعد شعلہ بانو کا کہنا تھا کہ ان کے سامنے ایک جلی ہوئی لاشت تھی۔

ریاض احمد برنی ان نوٹس کو ایک انگریزی مضمون کی شکل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ عالم ارواح والا موضوع بہت متنازع ہے۔ ایک طرف یہ شاید اہل طریقت صوفیہ کا موضوع ہو اور دوسری طرف اس کا پیرا سائیکلوجی سے بھی گہرا تعلق ہے۔ غرض کس قدر اس گفتگو پر اعتبار کیا جاسکتا ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ اگر واقعی ایسا ہوسکتا تو بہت سی پیچیدہ گتھیاں سلجھ گئی ہوتیں اور کتنے ہی رازوں سے پردہ اٹھ چکا ہوتا۔ موت کے بعد کیا گزرتی ہے انسان پر، قبر میں کیا حالات پیش آتے ہیں وغیرہ۔ غرض دورِ حاضر کے کتنے ہی مسئلے شاید حل ہو چکے ہوتے لیکن شاید روحوں کو ان موضوعات پر زبان کھولنے کی اجازت نہ ہو۔

ہم کتنا بھی روحوں سے اس قسم کے رابطوں کی سچائی کے منکر ہوں اور ان کو ایک دھوکا سمجھیں لیکن یہ بات بھی خاصی حیرت انگیز ہے کہ کتنی ہی شخصیات سے تو شعلہ بانو کا دور کا تعلق بھی نہیں تھا پھر وہ سب کچھ کیسے بولتی جاتی تھیں؟ اُن کی زبان جمال الدین افغانی کا پیغام پڑھنے سے لگتا ہے کہ یہ واقعی کسی دردمند۔۔۔ لیکن اس بحث سے قطع نظر ایک طرف ڈاکٹر سید سجاد عالم ارواح کے اسرار و رموز جاننے کی جستجو میں تھے اور دوسری طرف برنی کو بہت سی اہم شخصیات کے بارے میں مزید معلومات کی تلاش تھی۔ خصوصاً وہ گوشے اُن کی زندگیوں کے جن پر تاریخ یا تو خاموش ہے یا متضاد روایات ہیں۔ پتا نہیں یہ سلسلہ آگے کیوں نہیں بڑھا۔

## (ج): وہ کتب جن کا صرف ذکر ملتا ہے:

### ا۔ ''سلطان محمود غزنوی'':

اس کتاب سے متعلق کہیں اور سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ یہ ترجمہ ہے ڈاکٹر محمد ناظم (۱۵) کے انگریزی زبان میں پی ایچ ڈی کے مقالے ''The Life and Times of Sultan Mahmud of Ghazna'' کا جسے کیمبرج یونی ورسٹی پریس نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ (۱۶) برنی نے اپنی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' میں اس ترجمے سے متعلق لکھا ہے:

انھوں (ڈاکٹر محمد ناظم) نے کیمبرج یونیورسٹی سے سلطان محمود غزنوی پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ان کا مقالہ ایسا جامع اور فاضلانہ تھا کہ خود یونیورسٹی نے خواہش ظاہر کی کہ اسے کتابی صورت میں چھاپے،اور یہ بجائے خود بہت بڑا اعزاز ہے۔اس کا دیباچہ مشہور مستشرق آر۔اے۔ نکلسن کا تحریر کردہ ہے۔اس میں وہ لکھتے ہیں"۔۔۔جب یہ کتاب شائع ہوجائے گی تو اس سے نہ صرف مصنف کا وقار بلند ہوگا بلکہ علی گڑھ یونیورسٹی کی بھی عزت بڑھ جائے گی۔"متحدہ ہندوستان کے مشہور مورخ سرجادوناتھ سرکار نے جو رائے دی تھی وہ یہ ہے"یہ کتاب لکھ کر انھوں نے غزنوی خاندان پر سب سے بڑے زندہ اتھارٹی کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی خواہش پر میں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو ابھی تک شایع نہیں ہوا۔"(۱۷)

برنی کی کسی اور دست آویز سے مذکورہ کتاب سے متعلق مزید کچھ معلوم نہیں ہوتا۔انگریزی کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر محمد ناظم نے جہاں اور لوگوں اور اداروں کا شکریہ ادا کیا ہے وہاں ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتا ناظم سندھ مدرستہ الاسلام،کراچی کا بھی شکریہ ادا کیا ہے۔(۱۸)اس کے ترجمے سے متعلق مزید کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔

## ۲۔"انگریزی مضامین کا مجموعہ":

اس مجموعے کا ذکر برنی نے اپنے"خودنوشتہ حالات"میں کیا ہے ان کے الفاظ ہیں"انگریزی مضامین کی کتاب جناب جعفری(Pak-Amarican)کے ذریعے ایک پبلیشر کو دی گئی ہے۔"(۱۹)

۲۱/اگست ۱۹۶۸ءکو برنی نے یادداشت کے طور پر جو باتیں تحریر کروائیں ان میں مذکورہ مجموعہ مضامین سے متعلق لکھوایا"میں نے اپنے انگریزی مضامین کا مجموعہ پاک امریکن Pak-Amarican کو چھپنے کے لیے دیا ہے اور اُن کی رسید بھی آگئی ہے۔"(۲۰)متفرقات کے ذیل میں بھی برنی اپنے مضامین سے متعلق لکھا ہے"جعفری کے پاس میرے انگریزی مضامین کا مجموعہ ہے جس کے بارے میں وہ بات چیت کررہے ہیں۔"(۲۱)

برنی کے تمام مضامین میرے علم میں نہیں ہیں تاہم بعض مضامین ہیں جن کی تفصیل مضامین کے ذیل میں آئے گی۔ریاض احمد برنی کا کہنا ہے کہ تاحال برنی کے کاغذات سے ان کے انگریزی مضامین کا کوئی مسودہ برآمد نہیں ہوا افسوس ہے کہ ان کا وہ مجموعہ ہماری دست رس میں نہیں۔

## ۳۔"اردو مضامین کا مجموعہ":

اردو مضامین کے سلسلے میں بھی برنی کی یادداشتوں کا مجموعہ ''خودنوشتہ حالات'' ہی رہ نمائی کرتا ہے۔ برنی نے ۱۸ راگست ۱۹۶۸ء کو اس ضمن میں لکھوایا ''اردو مضامین کی ایک کتاب تیار ہے اس کو شایع کیا جاسکتا ہے۔''

گزشتہ اوراق میں برنی کے مضامین لکھنے کے آغاز سے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ ''ان کا پہلا مضمون ''سقراط کا دمِ واپسیں'' امرتسر کے کسی رسالے میں شایع ہوا'' اس کے علاوہ برنی نے اپنے خودنوشت حالات ''میری ادبی زندگی کے بارے میں'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''طالب علمی کے زمانے میں میں نے متعدد مضامین رسالہ صوفی کے لیے لکھے جو بہاء الدین سے نکلتا تھا۔ مجھے یہاں سے فی مضمون پانچ روپے ملتے تھے۔''

برنی کے اردو مطبوعہ اور غیر مدون مضامین کی تفصیل مضامین کے ذیل میں دی جارہی ہے وہیں دیکھی جائے۔

## ۴۔ ''تعلیم کے چار پہلو'':

۱۹۶۰ء میں برنی نے پاکستان رائٹرز گلڈ کا فارم Biographical Directory کے لیے بھرا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنے ہاتھ سے اپنی کتابوں کے نام اور سنین بھی لکھے تھے۔ (۲۲) اس فہرست میں اگرچہ بعض کتابوں کا اندراج ہونے سے رہ گیا ہے تاہم مذکورہ کتاب ''تعلیم کے چار پہلو'' کا اندراج ہے۔ اس فہرست میں ان کی تصنیف ''تعلیم و تربیت'' کا ذکر بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے برنی نے ''تعلیم و تربیت'' کا نام ''تعلیم کے چار پہلو'' رکھا ہو۔ بہرحال چوں کہ برنی کے مسودات میں اس کا ذکر آگیا ہے اور یہ امر بھی پیش نظر ہے کہ برنی کی بہت سی تحریریں لاپتا ہیں چناں چہ یہ خیال بھی ہے کہ ''تعلیم کے چار پہلو'' کتاب تصنیف کی ہو اور اس کا مسودہ بھی کسی کو دے دیا ہو چھاپنے کے لیے یا ان کے انتقال کے اور سامان کے ساتھ اُٹھ گیا ہو۔

## ۵۔ ''خالدہ ادیب خانم'':

یہ ایک کتابچہ تھا جس کا ذکر برنی پر لکھے گئے ایک مضمون (۲۳) میں ملتا ہے۔ یہ مضمون مرحومہ قمر القادری کا لکھا ہوا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ برنی کو خالدہ ادیب خانم سے خاص دل چسپی تھی۔ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث برنی نے اپنی ایک بیٹی کا نام بھی اسی پر رکھا تھا اور کتابچہ بھی لکھا تھا جو ناپید ہوگیا۔

قمر القادر وہ خاتون ہیں جن کے والد سے برنی کے دوستانہ تعلقات تھے اور برنی بمبئی میں ان کے پڑوس میں رہے تھے۔ قمر القادر نے اپنے مضمون میں برنی کی زندگی سے متعلق بہت حقائق بیان کیے ہیں۔ چوں کہ وہ ایک شاہد کی حیثیت رکھتی ہیں لہٰذا برنی کے اس کتابچہ کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے ان کی ان تصانیف میں درج کیا جاتا ہے جن کے بارے میں تاحال مکمل معلومات حاصل نہیں ہوسکی ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ برنی سے متعلق تمام معلومات کو یک جا کیا جانا چاہیے چناں چہ اسی خیال کے تحت

اسے درج کیا جاتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ برنی نے پاکستان بن جانے کے بعد اخبار جنگ، کراچی میں خالد ادیب خانم پر ایک مضمون لکھا تھا۔

### ۶۔ ''رنگیلا رسول'':

یہ برنی کی وہ کتاب ہے جو انھوں نے زمانہ ء قیام بمبئی ایک خاص مقصد کے تحت ترجمہ کی تھی۔ اس کتاب کا تذکرہ انھوں نے اپنے خود نوشت حالات میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> چوں کہ میں حکومت بمبئی کی پریس برانچ سے تعلق رکھتا تھا اس لیے مجھے رطب و یابس قسم کے مضامین ہزار ہا کی تعداد مُں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے جو کچھ پڑھا عام آدمی کی دست رس سے باہر ہے۔ اسلام کے خلاف مجھے ایسی ایسی لغو کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا کہ جن کو محض پڑھنا ہی کار دارد ہے۔ میں اس سلسلے میں [ایک] کتاب رنگیلا رسول کا ذکر کروں گا۔ اس سے قبل کہ حکومت بمبئی جس سے میں متعلق تھا ''رنگیلا رسول'' کو ضبط کرے مجھے اس کا ترجمہ کرنا پڑا اور میں برملا کہتا ہوں کہ وہ کتاب حقیقتاً لغو ترین تھی اور اس کے مصنف نے اس سے بڑھ کر مایوس کن کتاب نہ لکھی ہوگی۔ (۲۴)

خواہ وہ ترجمہ کسی خاص مقصد کے تحت کیا گیا ہو بہر حال ترجمہ کیا۔ برنی نے اس پر تبصرہ بھی کر دیا۔ وہ ترجمہ ناپید ہے نہیں معلوم کہ محفوظ رہا یا نہیں۔

### ۷۔ ''حیاتِ مولانا محمد علی جوہرؔ'' (۱۹۲۶ء):

اس کتاب سے متعلق کسی اور دست آویز سے کچھ معلوم نہیں ہوتا جب کہ کتابی دنیا، مئی ۱۹۶۷ء کے شمارے میں مذکورہ کتاب کے حوالے سے یہ عبارت درج ہے:

> قبلہ برنی صاحب نے ۱۹۲۶ء میں بھی مولانا کی مختصر سوانح لکھی تھی جو مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی کی طرف سے ٹائپ میں شایع ہوئی تھی، سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اس پر مصنف کا نام درج نہ تھا۔

غالباً یہ اطلاع علاء الدین خالد کی جانب سے ہے کیوں کہ ان دنوں برنی بہت زیادہ بیمار تھے اور ان کی غیر موجودی میں علاء الدین خالد ادارت کے معاملات سنبھالتے تھے۔ برنی نے مولانا محمد علی جوہر پر اپنی انگریزی کتاب کا تذکرہ ضرور کیا ہے جو ۱۹۱۸ء میں مدراس سے شایع ہوئی تھی تاہم ان مذکورہ کتاب کا تذکرہ کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ

بات تو بالکل مختلف ہے۔ جس پر یقین کرنا بھی پڑتا ہے کیوں کہ علاء الدین خالد مکتبہ جامعہ ملیہ سے وابستہ رہے تھے اور وہ غلط نہیں لکھ سکتے پھر کئی باتوں میں اختلاف ہے ایک یہ کہ وہ اردو میں تھی کیون کہ علاء الدین خالد نے انگریزی کا ذکر نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ وہ مدراس سے نہیں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی سے شایع ہوئی۔ تیسرے یہ کہ ۱۹۲۶ء میں شایع ہوئی۔ علاء الدین خالد کے علم میں برنی کی تمام کتابیں تھیں۔ وہ غلط نہیں لکھتے دوسرے یہ کہ دونوں کتابوں سے متعلق کئی باتوں میں اختلاف ہے۔ بہر حال یہ کتاب دست یاب نہیں ہے۔

## حصہء دوّم، مضامین:

اب اس باب کے دوسرے حصے یعنی مضامین کے حوالے سے جائزہ لیا جائے گا۔ مضامین کی نوعیت تین طرح کی ہے۔ ایک وہ مضامین ہیں جو شایع ہوئے اور دست یاب ہیں تاہم مدون نہیں ہوئے، دوسرے وہ مضامین جو شایع ہوئے مگر نہ تو دست یاب ہیں اور نہ مدون ہو سکے۔ تیسرے وہ مضامین ہیں جن کے بارے میں برنی کی تحریروں سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ لکھے گئے یا شایع بھی ہوئے تاہم مزید تفصیل معلوم نہ ہونے کی صورت میں ان تک رسائی نہیں ہو سکی۔

برنی کی ابتدائی تحریروں سے متعلق ذکر گزشتہ اوراق میں آچکا ہے۔ برنی کا پہلا باقاعدہ مضمون "سقراط کا دمِ واپسیں" ۱۹۰۸ء میں جالندھر کے کسی رسالے میں شایع ہوا تھا۔ باوجود کوشش کے یہ مضمون دست یاب نہیں ہو سکا۔

برنی کے مطبوعہ اور دست یاب مضامین کی تقسیم موضوع وار بھی ہو سکتی ہے اور زمانی اعتبار سے بھی۔ اولاً مطبوعہ اور مدون مضامین کو موضوع کے اعتبار سے ترتیب وار پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مضامین ردو بدل کے بعد "عظمتِ رفتہ" کی زینت بنے یا عظمتِ رفتہ سے لے کر کہیں اور شایع کیے گئے۔

### (الف) مطبوعہ اور مدوّن مضامین:

**۱۔ "امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد"**

کتابی دنیا، کراچی، اپریل ۱۹۵۸ء۔

**۲۔ "ڈاکٹر اقبال"**

(۱) جام نو، کراچی، اقبال نمبر، شمارہ ۱، ۱۹۶۷ء، ص: ۱۰۴ تا ۱۰۶ (۲) انجمن اسلامیہ میگزین، کراچی، اپریل ۱۹۶۹ء۔ (۳) بہ عنوان "اقبال کی یادیں" سے ماہ نامہ سیارہ، اقبال نمبر، میں شایع ہوا۔

**۳۔ "خواجہ کمال الدین۔ چند تاثرات"**

ریاض، کراچی، جون ۱۹۵۳ء، ص: ۵۱۔۵۳۔

**۴۔ "دادا بھائی واچ میکر"**

ریاض، کراچی، اپریل ۱۹۵۳ء، ص ۴۱۔۴۳۔

**۵۔ ''سید عبداللہ بریلوی مرحوم، چند تاثرات''**

سہ ماہی العلم، کراچی، اپریل تا جون ۱۹۵۳ء۔ ص ۱۴ تا ۲۰۔

**۶۔ ''شیخ حسن علی''**

ریاض، کراچی، مارچ ۱۹۵۵ء، ص: ۴۵۔۴۷۔

**۷۔ ''علی محمد مولوی۔ چند تاثرات''**

ریاض، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۴ء، ص: ۵۵۔۵۶۔

**۸۔ ''عمر ثوبانی۔ چند تاثرات''**

ریاض، کراچی فروری ۱۹۵۴ء۔

**۹۔ ''مولانا محمد علی جوہر''**

(۱) نقوش، شخصیات نمبر ۵۹۔۶۰، اکتوبر ۱۹۵۶ء ص ۱۱۵۹۔۱۱۶۸۔ (۲) سہ ماہی جامعہ، نئی دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء ص: ۱۳۳۔۱۵۱۔

**۱۰۔ ''مولانا ظفر علی خاں''**

کتابی دنیا، کراچی، جنوری ۱۹۵۷ء۔

**۱۱۔ ''میرے دوست راشد الخیری''**

جولائی ۱۹۶۴ء میں مولانا رازق الخیری نے اپنے والد علامہ راشد الخیری کی سوانح حیات کی اشاعت پر کراچی میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ برنی نے اسی موقع پر اپنا یہ مضمون پڑھا تھا۔ مشمولہ مشہور اہل قلم کی گمنام تحریریں، مرتبہ شفیع عقیل، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

**۱۲۔ ''مولانا محمد علی جوہر''**

۴ جنوری ۱۹۶۵ کو کراچی میں مولانا محمد علی جوہر کی یاد میں جلسہ میں برنی نے پڑھا، مشمولہ مشہور اہل قلم کی گمنام تحریریں، مرتبہ شفیع عقیل، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۴ء۔

**۱۳۔ ''منشی پریم چند اور فلم کمپنیاں''**

زمانہ، کانپور، پریم چند نمبر، جنوری ۱۹۲۷ء۔ (عظمتِ رفتہ میں صرف ''منشی پریم چند'' کے عنوان سے شامل ہوا)

اب ان مضامین کی فہرست دی جا رہی ہے جو شایع تو ہوئے مگر مدون ہو کر کتابی شکل میں شایع نہیں ہوئے۔ ان منتشر و غیر مرتب مضامین کی فہرست ملاحظہ فرمائی جائے۔ اس مضامین کو نوعیت کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔

**(ب) مطبوعہ غیر مدون ادبی مضامین:**

۱۔ ''اردو کے دو ادیب'' (ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر عبدالقیوم)

کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۳ء۔

۲۔ ''اردو کے چند ادیب لیڈر'' (سرسید، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد، جوہرؔ، حسرتؔ، اجمل، حسین مدنی)

مشرب، کراچی، تاریخ ادب اردو نمبر، جولائی ۱۹۵۶ء، ص ۵۲۹۔۵۳۸۔

۳۔ ''ادیبوں کی کہانی ٹکٹوں کی زبانی''

کتابی دنیا، کراچی، ستمبر ۱۹۵۶ء۔

۴۔ ''ادیبوں کا کنونشن خطبۂ صدارت (بابائے اردو) سے اقتباسات''

کتابی دنیا، کراچی، مارچ ۱۹۵۹ء۔

۶۔ ''انگریزی تذکرہ بلھے شاہ کا ترجمہ'' (ترجمہ)

نظام المشائخ، دہلی، دسمبر ۱۹۱۱ء، ص ۲۵ تا ۳۶۔

۷۔ ''اقبالؒ، دیگر مشاہیر اور عطیہ فیضی''

ماہِ نو، کراچی، اپریل ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۔۲۶۔

۸۔ ''ایک پارسی فاضل کی وفات۔ جہانگیر ایدلجی سنجانا''

کتابی دنیا، کراچی، مارچ ۱۹۶۴ء۔

۹۔ ''ایک حدیث کی شرح اقبال کی زبانی''

ریاض، کراچی، مئی ۱۹۵۳ء، ص ۴۳۔۴۵۔

۱۰۔ ''آغا حشر پر بہتان''

مہر نیم روز، کراچی، نومبر ۱۹۵۶ء اور جنوری ۱۹۵۷ء۔

۱۱۔ ''آہ سمیع آرٹسٹ''

کتابی دنیا، کراچی

۱۲۔ ''انگلستان کے بچے کیا پڑھتے ہیں؟''

کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۴ء۔

۱۳۔ ''بابائے اردو کا انتقال'' (اداریہ مختصر نوٹ)

کتابی دنیا، کراچی، اگست ۱۹۶۱ء۔

۱۴۔ ''بچوں کے لیے کتابوں کا انتخاب'' (ترجمہ)

کتابی دنیا، کراچی، مارچ ۱۹۶۱ء۔

۱۵۔ ''برٹش میوزیم۔ لاکھوں کتابوں کا گھر'' (ترجمہ)

کتابی دنیا، کراچی، فروری ۱۹۶۶ء۔

۱۶۔ ''بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں۔ گاما پہلوان'' (ترجمہ)(۱)

کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۸ء۔

۱۷۔ ''بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں۔ مسز اینی بیسنٹ، نائیڈو'' (ترجمہ)(۲)

کتابی دنیا، کراچی، نومبر ۱۹۵۸ء۔

۱۸۔ ''بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں۔ شاہ مرزا بیگ'' (ترجمہ)(۳)

کتابی دنیا، کراچی، دسمبر ۱۹۵۸ء۔

۱۹۔ ''بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں۔ مولانا محمد علی، مسز سوکھی'' (ترجمہ)(۴)

کتابی دنیا، کراچی، جنوری ۱۹۵۹ء۔

۲۰۔ ''بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں۔ جی کے گوکھلے، شریف حسین'' (ترجمہ)(۵)

کتابی دنیا، کراچی، فروری ۱۹۵۹ء۔

۲۱۔ ''بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں۔ مہاتما گاندھی'' (۶)

کتابی دنیا، کراچی، مارچ ۱۹۵۹ء۔

۲۲۔ ''بعض مشاہیر سے میری ملاقاتیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو'' (۷)

کتابی دنیا، کراچی، اپریل ۱۹۵۹ء۔

۲۳۔ ''بہادر شاہ ظفر کچھ غیر مطبوعہ خطوط''

نگار، لکھنؤ، مئی ۱۹۲۵ء۔

۲۴۔ ''بیابہ مجلس اقبال''

کتابی دنیا، کراچی، اپریل ۱۹۶۶ء۔

۲۵۔ ''پانیر کی کہانی''

کتابی دنیا، کراچی، مئی ۱۹۶۵ء۔

**۲۶۔ ''پریس آرڈیننس''**

کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۳ء۔

**۲۷۔ ''تاریخ اسلام'' کی ضبطی''**

کتابی دنیا، کراچی اگست ۱۹۶۲ء۔

**۲۸۔ ''جوش۔ چند یادیں''**

ساقی، کراچی، جوش نمبر، جلد ۶۸، نمبر ۴۔

**۲۹۔ ''حافظ عبدالکریم'' (ملکہ وکٹوریہ کے استاد)**

ماہ نو، کراچی، جون ۱۹۶۷ء۔

**۳۰۔ ''حسرت موہانی''**

قومی زبان، کراچی، ۱۶/اپریل ۱۹۵۵ء۔

**۳۱۔ ''حضرت امجد حیدر آبادی'' (اداریہ، مختصر نوٹ کی صورت میں)**

کتابی دنیا، کراچی، اپریل ۱۹۶۱ء۔

**۳۲۔ ''حضرت نیاز اور ان کا فن''**

نیاز نمبر حصہ دوم، نگار، کراچی سالنامہ ۱۹۶۳ء ص ۳۴۔۳۵۔

**۳۳۔ ''حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی''**

کتابی دنیا، کراچی، اگست ۱۹۶۳ء۔

**۳۴۔ ''حیدر آباد سے جوش کی علیحدگی''**

ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵ جولائی ۱۹۶۳ء۔

**۳۵۔ ''ایک عظیم عورت'' (خالدہ ادیب خانم)**

روزنامہ جنگ، کراچی، ۲۲/فروری ۱۹۶۴ء۔

**۳۶۔ ''خواجہ حسن نظامی''**

ماہنامہ منادی، دہلی خواجہ نمبر، جلد ۳۰، شمارہ ۸۔۹، اگست۔ستمبر ۱۹۵۶ء۔

**۳۷۔ ''خیالات مولوی عبدالحق''**

کتابی دنیا، کراچی، ستمبر ۱۹۵۸ء۔

۳۸۔ ’’دو معاصر نذیر احمد اور ذکاء اللہ‘‘ (ترجمہ) سی۔ ایف۔ اینڈریوز/ برنی

ماہ نو، کراچی، مئی ۱۹۵۱ء۔

۳۹۔ ’’ڈاکٹر اقبال کی معیت میں چند لمحات‘‘

ماہ نو، کراچی، اپریل ۱۹۴۹ء ص ۸۔

۴۰۔ ’’ڈاکٹر محمد حفیظ سید‘‘

کتابی دنیا، کراچی، جنوری ۱۹۶۲ء۔

۴۱۔ ’’رابندر ناتھ ٹیگور‘‘ (ترجمہ) سی ایف اینڈریوز/ برنی

اردو، جنوری ۱۹۴۷ء، ص: ۱۳۲۔۱۵۴۔ (۲۵ صفحات طویل)

۴۲۔ ’’رشوت‘‘

کتابی دنیا، کراچی، اگست ۱۹۶۵ء۔

۴۳۔ ’’سرسید اور اردو‘‘

کتابی دنیا، کراچی، مارچ ۱۹۶۱ء۔

۴۴۔ ’’سید جمال الدین افغانی‘‘

معارف، اعظم گڑھ، نمبر ۴، جلد ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء۔

۴۵۔ ’’سید جمال الدین افغانی‘‘

معارف، اعظم گڑھ، نمبر ۵، جلد ۸ نومبر ۱۹۲۱ء۔

۴۶۔ ’’شاہد احمد دہلوی‘‘

کتابی دنیا، کراچی،

۴۷۔ ’’صوبہ بمبئی کے اردو، فارسی اور عربی اخبارات (۱۸۶۷ء سے ۱۹۱۴ء تک)‘‘

اردو، کراچی، اکتوبر ۵۴ء، ص ۶۵۔۷۶۔

۴۸۔ ’’ظفر کی شاعری‘‘

اردو، کراچی، جنوری، ۱۹۵۴ء ص ۹۷ تا ۱۱۳۔ (۱۷ صفحات، طویل مضمون)

۴۹۔ ’’غالب وصہبائی کے خطوط‘‘

معارف، اعظم گڑھ، نمبر ۳، جلد ۱۹، مارچ ۲۷ء، ص: ۲۱۱۔۲۱۳

۵۰۔ ''غازی مصطفیٰ کمال پاشا''

کتابی دنیا، کراچی، دسمبر ۱۹۶۳ء

۵۱۔ ''غلام علی الانا''

کتابی دنیا، کراچی،

۵۲۔ ''فارسی غزل اور غالب''

ماہنامہ، اردوئے معلیٰ، فروری ۱۹۶۹ء۔

۵۳۔ ''فلسفۂ قوتِ ارادی''

الناظر، لکھنؤ، یکم اگست، ۱۹۱۲ء، ص:۶۔۹[عنوان کے نیچے یہ عبارت درج ہے (قابلِ ملاحظہ جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے، پی ایچ ڈی)

۵۴۔ ''قاتل کی نئی سراغ رسی'' (ترجمہ)

کتابی دنیا، کراچی، اپریل ۱۹۶۵ء۔

۵۵۔ ''قاری عباس حسین کی وفات''

کتابی دنیا، کراچی،

۵۶۔ ''کاپی رائٹ'' (انگریزی)

یوسف بخاری (مترجم)، ہم قلم، کراچی، سال گرہ نمبر ۱۹۶۱ء ص ۹۴ تا ۱۰۵۔

۵۷۔ ''کاپی رائٹ''

کتابی دنیا، کراچی، جون ۱۹۶۰ء۔

۵۸۔ ''کپلنگ کی صد سالہ سالگرہ''

کتابی دنیا، کراچی، فروری ۱۹۶۶ء۔

۵۹۔ ''کتابوں کی فہرست (کیٹیلاگ)''

کتابی دنیا، کراچی، جون ۱۹۵۹ء۔

۶۰۔ ''کراچی کے قیدی (تاریخِ ملت کا ایک ورق)''

ماہ نو، کراچی، جولائی ۱۹۶۵ء۔

۶۱۔ ''کیا آپ محبِ وطن ہیں؟'' (ترجمہ از برکلے)

کتابی دنیا، کراچی، اپریل ۱۹۶۱ء۔

**۶۲۔ ''گالیاں''**

زمانہ، کانپور، اگست ۱۹۴۶ء، ص ۷۳ تا ۷۶۔

**۶۳۔ ''مارماڈیوک پکتھال ایک مسلم ادیب''**

نگار، لکھنؤ، مارچ ۱۹۲۴ء۔

**۶۴۔ ''ماں کا دل'' (فارسی سے ترجمہ)**

کتابی دنیا، کراچی، اگست ۱۹۵۷ء۔

**۶۵۔ ''مجھے اختلاف ہے'' (غالب کے ایک شعر سے متعلق)**

فاران، کراچی، جون ۱۹۵۲ء، ص ۴۱۔۴۲۔

**۶۶۔ ''محمد امین زبیری''**

کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۸ء۔۵

**۶۷۔ ''محمد رفیع کاشمیری۔ چند تاثرات''**

ریاض، کراچی، اگست ۱۹۵۳ء، ص ۴۵۔۴۷۔

**۶۸۔ ''مردے از غیب بروں آید و کارے بکند''**

کتابی دنیا، کراچی، نومبر ۱۹۵۸ء۔

**۶۹۔ ''مسز اینی بیسنٹ کا لیکچر'' (ترجمہ)**

ہمدرد (اخبار)، دہلی، اکتوبر ۱۹۱۷ء پہلا صفحہ۔

**۷۰۔ ''مفتی محمد کفایت اللہ صاحب''**

کتابی دنیا، کراچی، جولائی ۱۹۶۷ء۔

**۷۱۔ ''منشی دیا نرائن [نگم] کے چند اوصاف''**

زمانہ، کانپور، فروری و مارچ ۱۹۴۳ء، ص: ۳۷۔۴۰۔

**۷۲۔ ''منظوم ترجمہ قرآن''**

کتابی دنیا، کراچی، جون ۱۹۶۰ء۔

**۷۳۔ ''مولانا شبلی کی ایک نظم''**

ساقی، کراچی، جولائی ۱۹۵۶ء ص ۴۔۵۔

۷۴۔ ''مولانا شوکت علی''

۷۵۔ ''مولانا عبدالسلام ندوی''

کتابی دنیا، کراچی، جنوری ۱۹۵۷ء۔

۷۶۔ ''مولانا کیفی چڑیا کوٹی''

کتابی دنیا، کراچی، جنوری ۱۹۵۷ء۔

۷۷۔ ''مولانا محمد علی جوہر''

(۱) نقوش، لاہور، شخصیات نمبر، اکتوبر ۱۹۵۶ء۔ (۲) کتابی دنیا، کراچی، جنوری ۱۹۵۷ء۔

۷۸۔ ''مولانا محمد علی بہ حیثیت صحافی کے''

کتابی دنیا، کراچی، فروری ۱۹۶۱ء۔

۷۹۔ ''مولانا نیاز فتحپوری''

کتابی دنیا، کراچی، جولائی ۱۹۶۶ء۔

۸۰۔ ''مولوی عبدالحق۔ ایک تاثر''

قومی زبان، بابائے اردو نمبر، ۱۶ اگست ۱۹۶۴ء ص ۷۰۔

۸۱۔ ''مولوی عبدالحق''

(۱) نورس، کراچی، عبدالحق نمبر، جولائی ۶۰، ص ۱۴۲۔۱۴۳، (مولوی صاحب کی زندگی میں لکھا گیا) (۲) مشمولہ مجموعہ مطالعاتِ عبدالحق، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۳۶۳۔

۸۲۔ ''میرا دوست........ماتری''

کتابی دنیا، کراچی، مئی ۱۹۶۶ء۔

۸۳۔ ''میری علالت''

کتابی دنیا، کراچی، جون ۱۹۶۰ء۔

۸۴۔ ''نظامی گنجوی''

کتابی دنیا، کراچی، ستمبر ۱۹۵۶ء۔

۸۵۔ ''نئی تہذیب کے کرشمے'' (ترجمہ)

زمانہ، کانپور، اکتوبر ۱۳ ۱۹ء، ص: ۱۹۶۔۲۰۳۔ (نام: مولوی ضیاء الدین احمد برنی، بی۔اے)

۸۶۔ ''نیاز ایک منارۂ ادب''

کتابی دنیا، کراچی، جولائی ۱۹۶۶ء۔

۸۷۔ ''نیوز پرنٹ کی ہوش ربا گرانی''

کتابی دنیا، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۳ء۔

۸۸۔ ''وہ کرکٹ کھیلا کرتے تھے'' (مولانا شوکت علی)

ریاض، 'شوکت علی نمبر'، کراچی، جنوری ۱۹۵۴ء، ص ۳۷۔۴۲۔

(ج) تاریخی، علمی اور سماجی مضامین:

۱۔ ''ارسطو بن نیقو ماجس''

تمدن، دہلی، فروری ۱۹۱۳ء ص: ۱۱۔۱۸۔

۲۔ ''الفریڈ نوبل''

ہفت روزہ غالب، کراچی، ۷ جنوری ۱۹۴۹ء، دسمبر ۱۹۵۶ء، ص ۳۔

۳۔ ''ایک عظیم عورت''

روزنامہ جنگ کراچی، ۲۲ فروری ۱۹۶۴ء۔

۴۔ ''بھنگیوں کی ہڑتال'' (ترجمہ)

زمانہ، کانپور، ستمبر ۱۹۴۶ء، ص: ۱۲۱۔۱۲۷۔

۵۔ ''تاج محل کی تشکیل'' (انگریزی سے ترجمہ)

زمانہ، کانپور، ستمبر ۱۹۴۵ء، ص: ۱۲۹۔۱۳۲۔

۶۔ ''ٹکٹوں کا شوق''

تمدن، دہلی، جولائی ۱۹۱۴ء، ص: ۱۱۔۱۷۔

۷۔ ''جناح میموریل ہال کیسے بنا''

ماہِ نو، کراچی، قائداعظم نمبر، نومبر، ۱۹۴۸ء، ص ۵۵۔۶۰۔

۸۔ ''دہلی سازش کیس''

روزنامہ ہمدرد، دہلی، ۱۹۱۳ء۔ (یہ ایک طرح کی کارروائی ہے جو کئی روز تک شائع ہوئی)

**۹۔ ''طاس پین کی سرگزشت''**

تمدن، دہلی، دسمبر ۱۹۱۵ء، ترجمہ، ص: ۱۱۔۲۴۔

**۱۰۔ ''گمشدہ عورتیں''**

رہنمائے تعلیم، خاص نمبر، دہلی ۱۹۴۷ء۔

**۱۱۔ ''لارڈ رپن کا عہد حکومت''**

نگار، لکھنؤ، جنوری، فروری، اپریل۔۔۔ستمبر ۱۹۲۶ء۔

**۱۲۔ ''لارڈ لائڈ''**

ریاض، کراچی، دسمبر ۱۹۵۳ء، ص: ۵۹۔۶۱۔

**۱۳۔ ''میں نے جو لڑائیاں دیکھیں''**

نقوش، لاہور، ۱۹۶۵ء۔

**۱۴۔ ''ہندی قومیت کا نصب العین'' (ترجمہ)**

زمانہ، کانپور، جنوری ۱۹۱۳ء، ص ۲۶ تا ۵۱

**۱۵۔ ''ٹکٹوں کا شوق''**

تمدن، دہلی، جولائی ۱۴ء ص ۱۰۔۱۷

**(د) مذہبی مضامین:**

**۱۔ ''پیغمبر اسلام میری نظر میں'' ڈاکٹر مسز اینی بیسنٹ/ برنی**

ماہِ نو، کراچی، سیرت نمبر، جولائی۔اگست، ۱۹۶۳ء۔

**۲۔ ''حضرت عمر بن عبدالعزیز'' (حالات)**

فاران، کراچی، مارچ ۱۹۵۹ء، ص ۲۶۔

**۳۔ ''دعا کی عظمت'' (''سرالدعا'' [انگریزی] کا ترجمہ) سی ایف اینڈ یور/ برنی**

نظام المشائخ، دہلی، جلد ۶، نمبر ۵، ۳۰ھ۔ص ۱۔۳۔

**۴۔ ''رسول غیروں میں مقبول''**

نظام لمشائخ، دہلی، جلد ۸، نمبر ۲، ۳، ربیع الاول ۳۱ھ اور جلد ۲۶ نمبر ۶، ۳۱ھ ص: ۸۴ تا ۹۵۔

۵۔ ''رسول کا تیسرا ساتھی'' (ترجمہ) سی ایف اینڈریوز/ برنی

نظام المشائخ، دہلی، جلد ۲۶ نمبر ۲، ۱۳۱ھ۔ ماہ نو، کراچی، سیرت نمبر، جولائی۔ اگست ۶۳ء، ص ۱۸۷۔۱۹۵۔

۶۔ ''صغرسنی کی شادی''

تمدن، دہلی، جلد ۱۰، مارچ ۱۹۱۶ء۔

۷۔ ''علمِ نجوم اور مذہب''

ماہنامہ الناظر لکھنؤ، یکم مارچ ۱۹۱۲ء، ص ۲۱۔۲۴۔

۸۔ ''فلسفہء خودکشی ایک دہریہ کی نظر میں''

تمدن، دہلی، اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۱۳ء، ص ۳۸۔۵۳، ۳۲۔۳۹۔ (دو اقساط میں) (پہلی قسط میں نام ضیاء الدین احمد برنی بی اے اور دوسری قسط میں نام شیخ کے سابقے کے ساتھ لکھا گیا)

۹۔ ''ہندو مذہب اور عورت'' (ترجمہ)

زمانہ، کانپور، دسمبر ۱۹۱۵ء۔

برنی کے انگریزی مضامین تمام میری نظر میں نہیں ہیں۔ چند ایک ہیں۔ گزشتہ اوراق میں بیان کیا جا چکا ہے کہ برنی اپنے انگریزی مضامین مرتب کر چکے تھے تاہم شایع نہیں ہو سکے۔ مذکورہ مجموعہ دریافت و دست یاب نہیں ہو سکا چناں چہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کون کون سے مضامین لیے جا چکے ہیں۔ بہر حال میری نظر میں جو مضامین آ چکے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

1. 7586. Barni, Z.A. - Sir Syed Ahmad Khan: A life sketch, Dawn, 29 March 1953

2. 7587. Barni, Z.A. - Syed Sulaiman Nadvi, a life sketch, Dawn, 29 Nov. 1953

3. 7884. Barni, Z.A. - Flashes from the Life of Maulana Mohammad Ali, Dawn, 4 Jan. 1959(The Historical Background of Pakistan: 1857-1947: An Annotated Digest of Source Material, compiled by K. K. Aziz, PIIA (Pakistan Institute of International Affairs ?)

4. Syed Suleman Nadvi for "The P.E.N" Bombay

5.The Contribution of Islam to the World's Thought ,Theost y1919 v40 June p267 .

6.Beauties of the Quran ,Theost y1916 v37 August p515 .

انگریزی کے مذکورہ مضامین کے علاوہ بھی Bombay اور The P.E.N" Bombay Chronicle کی جانب سے متعدد خطوط ایسے ہیں جن میں برنی کی جانب سے لکھے مضامین یا کتابوں پر تبصروں کا تذکرہ ہے۔

اردو انگریزی کے کل ١١٥ مضامین ہیں جن کی نوعیت ادبی، علمی، تاریخی، سماجی اور مذہبی ہے ان میں بعض مضامین وہ ہیں جو اپنی اولین اشاعت کے بعد برنی کی تصنیف ''عظمتِ رفتہ'' (١٩٦١ء) میں بعض ترمیمات کے ساتھ شامل کیے گئے۔ بعض وہ مضامین ہیں جو اپنی اولین اشاعت کے بعد کسی اور کتاب یا رسالے میں بھی شایع ہوئے۔ ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد اُن مضامین کی ہے جو ''عظمتِ رفتہ'' کے علاوہ کہیں اور مرتب ہو کر شایع نہیں ہوئے۔ جیسا کہ گزشتہ اوراق میں ذکر ہو چکا ہے کہ برنی نے اردو مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا تاہم وہ طبع نہیں ہو سکا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اس مجموعے میں کون کون سے مضامین شامل ہوئے اور کون سے نہیں تھے۔

یہ مضامین کئی لحاظ سے اہم اور مفید ہیں۔ ان سے برنی کی علمی ادبی سرگرمیوں، ان کے علمی، ادبی، مذہبی اور کسی قدر سیاسی اور سماجی رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ یہ مضامین برنی کی زندگی سے متعلق بھی بعض اہم باتوں کے جاننے میں رہ نمائی کرتے اور معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان مضامین میں کہیں برنی کو ضیاءالدین احمد برنی بی اے، کہیں مولوی ضیاءالدین احمد برنی بی اے، کہیں شیخ ضیاءالدین احمد برنی، کہیں مسٹر ضیاءالدین احمد برنی اور کہیں محض ضیاءالدین برنی لکھا گیا ہے۔ اس سے جہاں ان کے اصل نام کے سلسلے میں شبہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی واضح نہیں ہوتا کہ یہ کون سے برنی ہیں۔ اس نوع کی الجھن کو گزشتہ اوراق میں بھی سلجھایا گیا ہے۔

ان مضامین میں بعض خالص تحقیقی نوعیت کے ہیں اور برنی کے تحقیقی اور تنقیدی رجحانات کو ظاہر اور واضح کرتے ہیں۔ مثلاً ''انگریزی تذکرہ بلھے شاہ'' اگرچہ مذکورہ مضمون ترجمہ ہے تاہم اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ برنی نے اپنے دیباچے اور حواشی کی ذریعے اس کی نوعیت تحقیقی اور تنقیدی بنا دی ہے۔ چوں کہ انگریزی مضمون تنقیدی ہے لہذا برنی نے جس نقطۂ نظر سے اس کا ترجمہ پیش کیا ہے وہ تنقیدی ہے۔

''آغا حشر پر بہتان'' یہ مضمون بھی تحقیقی نوعیت کا ہے اس میں آغا حشر پر لگائے ایک الزام کو دلائل کے ساتھ بہتان قرار دیا ہے۔ اس مضمون میں ان کے تنقیدی رویے کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون ہم قلم میں کئی قسطوں میں شایع ہوا تھا۔

''بہادر شاہ ظفر کچھ غیر مطبوعہ خطوط''، ''تاریخ اسلام'' کی ضبطی''، ''حافظ عبدالکریم'' (ملکہ وکٹوریہ کے استاد)، ''حیدر آباد سے جوش کی علحدگی''، ''صوبہ بمبئی کے اردو، فارسی اور عربی اخبارات (١٨٦٧ء سے ١٩١٤ء تک)''، ''ظفر کی شاعری''، ''غالب وصہبائی کے خطوط''، ''مجھے اختلاف ہے'' اور ''مولانا شبلی کی ایک نظم''۔

ان مضامین میں ''صوبہ بمبئی کے اردو، فارسی اور عربی اخبارات (١٨٦٧ء سے ١٩١٤ء تک)'' وہ مضمون ہے جس کے حوالے سند کو طور پر میمونہ عبدالستار دلوی کے پی ایچ ڈی کے مقالے دیے گئے ہیں۔ یہ مقالہ شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی کا پہلا مقالہ ہے۔ ''غالب وصہبائی کے خطوط'' اس مضمون میں برنی نے دہلی کے شمس العلماء مولوی ضیاءالدین خان، ایل ایل ڈی کے نام مشاہیر

کے خطوط کے ذخیرے سے ایک عدد خط غالب کا مرقومہ (۲۵) اور ایک عدد خط امام بخش صہبائی کا مولوی ضیاء الدین خان کے نام پیش کیے ہیں۔ غالب کے خط کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ خطوط کے مجموعے ''اردو معلّٰی'' میں نہیں ہے۔

''ظفر کی شاعری'' یہ مضمون بھی برنی کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مختلف حوالوں سے اور داخلی شہادتوں سے اس امر کو ثابت کیا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کا کلام اس کا اپنا ہے نہ ابراہیم ذوق کا اس سلسلے میں مصنف ''آبِ حیات'' محمد حسین آزاد کے بیانات کا بطلان کیا ہے۔ علاوہ ازیں ظفر کا کلام کا تنقیدی جائزہ لے کر اس کے محاسن کو اجاگر کیا ہے۔

''مجھے اختلاف ہے'' یہ مضمون برنی نے غالب کے ایک مشہور شعر

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا     کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کی شرح کے ذیل میں تحریر کیا ہے۔ انھوں نے اُس وقت تک ہو جانے والی شرحوں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی توجیہ پیش کی ہے۔ اس توجیہ میں برنی نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ نقدِ شعر میں برنی کا انداز استدلالی ہے۔ وہ جدید تنقید کے پیرائے میں شاعر کے اندازِ فکر، اس کے فن، ماحول اور اس کی نفسیات کو بنیاد بنا کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اس شعر کے ضمن میں ان کی دلیلیں ٹھوس ہیں۔

''عظمتِ رفتہ'' میں اگرچہ سوانحی خاکے ہیں تاہم ان خاکوں میں بھی برنی کا تحقیقی رویہ اور تنقیدی طرز نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ خیال اور قیاس پر یقین کی بنیاد اس وقت رکھتے ہیں جب بنیادی ماخذ تک رسائی باوجود کوشش کے نہ ہو سکے۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ برنی نے بہت لکھا ہے اور ان کی تمام تحریرات کے جمع کر لینے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا تاہم ایک عرصے کی تگ و دو جھولی بہت بھر لی ہے۔

''مولانا شبلی کی ایک نظم'' یہ مضمون بھی تحقیقی حوالے سے اہم مضمون ہے۔ اس میں برنی نے مولانا شبلی نعمانی کی ایک نظم جو انھوں نے اگست ۱۹۱۳ء میں بمبئ میں کہی تھی اور محمود احمد عباسی کو لکھ کر بھیجی تھی۔ برنی نے دعویٰ کیا ہے کہ نظم شبلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور اس کے بعد اس میں متعدد تصرفات ہو چکے ہیں چناں چہ برنی نے اس مضمون میں ان تصرفات کی نہ صرف نشان دہی کی ہے بلکہ ان سے بحث بھی کی ہے۔ ادبی مضامین کی طرح علمی، تاریخی، سماجی اور مذہبی مضامین بھی نہایت اہم ہیں۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے کہ ان مضامین کو تخلیق ہونے میں جہاں برنی کی افتادِ طبع نے انھیں مجبور کیا وہاں مقتضیٔ وقت افادۂ عام بھی اس کا باعث بنا۔

برنی کے مضامین کی ایک قسم وہ ہے جن کا ذکر انھوں نے عظمتِ رفتہ یا اپنی کسی اور کتاب میں کیا اور ان کے مکمل حوالے درج نہیں کیے چناں چہ ان تک رسائی ممکن نہیں ہو سکی۔ عظمتِ رفتہ میں برنی نے منشی سید احمد دہلوی پر خاکے میں لکھا ہے کہ جب سید صاحب نے چاہا کہ وہ ان کی اردو کتابوں پر انگریزی میں نوٹ لکھ دیں تا کہ انگریزی توضیح کو حکومتِ برطانیہ کو پیش کیا جائے تا کہ حکومت کی جانب سے ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ برنی سید احمد دہلوی کے اردو میں لکھے ہوئے نوٹ پر انگریزی میں ''تبصرہ لکھ دیا''۔ جس کے باعث سید احمد دہلوی کو حکومتِ ہند کی جانب سے ''خان صاحب'' کا خطاب عطا ہوا۔ (۲۶) اُن تبصروں سے متعلق کوئی لفظ تا حال ہاتھ نہیں لگ سکا۔ عظمتِ رفتہ ہی میں حکیم ''اجمل احمد خاں'' میں لکھتے ہیں ''قابلِ توجہ مضامین کا خلاصہ اردو میں تیار کر لیتا تھا تا کہ حکیم صاحب جب چاہیں، ملاحظہ فرمالیں۔'' (۲۷)

اسی مذکورہ کتاب میں ''مولانا محمد علی جوہرؔ'' خاکے، کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے محمد علی جوہر اور شوکت کی تقریریں اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیں۔(۲۸) ''خلیل خالد بک'' کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے خلیل خالد بک کا انٹرویو کیا اور اس انٹرویو کا حال ''ہمدرد'' دہلی میں تین چار کالم میں شایع ہوا۔اس کی اشاعت کے چند دن کے بعد مولانا محمد علی جوہر کو کسی جانب سے یہ معلوم ہوا کہ اس انٹرویو کی وجہ سے ترکی قونصل کی پوزیشن نازک ہوگئی ہے چناں چہ وہ برنی پر برہم ہوئے جب برنی نے معاملے کو صاف کیا تو وہ نرم ہوئے اور برنی نے ان کی ہدایت کے مطابق اس کا انگریزی ترجمہ کر کے ترکی قونصل کو بھیج دیا۔(۲۹) اور بھی کئی ایسے مضامین ،رپورٹ ،روداد،تقریر،طویل مراسلے اور بعض مختصر تحریریں ہیں جن کا صرف ذکر ملتا ہے۔خیال ہے کہ بہت سی ایسی تحریریں ہوں گی جن کا تذکرہ بھی نہیں ملتا۔

دست یاب مضامین کی اس طویل فہرست کے بعد ان مضامین کی فہرست دی جاتی ہے جن کے مکمل حوالے دست یاب نہیں تاہم برنی کی تحریروں سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہ مضامین لکھے گئے ہیں بعض کے شایع ہونے کی صرف اطلاع ہے۔انھیں برنی کے ''گم شدہ مضامین'' کے عنوان سے دیا جا رہا ہے۔

## (ہ) غیر دست یاب (گم شدہ) مضامین:

۱۔ سید احمد دہلوی (مؤلفہ فرہنگِ آصفیہ) کی کتابوں پر تشریح نوٹ

۲۔ برنی کے دست آویزات میں تھیوسوفیکل سوسائٹی، چوہان لاج، کانپور کی جانب سے ایک اطلاع نامہ ہے۔اس اطلاع نامے میں سوسائٹی سے متعلق افراد کے نام اور ان کے لیکچر کے عنوان اور دیے جانے کی تاریخ اور مہینہ بھی درج ہے۔اس کا سرنامہ اس طرح ہے:.Programme of Sunday evening Meeting in Lodge Rooms۔ برنی کا حوالہ اس طرح ہے: Theosophy"Sept.12th. "Sufism in the Light of۔اس سے پتا چلتا ہے کہ برنی نے مذکورہ موضوع پر مضمون لکھا مگر اس اطلاع کے علاوہ کوئی اور حوالہ اس تحریر کا کہیں دست یاب نہیں۔

۳۔ برنی کا ایک مضمون لیڈر، کراچی میں چند سال قبل شایع ہوا تھا جس میں خطیبوں کی خصوصیات بیان کی گئی تھیں۔(کتابی دنیا، کراچی، جون ۱۹۶۳)

۴۔ ہم قلم، کراچی ستمبر ۱۹۶۴ء میں برنی کا مضمون شایع ہوا تھا جو انھوں نے ''یومِ نذیر'' پر پڑھا تھا۔

۵۔ رہنمائے تعلیم، دہلی مدیر ماسٹر جگت سنگھ کے ''انسانیت نمبر'' میں ''اغوا شدہ عورتوں'' پر برنی نے مضمون بھیجا تھا (کتابی دنیا، مارچ ۶۴ء، ص ۱۱)

۶۔ ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی موت پر میرا مضمون ''اردو نامہ'' مین نکلے گا۔(خط انیس شاہ جیلانی کے نام، ۲۶ مارچ ۱۹۶۷ء۔)

۷۔ رئیس احمد جعفری کی کتاب '' Selection From Maulana Mohammad Ali's "COMRADE" میں برنی کا مضمون شامل ہے۔(کتابی دنیا جون ۶۵ ص ۱۱)

۸۔ ''عظمت رفتہ'' میں سید عبداللہ بریلوی کے خاکے میں ص ۳۰۴ پر اپنے چند مضامین کا ذکر کیا ہے۔

۹۔ احسن مارہروی کو ایک خط میں ان سے۔ سرسید کے خلاف لکھی جانے والی نظمیں طلب کی ہیں کسی مضمون کی تکمیل کے لیے۔

۱۰۔ ''آپ کا مقالہ مل گیا''۔ (مکتوب، ماہر القادری)

۱۱۔ ۱۹۱۳ء میں برنی کا ایک مضمون ''پین اسلامز'' پر افریکن ٹائمز اینڈ اورینٹ ریویو (لندن) (African Times and Orient review,London) میں شایع ہوا تھا۔

۱۲۔ سی ایف اینڈ ریوز کے خاکے میں منشی ذکاء اللہ پر مضمون کا ذکر ہے۔

۱۳۔ ستمبر ۱۹۲۱ء کو برنی نے معارف کو مضمون بھیجا۔ دیکھیے عبد الباری کا خط برنی کے نام۔

۱۴۔ ایک مضمون ''پین اسلامز'' پر ''افریکن ٹائمز اینڈ اورینٹ ریویو''، لندن میں ۱۹۱۳ء میں شایع ہوا۔ (عظمتِ رفتہ ''راجہ غلام حسین''، ص ۶۳۔)

۱۵۔ ۱۹۱۳ء میں ''خلیل خالد بک'' کا انٹرویو ہمدرد میں چار کالم میں شایع کیا اور پھر اس کا انگریزی ترجمہ کیا۔ (عظمتِ رفتہ، ص ۱۴۴)

۱۶۔ رسالہ نمک دان کا مجید لاہوری نمبر، جولائی ۵۹ء ضیاء الدین احمد برنی کا مضمون ہے۔

۱۷۔ رہنمائے تعلیم، دہلی، ''انسانیت نمبر'' میں برنی کا مضمون شائع ہوا (کتابی دنیا، مارچ ۶۴ء)

۱۸۔ سید جمال الدین افغانی میں اپنے دوست عبد الرحمٰن صدیقی کے مضمون کا اردو ترجمہ کیا اور شامل کتاب کیا۔

۱۹۔ اقبال از عطیہ بیگم (اردو) میں ایک مضمون ''ایک بھولی ہوئی صحبت'' جو ۲۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو انجمن ہائی اسکول بمبئی کے ہال میں نواب حسن یار جنگ بہادر، کی زیر صدارت ہونے والے ''اقبال ڈے'' میں پڑھا گیا۔ اس جلسے میں عطیہ بیگم بھی شریک تھیں۔ انھوں نے ہی اس جلسے کو ترتیب دیا تھا۔

۲۰۔ ''میرے مضامین'' یہ مضمون مشفق خواجہ کے دے دیا گیا۔ (خودنوشت)

۲۱۔ دیانرائن نگم (ایڈیٹر زمانہ، کانپور) نے ایک خط میں مرقومہ مارچ ۱۹۳۲ء میں لکھا ''آپ کا مضمون زیر طبع ہے، جلد شایع ہوگا۔''

کتب و مضامین کے جائزہ ہذا اور باب چہارم میں پیش کیے گئے مطبوعہ کتب کے جائزے کے پیش نظر برنی کی طویل، مسلسل اور متنوع خدمات کا اندازہ کر لینا مشکل نہیں رہتا۔ بھرپور کوشش کر کے یہ فہرست مرتب کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں بھی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ برنی کی تمام تحریروں تک مکمل رسائی ہوگئی ہے۔ کتب اور مضامین کی بازیافت میں تلاش اور کھوج کا سلسلہ ہنوز جاری ہے ان شاء اللہ برنی کی مکمل خدمات کو ضرور سامنے لایا جائے گا۔

## حواشی و تعلیقات:

۱۔ نگار، لکھنؤ، جنوری ۱۹۲۶ء۔

۲۔ رپن لارڈ (۱۸۲۷ء۔۱۹۰۹ء) ایک انگریز مدبر اور سیاست داں ۱۸۸۰ء میں وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجا گیا۔ یہ ہندوستان میں ساتواں وائسرائے تھا۔ اس نے آتے ہی افغانستان سے دوسری لڑائی ۱۸۷۸ء تا ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے والے مسائل کو حل کرنے کی غرض سے امیر شیر علی کے بھتیجے امیر عبدالرحمٰن کو افغانستان کا امیر بنایا۔ اس نے میونسپل ایکٹ اور لوکل ایکٹ نافذ کیے اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی بنیاد قائم کی۔ ۱۸۸۳ء لاہور میں یونی ورسٹی قائم کی۔ نمک کا محصول کم کیا اور ورنیکلر ایکٹ منسوخ کر دیا جس سے دیسی اخبارات کو نسبتاً آزادی مل گئی۔ ۱۸۸۴ء میں مستعفی ہو کر انگلستان لوٹ گیا۔ (شخصیات کا انسائیکلو پیڈیا، مرتب مقصود ایاز، محمد ناصر، شعاع ادب، لاہور، اول، ۱۹۸۷ء۔)

۳۔ ضیاء الدین احمد برنی کے سب چھوٹے بیٹے۔ جن کے بارے میں تفصیل برنی کی اولاد کے ذیل میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۴۔ یہ معلومات ریاض احمد صاحب برنی نے ۷/ اپریل ۲۰۰۹ کو ای میل کے ذریعے دیں۔

۵۔ نیشنل میوزیم کے ریکارڈ کے مطابق۔

۶۔ چوں کہ ریاض صاحب اس کی نقل خواجہ مرحوم کے دے آئے تھے اور راقم اکثر خواجہ صاحب کے پاس اپنے علمی کاموں کی غرض سے جایا کرتا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ راقم برنی پر تحقیقی کام کر رہا ہے چناں چہ انھوں نے اس اہم کام کے لیے راقم کا انتخاب کیا۔

۷۔ ای میل کے ذریعے۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ یہ معلومات ریاض احمد برنی صاحب کی فراہم کردہ ہیں۔

۱۰۔ ایک باب لاپتا ہے۔

۱۱۔ یہ ترجمہ ریاض احمد برنی نے کیا ہے اور ای میل کے ذریعے رومن زبان میں بھیجا ہے۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ ریاض صاحب نے شمع بانو بتایا ہے جب کہ برنی جمال الدین افغانی میں شعلہ بانو لکھا ہے۔

۱۴۔ یہ گفتگو ۱۶ جنوری ۱۹۵۴ء کی شام کو ہوئی تھی۔ دیکھیے: جمال الدین افغانی، ص ۱۹۹۔

۱۵۔ ڈاکٹر محمد ناظم نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے ایم اے کیا۔ وہیں تاریخ کے لکچرر ہوئے۔ انھوں نے کیمبرج یونی ورسٹی سے مذکورہ موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۹ء میں حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ پاکستان بن جانے کے بعد وہ سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ (عظمتِ رفتہ از ضیاء الدین احمد برنی، ص ۴۲۰) برنی نے آخری زمانے کی تحریر میں انھیں اپنا عزیز لکھا ہے۔ گزشتہ اوراق میں ایک ''تاریخ اسلام کی سچی کہانیاں'' کا تذکرہ ہو چکا ہے اسے ڈاکٹر محمد ناظم اور برنی نے مرتب کیا تھا۔

۱۶۔ یہ معلومات ویب سائٹ: www.books.google.com سے حاصل کی گئیں۔

۱۷۔ عظمتِ رفتہ، ص ۴۲۱۔

۱۸۔ یہ مکمل کتاب درج بالا ویب سائٹ پر دیکھی جا سکتی ہے۔ www.books.google.com

۱۹۔ یہ یادداشت مختلف دنوں میں برنی نے لکھوائی تھی اس کا عنوان کوئی نہیں بلکہ چند عنوانات کی فہرست ہے، جو یہ ہیں

۱۔ ضیاء الدین احمد برنی (مرحوم) کے خاندانی اور ذاتی حالات (خود نوشتہ)

۲۔ مالیات کے بارے میں ہدایات۔

۳۔ یادداشت۔

۴۔ متفرقات۔

۵۔ میرا المیہ۔

۶۔ میری ادبی زندگی کے بارے میں (خودنوشتہ یادداشت)۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ یہ معلومات ریاض برنی صاحب نے ای میل کے ذریعے فراہم کی تھیں۔ وہ پروفارما بھی نقل کر دیا تھا جس کا ذکر ہوا ہے۔ اس پروفارمے پر برنی بھیجنے کی تاریخ ۶۰/۸/۵ لکھی ہے۔

۲۳۔ ''روشنی کا مینار ضیاء الدین احمد برنی'' از قمر القادری، روزنامہ جنگ، کراچی، ۹/ اگست ۱۹۶۹ء۔

۲۴۔ ''میری ادبی زندگی کے بارے میں'' از برنی، ص ۸۔

۲۵۔ برنی کے بیان کے مطابق غالب کے دو خط اس ذخیرے سے بازیافت ہوئے تاہم انھوں نے ایک آیندہ کسی موقع پر پیش کرنے کا لکھا تھا تاہم وہ شایع نہیں کر سکے۔

۲۶۔ عظمتِ رفتہ، ص ۱۱۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔۱۵۲۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۸۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۴۵۔

## نتیجہ تحقیق:

آٹھ ابواب اور ضمیمہ جات کی تشکیل و ترتیب کے بعد یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ضیاء الدین احمد برنی کے سوانح اور ان کی علمی و ادبی خدمات تحقیق اور تنقیدی جائزے کے ساتھ مجتمع و مرتب ہونا ضروری تھے۔ تمام تر تحقیق سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

☆--- برنی کی شخصیت، کردار، طرزِ زندگی، نشیب و فراز، کامیابیوں اور ناکامیوں، فکر، ذہنی ارتقاء اور ان کے مزاج کو سمجھنے اور صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ان کے خاندان کا تفصیلی جائزہ تحقیق کے ساتھ بہ طور پس منظر، لیا جانا ضروری تھا۔

☆--- برنی نے جس عہد میں زندگی گزاری وہ کئی حوالوں سے برصغیر کی تاریخ میں نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے علاوہ ازیں برنی نے بھرپور علمی، ادبی اور صحافتی زندگی گزاری جس کا ضبطِ تحریر میں لا کر مطالعہ کیا جانا اور محفوظ ہونا ضروری تھا تا کہ اُردو زبان و ادب کا مؤرخ و محقق ان کے احوال و آثار سے پورے طور پر آگاہ ہو سکے اور تاریخ میں انھیں صحیح مقام دے سکے۔

☆--- برنی کی کئی حیثیتیں ایسی ہیں جن کے حوالے سے برنی کا تذکرہ اُردو کی تاریخ میں جیسا ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا۔ مدیر رسالہ کے طور پر تو رسائل کی تاریخ میں ذکر پایا جاتا ہے تاہم مترجم، مبصر، سوانح نگار، خاکہ نگار کے طور پر ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ اسی طرح اقبال کے حوالے سے ان کی کتاب ''اقبال از عطیہ بیگم'' کا حوالہ تو ملتا ہے تاہم عاشقِ اقبال کے طور پر صحیح حق ادا نہیں ہو سکا۔

☆--- مولانا محمد علی جوہر کے حوالے سے بھی ان کی خدمات کا علاحدہ سے جائزہ لیے جانے کی ضرورت تھی اور ان کی خدمات کو مولانا کے ماہر کے طور دیکھنا چاہیے تھا۔

☆--- بہ حیثیت نقاد ان کا کوئی باقاعدہ مضمون یا تصنیف تو نہیں پائی جاتی تاہم تبصروں اور بعض دیگر تحریروں سے برنی کے ''نقاد'' ہونے کی جہت بھی سامنے آتی ہے۔ برنی کا انگریزی اور اُردو زبان و ادب کا مطالعہ وسیع تھا چناں چہ انھوں نے اپنے تنقیدی رجحان کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ بمبئی کرانیکل اور کتابی دنیا میں شائع ہونے والے تبصرے اور ان کے بعض مضامین بھی اس زمرے میں آتے ہیں۔

☆--- برنی کی تحقیقی سرگرمیوں پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ ان کے کئی مضامین اس زمرے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کتابیں ان کے تحقیقی رجحان کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ''اخباری لغات''، ''سید جمال الدین افغانی''، ''جہاں آرا بیگم'' اور ''حیاتِ مولانا محمد علی جوہر'' تو انھوں نے باقاعدہ تحقیقی اصولوں کے مطابق تصنیف کیں اور جا بہ جا حوالوں کا اہتمام کیا ہے۔

☆--- تحقیق سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ ان کے مراسم اپنے عہد کے ہر بڑے ادیب، شاعر اور صحافی سے رہے ہیں۔ ان کے نام ڈیڑھ ہزار سے زائد غیر مطبوعہ خطوط اس امر کی شہادت ہیں۔ یہ خطوط جہاں ان کے زندگی اور

خدمات پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں اس عہد کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ماحول کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

☆--- برنی کے خطوط کے اپنے خطوط بھی ان کی زندگی اور خدمات کو سمجھنے میں خاصی مدد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مکتوب الیہان اور ان کے تعلقات اور مکتوب الیہان کی فکر اور زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

# کتابیات:

## اُردو کتب:

☆ ابن حزم: برنی، ضیاء الدین احمد (مترجم)، شریف ترک، دہلی، عبدالقدیر والاخوان تاجران کتب، ۱۹۲۰ء۔
☆ ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر: علامہ اقبال اور مولانا محمد علی، کراچی، مکتبہ شاہد علی، ۱۹۹۳ء۔
☆ ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر: خواجہ حسن نظامی، اسلام آباد، پورب اکادمی، اول، ۲۰۰۷ء۔
☆ ابوسلمان شاہجہاں پوری، ڈاکٹر: مولانا محمد علی اور ان کی صحافت، کراچی، ادارہ تصنیف و تحقیق پاکستان، اول دسمبر ۱۹۸۳ء۔
☆ ابوسلمان شاہجہاں پوری، ڈاکٹر: مکتوبات رئیس الاحرار، کراچی، موڈرن پبلیشرز، دسمبر ۱۹۷۸ء۔
☆ ابوسلمان شاہجہاں پوری، ڈاکٹر: مکاتیب ابوالکلام آزاد، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۸ء۔
☆ ابوسلمان شاہجہاں پوری، ڈاکٹر: پاکستان کے اُردو اخبارات ورسائل، کتابیات، جلد دوم، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان۔
☆ احترام الدین شاغل عثمانی، مولوی: صحیفہ خوشنویساں، نئی دہلی، ترقی اُردو بیورو، ثانی، اکتوبر دسمبر ۱۹۸۷ء۔
☆ احمد حسین صدیقی: دبستانوں کا دبستان، کراچی، حصہ اول، کراچی، محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۰۳ء۔
☆ اعجاز راہی: تاریخ خطاطی، ادارہ ثقافت پاکستان، اول، مئی ۱۹۸۶ء۔
☆ اعجاز راہی، ڈاکٹر: اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔
☆ اعظم چودھری، محمد، ڈاکٹر (مرتب)، منشی عبدالقدیر، آزاد ہند فوج، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، جنوری ۱۹۹۸ء۔
☆ اقبال، علامہ: سید مظفر حسین برنی (مرتب) کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول، جلد دوم، سوم، دہلی، اُردو اکادمی، ۱۹۹۳ء۔
☆ الطاف علی بریلوی، سید: تخلیقات و نگارشات، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۸۵ء۔
☆ امداد صابری: دہلی کی یادگار ہستیاں، دہلی، جمال پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۲ء۔
☆ امداد صابری: تاریخ صحافت اُردو، جلد ۵، ۱۹۸۳ء۔
☆ امداد صابری: تاریخ جرم وسزا، جلد اول کا دوسرا حصہ، دہلی، ۱۹۴۶ء۔
☆ امداد صابری: تاریخ صحافت اُردو، جلد ۵۔
☆ امداد صابری: دہلی کی یادگار ہستیاں، دہلی، جمال پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۲ء۔
☆ امداد صابری: امام الہند مولانا آزاد، کراچی، مکتبہ رشیدیہ، اگست ۱۹۸۶ء۔
☆ انور سدید، ڈاکٹر: پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲ء۔
☆ انیس شاہ جیلانی، سید: آدمی غنیمت ہے، اول، صادق آباد، مبارک لائبریری، محمد آباد، جنوری ۱۹۹۴ء۔
☆ اوصاف علی واحدی دہلوی، سید: ''نا قابل فراموش شخصیات''، اسلام شبنم، کراچی، نظام المشائخ، ۲۰۰۵ء۔
☆ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر: اُردو میں اصول تحقیق، جلد اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔
☆ آقا محمد رمضانی: برنی، ضیاء الدین احمد (مترجم) لطائف ملا نصر الدین، کراچی، تعلمی مرکز، ۱۹۵۰ء۔
☆ برنی، ضیاء الدین احمد: میرے خاندانی اور ذاتی حالات (غیر مطبوعہ) ۱۹۶۸ء۔
☆ برنی، ضیاء الدین احمد: جہاں آرا بیگم، تعلیمی مرکز، کراچی دوسرا ایڈیشن، ۱۹۵۵ء۔

☆ برنی، ضیاءالدین احمد: میری زندگی کے بارے میں (غیر مطبوعہ) مرقومہ ۲۲ اگست ۱۹۶۸ء۔
☆ برنی، ضیاءالدین احمد: اقبال از عطیہ بیگم، دوم، کراچی، اقبال اکیڈمی، مارچ ۱۹۶۹ء۔
☆ برنی، ضیاءالدین احمد: تعلیم و تربیت، کراچی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۶۹ء۔
☆ برنی، ضیاءالدین احمد: اخباری لغات معروف بہ کلید اخبار بینی، دہلی، دلی پرنٹنگ ورکس، ۱۹۱۵ء۔
☆ برنی، ضیاءالدین احمد: حیاتِ مولانا محمد علی جوہر، کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ، ۲۰۰۱ء۔
☆ برنی، ضیاءالدین احمد: عظمتِ رفتہ، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۶۱ء۔
☆ برنی، ضیاءالدین احمد: حیاتِ مولانا محمد علی جوہر، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۲۰۰۱ء۔
☆ برنی، ضیاءالدین احمد: جمال الدین افغانی، دہلی، جامعہ ملیہ پریس، ۱۹۲۴ء۔
☆ بشیر احمد ڈار: Letters of Iqbal، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان۔
☆ بشیر احمد ڈار، : نوادرِ اقبال، طبع اول، کراچی، اقبال اکادمی پاکستان، مارچ ۱۹۶۰ء۔
☆ بشیر الدین احمد: واقعاتِ دارالحکومت دہلی، حصہ دوم، اُردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۰ء۔
☆ بنارسی داس چترویدی اور مس مارجوری سائکس: ضیاءالدین احمد برنی (مترجم)، سی۔ ایف۔ اینڈریوز، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۵۲ء۔
☆ بیگم رشیدہ آفتاب: علامہ اقبال اور ان کے فرزند اکبر آفتاب، کراچی، فروز سنز، اگست ۱۹۹۹ء۔
☆ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر: ادبی تحقیق کے اصول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۲ء۔
☆ تحسین فراقی، ڈاکٹر: عبدالماجد دریابادی۔ احوال و آثار، دوم، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۶ء۔
☆ جلیل قدوائی (مرتب): مکاتیب عبدالحق، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۳ء۔
☆ جمیل احمد رضوی، سید: توضیحی کتابیات ابلاغیات (جلد اول)، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء۔
☆ جمیل احمد رضوی، سید: توضیحی کتابیات ابلاغیات (جلد اوّل)، لاہور، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی۔
☆ جمیل احمد، خواجہ: چند یادیں، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۷ء۔
☆ چارلس تھیوفلس مٹکاف: برنی، ضیاءالدین احمد (مترجم)، غدر کے صبح شام، دہلی، کارکن حلقہ مشائخ بک ڈپو، ۱۹۲۶ء۔
☆ حمزہ فاروقی: سفرنامہ اقبال، کراچی، اسلوب، ۱۹۸۹ء۔
☆ حمزہ فاروقی، محمد: یادوں کے دیے، کراچی، مکتبہ دانیال، اول ۲۰۰۱۔
☆ خلیق انجم، ڈاکٹر: فنِ ترجمہ نگاری، قمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دلی، ۱۹۹۵ء۔
☆ دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور، جلد ۴، ۱۹۶۹ء۔
☆ ذکاء اللہ دہلوی، منشی: مقدمہ از ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، عرب قبل اسلام، کراچی، طاہرہ کتاب گھر، ۱۹۶۴ء۔
☆ رابعہ طارق: مولانا ظفر علی خاں کی آپ بیتی، لاہور ندوۃ المعارف، ۱۹۹۹ء۔
☆ راشد شیخ، محمد: تذکرہ خطاطین، کراچی، ادارہ علم و فن، ۱۹۹۸ء۔
☆ رانا محمد سرور خاں: تاریخ راجپوت کھوکھر، کینال ویو کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی ملتان روڈ، لاہور، ۲۰۰۴ء۔
☆ رفیق خاور: سفیر خیال، خطاطی، ماہِ نو، کراچی، ستمبر ۱۹۶۲ء۔
☆ رئیس احمد جعفری: علی برادران، لاہور محمد علی اکیڈیمی، ۱۹۶۴ء۔
☆ سرفراز علی رضوی، سید: اشاریہ اُردو، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء۔
☆ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر سید: اقبال کی ابتدائی زندگی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اول، ۱۹۸۶ء۔

☆ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر، سید: علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن (حیات و افکار)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اول، ۱۹۸۱ء۔

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر: علامہ اقبال۔ حیات، فکر و فن، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

☆ سہیل شفیق، محمد: اشاریہ معارف، قرطاس، کراچی یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء۔

☆ سی ایف اینڈ ریوز: ضیاء الدین احمد برنی (مترجم)، خیالاتِ مہاتما گاندھی، جلد اول، دوم، بمبئی، معین الدین حارث، اجمل پریس، پرنس بلڈنگ، ۱۹۳۴ء۔

☆ سی۔ایف۔اینڈ ریوز: ضیاء الدین احمد برنی (مترجم) تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۵۲ء۔

☆ سی۔ایف۔ازبورن: برنی، ضیاء الدین احمد (مترجم)، تذکرہ حضرت بلھے شاہ، دہلی، نظام المشائخ، ۱۹۲۰ء۔

☆ شاہ محمد قادری، سید: مولانا محمد علی جوہر، لاہور، تخلیقات، ۱۹۹۸ء۔

☆ شاہ محی الحق فاروقی: بیدار دل لوگ، کراچی، اکادمی بازیافت۔

☆ شفیق عقیل: مشہور اہل قلم کی گمنام تحریریں، لاہور، بک ہوم، ۲۰۰۴ء۔

☆ شمشیر خان: پاکستان کے منتخبہ ادبی اُردو رسائل کا تاریخی، تنقیدی و ادبی جائزہ، کراچی، علی اصغر فرزانے، ۱۹۷۰ء۔

☆ ظہیر علی صدیقی، ڈاکٹر: مولانا محمد علی اور جنگ آزادی، لاہور، سندھ ساگر اکادمی، ۱۹۹۹ء۔

☆ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر: کاروانِ صحافت، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، اوّل ۱۹۶۲ء۔

☆ عبدالعزیز خالد: اقبال، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۷۵ء۔

☆ عبدالعزیز ساحر: ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے خطوط، لاہور، حسنین پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء۔

☆ عبدالقوی دسنوی: اقبالیات کی تلاش، لاہور، گلوب پبلشرز، ۱۹۸۳ء۔

☆ عبدالقوی دسنوی: اقبالیات کی تلاش، لاہور، گلوب پبلیشرز، س،ن۔

☆ عبداللطیف اعظمی: مشاہیر کے خطوط، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، دسمبر ۱۹۷۵ء۔

☆ عبداللطیف اعظمی: مولانا محمد علی ایک مطالعہ، لاہور، ایچ۔وائی۔ پرنٹرز، ۲۰۰۰ء۔

☆ عبدالماجد دریابادی، مولانا: سیاحتِ ماجدی، کراچی، ادارہ علم و فن، ۲۰۰۱ء۔

☆ عبدالماجد دریابادی، مولانا: محمد راشد شیخ (مرتب) سیاحتِ ماجدی، کراچی، ادارہ علم و فن، ۲۰۰۱ء۔

☆ عبدالمجید قریشی: کتابیں ہیں چمن اپنا، کراچی، ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ۱۹۹۲ء۔

☆ عطا خورشید، ڈاکٹر: اشاریہ نگار، دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۴ء۔

☆ عطش درانی، ڈاکٹر: جدید رسمیات تحقیق، لاہور، اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۵ء۔

☆ عطیہ بیگم: ضیاء الدین احمد برنی (مترجم)، اقبال از عطیہ بیگم، کراچی، اقبال اکیڈمی، ۱۹۵۶ء۔

☆ علاء الدین خالد: مترجمہ: نیر علوی، صحافت اور جمہوریت، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ، ستمبر ۱۹۶۸ء۔

☆ فاطمۃ الکبریٰ: حمائل شریف (غیر مطبوعہ)۔

☆ فقیر محمد فقیر: تاریخ گوجرانوالہ، مرتبہ محمد جنید اکرم، بزمِ فقیر پاکستان، ۱۹۹۷ء۔

☆ فیروز سنز اُردو انسائیکلو پیڈیا تیسرا ایڈیشن، کراچی، جنوری ۱۹۸۴ء۔

☆ قمر رئیس، ڈاکٹر: ترجمہ کا فن اور روایت، تاج پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۶ء۔

☆ کامل قریشی، ڈاکٹر: (مرتب)، داغ دہلوی حیات اور کارنامے، دہلی، اُردو اکادمی۔

☆ ماہر القادری، مولانا: طالب ہاشمی (مرتب)، یادِ رفتگاں، جلد اول، لاہور، البدر پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء۔

☆ ماہرالقادری، مولانا: طالب ہاشمی (مرتب): یادِ رفتگاں، طبع اول، لاہور، البدر پبلی کیشنز، مارچ ۱۹۸۴ء

☆ محمد اصغر کاظمی، سید: مولانا حسرت موہانی ایک ہمہ جہت شخصیت، کراچی حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال ٹرسٹ، ۲۰۰۴ء۔

☆ محمد اصغر کاظمی، سید: نشاط النسا بیگم حسرت موہانی، کراچی، حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال، فروری ۲۰۰۵ء۔

☆ محمد ناظم، ڈاکٹر، برنی، ضیاءالدین احمد: تاریخ اسلام کی سچی کہانیاں، کراچی، تعلیمی مرکز، ۱۹۵۰ء۔

☆ محمود الحسن: پاکستان کے اُردو اخبارات ورسائل کتابیات، جلد اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان۔

☆ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: ترجمے کا فن، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء۔

☆ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: کتابیات تراجم، جلد دوم، نثری ادب، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء۔

☆ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: کتابیاتِ تراجم، اول، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸ء۔

☆ مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: مغرب سے نثری تراجم، اول، اسلام آباد، جلد دوم، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء۔

☆ مسز اینی بیسنٹ: برنی، ضیاءالدین احمد (مترجم) اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں، بمبئی، مکتبہ سلطانی، بھنڈی بازار ۱۹۵۰ء۔

☆ مصباح العثمان: اشاریہ اُردو نامہ، کراچی، اُردو ڈکشنری بورڈ، ۱۹۹۷ء۔

☆ معین الدین عقیل، ڈاکٹر: تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ، کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۷۶ء۔

☆ معین الرحمن، سید، ڈاکٹر: شخصیات اور ادبیات، اول، لاہور، مکتبہ عالیہ، اُردو بازار، ۱۹۹۵ء۔

☆ مقصود ایاز، محمد ناصر: شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، شعاع ادب، لاہور، اول، ۱۹۸۷ء۔

☆ ملا واحدی: تاثرات، مرتبہ حکیم محمد سعید، اول کراچی، ہمدرد اکیڈمی، جلد اول، ۱۹۷۰ء۔

☆ ملا واحدی: سوانح عمری حضرت خواجہ حسن نظامی، کراچی، گلڈ انجمن کتاب گھر، ۱۹۵۷ء۔

☆ ملا واحدی: میرے زمانے کی دلی، کراچی انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۲۰۰۰ء

☆ ملا واحدی: حکیم محمد سعید (مرتب)، تاثرات، اول، جلد اول، کراچی، ہمدرد اکیڈمی، ۱۹۷۰ء۔

☆ ملا واحدی: دِلّی جو ایک شہر تھا، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء۔

☆ منیر احمد سلیچ، ڈاکٹر: وفیاتِ نام ورانِ پاکستان، لاہور، اُردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۶ء۔

☆ موسیو سلواڈوری: ضیاءالدین احمد برنی (مترجم)، جدید کمیونزم کا ارتقاء، کراچی، جاوید پریس، ۱۹۵۸ء۔

☆ مولانا عبدالماجد دریابادی: معاصرین، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۴ء۔

☆ میمونہ دلوی: بمبئی میں اُردو، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ستمبر ۱۹۷۰ء۔

☆ نعیم الدین زبیری، حکیم: توضیحی فہرست کتب خانہ ہمدرد، اشاعت ہائے خاص اُردو رسائل، کراچی، ہمدرد فاؤنڈیشن، ۱۹۸۴ء۔

☆ نقی محمد خان خورجوی: عمر رفتہ، ادارہ علم و فن، کراچی، ۲۰۰۳ء۔

☆ نیر علوی: صحافت اور جمہوریت، کراچی، اُردو اکیڈمی سندھ۔ ستمبر ۱۹۶۸ء۔

☆ والٹر جوزیف فشل: ضیاءالدین احمد برنی (مترجم)، ابن خلدون اور امیر تیمور، کراچی، اُردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۶۷ء۔

☆ ولی مظہر: عظمتوں کے چراغ، ملتان، مجلس کارکنان تحریک پاکستان، جلد دوم، ۱۹۸۸ء۔

☆ ولیم ایڈ لنگٹن: ضیاءالدین احمد برنی (مترجم) کیوپڈو سائیکی، کراچی، تعلمی مرکز، ۱۹۵۰ء۔

☆ یحییٰ ہاشم بوانی: پاکستان کے پچاس سال اور میمن برادری، حصہ اول، کراچی، دی میمن ویلفیر سوسائٹی، س ن۔

☆ یوسف بخاری، سید: خطاطی اور ہمارا رسم الخط، کراچی، ایچ، ایم، سعید کمپنی، ناشران و تاجران کتب، مئی ۱۹۵۹ء۔

## انگریزی کتب:

1. Separatism Among Indian Muslims, Cambridge University Press, by Francis Robinson
2. Muhammad Ali:His life and Services, Ganesh Book Co.Madras, India, 1918, by Ziauddin Ahmed Barni
3. Romance of the Oriental Translator's Office, Bombay, Talimi Markas, Karachi, 1952, by Ziauddin Ahmed Barni.
4. Zakaullah of Delhi, Cambridge University Press, 1929, by C.F.Andrews.
5. Mahatma Gandhi's Ideas(tow volume), 1934, The Macmillan Co.New Yark, by C.F.Andrews.
6. Two Native Narratives of the Mutiny in Delhi, A.Constable, London, Harvard University, 1898, by C.T.Metcalfe.
7. The Rise of Modern Communism, by Massimo Salvadori, Henry Holt and Company New York, 1952.
8. Ibn Khaldu-n and Tamerlane, by Walter Joseph Fischel, University of California Press, Berkeley and Los Angeles, California, 1952.

## وہ چند انگریزی کتب جن میں کسی نہ کسی حوالے سے برنی کا تذکرہ ہے:

1. LIBRARIANSHIP IN PAKISTAN FIFTEEN YEAR'S WORK.1947-62 (Bani onPAGE-5) by:Anis kurshid, irshad Ali 1965.
2. NATIONALIST CONSCIENCE:M.AANSARI, THE CONGRESS, AND THE RAJ.(Bani on PAGE-11) By:Mushirul Hassan 1987.
3. PUBLICATIONS OF LEARNED BODIES AND RESEARCH ORGANIZATIONS IN PAKSTAN. By:National Book Centre of Pakistan. 1973-(Bani on page-11)
4. NEW HISTORY OF INDIA 7 PAKISTAN. By:abdul qayyum, Mahmud Brelvi.1951.(Bani onPAGE-123)
5. JOURNAL OF THE PAKISTAN HISTORICAL SOCIETY. By:pakistan Historical Society.1953.(Bani on PAGE-46)
7. LETTERS OF WRITINGS OF IQBAL.By:Bashir Ahmed Dar.1967(Bani onPAGE-11)
8. MOHAMED ALI IN INDIAN POLITICS:SELECT WRITINGS. By:Mushirul Hassn.1986.(Bani onPAGE-15)
9. SEPARATISM AMONG INDIAN MUSLIMS: THE POLITICS OF THE UNITED PROVINCES...By: Francis Robinson.2007.(Bani onPAGE-368)
10. MUSLIM WOMEN IN MEDIEVAL INDIA. By:Zinat Kausar.1992.(Bani onPAGE-174)
11. SUCCESSORS OF SIR SYED AHMED KHAN:THEIR ROLE IN THE GROWTH OF MUSLIM...By:Shan Muhamm 1981.(Bani onPAGE-84)
12. JOURNAL OF THE RESEARCH SOCIETY OF PAKISTAN. By:Research Society of

Pakistan.1964.(Bani onPAGE-70)

13. THE THEOSOPHIST. By:Helena Petrovna Blavatsky.Theosophical Society(Madras India).1916.(Bani onPAGE-515)
14. LEADERSHIP IN SOUTH ASIA. By:Bishwa NathPandey, University of London.1977.(Bani onPAGE-393)
15. THE VOICE OF ISLAM. By:Jamiyat-ul-Falah.1952.(Bani onPAGE-104)
16. PAKISTAN BOOK TRADE DIRECTORY. By:Muhammad adil Usmani.1966.(Bani onPAGE-82)
17. IQBAL by ATIYA BEGAM, IQBAL by Atiyq Begum, IstEdition, Bobay, 1947 & 2nd Edition, Aina-e-Adab, Lahore, 1969.
18. A CONCISE ETYMOLOGICAL DICTIONARY OF PERSIAN LANGUAGE by Dr.Sheikh Ghulam Maqsud Hilali, Patna, Khuda Bakhsh Oriental Public Library, 1961.
19. A CATALOGUE OF THE PERSIAN PRINTED BOOKS IN THE MUSEUM(LONDON)By British Museum Dept. of Oriental Printed Books and Manuscripts, Edward Edwards, Published by British Museum, 1922, 967 pages.
20. JOURNAL OF THE ASIATIC SOCIETY OF BOMBAY by Asiatic Society of Bombay. Published by Asiatic Society of Bombay, Item notes: v.25, Original from the University of California, Digitized Jul 31, 2008.
21. QUARTERLY JOURNAL OF INDIAN STUDIES IN SOCIAL SCIENCES, by Indian Institute of Asian Studies. Published by Indian Institute of Asian Studies, 1967 Original from the University of California. Digitized Dec 17, 2007.
22. GAZETTEER OF THE BOMBAY PRESIDENCY, By Bombay (India : State), James M Campbell, R E Enthoven, Bombay (India : State Published by Govt. Central Press, 1904.
23. PAKISTAN BOOK TRADE DIRECTORY, By Muhammad Adil Usmani, Ghaniul Akram Sabzwari, Published by Library Promotion Bureau, 1966.Original from the University of California, Digitized Dec 14, 2006 , 204 pages.
24. THE VISHVA-BHARATI, QUARTERLY, By Rabindranath Tagore, Visva-Bharati Published by Visva-bharati, 1941, Item notes: ser.2 v.16-17 (May 1950-A Original from the University of California, Digitized Jan 10, 2007.
25. THE HISTORICAL BACKGROUND OF PAKISTAN:1857-1947:An Annotated Digest of Source Material, compiled by K. K. Aziz, PIIA (Pakistan Institute of International Affairs)

## انگریزی اخبار اور رسائل:

### NEWS PAPERS

1. Dawn, karachi, 29 March 1953
2. Dawn, karachi, 29 November 1953
3. Dawn, karachi, 4 Jan. 1959

4. The Evening News, Karachi
5. The P.E.N, India
6. Asiatic Society Journal, India.

## اُردولغات:

۱۔ ''اُردولغت'' (تاریخی اصول پر)، جلد جلد دہم، کراچی، اُردولغت بورڈ۔

2. Concise Etymological Dictionary of Persian Language, by Dr.Sheikkh Ghulam Maqsud Hilali, Khuda Bakhsh Oriental Public Library Patna, 1961.

## رسائل:

☆ عصمت (ماہ نامہ)، کراچی، جولائی واگست ۱۹۶۴ء۔
☆ قومی زبان (ماہ نامہ)، کراچی، بابائے اُردو نمبر، اگست ۱۹۶۴ء۔
☆ کتابی دنیا (ماہ نامہ)، کراچی تعلیمی مرکز، دسمبر ۱۹۵۵ء۔
☆ کتاب (ماہنامہ)، لاہور، شمارہ ۱۲، ستمبر ۱۹۶۹ء۔
☆ شمارہ ۶، فروری ۱۹۶۷ء۔
☆ جنوری ۱۹۶۸ء۔
☆ جلد ۸، شمارہ ۲ نومبر ۱۹۷۳ء۔
☆ معارف (ماہ نامہ)، اعظم گڑھ، نمبر ۱، جلد ۲، جولائی ۱۹۱۷ء۔
☆ اپریل ۱۹۳۴ء۔
☆ نگار (ماہ نامہ)، لکھنؤ جنوری ۱۹۳۶ء۔
☆ ہم قلم (ماہ نامہ)، کراچی، سال گرہ نمبر، ۱۹۶۱ء۔
☆ مجلّہ تحقیق، جلد ۲۰، مسلسل ۶۴، کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۹۹ء۔
☆ فاران (ماہنامہ)، کراچی، جولائی ۱۹۶۹ء۔
☆ ساقی (ماہنامہ)، کراچی، ستمبر ۱۹۵۶ء۔
☆ مہک (مجلّہ)، گوجرانوالہ نمبر، گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ، ۱۹۸۲ء۔
☆ المعارف، خصوصی شمارہ، ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ، لاہور، مارچ۔اپریل ۱۹۸۶ء۔
☆ نقاد (ماہ نامہ)، کراچی۔
☆ ماہِ نو (ماہ نامہ)، کراچی، نومبر ۱۹۴۸ء۔
☆ سیارہ ڈائجسٹ (ماہ نامہ)، قرآن نمبر جلد اول، لاہور

☆ آہنگ (ماہ نامہ) کراچی، یکم سے ۱۵ اپریل ۱۹۷۷ء۔
☆ تمدن (ماہ نامہ)، دہلی، مارچ، ۱۹۱۵ء۔
☆ سب رس (سہ ماہی)، کراچی، ڈاکٹر سید سجاد دہلوی نمبر، اگست ۱۹۸۰ء۔
☆ صحیفہ (سہ ماہی)، لاہور مجلس ترقی ادب، شمارہ ۵۲، جولائی ۱۹۷۰ء۔
☆ نوائے ادب (سہ ماہی) ممبئی، اکتوبر ۲۰۰۶ء۔
☆ زمانہ (ماہ نامہ)، کانپور، فروری مارچ یادگار نمبر ۱۹۲۳ء۔
☆ نمک دان (ماہ نامہ)، کراچی، ''مجید لاہوری نمبر''، جون، ۱۹۵۹ء۔
☆ منادی (ماہ نامہ)، دہلی، ''خواجہ حسن نظامی نمبر''، اگست، ستمبر، ۱۹۵۷ء۔
☆ ریاض (ماہ نامہ) کراچی۔

## اخبارات:

☆ جنگ (روزنامہ)، کراچی، ۱۶ اپریل، ۱۹۵۵ء
☆ ۲ دسمبر ۱۹۶۸ء،
☆ جمعہ ایڈیشن ۱۵ مئی ۱۹۶۹ء
☆ سنڈے ایڈیشن، ۱۴ جون ۱۹۶۹ء،
☆ ۹ راگست ۱۹۶۹ء،
☆ ڈان (اُردو)، کراچی۔
☆ ہمدرد (روزنامہ)، دہلی۔

## غیر مطبوعہ مقالے:

☆ شہزاد عالم: ''اشاریہ آہنگ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ء، (ریڈیو پاکستان)، (غیر مطبوعہ) مقالہ برائے ایم۔اے، شعبۂ اُردو، سندھ یونی ورسٹی۔
☆ خان نبی: ''اشاریہ آہنگ ۱۹۷۱ء تا ۱۹۸۰ء، (ریڈیو پاکستان)، (غیر مطبوعہ) مقالہ برائے ایم۔اے، شعبۂ اُردو، سندھ یونی ورسٹی۔

## کتاب خانے:

☆ انجمن ترقی اُردو، ''کتب خانۂ خاص''، کراچی۔
☆ بہادر یار جنگ لائبریری، بہادر آباد، کراچی۔

- ☆ بہاولپور پبلک لائبریری، بہاولپور۔
- ☆ بیدل لائبریری، شرف آباد، کراچی۔
- ☆ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور۔
- ☆ پنجاب یونی ورسٹی، مرکزی کتاب خانہ، لاہور۔
- ☆ تھیوسوفیکل ہال، لائبریری، کراچی۔
- ☆ جامعہ سندھ، ''مرکزی کتاب خانہ'' جام شورو، سندھ۔
- ☆ جامعہ کراچی، ''مرکزی کتاب خانہ''، کراچی۔
- ☆ حسرت موہانی لائبریری، حیدر آباد، سندھ۔
- ☆ حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال ٹرسٹ، کراچی۔
- ☆ ریڈیو پاکستان، لائبریری، کراچی۔
- ☆ سردار پور جھنڈیر لائبریری، بہاولپور۔
- ☆ سلفیہ کتاب خانہ، لاہور۔
- ☆ سند حالو جی، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، سندھ۔
- ☆ سندھی ادبی بورڈ ''کتاب خانہ''، جام شورو، سندھ۔
- ☆ شمس العلماء داؤد پوتا لائبریری، حیدر آباد، سندھ۔
- ☆ غالب لائبریری، ناظم آباد، کراچی۔
- ☆ کتاب خانہء عجائب گھر، لاہور۔
- ☆ گورنمنٹ کالج، لائبریری، لاہور۔
- ☆ لیاقت میموریل لائبریری، کراچی۔
- ☆ مدینۃ الحکمت، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی۔
- ☆ نیشنل میوزیم پاکستان، ''شعبۂ مخطوطات''، کراچی۔

## نجی یا ذاتی کتاب خانے:

- ☆ کتاب خانہء عتیق احمد جیلانی، حیدر آباد، سندھ۔
- ☆ کتاب خانہء ریاض احمد برنی، کراچی۔
- ☆ کتاب خانہء شاہ انجم، حیدر آباد، سندھ۔
- ☆ کتاب خانہء غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر، حیدر آباد، سندھ۔
- ☆ کتاب خانہء مشفق خواجہ، کراچی۔
- ☆ کتاب خانہء معین الدین عقیل، ڈاکٹر، کراچی۔

## ویب سائٹس:

1. http://www.ampltd.co.uk/collections_az/African-Journals
2. http://www.books.google .com
3. http://www.questia.com

0 ----------- 0

# ضمیمہ جات

# ضمیمہ نمبرا

☆۔۔منشی محمد الدین (برنی کے والد) کی تصویر
☆۔۔فاطمۃ الکبریٰ (بہن) کی تصویر
☆۔۔ضیاء الدین برنی اور بیگم برنی کی تصاویر
☆۔۔خطاطی کے نمونے
☆۔۔حسن بانو (برنی کی والدہ) کی تصویر
☆۔۔منشی عبدالقدیر (بھائی) کی تصویر
☆۔۔منشی محمد یوسف دہلوی (بھائی) کی تصویر
☆۔۔ڈائری کا عکس (انتقال کے اندراجات)



شی محمد الدین (برنی کے والد) اپنے دوست کے ساتھ



برنی کی والدہ حسن بانو

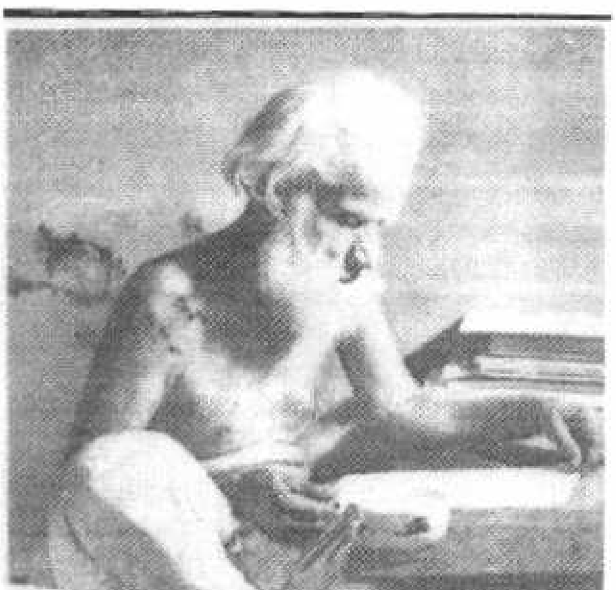


آمنہ بیگم (ضیاء الدین احمد برنی کی دوسری بیوی)





# ضیاءالدین احمد برنی



منشی عبدالقدیر (برنی کے بڑے بھائی)



منشی محمد یوسف (برنی کے چھوٹے بھائی)

fatima.jpg (576x374x24b jpeg)



إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ

بیشک اس کتاب پر عمل کرنے سے

اللہ تعالیٰ قوموں کو بلند کرتا ہے اور اس کو نہ ماننے کی وجہ سے دوسری قوموں کو گرا دیتا ہے

۱۳۵۲ ھ

# حمائل شریف مترجم

مُحشّٰی مع فوائد موضح القرآن

جس کو ہندوستان کی نامور خوشنویس خطیبہ مصنفہ جناب فاطمۃ الکبریٰ سلمہا اللہ تعالیٰ

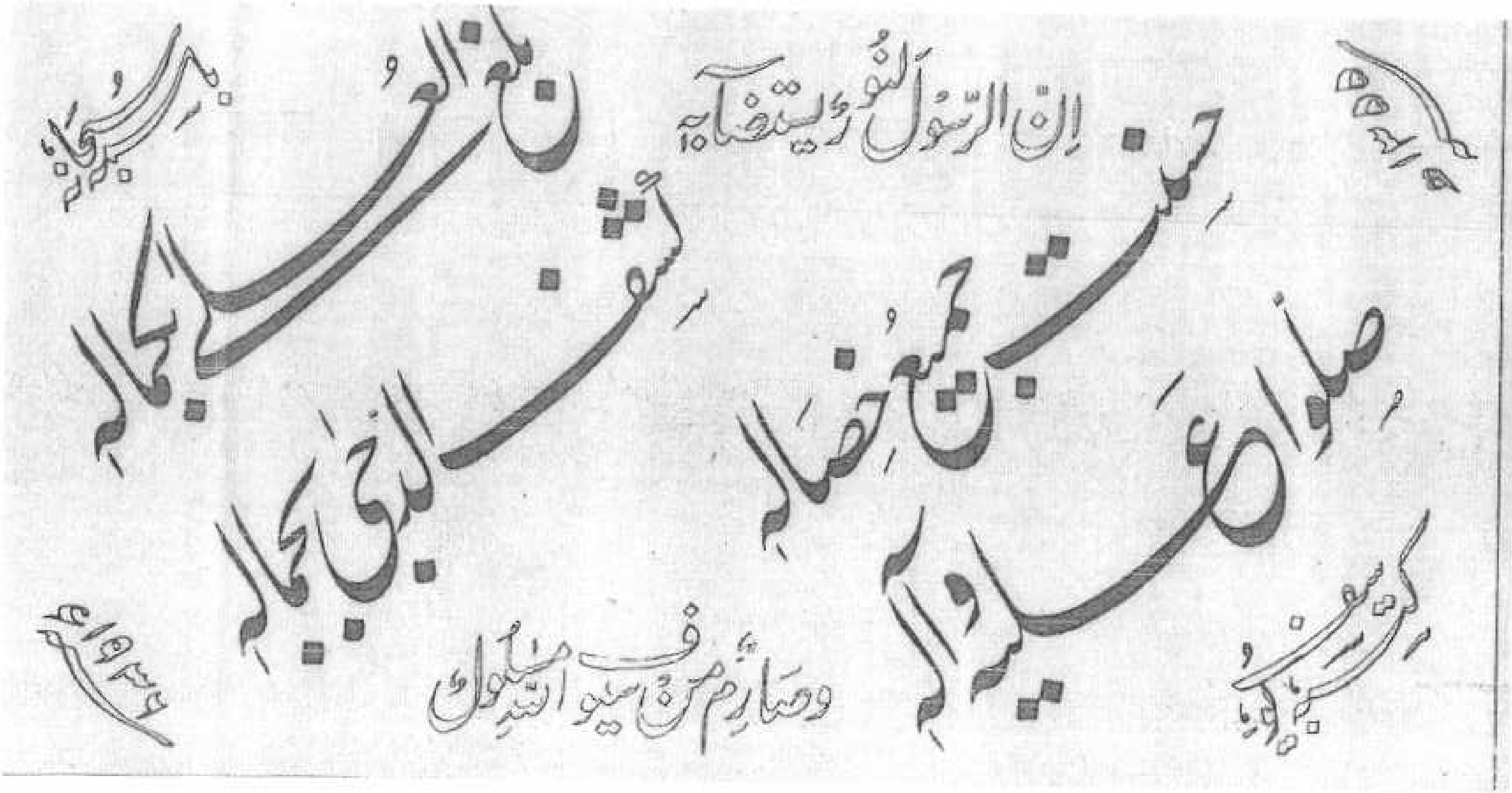
(وظیفہ خوار سرکار عالی حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ)

نے اپنے قلم سے لکھا اور خود چھپوایا

مقام اشاعت مکان نمبر ۹۲۲ چھتہ لعل میاں دہلی

ناظم اشاعت علاء الدین خاں

m.y11.jpg (1370x2646x24b jpeg)



اماں جی

13 رمضان المبارک 1354ھ مطابق [illegible] 1935ء بروز منگل دوپہر 2 بجکر 25 منٹ پر دارالمصطفیٰ [illegible] جہانِ فانی سے کوچ کیا۔ [illegible] قبرستان [illegible] سپردِ خاک ہوئیں۔
[illegible]

30 جنوری 1948ء مطابق 12 محرم الحرام بروز جمعہ 10 بجکر 5 منٹ پر ارون ہسپتال میں

اسی جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ صرف 2 دن ہسپتال میں رہے [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

8 بجے 46

27 نومبر 1961ء [illegible]

27.11.61

انتقال [illegible] [illegible]
تدفین۔ قبرستان [illegible]

[illegible] انتقال 18 رمضان المبارک [illegible] 19 دسمبر 1967ء [illegible] قبرستان میں
20 دسمبر 1967ء کو سپردِ خاک کیا۔

[illegible] انتقال 25 جنوری 1969ء بوقت صبح [illegible] بجے مقام [illegible]
عمر 93 سال۔ تدفین۔ قبرستان نزد [illegible] بیرون [illegible] دروازہ دہلی [illegible]
پیدائش 1875ء [illegible] اگست مقام [illegible]

[illegible] انتقال [illegible] جناح ہسپتال
تدفین۔ قبرستان [illegible]

وفات 4 مئی 1969ء
بروز اتوار (؟)

[illegible] Christian Hospital

UCH

انتقال [illegible] مقام [illegible] ہسپتال [illegible]

[illegible] 1973ء بوقت [illegible] بجے [illegible]

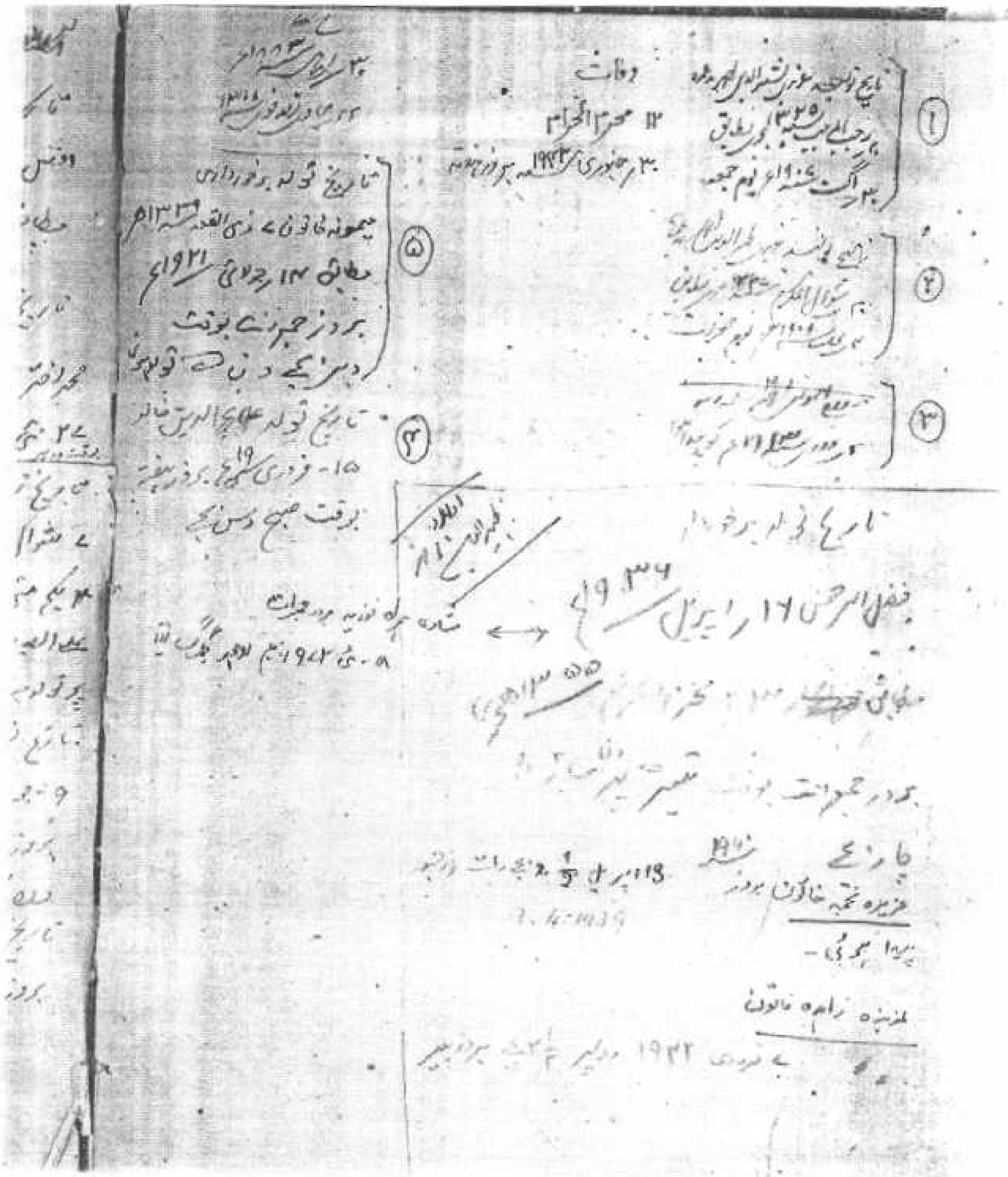
تدفین [illegible]

21 ربیع الاول 1397 ہجری

[illegible] 11 مارچ 1977ء کو کار کے حادثہ میں [illegible]
[illegible] رات کو [illegible] قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

انتقال سعیدہ بیگم ظہیر الدین: رات 9½ بجے بروز بدھ 19 فروری 1986ء تدفین قبرستان [illegible]

born dairy2.jpg (813x935x24b jpeg)



# ضمیمہ نمبر ۲

☆۔۔ضیاءالدین برنی کی اسکول، کالج کی اسناد
☆۔۔اسکول اور کالج کے نتیجے
☆۔۔ملازمتوں کے دست آویزات
☆۔۔نکاح نامہ
☆۔۔امتحانی پرچے
☆۔۔دیگر تعلیمی اسناد
☆۔۔بعض دیگر اسناد
☆۔۔خودنوشت اور یادداشتوں کے چند صفحات

No: 55

Lahore : "C. & M. Gazette" Press— [illegible]

# Upper Primary Examination.

Certified that Ziaud Din Ahmad,
son of Mohammad Din Student of
Delhi, passed the Upper Primary School Examination
held in 1902, in the following subjects:—

(1) Reading and (2) Writing in the Urdu character.
(3) Arithmetic (4) English (5) Persian
(6) Nil

Dated Delhi
The 10th December 1902 } Asst Inspr. of Schools, Delhi Circle.

ST. STEPHEN'S COLLEGE, DELHI.

Name Zia-ud-Din

Class III year

Report of Examination held in Feb. 1911
Maximum each subject 150

| Subjects. | Marks obtained. | Remarks. |
|---|---|---|
| English ... | 68 | weak |
| Sanskrit / Persian / Arabic | 113 | |
| Mathematics ... | — | |
| ~~Physics~~ / ~~Chemistry~~ / ~~History~~ / ~~Economics~~ / Philosophy / ~~Pure Mathematics~~ | 40 | fails |
| Honours ... | — | |

Games played :—~~Cricket~~, ~~Tennis~~, Foot-ball, Hockey.

Health Satisfactory constitution weak - needs exercise

Fines

Tutor's remarks and signature ought to pay very particular attention to English & philosophy Kinnaird

Dated Ap. 1911.

S. K. Rudra
Principal.

ST. STEPHEN'S COLLEGE, DELHI.

Name Zia-ud-Din

Class III year

Report of Examination held in Dec. '10

| Subjects. | Marks obtained. | Remarks. |
|---|---|---|
| English ... | 57/150 | fails |
| Sanskrit / Persian / Arabic | 111/150 | |
| Mathematics ... | | |
| Physics / Chemistry / History / Economics / Philosophy / Pure Mathematics | 65/150 | Weak. |
| Honours ... | — | |

Games played :—Cricket, Tennis, Foot-ball, Hockey.

Health good

Fines

Tutor's remarks and signature good Kinnaird
Conduct satisfactory. Weak in English subjects

Dated Nov. 16 1910.

S. K. Rudra
Principal.

144

# The University of the Panjab.

## FACULTY OF ARTS.

SESSION 1908.

This is to certify that Zia-ud din Ahmad son of M. Mohammad Din and a student of the Government High School, Delhi, passed in the Third Division, the Matriculation Examination of the Panjab University held in March, 1908.

Passed also in X Optional Subject:

Nil.

G. S. Brett

OFFG. REGISTRAR,

Panjab University.

Senate Hall,
Lahore:
The 1st June, 1908.

# The University of the Panjab.

## FACULTY OF ARTS.

### SESSION 1910.

This is to certify that Ziauddin Ahmad

Reg. No. Sts. 27. son of Mr. Mohammad Din

and a student of the St. Stephen's College, Delhi,

passed in the Second Division, the Intermediate Examination of

the Panjab University held in March, 1910.

Senate Hall,
Lahore:
The 1st June, 1910.

REGISTRAR,
Panjab University.

P-KU

1908-09

1908

6

# EXAMINATION PAPERS.

## Matriculation Examination.

### 1908.

---

ENGLISH.—PAPER A.

*Examiner* :—LALA JIYA RAM, M.A.

I. Give :—

(*a*) the plural of *thief*, *daughter-in-law*, *analysis*.
(*b*) the comparative and superlative degrees of *bad*, *beautiful*, *up*.
(*c*) the past tense and past participle of *drive*, *stick*, *set*, *fly*. 4

II. What is emphasis? What is the meaning of the following sentence if the emphasis lies, first, on the first word, then, on the third, and then, on the fifth ?—"This is the book I want." 3

III. Supply the prepositions omitted in (*a*) and the connecting words omitted in (*b*) below :—

(*a*) He was displeased — me. I am averse — change. Beware — the dog. He was shocked — his behaviour. I thirst — knowledge. 7

(*b*) Knowing — our boat would soon be in danger of upsetting — we allowed the swimmers to approach us, we held our course — we came to the west side of the island, — a smooth beach of dark sand offered a convenient landing-place. 5

IV. Give a full analysis of the following sentence :—

When I came to the foot of the hill called Difficulty, I met with a very aged man, who asked me what I was and where I was bound for. 3

## MATRICULATION EXAMINATION (ARTS FACULTY), 1908—CONTINUED.

| Merit No. | Roll No. | Name of Candidate. | Race or Creed. | Age. | Total number of marks obtained. | Institution. |
|---|---|---|---|---|---|---|
| | | | *Third Division*—continued. | | | |
| 10 | 65 | Padam Chand Taela | N. B. H. | 15-3 | 239 | A. S. V. J. High School, Delhi |
| | 115 | Wazir-ud-din | Muhammadan | 19-8 | 208 | Government Anglo-Arabic High School, Delhi. |
| | 134 | Nanak Chand | Brahman | 19-5 | 241 | Government High School, Delhi |
| | 139 | Sia Ram | N. B. H. | 20-1 | 216 | Ditto, ditto |
| | 144 | Zia-ud-din Ahmad | Muhammadan | 18-1 | 249 | Ditto, ditto |
| | 148 | Mansukh Rai | N. B. H. | 19-4 | 217 | Ditto, ditto |
| | 175 | Sultan Singh | Do. | 18-3 | 239 | Ditto, ditto |
| | 182 | C. Sheo Ram | N. B. H. J. A. | 19-7 | 244 | Shahzada High School, ditto |
| | 204 | Mohan Behari Lall | N. B. H. | 15-4 | 236 | St. Stephen's High School, ditto |
| | 215 | Ram Kishore Sexana | Do. | 17-2 | 207 | Ditto, ditto |
| 20 | 221 | Jai Gopal Gaur | Brahman | 19-9 | 204 | Ditto, ditto |
| | 222 | Kishan Chand | N. B. H. | 16-2 | 237 | Ditto, ditto |
| | 223 | Gordhan Dass | Brahman | 17-5 | 241 | Ditto, ditto |
| | 232 | Babu Ram | N. B. H. | 18-6 | 245 | Ditto, ditto |
| | 265 | Puran Chand | Brahman | 21-4 | 230 | Private Student, Delhi District |
| | 271 | Purshottam Das | Jain | 17-9 | 239 | Government High School, Karnal |
| | 272 | Lakshmi Narain | N. B. H. | 16-1 | 241 | Ditto ditto |
| | 280 | Kura Mal | N. B. H. R. A. | 19-1 | 223 | Ditto. ditto |
| | 303 | Kesho Ram | N. B. H. | 23-4 | 195 | A. S. High School, Ambala City |
| | 306 | Bhagwat Sarup Varma | Do. | 17-10 | 239 | Ditto, ditto |
| 30 | 324 | Piare Lal Gupta | Do. | 19-2 | 248 | Hindu-Muhammadan High School, Ambala Cant. |
| | 329 | Ram Chander | Do. | 18-5 | 231 | Ditto, ditto |
| | 330 | Kidar Nath Aggarwal | Do. | 18 | 244 | Ditto, ditto |
| | 331 | Chhote Lal | Do. | 18-1 | 248 | Ditto, ditto |
| | 339 | Kishan Singh | Sikh | 21-7 | 221 | Ditto, ditto |
| | 350 | Ganpat Rai | N. B. H. | 18-5 | 243 | Jagadhri M. B. High School |
| | 351 | Banarsi Dass | Do. | 16-3 | 195 | Ditto. ditto |
| | 372 | Joti Ram | Do. | 19-2 | 225 | Mission High School, Ambala City |
| | 375 | Gainda Lal | Do. | 17-3 | 233 | Ditto, ditto |
| | 377 | W. V. Mackenzie | Christian | 18-5 | 212 | Ditto, ditto |
| 40 | 388 | Sri Ram | N. B. H. | 19-1 | 242 | Ditto, ditto |
| | 390 | Mai Dhan Gupta | Do. | 17-11 | 219 | Private Student, Ambala District |
| | 396 | Jagdamba Parshad | Brahman | 19-4 | 223 | Government High School, Simla |
| | 404 | Gulab Chand Kapur | N. B. H. | 16 | 238 | Ditto, ditto |
| | 406 | Khazana Ram | Do. | 20-8 | 234 | Private Student, Simla |
| | 410 | Ram Lal | Do. | 15-7 | 242 | Government High School, Firozepore City. |
| | 413 | Amar Nath *alias* Albert Faiz Ali | Christian | 18-5 | 213 | Ditto, ditto |
| | 417 | Kanshi Ram Katariya | N. B. H. | 19 | 190 | Ditto, ditto |
| | 419 | Gulam Mohayy-ud-din | Muhammadan | 16-11 | 240 | Ditto, ditto |
| | 424 | Atta Ullah Khan Awan | Do. | 15-8 | 222 | Ditto, ditto |
| 50 | 450 | Dhirendra Mohan Banerjee | Brahman | 19-1 | 247 | Harbhagwan Memorial High School, Firozepore City. |
| | 460 | Dina Nath | N. B. H. | 19 | 245 | Ditto, ditto |
| | 474 | Kishori Lal | Do. | 19-6 | 237 | Ditto, ditto |
| | 480 | Bishan Dass Sud | Do. | 17-9 | 239 | Moga D. B. High School |
| | 482 | Bachittar Singh | S. J. A. | 19-4 | 228 | Ditto, ditto |
| | 493 | Des Raj Sharma | Brahman | 18-8 | 246 | Ditto, ditto |
| | 497 | Bhag Singh | S. J. A. | 19-3 | 224 | Moga Dev Samaj High School |
| | 500 | Ram Chand | N. B. H. | 21-11 | 232 | Ditto, ditto |
| | 501 | Ram Narain | Do. | 18-2 | 229 | Ditto, ditto |
| | 502 | Mangtoo Ram Sood | Do. | 21-1 | 247 | Ditto, ditto |
| 60 | 503 | Muhammad Amir | Muhammadan | 15-10 | 244 | Ditto, ditto |
| | 504 | Bakhtawar Singh | S. J. A. | 17-5 | 215 | Ditto, ditto |
| | 513 | Shiv Singh | N. B. H. R. A. | 16-5 | 215 | Palampur Government High School |
| | 514 | Chaina Mal | N. B. H. | 18-7 | 236 | Ditto, ditto |
| | 522 | Paryag Chand | Do. | 20-8 | 235 | Ditto, ditto |
| | 524 | Durga Parshad Sharma | Brahman | 15-9 | 236 | Ditto, ditto |
| | 525 | Lakshmi Singh Varma | N. B. H. R. A. | 19-4 | 241 | Ditto, ditto |
| | 528 | Bhagwan Das | N. B. H. | 19-5 | 199 | Ditto, ditto |
| | 531 | Oman Chand Varma | Do. | 20-5 | 207 | Ditto, ditto |
| | 532 | Ubaid Ullah | Muhammadan | 21-7 | 222 | Ditto, ditto |
| 70 | 548 | Raja Ram | Brahman | 19-7 | 245 | A. S. High School, Hoshiarpur |
| | 556 | Siri Ram Vedi | N. B. H. | 20-1 | 231 | Ditto, ditto |
| | 560 | Ram Rakha | Do. | 10-2 | 243 | Ditto, ditto |
| | 567 | Mukand Lal Puri | Do. | 18-2 | 226 | Bajwara S. B. Amin Chand High School. |
| | 576 | Basant Ram Datt | Brahman | 21-4 | 231 | Ditto, ditto |
| | 577 | Birj Lal Bazaz | N. B. H. | 16-4 | 239 | Ditto, ditto |

INTERMEDIATE (A. F.) EXAMINATION, 1910—*continued.*

| Merit No. | Roll No. | Registered No. | Name of Candidate. | Race or Creed. | Age. | Total number of marks obtained. | Institution. | Elective subjects in which candidate passed … |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | | | *Second Division*—continued. | | | | | |
| 52 | 59 | H. n. 16 | Norah Meehan | Christian | 28 | 305 | St. Bede's College, Simla | L., M., R. |
| | 301 | F. d. 151 | Lal Chand Chopra | N. B. H. | 18 | 305 | D. A.-V. College, Lahore | P., M., R. |
| 54 | 629 | H. k. 9 | Shri Ram Sharma | Brahman | 19-2 | 304 | Randhir College, Kapurthala | P., M., R. |
| 55 | 390 | H. g. 8 | Brij Lal Saigal | N. B. H. | 17-8 | 303 | Government College, Lahore | S., M., R. |
| | 627 | H. k. 17 | Harsahai Mahandru | Do. | 18-6 | 303 | Randhir College, Kapurthala | P., M. |
| 57 | 411 | H. g. 70 | Ata Mohammad | Muhammadan | 17-6 | 302 | Government College, Lahore | P., M. |
| 58 | 151 | G. d. 42 | Jas Raj | N. B. H. | 18-4 | 301 | D. A.-V. College, Lahore | S., M., C. |
| 59 | 50 | H. s. 25 | Satish Chandra Chatterji | Christian | 18-1 | 299 | St. Stephen's College, Delhi | P., Ch. |
| | 212 | H. d. 107 | Khanda Ram Kalra | N. B. H. | 17-8 | 299 | D. A.-V. College, Lahore | P., M. |
| | 265 | H. d. 129 | Pran Nath | Brahman | 19-7 | 299 | Ditto | P., M. |
| | 289 | H. d. 70 | Daulat Ram Gajri | N. B. H. | 17-2 | 299 | Ditto | P., M. |
| 63 | 25 | H. s. 3 | Baldeva Singh | N. B. H. J. A. | 21-9 | 298 | St. Stephen's College, Delhi | P., M., C. |
| | 36 | H. s. 31 | Ram Gopal Jain | Jain | 19-4 | 298 | Ditto | P., M. |
| 65 | 145 | H. d. 23 | Jai Krishen Nanda | N. B. H. | 18-6 | 297 | D. A.-V. College, Lahore | S., M. |
| | 416 | H. g. 82 | Dhalu Ram Chopra | Do. | 20 | 297 | Government College, Lahore | S., Ch. |
| | 632 | H. v. 13 | Kashi Nath | Brahman | 21-2 | 297 | Sri Pratap Hindu College, Srinagar. | S., M. |
| 68 | 52 | G. s. 28 | Qurban Ullah | Christian | 20-4 | 295 | St. Stephen's College, Delhi | P., Ch. |
| | 162 | H. d. 21 | Jagan Nath Aggarwal | N. B. H. | 18-7 | 295 | D. A.-V. College, Lahore | S., M. |
| | 169 | H. d. 31 | Megh Warn | Brahman | 19-10 | 295 | Ditto | S., M. |
| 71 | 61 | H. n. 4 | Prudence Stoddart | Christian | 21 | 294 | St. Bede's College, Simla | L., M. |
| | 428 | H. g. 112 | Dina Nath Rampal | Brahman | 16-9 | 294 | Government College, Lahore | P., M. |
| 73 | 176 | G. d. 9 | Amin Chand Mehta | N. B. H. | 18-10 | 293 | D. A.-V. College, Lahore | S., M. |
| 74 | 215 | H. d. 60 | Behari Lal | Do. | 18-5 | 292 | Ditto | P., M. |
| | 331 | H. f. 112 | Sham Lall Chawla | Do. | 16-8 | 292 | Forman Christian College, Lahore | P., M. |
| | 524 | F. s. 53 | Barkat Singh | Sikh | 22-9 | 292 | Murray College, Sialkot | P., M. |
| | 607 | H. g. 73 | Atma Anand Sharma | Brahman | 17-4 | 292 | Randhir College, Kapurthala | S., M. |
| 78 | 334 | G. a. 69 | Balwant Rai | N. B. H. | 17-1 | 291 | Forman Christian College, Lahore | P., M., C. |
| | 503 | G. f. 10 | Abdul Ghani | Muhammadan | 20-2 | 291 | Private Student, Lahore District | P., M. |
| 80 | 231 | H. d. 133 | Ram Chand | N. B. H. | 18 | 290 | D. A.-V. College, Lahore | P., M. |
| | 313 | H. f. 82 | Naina Rama *alias* Anand Prakash | Do. | 20-4 | 290 | Forman Christian College, Lahore | S., M. |
| | 351 | H. f. 18 | Barakat Rahmat Ullah *alias* Barakat Ullah | Christian | 18-5 | 290 | Ditto | P., M. |
| 83 | 160 | H. d. 27 | Kamala Pati Roy | Brahman | 13 | 289 | D. A.-V. College, Lahore | S., M. |
| | 611 | H. k. 6 | Arjan Singh Aujala | S. J. A. | 18-9 | 289 | Randhir College, Kapurthala | P., M. |
| 85 | 290 | H. d. 139 | Rattan Singh Bhandari | N. B. H. | 19-2 | 288 | D. A.-V. College, Lahore | P., M. |
| 86 | 402 | H. g. 44 | Durga Dass Ahluwalia | Do | 17 | 287 | Government College, Lahore | P., M. |
| 87 | 51 | H. s. 29 | Nanak Chand Sharma | Brahman | 21-5 | 286 | St. Stephen's College, Delhi | P., Ch. |
| | 132 | H. a. 1 | Gulab Singh | Sikh | 21-1 | 286 | Khalsa College, Amritsar | P., Ch. |
| | 639 | H. v. 2 | Pandith Dina Nath Fotadar | Brahman | 19-11 | 286 | Sri Pratap Hindu College, Srinagar. | P., M. |
| 90 | 150 | G. g. 81 | Ramji Das | N. B. H. | 19 | 285 | D. A.-V. College, Lahore | S., M. |
| | 283 | H. d. 109 | Kundan Lal Agarwal | Do. | 18-4 | 285 | Ditto | P., M. |
| | 361 | H. f. 35 | Fazal Karim Khan | Muhammadan | 10-2 | 285 | Forman Christian College, Lahore | P., M. |
| 93 | 27 | G. s. 12 | William Miran Bakhsh | Christian | 20 | 284 | St. Stephen's College, Delhi | P., M. |
| | 288 | H. d. 53 | Atma Ram Bansal | N. B. H. | 18-1 | 284 | D. A.-V. College, Lahore | P., M. |
| | 403 | H. g. 53 | Ram Richhpal Mathur | Do. | 17-0 | 284 | Government College, Lahore | P., M. |
| 95 | 1 | G. h. 12 | Asghar Ali | Muhammadan | 25-8 | 283 | Private Student, Gurgaon District | P., M. |
| | 222 | G. d. 140 | Kailash Chandra Gupta | N. B. H. | 15-5 | 283 | D. A.-V. College, Lahore | P., M. |
| | 322 | G. f. 51 | Jamna Das | Do. | 18-6 | 283 | Forman Christian College, Lahore | P., M. |
| | 394 | H. g. 31 | Abdul Qadir Sheikh | Muhammadan | 16-11 | 283 | Government College, Lahore | P., M. |
| | 500 | J. z. 14 | Budh Ram | Brahman | 24-4 | 283 | Private Student, Lahore District | P., M. |
| | 504 | J. z. 17 | Bhagwan Das Raheja | N. B. H. | 21 | 283 | Ditto ditto | P., M. |
| 102 | 64 | H. n. 7 | Ethel Murphy | Christian | 19 | 282 | St. Bede's College, Simla | F., M. |
| 103 | 380 | H. f. 21 | Balwant Singh Grewal, II. | S. J. A. | 18-8 | 281 | Forman Christian College, Lahore | P., M. |
| | 559 | H. r. 15 | Mohd. Sarwar Tarkheli | Muhammadan | 20-7 | 281 | Gordon Mission College, Rawalpindi. | P., M. |
| | 642 | G. v. 17 | Pt. Mahishur Kaul | Brahman | 20-9 | 281 | Sri Pratap Hindu College, Srinagar. | P., M. |
| 106 | 175 | H. d. 22 | Jagan Nath Bahar | N. B. H. | 21-3 | 280 | D. A.-V. College, Lahore. | S., M. |
| 107 | 20 | H. s. 5 | Bhagwan Das, I. | Do. | 20 | 279 | St. Stephen's College, Delhi | S., M. |
| | 95 | H. a. 24 | Sahib Singh | Sikh | 17-9 | 279 | Khalsa College, Amritsar | P., M. |
| | 323 | H. f. 45 | Husain Bakhsh | Muhammadan | 18-6 | 279 | Forman Christian College, Lahore | P., M. |
| 110 | 40 | H. s. 27 | Ziauddin Ahmad | Do. | 19-10 | 278 | St. Stephen's College, Delhi | P., Ch. |
| | 98 | H. s. 34 | Gulam Hassan | Do. | 18-7 | 278 | Khalsa College, Amritsar | P., M. |
| | 483 | F. i. 8 | Mohammad Asadullah | Do. | 20 | 278 | Private Student, Lahore District | A., M. |
| 113 | 172 | H. d. 7 | Chuni Lal Anand | N. B. H. | 19 | 277 | D. A.-V. College, Lahore | S., M. |
| | 511 | H. g. 88 | Rashid Ahmad | Muhammadan | 17-4 | 277 | Murray College, Sialkot | A., M., C. |

| | | |
|---|---|---|
| Anant Ram Sachar | ... | Government College, Lahore. |
| Ram Kishen Chopra *alias* Dhalu Ram | ... | Ditto ditto. |
| Nanak Chand Khosla | ... | Prince of Wales College, Jammu. |
| John Price | ... | St Stephen's College, Delhi. |
| Uttam Chand Lala | ... | D. A. V. College, Lahore. |
| Atma Ram Khosla | ... | Forman Christian College, Lahore. |
| Jai Parkash Rai | ... | Dyal Singh College, Lahore. |
| Jagjit Singh (Nakhauj) | ... | Ditto ditto. |
| Muhammad Shakir | ... | Forman Christian College, Lahore. |
| Brij Lal Agerwala | ... | Government College, Lahore. |
| Mahajot Sahai | ... | St. Stephen's College, Delhi. |
| Mathura Dass Sharma | ... | Private Student, Hoshiarpur District. |
| Hari Ram Luddhar | ... | Ditto ditto. |
| Hari Ram Sethi | ... | D. A.-V. College, Lahore. |
| Rattan Singh Bhandari | ... | Dyal Singh College, Lahore. |
| Samuel Nasir | ... | Forman Christian College, Lahore. |
| Mehta Sohan Lal | ... | Private Student, Lahore District. |
| Nand Kumar | ... | Mohindra College, Patiala. |
| Barkat Rai | ... | D. A.-V. College, Lahore. |
| Jiwan Lal Kaul | ... | Government College, Lahore. |
| Sri Bhagwan | ... | St. Stephen's College, Delhi. |
| Lal Chand Jain | ... | Ditto ditto |
| Siddhu Ram Kathuriya | ... | Private Student, Multan District. |
| Arjan Singh | ... | Khalsa College, Amritsar. |
| Lakhmi Das Anand | ... | D. V.-A. College, Lahore. |
| Chet Singh | ... | Mohindra College, Patiala. |

*Third Division.*

| | | |
|---|---|---|
| Amar Singh | ... | St. Stephen's College, Delhi. |
| Raj Narayan | ... | Ditto ditto. |
| Amolak Ram Raghava | ... | Ditto ditto. |
| William Miran Bakhsh | ... | Ditto ditto. |
| Alfred Zahir | ... | Ditto ditto. |
| Balbir Singh Jaini | ... | Ditto ditto. |
| Nehal Chand | ... | Ditto ditto. |
| Upendra Nath Bose | ... | Ditto ditto. |
| Zia ud din Ahmad | ... | Ditto ditto. |
| N. Howard | ... | Private Student, Simla District. |
| Rashid Ahmad | ... | Ditto Jullundur District. |
| Kirpa Ram Sharma | ... | Khalsa College, Amritsar. |
| Sohan Singh Bhindar | ... | Ditto ditto. |
| Gopal Singh | ... | Ditto ditto. |
| Ram Rakha Mall Channan | ... | D. A.-V. College, Lahore. |
| Kidar Nath Sahni | ... | Ditto ditto. |
| Sundar Dass Anand | ... | Ditto ditto. |
| Wazir Chand Gulati | ... | Ditto ditto. |
| Pindi Dass Chopra | ... | Ditto ditto. |
| Bishamber Nath | ... | Ditto ditto. |
| Ram Lall Bansal | ... | Ditto ditto. |
| Dina Nath Kapoor | ... | Ditto ditto. |
| Ganpat Rai Khanna | ... | Ditto ditto. |
| Naubat Rai Sehgal | ... | Ditto ditto. |
| Parm Nand Sharma | ... | Ditto ditto. |
| Kishan Chand Anand | ... | Ditto ditto. |
| Jawanda Ram | ... | Ditto ditto. |
| Pran Nath Kaul | ... | Ditto ditto. |
| Labhu Ram Sud | ... | Ditto ditto. |
| Mathra Das Sharma | ... | Dyal Singh College, Lahore. |
| Narain Das Kapur | ... | Ditto ditto. |
| Thakar Dass | ... | Ditto ditto. |
| Choudhari M. Aziz R. K. | ... | Ditto ditto. |
| Ram Singh Sharma | ... | Ditto ditto. |
| Jagan Nath Madhok | ... | Ditto ditto. |
| Ram Narayan | ... | Ditto ditto. |
| Ram Chand Kapur | ... | Ditto ditto. |
| Shiv Lal Chopra | ... | Forman Christian College, Lahore |
| Parma Nand Bahl | ... | Ditto ditto. |
| Syed Jafar Hussain | ... | Ditto ditto. |



**ANJUMAN-I-ISLAM,**

*Bombay,* 31st January 19

No. 491.

To,

Ziauddin Ahmed Barni Esqr., B.A.

90, Civil Lines, <u>**C A W N P O R E**</u>.

Sir,

I am directed to offer you the post of an assistant teacher on the Staff of the Anjuman-i-Islam High School Bombay on a salary of Rs. 125/- per mensem. According t our present Scheme graduates start on Rs. 60/- and rise Rs. 150/- by biennial increments of Rs.10/-. Your promo will be subject to the Scheme until you reach Rs. 150/- If you, however, qualify yourself as a trained teacher, can rise to Rs. 250/- by biennial increments of Rs.15/- Should the terms be agreeable to you, I should like to when you can join the earliest. You will have to work d the present term on probation, and after that, if confi you will have to give the authorities an undertaking to serve the institution for a term of 5 years certain.

Hoping to hear soon from you

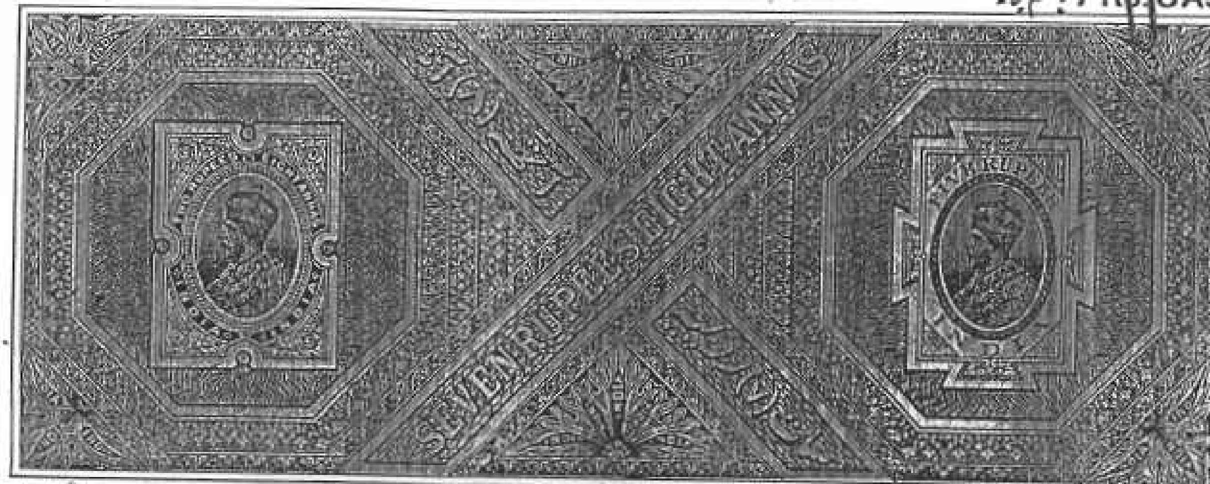
I am

Yours faithfully,

[signature]

Asstt. Secretary

7 Rs. 8 As




مسمی ضیاء الدین ولد منشی محمد الدین قوم راجپوت گکھڑ پیشہ ملازمت ساکن چیتہ لالہ ملتان خیرو پیلے

حال وارد منڈی بہاؤ الدین ہوں — چونکہ عقد منعقد ہمراہ مسماۃ محمودہ بیگم عرف بی بی بنت منشی

محمد عصمت ... خان صاحب ... ساکن منڈی ... قرار پایا ہے اسلئے میں مقر اقرار کرتا ہوں

تاحیات زوجہ منکوحہ کو ... رضا جوئی ... خلاف شرع شریف و رواج ... نہ کرونگا

یہ کہ تا زیست مسماۃ منکوحہ مذکورہ کو کوئی تکلیف نان نفقہ وغیرہ ... کسی قسم کا رنج نہیں دونگا بلکہ ہر ایک طرح خبر گیری

مسماۃ منکوحہ مذکورہ کا رکھونگا اور ... ضرورت ... رشتہ داران ... حالت ... کرونگا اور دونت

جائز ... رکھی ... یہ کہ تا زندگی مسماۃ منکوحہ ... اور ... دیگر عورت ... خواہ جائز ہو یا نا

جائز ... نہ رکھونگا ... عقد ثانی عمل میں نہ لاؤنگا ... بصورت عدم تعمیل اقرار نامہ ہذا کے مسماۃ

... منکوحہ مذکورہ ... ماہوار ... ادا کرونگا

# ضمیمہ نمبر۳

☆ ۔۔برنی کے اپنے ہاتھ کے خطوط کے نمونے ☆ ۔۔برنی کے نام مشاہیر کے خطوط بہ طور نمونہ

letter of barni2.jpg (650x972x24b jpeg)


# THE FANUS.

AN ILLUSTRATED URDU MAGAZINE DEVOTED TO LIGHT LITERATURE.

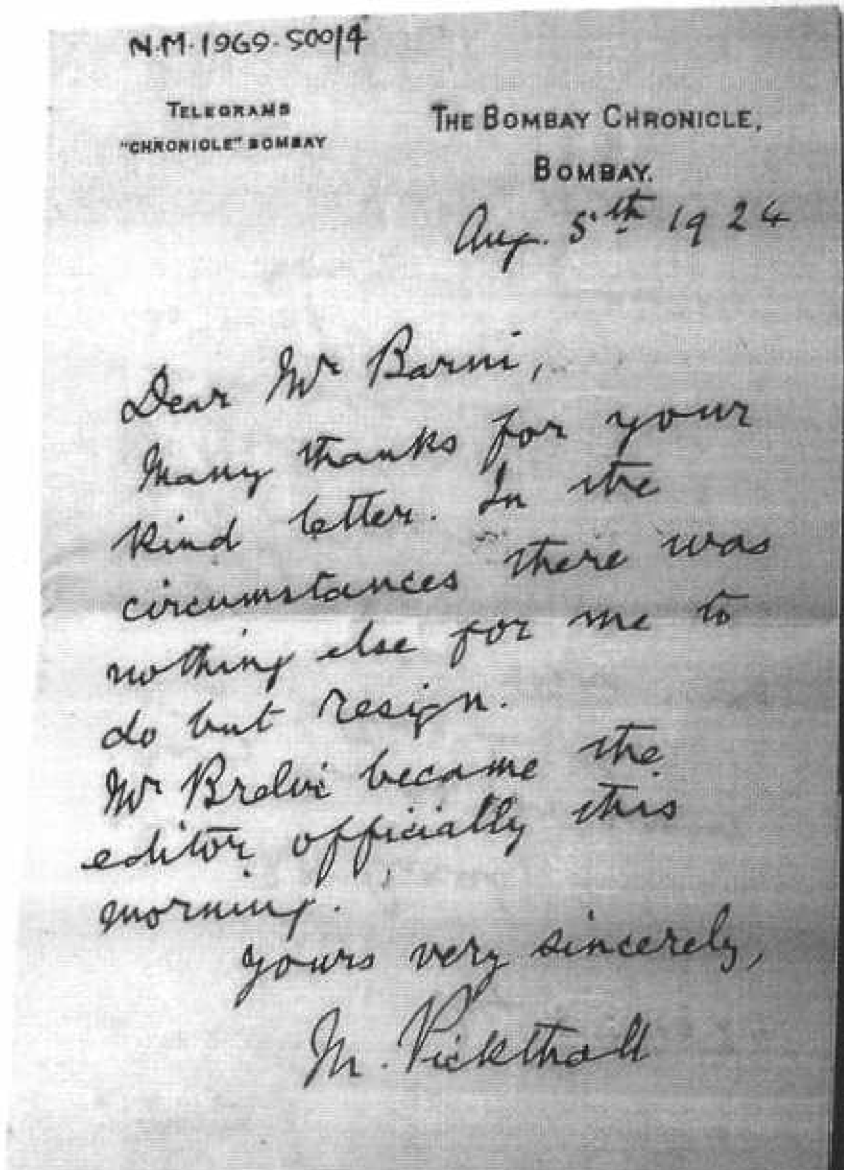
GOOLSHAN MAHAL,
53-B, Lady Jamshedji Road, Mahim.

Ref. No.

BOMBAY, 16. 13-1 19[illegible]


برادرم۔ تسلیم۔ [illegible] دیکھ [illegible] تذکرہ [illegible]
[illegible]
بھیجی [illegible] ان کا خط
[illegible] رہنے والا ہوں۔
[illegible] آج [illegible]
[illegible] میں [illegible]
[illegible] گورنمنٹ [illegible] کا سرٹیفکیٹ
بھجوا سکتا ہوں۔ اگر [illegible] ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ
[illegible] سرٹیفکیٹ بھجوا [illegible]
سے واقف ہیں۔ [illegible] امداد
[illegible] امید [illegible] بخیر ہوں گے۔ والسلام

مخلص
[illegible]



N.M. 1969-500/4

TELEGRAMS
"CHRONICLE" BOMBAY

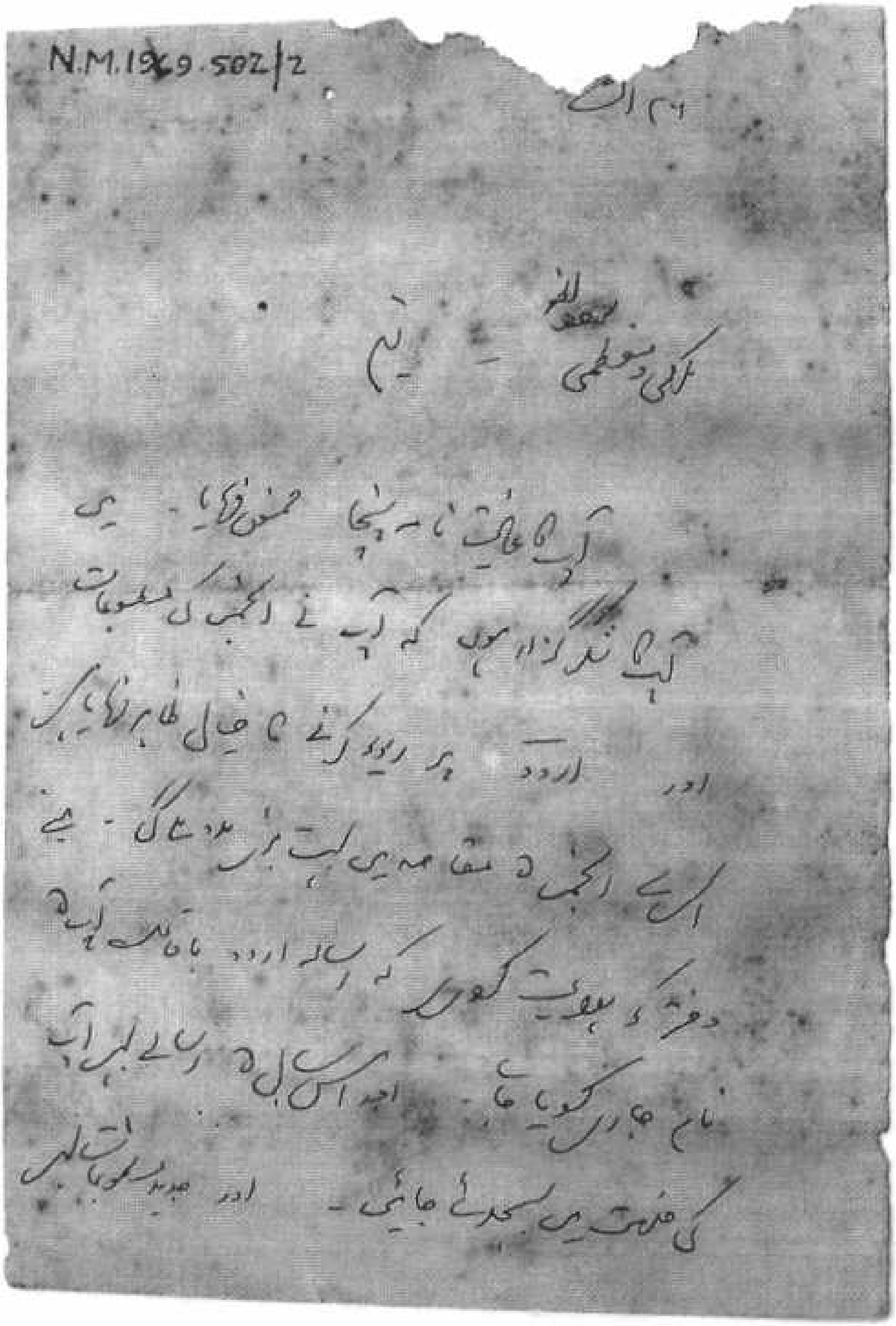
THE BOMBAY CHRONICLE,
BOMBAY.

Aug. 5th 1924

Dear Mr Barni,
Many thanks for your kind letter. In the circumstances there was nothing else for me to do but resign.
Mr Brelvi became the editor officially this morning.

Yours very sincerely,
M. Pickthall

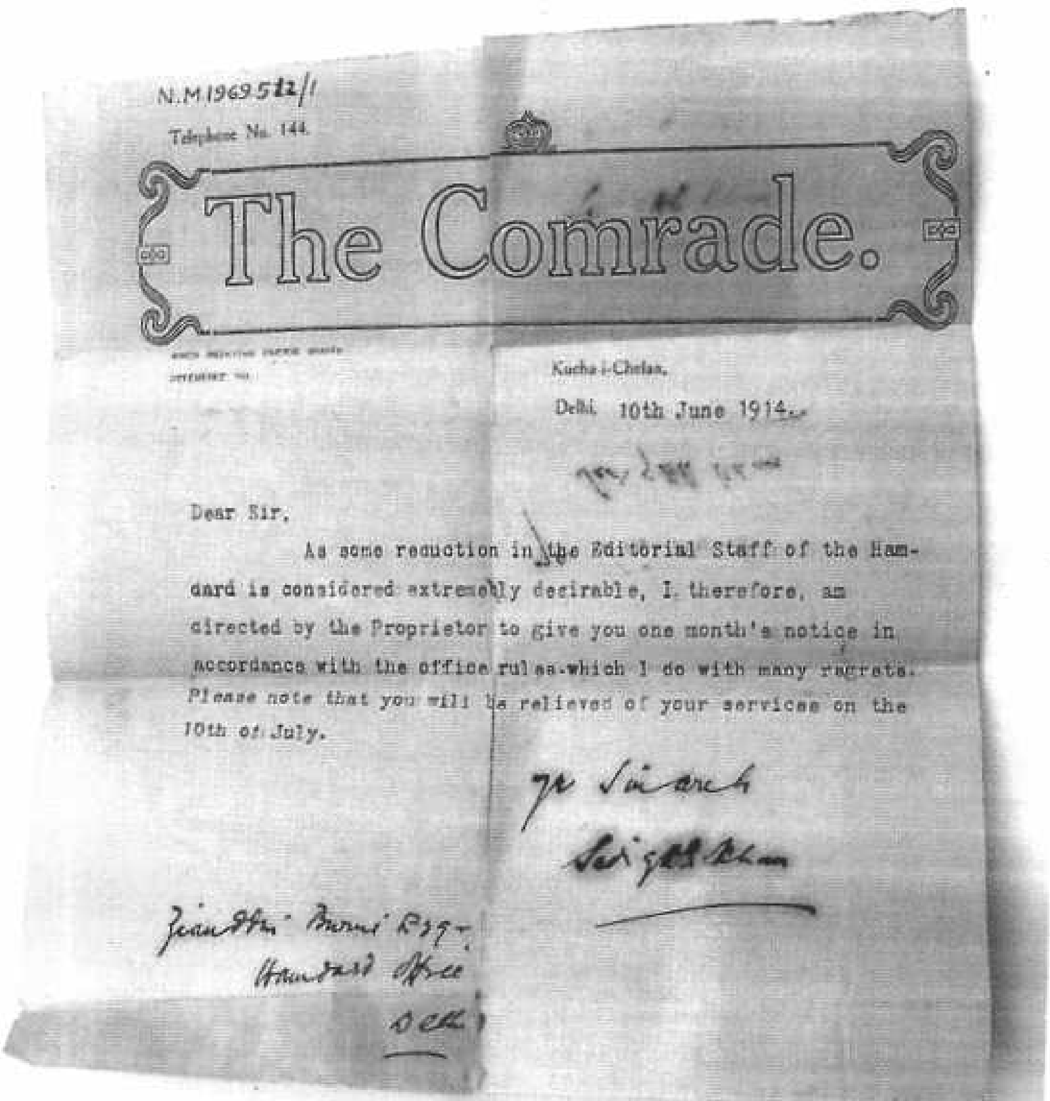
محمد مارماڈیوک پکتھال کا خط ضیاء الدین احمد برنی کے نام


N.M.1969.502/2

مکرمی و معظمی زاد لطفہ تسلیم

آپ کا عنایت نامہ پہنچا ممنون ہوا۔ یہ
آپ کا تذکرہ ہوا کہ آپ نے انجمن کی مطبوعات
اور اردو پر ریویو کرنے کا خیال ظاہر فرمایا ہے
اس سے انجمن کے مقاصد میں بہت بڑی مدد ملے گی۔ میں
دفتر کو ہدایت کر رہا ہوں کہ رسالہ اردو باقاعدہ آپ کے
نام جاری کر دیا جائے۔ اور اس سال کے رسالے بھی آپ
کی خدمت میں بھیج دیئے جائیں۔ اور جدید مطبوعات بھی

مولوی عبدالحق کا خط ضیاء الدین احمد برنی کے نام



N.M.1969.582/1

Telephone No. 144.

# The Comrade.

Kucha-i-Chelan,

Delhi. 10th June 1914.

Dear Sir,

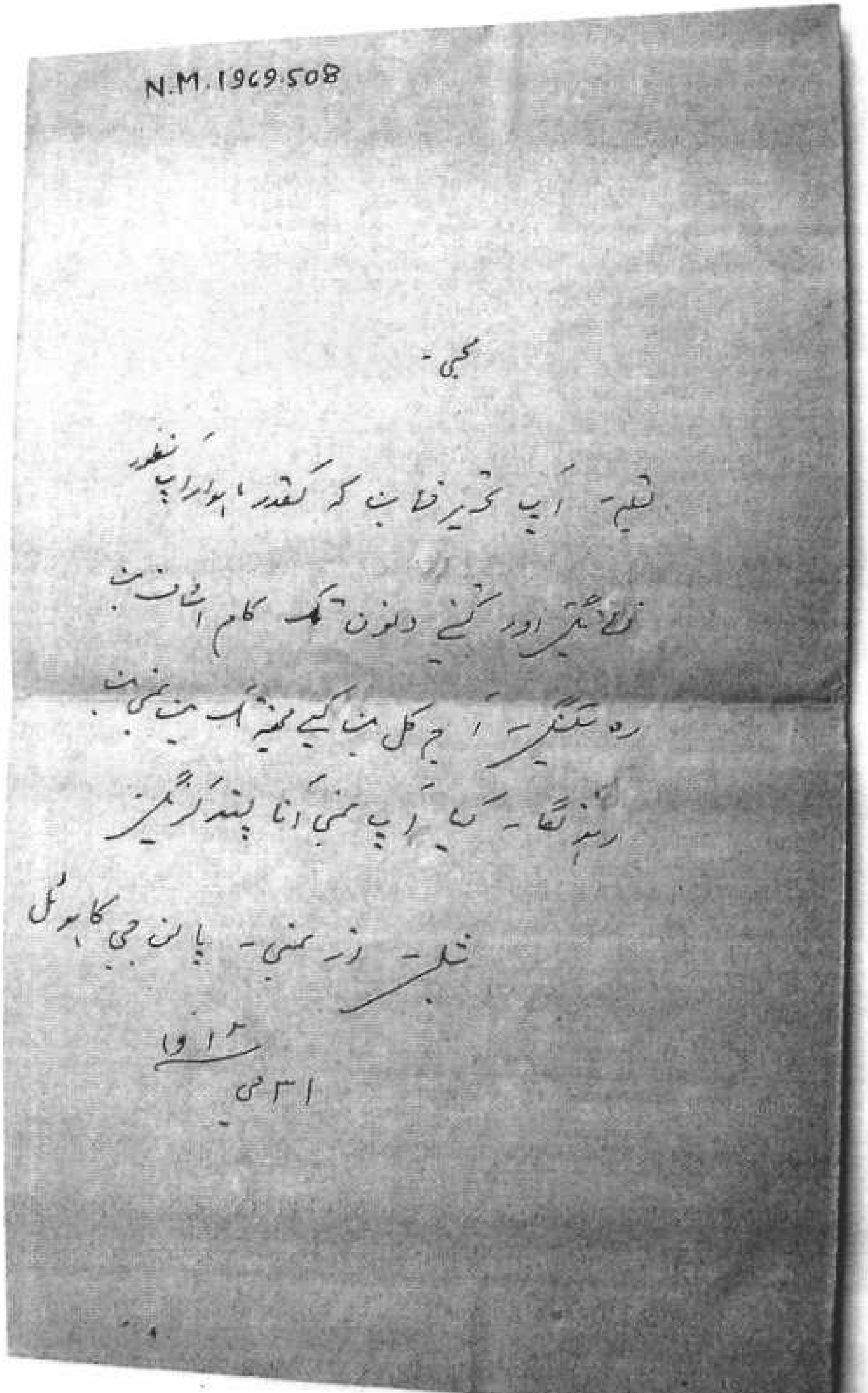
As some reduction in the Editorial Staff of the Hamdard is considered extremelly decirable, I therefore, am directed by the Proprietor to give you one month's notice in accordance with the office rules-which I do with many regrets. Please note that you will be relieved of your services on the 10th of July.

Yr Sincerely

[illegible]

Ziauddin Barni Esqr.,
Hamdard Office
Delhi

ایڈیٹر ہمدرد، دہلی کا خط ضیاء الدین احمد برنی کے نام


N.M. 1969.508

محبی -

تسلیم - آپ کی تحریر خطاب کہ کہ قدر ہوا اور آپ نظر

نہ رہ سکیں اور کئی دنوں تک کام انشاء

رہ سکتی ہے - آج کل میں گئے ہفتہ تک یہیں

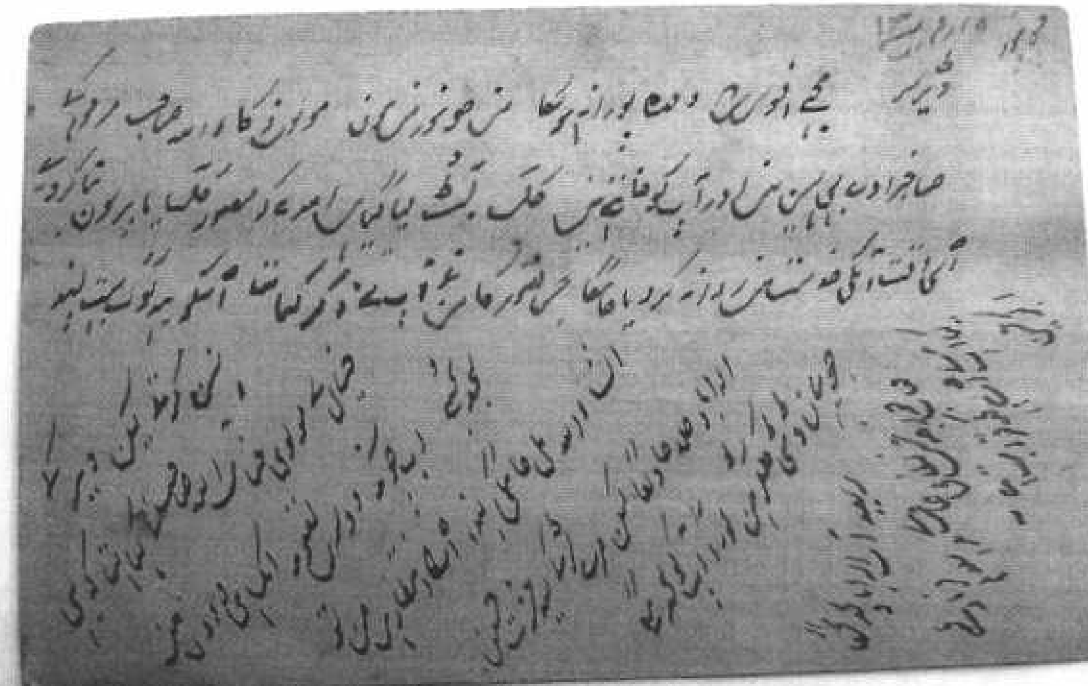
رہوں گا - کیا آپ بھی آنا پسند کریں

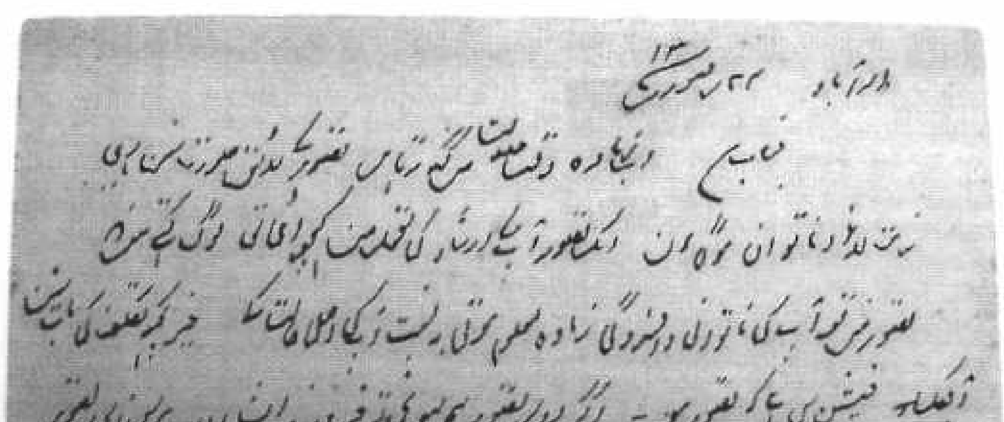
شبلی - از بمبئی - پالن جی کا ہوٹل

۱۹۱۳

۳۱ مئی

شبلی نعمانی کا خط ضیاء الدین احمد برنی کے نام





اکبر الہ آبادی کے خطوط ضیاء الدین احمد برنی کے نام

# ضمیمہ نمبر۴

☆۔۔برنی کی چند غیر مطبوعہ کتب کے عکس
☆۔۔برنی کی چند مطبوعہ کتب کے عکس

باسمہٖ تبارک و تعالیٰ

# صنائعِ لفظی

## تجنیسِ تام

اس صنعت کو جناس بھی کہتے ہیں جس کے معنی ہیں ہم جنس ہونا۔ لیکن شاعرانہ اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ کسی فقرہ یا شعر میں دو ایسے ہم جنس الفاظ استعمال کئے جائیں جو نوعیت، اعداد حروف، ہیئت اور ترتیب میں متفق لیکن معنی میں مختلف ہوں۔ اگر دونوں الفاظ کی نوعیت ایک ہی ہو، یعنی یہ کہ اگر دونوں اسم یا فعل یا حرف ہوں، تو اس صنعت تجنیسِ مماثل کہلائیگی۔ خاقانی دو شخصوں کی تعریف میں کہتا ہے:-

این یمین را ست جائے یمین ۔۔۔۔۔۔ واں یسار را ست جائے یسار

(ترجمہ) یہ میرا داہنا ہاتھ ہے جس کی میں قسم کھاتا ہوں اور وہ میرا بایاں پہلو ہے جو میرے لئے دولت و خوشحالی کا باعث ہے۔

معشوق کی تعریف میں ایک شاعر کہتا ہے:-

اگر روئے ترا نسبت بہ گُل کردم غلط کردم

وگر موئے ترا مشکِ خطا گفتم خطا گفتم

(پہلا خطا ترکستان کا مشہور شہر ہے جہاں کا مشک مشہور ہے۔ دوسرا خطا غلطی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔)

نگفتت کہ یغما مرو وقت سحری ۔۔۔۔۔۔ کہ دل می برند دلبران یغما را

(پہلے یغما سے مراد لوٹ مار ہے اور دوسرے یغما سے مراد ترکستان کا ایک شہر ہے جہاں کے باشندے اپنے حسن کے لئے مشہور ہیں)

باز اقبالش بہ صیدِ ملک رنگین چنگ باد!

تارِ چنگِ عشرتش باد از گسستن در امان! (ظہوری)

ہمیشہ ٹوٹنے سے محفوظ رہے

(ترجمہ) خدا کرے کہ اسکے اقبال کے باز کا پنجہ (نہ نہ) ملکوں کے شکار سے ہمیشہ رنگین رہے اور خدا کرے کہ اسکے عیش کے ساز کا تار

ظہوری اپنے آقا ابراہیم عادل شاہ والیِ بیجاپور کی کتاب نورس کی تعریف میں رقمطراز ہے:

عروسِ صفحہ را خطش نگارے ست — حروفش گرچہ ہر یک خود نگارے ست

(ترجمہ) صفحہ کی عروس (دلہن) کے لیے اسکی تحریر نقش و نگار کا کام دے رہی ہے، اگرچہ اسکے حروف میں سے ہر ایک بجائے خود معشوق [illegible] کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) لیکن اگر ہر دو لفظ بلحاظِ نوعیت مختلفہ ہوں یعنی کہ ایک اسم اور دوسرا فعل یا حرف ہو تو اس میں صنعت تجنیسِ مستوفی کہلائیگی۔ مثلاً:

امیدِ لذتِ عیش از مدارِ چرخ مدار (کمال اسمعیل)

(اس مصرع میں پہلا مدار (جائے گردش) اسم مکان ہے اور دوسرا صیغہ نہی ہے بمعنی مت رکھو)

شیخ سعدی شبِ معراج کا حال بیان کرتے ہوئے حضرت جبرئیل کے سدرۃ المنتہیٰ پر اٹک جانے اور آنحضرت (ﷺ) کا ساتھ نہ دے سکنے پر اپنی [illegible] کو کس خوبصورتی سے دکھاتے ہیں:

اگر یک سرِ موئے برتر پرم — فروغِ تجلی بسوزد پرم

ظہوری نورس کی تعریف میں کہتا ہے:

گو نورس کہ فردوسِ برین ست — نہ تنہا خلق، رضواں ہم برین ست

(ترجمہ) یعنی کہ نورس بہشت ہے، ساری خلقت کا ہی نہیں بلکہ رضوان (داروغۂ جنت) بھی اس بات پر متفق ہے۔

## تجنیسِ مرکب

اگر دو متجانس الفاظ میں سے بلحاظ ترکیب ایک مفرد ہو اور دوسرا مرکب اور ساتھ ہی دونوں مختلف المعنی

(9)

بھی ہوں، تو ایسی صنعت کو تجنیس ترکیب یا تجنیس مرکب کہیں گے۔ لیکن اگر الفاظ کی کتابت موافق ہو یعنی کہ الفاظ ایک ہی صورت سے لکھے جاتے ہوں، تو اس صورت میں اُسے متشابہ کہیں گے۔ جیسے:-

فریاد ز شمعِ من کہ در آتشِ عشق
پروانہ صفت سوزم و پروا نہ کند!

ذیل کی مثال میں مصرع ثانی میں صنعتِ خطی بھی پائی جاتی ہے:-

لبِ لعلِ تو یاقوت است یا قوت است مرجان را!
سیہ چشمِ تو یا دام است یا دام است مستان را!

(ترجمہ) تیرے سرخ لب یا تو یاقوت ہیں یا مرجان کے لیے غذا/روح یا قوت ہیں۔ تیری سیاہ آنکھیں یا دام کے مشابہ ہیں یا مستوں کے پھانسنے کے جال ہیں۔

اے برحمت عالمے را کارساز!
جملہ عالم را برحمت کارساز!

اگر تجنیس مرکب کے الفاظ عبارت میں متشابہ اور کتابت میں مختلف ہوں، تو اسے مفروق کہیں گے۔

اے بت الہیٔ [illegible] وگر ترسائی
باید کہ بسوئے بندہ بے ترس آئی

من بر لبِ خشک دیدہ ترسایم
تا بر لبِ خشکِ ما لب تر سائی

[illegible] جاتی کہتے ہیں:-

تو ہمائی و نیست ظلِ ہما
جز دو زلفِ تو دام ظلہما

(ترجمہ) تو ہما ہے اور ہما کا سایہ نہیں ہے سوائے تیرے دونوں زلفوں کے، خدا ان کا سایہ ہمیشہ قائم رکھے!

ساقی! از آن بادۂ منصور دم
در رگ و ریشہ بدہ من صور دم

انوری کی ایک مشہور رباعی میں یہ صنعت خوبصورتی کے ساتھ مستعمل ہوئی ہے:-

اے شاہ ہمہ ملکِ زمین حسب تراست
وز دولت و اقبال جہانی کسب تراست
امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر[1]
فردا خوارزم و ہزار اسپ تراست

[1] سلطان سنجر سلجوقی کے زمانے میں جب اس کے سردار آتسز نے خود مختار ہو جانے کی کوشش کی اور سلطان نے اس کو سزا دینے کا [illegible] تہیہ کر لیا تو وہ اپنے میں مقابلہ کی طاقت نہ پا کر ہزار اسپ کے قلعہ میں جا کر چھپ بیٹھا۔ سلطانی افواج نے قلعہ کا محاصرہ کر

[باقی آئندہ]

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینه هائے مردم عارف مزار ماست

# جہاں آرا بیگم

## بنتِ شاہجہان بادشاہ رح

از
ضیاءالدین احمد برنی - بی - اے

تعلیمی مرکز، کراچی

book5.jpg (483x715x24b jpeg)

سید

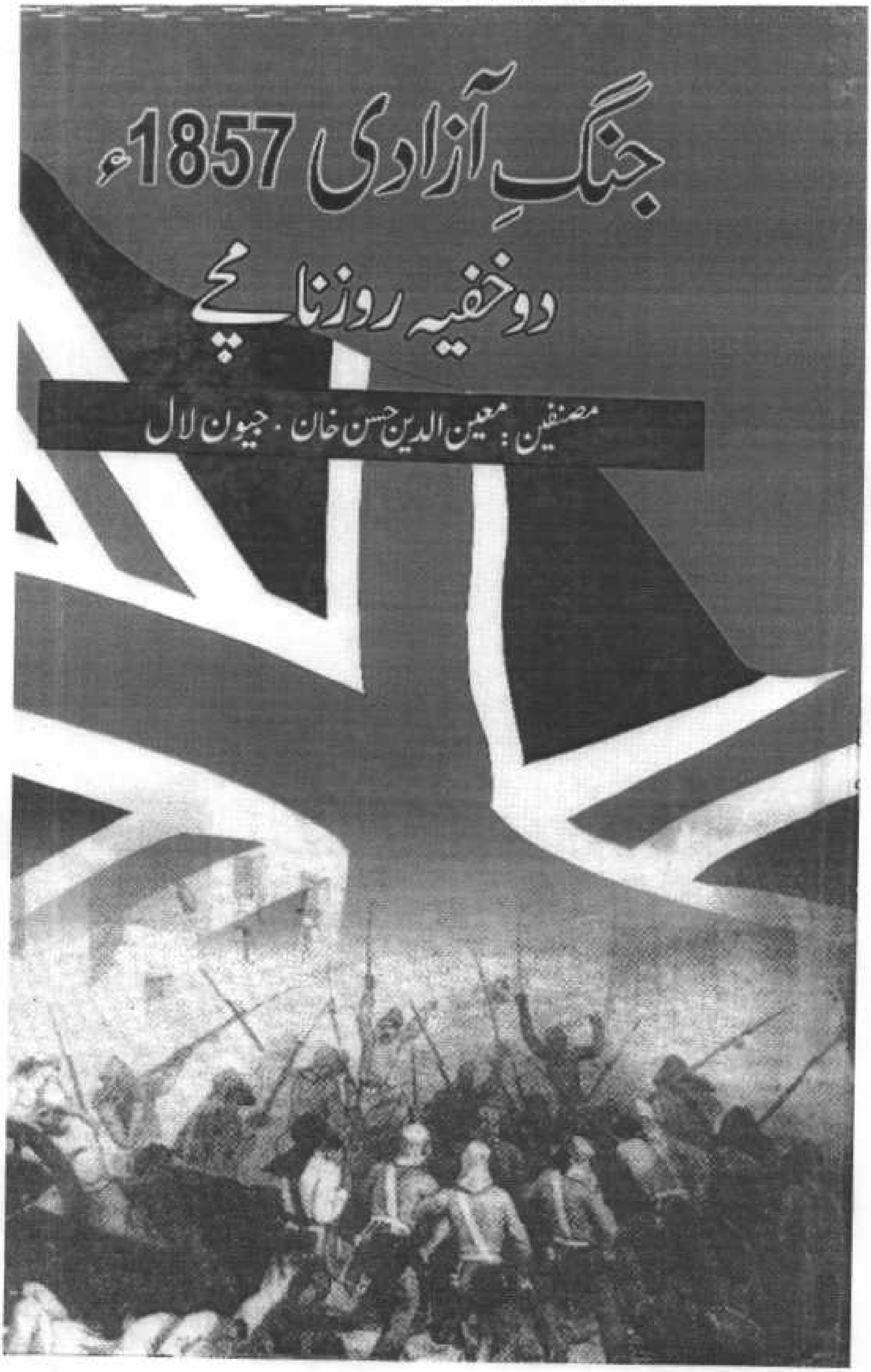
# جمالُ الدینِ افغانی

از

ضیاءُ الدین احمد برنی، بی۔ اے

تعلیمی مرکز

book4.jpg (540x852x24b jpeg)



تذکرہ

# مولوی ذکاءُاللہ دہلوی

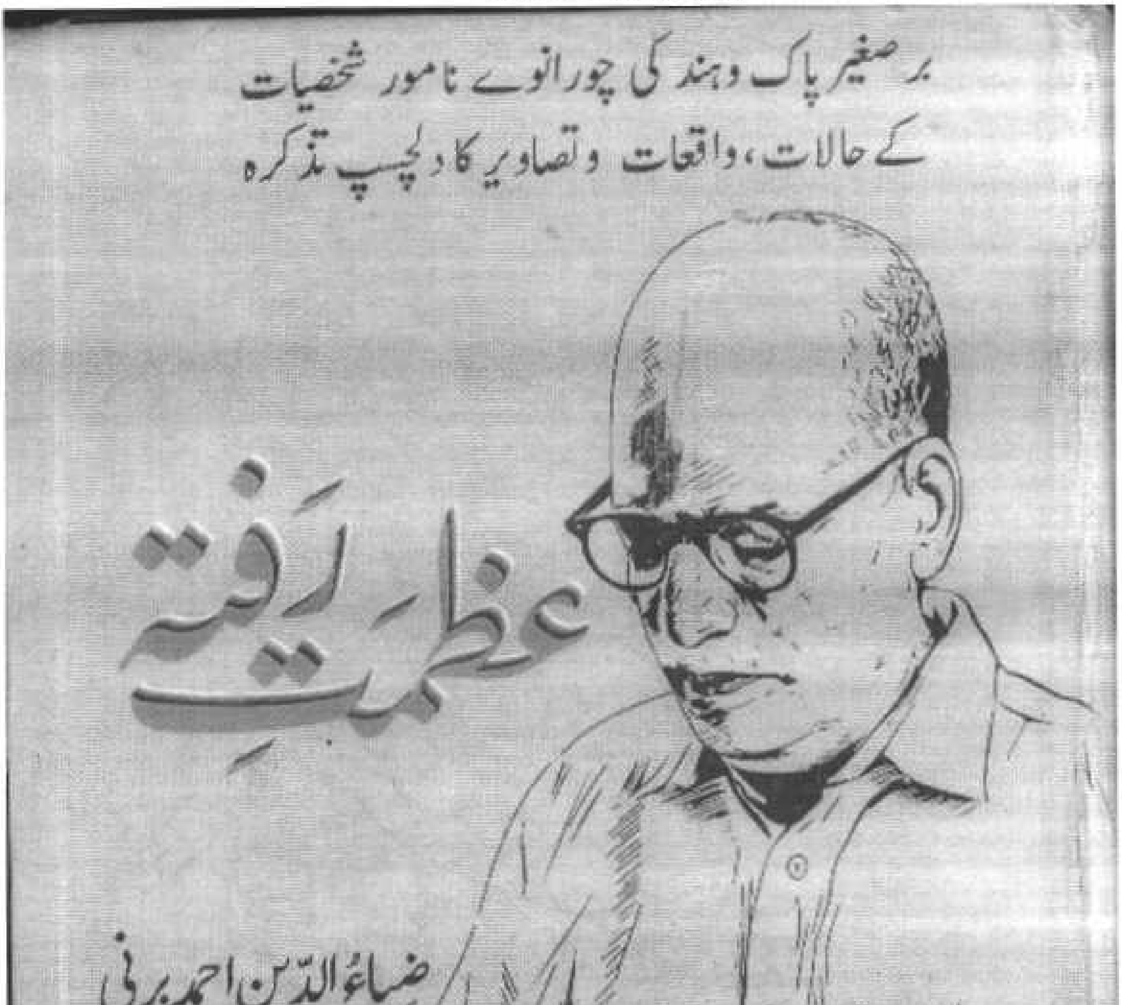
از

سی۔ ایف۔ اینڈریوز

دیباچہ از شمس العلماء ڈاکٹر حافظ مولوی نذیر احمد دہلوی مرحوم

مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی

book3.jpg (490x718x24b jpeg)



# تعلیم و تربیت

مصنفہ

ضیاء الدین احمد برنی

مقدمہ

پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم اے

اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔

۱۹۶۹ء

book2.bmp (540x848x24b bmp)



kitabi dunya2.jpg (686x902x24b jpeg)


ماہنامہ

# کتابی دُنیا

کراچی

مدیر: علاء الدین خالد




# ZIAUDDIN AHMED BARNI:CRITICAL ANALYSIS OF HIS SCHOLARLY AND LITERARY CONTRIBUTIONS

**for**

**Ph.D(Urdu)**

2009

**Scholar**

Rafique Ahmed

Assistant Professor

Department of Urdu,University of Sindh

**Supervisor**

**Dr.Nasim Ara Sartaj**

Ex.Professor & Head

Department of Urdu,University of Sindh

**Department of Urdu,Faculty of Arts**

**University of Sindh,Jamshoro**

# ABSTRACT

## ZIAUDDIN AHMED BARNI:CRITICAL ANALYSIS OF HIS SCHOLARLY AND LITERARY CONTRIBUTIONS

Ziauddin Ahmad Barni was born on 3 February 1890 in Delhi in a scholarly, literary and religious family. His father Munshi Mohammad-ud-Din was a renowned calligrapher of his times. He was given the title of Sartaaje Khush Naweesaan-e-Hind. Barni's elder sister Fatima al Kubraa and younger brother Mohammad Yusuf Dehlvi achieved renown in the field of calligraphy in the subcontinent. Mohammad Yusuf Dehlvi was given the titles of KhaTaaT-i-A'zam Pakistan (the greatest calligrapher of Pakistan), Baabaa-i-KhaTTaTi (the pioneer of calligraphy) and Shehenshah-i-Fann (the king of calligraphic art). Barni's father Munshi Mohammad al-Din and elder brother Munshi Abdul-Qadeer played a notable part in the development of Urdu journalism in the subcontinent. It was this scholarly and literary background in which Barni trained and nurtured his mental development. Those who also played a key role in developing Barni's literary career include Khwaja Hasan Nizami and C.F. Andrews. The latter was Barni's teacher of English at St. Stephen's College, Delhi.

Barni graduated from St. Stephen's College (Delhi) and then completed his M.A. (Previous) in Persian from Allahabad University. In 1913, on Maulana Mohammad Ali Jauhar's advice, Barni joined his newspaper "Hamdard" as an assistant editor. After this, he worked as a teacher in Kanpur'sTheosophical High School and Bombay's Anjuman-e-Islam High School.During his school and college days,Barni was involved with Persian and English besides Urdu. He was admitted to his college in 1908 and it was then that he started writing.

In 1908, an English article of Barni was published in African Times of London while an Urdu essay Suqraat kaa dam-e-wapseen (the last hours of Socrates) was published in an Amritsar magazine. At that time he was offered translation work which he began with great zest. As a result of his great proficiency at translation, he was appointed to the Oriental Translator's Office, Bombay, in 1918 and after a long and distinguished career retired as Senior Oriental Translator (Persian-Urdu) in February 1945.Barni was the author of some 42 books many of which are original compositions while others are translations. Besides these, he has left behind scores of essays on different topics many of which have not been printed as yet or if printed have not been compiled into one volume as yet. His essays cover a vast variety of subjects and his writing extends to analytical, philosophical, historical, biographical and journalistic subjects - in which Barni has exhibited his versatility. During his stay in Bombay,

Barni was also associated with the famous English newspaper, Bombay Chronicle, for a period of 27 years. He contributed book reviews as well as Urdu reports to this daily.This was a very important contribution not only to Urdu journalism but also to Urdu literatureand was greatly appreciated. He continued writing reviews and reports for newspapers and journals in Pakistan after his migration there. Among his other intellectual contributions was the establishment of a literary association called Bazm-i-Khayaal during his Bombay days. A number of poetic gatherings (mushaairay) were held under its auspices and Barni was instrumental in introducing several fledgling poets to public notice.

After migration, Barni started from Karachi a monthly literary journal titledKitaabi Duniyaa which consisted of extensive coverage of new books and publications, new writers and their efforts. This first came out in December 1955 and continued appearing without a break until his death in May 1969. This journal provided a number of bibliographic details but its predominant tone remained literary. Thus it was deeply favoured by the men of letters of the time who sent their contributions to it. As a result, its reputation as standard literary journal became firmly established. A unique feature was the mention of those scholars and writers who were in need of assistance.

Barni's chosen areas of expertise were Maulana Muhammad Ali Jauhar and Allama Iqbal. He has the distinction of celebrating Iqbal Day in Bombay and translating the valuable book Iqbal by Atiya Fyzee into Urdu which was published by the Iqbal Academy in several

editions (1956, 1969, 1981). Barni wrote commemorative essays on Iqbal on every Iqbal Day (21 April). He also issued an Iqbal Number as a special issue of Kitaabi Duniyaa. A very important part of all this literary production are the letters which Barni received from Iqbal in reply to his own letters. This extends our knowledge of the common interest of both personalities. As regards Maulana Muhammad Ali Jauhar, Barni has the unique distinction of authoring the first book in English entitled Muhammad Ali: His life and services in 1918. In the year 1968, Barni completed his Urdu book covering various aspects of Muhammad Ali which was published by Urdu Academy Sindh in 2001 under the title Hayaat-i-Maulana Muhammad Ali Jauhar. His essays and speeches on the two personalities are apart from this.

Barni's letters indicate that he was in contact with a vast number of important literary, political and public figures. After a long research, I have discovered no less than 1500 letters (all unpublished) to his eminent contemporaries which also contained within them the history of most of the 20th century.

Barni's association with Shamsul 'Ulama Dr. 'Umar Mohammad Daud Pota was also of long duration and of a close nature. Barni had begun his association with Dr Daud Pota in Bombay when the latter was Professor of Arabic at Ismail College. These ties continued into post-independence days. Barni issued Dr. Sahib's Persian text book Aaghaaz-i-Faarsi six times from his publishing firm Ta'leemi Markaz. One of the essays in Barni's book 'Azmat-i-Rafta describes this affectionate association.

Personally, Barni was a broad-minded, mild-natured, thoughtful and extremely intelligent person. He had countless admirers and no foes at all. Khwaja Hasan Nizami gave him the sobriquet Barni as a token of his affection for him. Mullaa Waahidi, the famous Urdu writer, was his class fellow. Dr Abdul-Haq, founder of Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, Dr. Syed Sajjaad Dehlvi and Jaleel Kidwai were among his close companions.

There is no doubt that the name of Ziauddin Ahmad Barni will always be included among those benefactors of Urdu literature who devoted their entire lifetime to serving its cause without any selfish motive.

In my essay I have established that Barni was deservedly the subject of critical attention on the basis of his vast literary output and achievements. If this were not done, it would be

possible for his great services to be forgotten. My purpose has been to highlight his contribution to Urdu literature in all its manifestations (essays, obituaries, letters, sketches, full-length books, translations, speeches and broadcasts). I hope my research will pioneer further investigation by other scholars into Barni's panorama of achievements.

☆......☆